TIGHT BINDING BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222736

UNIVERSAL
LIBRARY

دیباچۂ المعارف

یعنی

معارف اعظم گڈھ

کی

۴۸ ویں جلد

از جولائی سنہ ۱۹۴۱ء تا دسمبر سنہ ۱۹۴۱ء

کتب خانہ
جامعہ عثمانیہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ

٦٤٩ م
٨٩١٥٤٣٠٥
هـ ف
دائرة المعارف —
تنقيح
جلد ٢٨

فہرست مضمون نگارانِ معارف

جلد ۴۸

1955ء

جولائی ۱۹۴۱ء تا دسمبر ۱۹۴۱ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شمار	اسمائے گرامی	صفحہ
۱	جناب سید ابو عاصم صاحب بی اے، دسنوی،	۴۶۵
۲	جناب اقبال انصاری ایم اے ریسرچ اسکالر پی ایچ ڈی، لکھنؤ یونیورسٹی،	۱۱۲-۲۰۶
۳	جناب مولوی امتیاز علی خانصاحب عرشی، ناظم کتب خانہ، رامپور،	۳۷، ۸۵
۴	سید سلیمان، ندوی،	۲-۸۲-۱۶۲، ۱۶۵، ۲۴۲، ۲۴۵، ۳۲۲، ۴۰۲
۵	سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب ایم اے رفیق دارالمصنفین،	۶۴، ۷۴، ۱۳۱، ۱۴۱، ۲۱۸، ۲۲۶، ۲۵۶، ۳۰۸، ۳۴۷، ۳۹۱، ۴۳۲، ۴۷۳
۶	جناب شیخ عنایت اللہ صاحب بی اے، دہلوی،	۲۹۸، ۳۸۱، ۴۶۰
۷	جناب غلام مصطفیٰ خان صاحب ایم اے اسسٹنٹ لکچرار کنگ ایڈورڈ کالج، امراؤتی برار،	۳۶۹، ۴۵۰
	جناب محمد ابواللیث صاحب	۱۸۶، ۲۸۳

شمار	اسمائے گرامی	صفحہ
	صدیقی بدایونی لکچرار اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ،	
۹	مولوی محمد اویس صاحب ندوی نگرامی رفیق دارالمصنفین،	۱۷۱، ۲۷۲
۱۰	ڈاکٹر محمد حمید اللہ ایم اے پی ایچ ڈی پروفیسر جامعہ عثمانیہ،	۳۲۵، ۴۰۵
۱۱	پروفیسر مقتدر ولی الرحمن صاحب مرحوم	۴۹
۱۲	شاہ معین الدین احمد ندوی،	۷۷، ۱۴۵، ۱۵۰، ۱۵۶، ۲۳۶، ۳۱۵، ۳۹۶، ۴۷۶
۱۳	پروفیسر سید نواب علی صاحب سابق وزیر تعلیم ریاست جوناگڈھ	۹۸
۱۴	جناب میر ولی الدین صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی، استاذ	۵
	فلسفہ جامعہ عثمانیہ،	
	شعراء	
۱	جناب اثر صہبائی،	۱۴۴
۲	جناب اسد ملتانی،	۳۱۲
۳	جناب ثاقب کانپوری،	۱۴۳ - ۳۱۴
۴	سرور - پروفیسر آل احمد سرور،	۴۷۴
۵	جناب شاہد صدیقی اکبر آبادی،	۱۴۴
۶	منیر - پروفیسر محمد اکبر منیر ایم اے،	۲۲۹
۷	جناب نشور واحدی،	۳۱۳
۸	نظیر - جناب اصغر حسین خاں نظیر لودھیانوی،	۴۷۵
۹	جناب یحییٰ اعظمی،	۳۱۲

فہرست مضامین

جلد ۴۸

جولائی سنہ ۱۹۴۱ء تا دسمبر سنہ ۱۹۴۱ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شمار	مضمون	صفحہ
	شذرات	۸۲، ۱۶۲، ۲۴۲، ۳۲۲، ۴۰۲
	مقالات	
۱	تاریخ ملک ارسلان سلجوقی	۳۶۹، ۴۵۰
۲	تیموری شاہزادوں کا علمی ذوق	۲۵۶، ۳۴۷، ۴۳۲
۳	حافظ جلال الدین سیوطی،	۱۷۱، ۲۷۲
۴	دونوں جہاں کی بادشاہی	۱۶۵
۵	ظہور الاسرار نامی اور مطہر کڑہ،	۳۷-۸۵
۶	علیت اور انسانی آزادی،	۴۹
۷	عہد نبوی کا نظام تعلیم،	۳۲۵
۸	قرآن کا فلسفۂ مذہب،	۵
۹	قرآنی تصور مملکت،	۴۰۵
۱۰	قصص الحق،	۹۸
۱۱	مجمع النفائس،	۱۱۲، ۲۰۶
۱۲	محسن کاکوروی اور ان کی خصوصیات	۱۸۶، ۲۸۳
۱۳	موجودہ ہندوستان میں کاشتکاروں کے حقوق۔	۲۴۵
	تلخیص و تبصرہ	
۱	ترجمہ کے متعلق شیخ عنایت اللہ صاحب دہلوی کے خیالات،	۶۴،
۲	خانان سیر اور وہ،	۳۸۱
۳	خانانِ قرم (کریمیہ)	۴۶۰
۴	عربی زبان کے جدید رجحانات،	۱۳۱، ۲۱۸
۵	مغل یا مونگل،	۲۹۸

شمار	مضمون	صفحہ
۶	یوگوسلاویہ کے مسلمان،	۴۶۵
	اخبار علمیہ	۷۴، ۱۳۹، ۲۲۶، ۳۰۸، ۳۹۱، ۴۷۱
	ادبیات	
۱	جبریل و ابلیس،	۲۲۹
۲	حشر جذبات،	۱۴۳، ۳۱۴
۳	دعوتِ نشاط،	۴۷۵
۴	رباعی،	۱۴۴
۵	شورِ نشور،	۳۱۳
۶	غزل،	۱۴۴
۷	کس لئے،	۴۷۴

شمار	مضمون	صفحہ
۸	ماتمِ فانی،	۳۱۲
۹	وعظِ جدید،	۳۱۲
	باالتقریظ والانتقاد	
۱	رسالوں کے سالنامے اور خاص نمبر،	۱۴۵
۲	نئے رسالے،	۱۵۰
	مطبوعاتِ جدیدہ	۷۷، ۱۵۶، ۲۳۶، ۳۱۵، ۳۹۶، ۴۷۶
	———	

"جلد ۴۰" "ماہ جمادی الآخر ۱۳۶۰ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۴۱ء" "عدد ۱"

مضامین

شذرات،	سید سلیمان ندوی،	۲ - ۴
قرآن کا فلسفۂ مذہب،	جناب میر ولی الدین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی استاد فلسفہ جامعہ عثمانیہ	۵ - ۳۶
ظہور الاسرار نامی اور مظہر کٹرہ،	جناب مولوی امتیاز علی خاں صاحب عرشی، ناظم کتبخانۂ رامپور،	۳۷ - ۴۸
علیت اور انسانی آزادی،	پروفیسر معتقد ولی الرحمٰن صاحب مرحوم	۴۹ - ۶۳
ترجمہ کے متعلق شیخ عنایت اللہ صاحب دہلوی کے خیالات،	"ص ع"	۶۴ - ۷۳
اخبار علمیہ،	"	۷۴ - ۷۶
مطبوعات جدیدہ،	"م"	۷۷ - ۸۰

تاریخ اسلام حصۂ دوم بنی امیہ

اردو میں اسلامی تاریخ پر کوئی ایسی جامع کتاب موجود نہیں تھی جس میں تیرہ سو سال کی تمام اہم اور قابل ذکر اسلامی حکومتوں کی سیاسی، علمی اور تمدنی تاریخ کی تفصیل ہو، اس لئے دارالمصنفین نے تاریخ اسلام کا پورا سلسلہ مرتب کرایا ہے، اس کے بعض حصے پہلے شائع ہو چکے ہیں، اس نئے حصہ میں اموی حکومت کی صد سالہ سیاسی، علمی اور تمدنی تاریخ کی تفصیل ہے، (مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی) ضخامت ۴۰۰ صفحے، قیمت: ۳ سے ۰ نیچر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

سالانہ دستور کے مطابق ان دنوں وطن (بہار) میں قیام ہے، شہر بہار اور اس کے اطراف کے دیہاتوں میں مسلمانوں پر ہندوؤں کے ظالمانہ حملوں کی اطلاعیں اخباروں کے ذریعہ سے عام ہو چکی ہیں، ان میں ۲۷ مسلمان جن میں بوڑھے، بچے، اور عورتیں بھی داخل ہیں، شہید اور سو سے زیادہ زخمی کئے گئے، سات آٹھ مسجدوں کو نقصان پہنچایا گیا، چند قبریں توڑی گئیں، اور بہت سے مکانوں کو آگ لگائی گئی، اس وقت بہار کی عدالت میں مقدمے پیش ہیں، یورپین اور عیسائی مجسٹریٹ عدالت کی کرسیوں پر ہیں، ملزم حاضر کئے جا رہے ہیں اور گواہوں سے ان کی شناخت کرائی جا رہی ہے، مگر ایک بلوائے عام کے ملزموں اور مجرموں کی شناخت جس قدر مشکل ہے وہ ظاہر ہے، اور اس کا نتیجہ جو کچھ ہو سکتا ہے وہ بھی چھپا نہیں،

اس واقعہ نے متعدد نتیجے نگاہوں کے سامنے کر دیئے ہیں، ایک یہ ہے کہ ان سارے ہنگاموں میں مسلمانوں نے کسی ہندو پر از خود حملہ نہیں کیا، بلکہ ان کی حیثیت ہر جگہ اور ہر حالت میں مدافعانہ رہی، دوسری بات یہ کہ جہاں چند مسلمانوں نے بھی جرأت اور ہمت سے کام لیا اور حملہ آوروں کا شجاعانہ مقابلہ کیا، خدا کی موعودہ نصرت ان کے پاس پہنچی اور دشمنوں کے منہ پھیر دیئے، لیکن جہاں کہیں انھوں نے بھاگ کر چھپنے کی کوشش کی وہیں مارے گئے اور اپنی سزا کو پہنچے،

اس واقعہ نے ان دیہاتوں میں جہاں مسلمانوں کی آبادی کم ہے سراسیمگی پھیلا دی ہے، اور وہ اپنی جگہ چھوڑ کر بھاگنے اور بیچنے کی کوشش میں ہیں، اور مسلمانوں کی بعض انجمنیں بھی چاہتی ہیں کہ ایسے دیہاتوں سے مسلمانوں کو نکال کر محفوظ مقامات میں جہاں مسلمان زیادہ تعداد میں ہیں آباد کریں یہ صورت اچھی ہے اور آیندہ کے لئے حفاظت کی تدبیروں میں سے ایک یہ تدبیر بھی ہے، مگر میری نظر ایک اور واقعہ پر ہے، مسلمانوں کا اس ملک میں قیام اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے بعد صرف ان کی ذاتی قوتِ بازو پر موقوف ہے، مسلمانوں کی ہر آبادی اسلام کا ایک مورچہ ہے، کسی مورچہ کو بے لڑے بھڑے دشمن کے حوالہ کر دینا آئینِ جنگ نہیں، جس طرح مسلمانوں نے اس ملک کے ایک ایک چپہ کو اپنے خون سے حاصل کیا ہے، ویسے ہی اس کے ایک ایک چپہ کو اپنے خون ہی سے بچانا ہے دیکھئے کہ انگریزوں کو اپنی سلطنت کے بچاؤ کے لئے کتنی جانی اور مالی قربانیاں پیش کرنی پڑ رہی ہیں، مگر قدم پیچھے نہیں ہٹاتے، مسلمان بھی کبھی اپنی سلطنت کا یہی حق ادا کرتے تھے لیکن جس دن سے ان پر بزدلی چھائی اور شخصی زندگی کی اہمیت ان کی اجتماعی زندگی کی اہمیت پر غالب آگئی، ہندوستان کے ہر معرکہ میں وہ پیچھے ہٹ گئے، اب پھر ان کو اپنی اجتماعی زندگی کا ثبوت دینا ہے، اور ہر حال میں اسلام کے ہر مورچہ کو بچانا ہے، اور دنیا پر ثابت کرنا ہے کہ ان کو اس ملک میں زندہ رہنے کا حق حاصل ہے،

ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت اور سمجھوتے پر میرے قلم نے بارہا مضامین لکھے ہیں، اور اب بھی اس کی ضرورت کا قائل ہوں، مگر گڑگڑا کر دشمنوں سے اپنے زندہ رہنے کی التجا کرنے سے مرنا اور مرجانا بہتر جانتا ہوں، کیونکہ مردانہ وار مظلومانہ موت بھی زندگی سے کم نہیں،

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے ۔۔۔ اسلام زندہ ہوتا ہے، ہر کربلا کے بعد

حسرت

بہرحال ایسے صوبوں میں جہاں مسلمان بڑی اقلیت میں ہیں مسلمانوں کو اپنے بچاؤ کی تدبیروں سے غفلت برتنا نہیں چاہئے، مگر اس بات کو پوری طرح باور کرنا ہے کہ ان کی زندگی نامردی اور مرعوبیت میں نہیں، بلکہ شجاعانہ مدافعت اور اسلام کی برتر قوت پر یقین میں ہے، کوئی قوم دشمنوں کے مارنے سے نہیں مرتی، بلکہ اپنی اخلاقی اور ایمانی موت سے مرتی ہے، ہم کو اسی کی کوشش کرنا ہے کہ مسلمانوں کو اُن کی اخلاقی اور ایمانی موت سے بچائیں،

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سلطنتِ وقت ان کی حفاظت کی ذمہ دار ہے، اور اسی ذمہ داری کے زیرسایہ وہ اپنی زندگی کا خواب دیکھتے ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں، کوئی سلطنت نہیں، بلکہ خود قوم اپنی زندگی کی ذمہ دار ہے، اور قوم کے نوجوانوں پر جو ملت کے سپاہی ہیں، قوم کی حفاظت کا فرض عائد ہوتا ہے، مگر یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ہماری قوت کا سرچشمہ ہماری ایمانی طاقت کا خزانہ ہے، اس خزانہ کی حفاظت آہنی تیغ و خنجر کے بجائے اسلام کی حقانیت کی تلوار اور ایمان باللہ کے خنجر سے ہو سکتی ہے،

مقالات

قرآن کا فلسفۂ مذہب

از

جناب میر ولی الدین ایم اے پی ایچ ڈی استاذ فلسفہ جامعہ عثمانیہ

"اس مضمون مین جو کچھ آپ کے سامنے پیش کیا جارہا ہے، وہ مذہب یا دین کا فلسفہ ہے، جو ہمین قرآن مین تفصیلاً ملتا ہے جسکی مزید تصریح وتفسیر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت و عمل سے ہوتی ہو، فلسفہ کے لفظ سے آپ کو یہ گمان نہ ہونا چاہیے، کہ مذہب پر ایک سرد مہر نقاد کی نگاہ سے روشنی ڈالی جارہی ہے، اور تنقید اور عیب بینی اس تحریر کا محرک ہے، ایسا نہین! مذہب کی تعریف کیا ہوسکتی ہے، ؟ اسکی ماہیت کا تعین کس طرح کیا جاسکتا ہے، ؟ مذہب کے اعمال، عبادت واستعانت کس حکمت پر مبنی ہین، ؟ ان کی کیا مصلحتین ہین؟ ان کی نفسیات کو کس طرح ظاہر کیا جاسکتا ہو، اور ان کو زمانہ جدید کے ذہنون کے کس طرح قابل قبول بنایا جاسکتا ہو، یہ ہین محرکات میرے اس مختصر مقالہ کے،

مجھے امید ہو کہ اس کے سُن لینے اور سمجھ جانے کے بعد آپ مجھ سے اتفاق کرین گے، کہ مذہب کے معروض یعنی حق تعالیٰ سے ہمارا سابقہ بعثت ہی نہین، بلکہ اس دنیوی زندگی مین ہر لحظہ پڑتا ہو، اور ہر دم ہمین اسکی احتیاج ہوتی ہے، امعیت حق کے احساس کو بیدار کرنا دنیوی

دینی امور میں اسکی نصرت و ولایت کا یقین پیدا کرنا، اور اس طرح حقیقی معنی میں ہمیں مرد مجاہد بنانا، بے خوف و بے جگر مجاہد جسکی امید و بیم کا مرکز نہ صرف اللہ ہی کی ذات ہو جو سارے عالم کا مالک اور حاکم ہے،..... یہ ہیں غایات میرے اس مقالہ کے، ما توفیقی الا باللہ

اے در دلِ من اصل تمنا ہمہ تو — وے در سرِ من مایۂ سودا ہمہ تو،
ہر چند بہ روزگار در می نگرم — امروز ہمہ توی و فردا ہمہ تو،

(ابو سعید رحمہ)

انسان بلکہ تمام حیوانات کی زندگی کا پہلا قانون، جلبِ منفعت و دفعِ مضرت ہی تحفظِ ذات اور توالیدِ نسل دونوں کے لئے ضروری ہے کہ یہ ان چیزوں کی طلب کرے جو اسکی زندگی کے حفظ و بقا میں ممد و معاون ہیں، اور ان چیزوں سے گریز کرے، جو اس کو عدم کی طرف لیجاتی ہیں، یا قوتِ حیات کی تحدید کا باعث ہوتی ہیں، اشیاء کی ابتدائی تقسیم اسی نقطۂ نظر سے کیجاتی ہے، اشیاء یا تو نافع ہیں یا ضار، مفید ہیں یا نقصان رساں، اچھی ہیں یا بری، باعتبار اس کے اثرات کا ترتب ہوتا ہے، تو لذت، محبت، فریفتگی یا اطاعت پیدا ہوتی ہے، یا الم، نفرت، خوف اور توحش، ان میں سے ایک بالطبع محبوب ہیں، مرغوب ہیں، تو دوسری فطرۃً غیر محبوب و نامرغوب، ایک کے حصول کا وہ کوشاں ہوتا ہے، تو دوسرے سے گریزاں، کوشاں ہو کہ گریزاں انسان کی زندگی کا تار و پود یہی جذبات ہیں، ان کا زور مرد افگن ہوتا ہے، ان کے شر و شور سے اسکو فرصت ملتی ہے اور نہ نجات، یہانتک کہ زندگی کے مقررہ دن ختم ہو جاتے ہیں، اور وہ یہ کہتا ہوا رخصت ہوتا ہے:

من باغِ جہان را قفسے دیدم و بس — مرغش زہوا و ہوسے دیدم و بس
از صبحِ وجود تا شبانگاہِ عدم — چون چشم کشودم نفسے دیدم و بس

(سحابی استرآبادی)

اپنی زندگی کے مختصر قیام میں ہر شخص اشیا کو تغیر و حدوث کا اچھا مشاہدہ کرتا ہے، کائنات میں ایک دائمی تغیر جاری ہے، کوئی شے ساکن نظر نہیں آتی، سکون و ثبات فریب نظر معلوم ہوتے ہیں، ہر ذرۂ کائنات میں ایک تڑپ سی نظر آتی ہے، کاروانِ وجود کو کہیں قیام نہیں، شانِ وجود ہر لحظہ تازہ ہوتی ہے، قہری تجلی ہر شے کو ہر لحظہ فنا کر رہی ہے، اور جمالی تجلی ہر لحظہ وجود بخش رہی ہے،

ہستی کہ عیان نیست روان در فنا نے در شان و گر جلوہ کند بر آنے

این نکتہ بود ز کلّ یوم ھو فی شان گر بایدت از کلام حق برہانے (جامی)

اشیاء کے اس تغیر و تبدل، کون و حدوث، فنا پذیری و زوال کی جہت جب چشم بصیرت رکھنے والے انسان پر نمایاں ہو جاتی ہے تو اپنے فقر و احتیاج کی وجہ سے دل وافتقار یا بندگی کی نسبت جو ان سے قائم کر رکھی تھی، وہ یکدم کٹ جاتی ہے، ذواتِ[1] خلق کا فقر اسکی نظر دن میں واضح ہو جاتا ہے، اور اوسکو اس ذات کی تلاش ہوتی ہے، جو حدوث و تغیر سے منزہ ہے، جو قائم بالذات و متصور بالذات ہے، جو واجب و قدیم ہے، صفاتِ کمالیہ سے موصوف ہے، فعال ہے، سارے جہان کی مالک و حاکم و مولیٰ و رب ہے،!

اب مذہب یا دین کا ماحصل بھی اتنا ہی ہے، کہ دل وافتقار کی نسبت (جس کو دین کی زبان میں عبادت و استعانت سے تعبیر کیا جاتا ہے) ذواتِ خلق سے قائم نہ کیجائے، اور احتیاجات اور مرادات میں استعانت ذواتِ خلق سے نہ کی جائے، بلکہ عبادت و استعانت کا مرکز ذات اللہ رہے، یہی مفہوم ہے اس دعوتی کلمہ طیبہ

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

کا کہ اللہ کے سوا کوئی ذات قابلِ عبادت و مستحقِ استعانت (الٰہ) نہیں، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ

---

[1] معارف، یعنی مخلوقات،

کے رسول ہیں، اس پیام کو ساری دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے بھیجے گئے ہیں،

فقر و احتیاج انسان کی فطرت میں شامل ہے، اسی فقر یا احتیاج کو رفع کرنے کے لئے وہ ہر نفع و ضرر پہنچانے والی چیز کو اپنا "الٰہ" قرار دیتا ہے، خواہ یہ چیز عناصر سے ہو یا جمادات سے، نباتات سے ہو یا حیوانات سے، فوق الفطرت ہو یا فوق البشر ان سے رفع احتیاج کے لئے اعانت طلب کرتا ہے، اور استعانت کے لئے ان سے ذل و افتقار کی نسبت قائم کرتا ہے، اپنے جہل اور نادانی کی وجہ سے ان کو مستقل طور پر نافع اور ضار خیال کرتا ہے، اور یہی خیال اس کو اپنے سے کم تر مخلوق کے آگے سجدہ ریز ہونے پر مجبور کرتا ہے!

حواس کے اس التباس اور عقل کے اس دھوکے کو دور کرنے کے لئے دینِ حق کا یہ پیام محمد عربی (فداہ ابی و امی) نے عالم کو سنایا، کہ انسان اشرف المخلوقات ہو کر، فطرت کا شہ کار ہو کر اپنے سے ادنیٰ اور کمتر مخلوق کے آگے ذلیل نہیں ہو سکتا، اسکی گردن اگر جھک سکتی ہے، تو اسی ایک ہمہ خیر، ہمہ دان و ہمہ بین و ہمہ توان ہستی کے آگے جس کے دستِ قدرت میں ساری کائنات کی باگ ہے، جو جملہ صفاتِ کمالیہ سے متصف ہے، اور تمام عیوب سے منزہ اور مبرا ہے! یہی ہستی ہماری الٰہ ہے، یہی قابلِ عبادت ہے، یہی مستحقِ استعانت ہے، یہی ہماری خالق ہے، مالک ہے، ہماری رب ہے، مولیٰ ہے، حاکم ہے، اسی کے ہم مخلوق ہیں، مملوک ہیں، مربوب ہیں، عبد ہیں، محکوم ہیں، اسی کی ہم عبادت کرتے ہیں، اور اسی سے تمام حاجات و مرادات میں بھیک مانگتے ہیں، یہی ذات غنی ہیں، اور ہم سب اسی کے فقیر ہیں، اس کے فقیر ہو کر ہم سارے عالم سے غنی ہیں!

یہ پیام صدق محض ہے، ہماری عزتِ نفس کے عین مطابق ہے، حق و خلق کے رابطہ کا سچا اظہار ہے، اس کو مان کر انسان حقیقی معنی میں انسان بنتا ہے، بے خوف، بے جگر مجاہد جس کی امید و بیم کا مرکز وہی ایک اللہ ہوتا ہے، جو سارے عالم کا مالک اور حاکم ہے! اب مجاہد کی زندگی کی ہر جنبش

اسی مالک و حاکم کے حکم کے تحت ہو جاتی ہے، اور اس کے احکام کی تعمیل میں امر کے امتثال میں وہ ایک جان دیتا ہے، تو ہزار جان پاتا ہے، اس کا ضعف قوت سے اسکی ذلت عزت سے، اس کا فقر غنا سے بدل جاتا ہے، موجودات عالم میں سے وہ کسی سے نہیں ڈرتا، فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ[1] کنتم مومنین[2] کا حکم اس کو سارے عالم سے بے خوف کر دیتا ہے، نہ وہ کسی سے امید و رجا رکھتا ہے، اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ[3] اس کو ساری کائنات سے غنی کر دیتا ہے، ذوات خلق سے امید و بیم کی نسبت کٹتے ہی وہ نفس مطمئنہ حاصل کر لیتا ہے، اور اپنے رب سے راضی ہو جاتا ہے، اللہ کو راضی رکھ کر غیر اللہ سے مستغنی ہو جاتا ہے، اب وہ غنی عن الشی ہے، کونسی چیز اللہ سے برتر ہو سکتی ہے، جس کے حصول کی وہ خواہش کرے، اب سب کچھ اسے حاصل ہے، اسی لئے فرمایا گیا ہے، لِكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا اٰتٰكُمْ[4] علو و تمکین اسی کو حاصل ہے، وہی مخاطب ہے، اس قول کا: اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ[5]!

دیکھو "اللہ" کے فہم نے اس کو کیا سے کیا کر دیا، یا تو وہ ایک حقیر اور ذلیل جانور کی طرح ہر ایک سے ڈرتا اور لرزتا تھا، ہر ایک کو نافع اور ضار قرار دیتا تھا، سر عبودیت خم کرتا تھا، مدد و اعانت کا خواہاں تھا، ان ہی کی عبادت و عبودیت میں زندگی گزار رہا تھا، مشوش، پریشان، حیران، خود ضعیف اور مطلوب بھی ضعیف، "ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ" یا اب علم رسالت کے جاننے اور ماننے کے ساتھ ہی لا کی شمشیر ہاتھ میں لے کر وہ آگے بڑھتا ہے، اور اپنے جاہل ساتھیوں سے قرآن کے الفاظ میں پوچھتا ہے،

---

[1] اگر تم مومن ہو تو ان سے خوف نہ کرو مجھ سے خوف کرو [2] کیا اللہ بندہ کے لئے کافی نہیں،

[3] تاکہ تم غم نہ کھاؤ اس پر جو ہاتھ نہ آیا، اور نہ شیخی کرو، اس پر جو تم کو اس نے دیا،

[4] تم ہی بلند ہو اللہ تمہارے ساتھ ہے،

افغیر اللہ تامرونی اعبد ایھا الجاھلون[1]؟

تا چند گہ از چوب گہ از سنگ تراشی بگزر ز خدائے کہ بصد رنگ تراشی

غیر اللہ کی عبادت و معبودیت کا جوا وہ گردن سے نکال کر پھینک دیتا ہے، عمر میں پہلی مرتبہ حریت محسوس کرتا ہے، خوف کا بھاری پتھر اس کے سینہ سے اٹھ جاتا ہے، اپنے حقیقی مولیٰ کے آگے جھک جاتا ہے، اور ان کو رحیم پاتا ہے، کَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا کی بشارت اس کو ہر طرح مطمئن کر دیتی ہے، اب اس کو یقین ہو جاتا ہے، کہ حق تعالیٰ اس کے ساتھ ایمان کے بعد شانِ رحمت ہی سے پیش آئیں گے، ان کے علاوہ رحیم ہونے کے حاکم و حکیم ہونا، اس کے دل کو اور قوی کر دیتا ہے، وہ انھیں اپنے ہر امر میں متصرف سمجھتا ہے، اور ان کے ہر فعل کو سراسر حکمت سے معمور دیکھتا ہے، ان ہی کے حکم کے مطابق ان کو اپنے کاموں میں وکیل بناتا ہے فاتخذہ وکیلا ان کا فرمان ہے، کفیٰ باللہ وکیلا کہہ کر وہ آزادی و اطمینان کے ساتھ مصروفِ عمل ہو جاتا ہے، اب کہاں یہ اور کہاں وہ جاہل جو غیر اللہ سے ذل و افتقار کی نسبت جوڑ رہا ہے، سچ ہے،

وَمَا یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَالْبَصِیْرُ وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ، وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ وَمَا یَسْتَوِی الْاَحْیَاءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ[2] (الفاطر، ۱۵)

دین کا اجمال، عبادت و استعانت، اس کا ماحصل، تحفظ توحید، اب اس اجمال کی کسی قدر تفصیل ضروری ہے،

عبادت غایتِ تذلل کا نام ہے، جس کا اظہار معبودِ حقیقی کے آگے کیا جاتا ہے، اس کے معروف طریقے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ ہیں، نماز کے تمام اعمال و ارکان پر غور کرو، عبادت یا اظہارِ ذلت

---

[1] اے جاہلو کیا تم مجھے غیر اللہ کی عبادت کرنے کا امر کرتے ہو [2] برابر نہیں اندھا اور دیکھتا اور نہ اندھیرا اور نہ اجالا اور نہ سایہ اور نہ لو، اور برابر نہیں جیتے اور نہ مردے،

کا مفہوم بخوبی تمہارے دل نشین ہوگا، عابد نماز کا قصد کر رہا ہے، مصلے کی طرف بڑھ رہا ہے، زبان پر ہے انی ذاھب الی ربی سیھدین[۵۱] دل غیر حق سے پاک ہے، حق تعالیٰ کے سوا کسی کو بزرگی کا مستحق نہیں سمجھتا، اور اسی فہم کے ساتھ تکبیر تحریمہ اللہ اکبر کہتا ہے اور جب حق تعالیٰ کے روبرو ہو کر کہتا ہے انی وجھت وجھی للذی فطر السمٰوٰت والارض حنیفًا وما انا من المشرکین، دل پوری طرح متوجہ بحق ہے، ورنہ جانتا ہے، کہ جھوٹ کی سزا کیا ہے، یخٰدعون اللہ وھو خادعھم[۵۲] اب نیت میں بھی خلوص ہے، حق تعالیٰ ہی کے لئے نماز پڑھ رہا ہے، ماشتقانہ ایمان کے پیدا ہونے کے لئے پڑھ رہا ہے، عادت کے تحت نہیں، ان ہی کے حول وقوت سے پڑھ رہا ہے، ثنا میں حق تعالیٰ کی عظمت وجلالت وجبروت کا اظہار کر رہا ہے، اور توحید کا اقرار کہ اللہ غیرت سے ہو رہا ہے، اب حضوری میں دست بستہ نظر نیچی کئے ذلت ومسکنت کی تصویر بنا کھڑا ہے، زبان پر جاری ہے الحمد للہ، اور دل میں سمجھ رہا ہے، کہ عالم میں کوئی ذات مستحق حمد نہیں، سارے محامد ومحاسن کی وہی ایک ذات لاشریک لہ سزاوار ہے، جب رب العالمین کہتا ہے تو جانتا ہے، کہ لا رب ھنوالا، ربوبیت اسی کو زیبا ہے، عالم تمام اس کا مربوب ہے، الرحمٰن الرحیم کہتے وقت عالم رجا میں داخل ہوتا ہے، رحمت وکرم کی امید دل میں پیدا ہوتی ہے، جانتا ہے کہ رحمانیت کا تعلق تو ساری کائنات سے ہے، رحیمیت خصوصی شے ہے، اور مومنین سے مخصص کان بالمومنین رحیمًا، مالک یوم الدین کہتے وقت عالم خوف کا مشاہدہ کرتا ہے، روز قیامت حق ہے، اور یہ وہ دن ہے، کہ اسکی شان میں فرمایا گیا، یوم لا تملک نفس لنفس شیئًا[۵۳] اس امید وبیم کی حالت میں عرض کرتا ہے کہ ایاک نعبد حق تعالیٰ ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں، ذل انکسار

---

[۵۱] میں اپنے رب کی طرف چلا ہوں وہ میری ہدایت کرے گا [۵۲] دغابازی کرتے ہیں اللہ سے اور وہی ان کو دغا دیگا [۵۳] جس دن نہ کر سکے کوئی نفس کسی نفس کا کچھ،

کا رشتہ آپ ہی سے جوڑتے ہیں وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ، آپ ہی سے استعانت کرتے ہیں، جانتے ہیں کہ لَا فَاعِلَ فِی الْوُجُوْدِ اِلَّا اللّٰہ، ھُوَ اللّٰہ سو بالکلیہ اعراض کر کے آپ ہی کی طرف بالکلیہ رجوع ہوتے ہیں، ہم آپ کے سوا استعانت کی جہت سے غیر کو کیوں پکاریں جب کہ ہمیں یہ سنا دیا گیا ہو اور ہم نے بھی تجربہ سے اسکی توثیق کر لی ہو کہ آپ کے سوا کسی میں حول و قوت نہیں لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ اسلئے وہ نہ ہمیں نفع پہنچا سکتے ہیں، نہ ضرر، اس مدح و ثنا و اقرار عبودیت کے بعد التماس و دعا اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ حق تعالیٰ راہ مستقیم کی ہدایت فرمائے نفس و ہوی سے چھوٹیں، آپ کا قرب نصیب ہو، صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ اہل انعام کی راہ پر چلنا نصیب ہو، جو انبیا و اولیا، کی راہ ہو، یہی اہل انعام ہیں، وَالَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ مِنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَآءِ وَالصَّالِحِیْنَ، مغضوبین و ضالین کی راہ نہیں جنھوں نے غیر اللہ سے عبادت و استعانت کا رشتہ قائم کر کے ہمیشہ کے خسارہ میں اپنے کو مبتلا کر لیا، اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَھُمْ!

اس حمد و ثنا، التماس و دعا کے ساتھ وہ کلام ربانی کی چند اور آیتیں احکام خداوندی کے معلوم کرنے تکرار سے ان کو اپنے ذہن میں جمانے، ہر حرف کی تلاوت پر دس نیکیاں کمانے اور حق تعالیٰ سے سرگوشی کرنے کیلئے پڑھتا ہے، اور پھر فوراً پیشی میں جھک جاتا ہے، گویا اپنے رحمان و رحیم آقا کے "پیٹ میں مونڈھی" دے دیتا ہے، اس طرح اپنی ذلت کا مزید اظہار کرتا ہے، اسی حالت میں اسکی زبان سے اس کے مولیٰ کی تقدیس و تنزیہ و تحمید جاری ہوتی ہے، اپنی بے مائگی فقر و ذلت کا احساس قلب میں واضح طور پر موجود ہوتا ہے، جب سر اٹھاتا ہے، تو حق تعالیٰ اسی کی زبان سے فرماتے ہیں سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ اس طرح اس کا مرتبہ بلند کرتے ہیں، جو سر معبود حقیقی کے آگے جھکتا ہے، وہ مخلوق کے آگے جھک نہیں سکتا، وہ سب سے بلند ہوتا ہے، ممتاز ہوتا ہے، بے نیاز ہوتا ہے، وہ ایک لاقیمت جوہر ہوتا ہے

سچ ہے،

مَنْ رکن الی المولیٰ ومَالَ الیہ احرقہ اللہ بنورہ حتی یعیرجوھر الالیقۃ لہٗ[۱] (حدیث)

اس سرافرازی کے شکریہ مین وہ حق تعالیٰ کی حمد کرتا ہے، اور پیرون پر گر جاتا ہو، پیر پکڑ لیتا ہے، اور اس طرح غایت تذلل کا اظہار کرتا ہے، زبان پر آقا کی عظمت و رفعت و علو کا اقرار جاری ہوتا ہے، اس اظہار تذلل مین وہ اپنی آنکھ کی ٹھنڈک پاتا ہے، وجعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ[۲] یہ آنکھ کی ٹھنڈک اسکو اپنے محبوب مولیٰ کے مشاہدہ سے ہورہی ہے، یہی اس کا کمال ہے، یہی اسکی معراج ہے، الصلوٰۃ معراج المومن،

معبود کا نہ صرف غیر محض ہونا ضروری ہے، بلکہ اس کا ہمہ توان یا قادر مطلق ہونا بھی لازمی ہے، یہ اپنی لامحدود قدرت اور لامتناہی طاقت کی وجہ سے ہماری حفاظت کرتا ہے، ہماری حاجتون کو پوری کرتا ہے، مرادون کو بر لاتا ہے، اس کے اعتصام کے بعد ہمین اسکی نصرت و اعانت کا قطعی یقین ہوجاتا ہے، اشر کے مسئلہ کی توجیہ سے عاجز ہوکر نتائجیہ (Pragmatists)[۳] نے خدا کے ہمہ توان ہونے کا انکار کر دیا، لیکن جو خدا قادر مطلق نہ ہو، وہ معبود حقیقی کب قرار دیا جاسکتا ہے، جو خود شر پر غالب نہ ہو ہماری مدد کیسے کرسکتا ہے، ہمارا مولیٰ اور نصیر کیسے ہوسکتا ہے، شر کی توجیہ کا یہ موقع نہیں، لیکن ہم اپنے معبود کو فعال مطلق، ہمہ توان مانتے ہین، افعال و آثار کا مرجع اسی کو قرار دیتے ہیں، حول و قوۃ کا اسی کو مبدء سمجھتے ہین، اسی لئے اس سے استعانت چاہتے ہین، اور اس کے نعم المولیٰ و نعم النصیر

---

[۱] جو اپنے مولیٰ طرف جھکتا ہے، اور اسکی طرف مائل ہوتا ہے، تو وہ اس کو اپنے نور سے جلا دیتا ہو، یہانتک کہ وہ لائقیت جوہر ہوجاتا ہے [۲] میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز مین رکھی گئی ہے (نسائی باب عشرۃ النساء)

[۳] زمانہ جدید کے فلسفیون کا ایک گروہ جن مین ولیم جیمس ایم جی ولس، برنارڈ شا وغیرہ داخل ہین،

ہونے کا یقین رکھتے ہین، اعتصموا باللہ ھو مولٰکم نعم المولٰی ونعم النصیر[1] جب قوت صرف اسی کو حاصل ہے لا قوۃ الا باللہ حرکت کا بھی وہی مبدء ہے، لا حول ولا قوۃ الا باللہ توفل (یعنی حرکت) جو حرکت و قوت ہی کا نتیجہ ہے، صرف حق تعالیٰ ہی کے لئے ثابت ہوتا ہے اور ذواتِ خلق سے اسکی بالکلیہ نفی ہو جاتی ہے، اس حقیقت کے سمجھتے ہی اس کی بصر و بصیرت سے غفلت کا پردہ اٹھ جاتا ہے، اور وہ لا تحرک ذرۃ الا باذن اللہ[2] کے معنی سمجھ جاتا ہے، غیر اللہ سے استعانت کی نسبت کاٹ کر اسلم عبدی واستسلم کا مصداق بنجاتا ہے!

اپنے رب سے استعانت کے طریقے کیا ہین، ؟ بصیرتِ محمدیہ نے جن طریقون کی تعلیم فرمائی ہے، ان مین سے بعض یہ ہین:

اپنی حاجتون اور مرادون مین حق تعالیٰ سے دعا کرو، دعا کا حکم ہے، اور اجابت کا وعدہ، ادعونی استجب لکم، حق تعالیٰ جو دمحض ہین، عطا محض ہین، ان مین بخل کا شائبہ نہین، مایوسی و محرومی ان کی درگاہ سے نہیں تشفی کے لئے فرما رہے ہین، لا تایئسوا من روح اللہ[3] وہ حکیم بھی ہین، ان کا ہر فعل حکمت رکھتا ہے، وہ ہمارے خیر کو ہم سے بہتر جانتے ہین، اگر وہ ہماری کسی دعا کو قبول نہیں فرماتے ہین تو اسی نہ قبول فرمانے ہی مین ہمارا فائدہ ہے، اسی لئے کہا گیا ہے، منعہ عطاء کا مرد کا کمال اسی مین ہے، کہ ان کی منع کو عطا جانے، کسی عاشق نے اسی جذبہ کے تحت کہا ہے،

اگر مراد تو اے دوست نامرادی ماست — مراد خویش دگر بار من نخواہم خواست

سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا کرتے تھے، لا ابالی علی ای حال اصبح علی ما اکرہ او علی ما احب لانی لا ادری الخیر لا یکم[4] حق تعالیٰ خود ہمین تعلیم فرما رہے ہین، اور ایک نہایت دقیق نکتہ

---

[1] تمہین اپنے مولیٰ کا اعتصام چاہیئے، وہی تمہارا اچھا مولیٰ ہے، اور اچھا مددگار [2] کوئی ذرہ بغیر اللہ کے حکم کے حرکت نہیں کرتا [3] اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو [4] مجھے اس امر کی پرواہ نہیں کہ مین کس حال مین صبح کرونگا ایسی

کی تعلیم فرمارہے ہیں،

عَسٰی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ وَعَسٰی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّھُوَ شَرٌّ لَّکُمْ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (البقرہ ۱۰)

اسی نکتہ کو سمجھ کر عارف کہنے لگتا ہے "ہمہ آن باد کہ او خواہد آن مباد کہ ما خواہیم" اور خواجہ شبلی نے عارف کی تعریف ہی اس طرح کردی کہ "عارف اوست کہ منع نزد او دوست تر از عطا باشد" یہیں سے رضا کا مقام شروع ہوجاتا ہے، جو استعانت کا بلند ترین طریقہ ہے،

بہرحال اگر حق سبحانہ تعالیٰ کسی حکمت و مصلحت سے بندۂ مومن کی دعا قبول نہیں فرماتے تو اس کے قلب کی حفاظت فرمادیتے ہیں، مطلوب کی جانب سے خیال پلٹ دیتے ہیں، حکایت شکایت، جزع فزع کی طرف مائل نہیں کرتے، رضا کے مقام میں پہونچا دیتے ہیں، اور وہ "لِکُلِّ اَجَلٍ کِتَابٌ" کہہ کر حق تعالیٰ سے راضی ہوجاتا ہے، اجابتِ دعا کی ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ مطلوب تو حاصل نہیں ہوتا، لیکن حق تعالیٰ اسکی دعا کو رد نہیں فرماتے، بلکہ اسکی کسی بلا کو دور کردیتے ہیں، گو اس کو بدل کا علم نہیں ہوتا، ایک آخری صورت یہ بھی ہے کہ مدعا اگر وہ دنیا میں نہیں پاتا، تو آخرت کے لئے یہ ذخیرہ کیا جاتا ہے،

اِنَّ الْعَبْدَ یَرٰی فِیْ صَحَائِفِہٖ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ حَسَنَاتٍ لَا یَعْرِفُھَا فَیَقُوْلُ اَنّٰی لِیْ ھٰذَا فَیُقَالُ اِنَّمَا اُبْدِلَ سَوَالُکَ فِی الدُّنْیَا لَکَ وَقَدْ رَضِیْنَا لَکَ فِیْھَا" (حدیث)	ترجمہ	قیامت کے دن بندہ اپنے اعمال نامے پر وہ نیکیاں دیکھیگا جن کو وہ نہیں پہچانے گا اس سے کہا جائیگا کہ یہ تیرے سوال کا بدل ہیں جو تو نے دنیا میں کیا تھا لیکن تیرے مقدر میں دنیا میں ۴

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴) حالتیں ہیں جسکو یہ پسند نہیں کرتا یا ایسی حالت میں جس کو میں پسند کرتا ہوں کیونکہ میں نہیں جانتا کہ میرے لئے بھلائی کس حالت میں ہے ۱۲ شاید کہ بری لگے تم کو ایک چیز اور وہ بہتر ہو تمھارے حق میں، اور شاید تم کو بھلی لگے ایک چیز اور وہ بری ہو تمھارے حق میں اور اللہ جانتا ہے، اور تم نہیں جانتے،

بہرصورت اجابتِ دعا کا وعدہ سچا ہے، لیکن یہ وعدہ مطلق ہے، مقید نہیں کہ اسی وقت اور اسی صورت میں پورا کر دیا جائے، جس وقت اور جس صورت میں کہ بندے نے دعا مانگی ہے، فافہم اگر آپ اس نکتہ کو سمجھ جائیں تو پھر آپ کو معلوم ہو جائے گا، کہ کیوں رسول عربیؐ نے اس دعا کی تعلیم فرمائی تھی :-

"اللّٰھمّ اکفنی کلّ ھمّ من حیث شئتَ وکیف شئتَ وانّی شئتَ ومن اینَ شئتَ"

استعانت کا دوسرا طریقہ اپنے کاموں میں حق تعالیٰ پر توکل کرنا ہے، اگر ہمیں اس بات کا یقین ہو محض علم نہیں، یعنی تحقق ہو محض تعقل نہیں، یا جدید نفسیاتی اصطلاح میں یوں کہو کہ اگر یہ بات ہمارے تحت الشعوری نفس میں اتر گئی ہو، کہ فاعل حقیقی حق تعالیٰ ہیں، کرنے والے خود بدولت ہیں، افعال و آثار کا مرجع خود ہیں، حول و قوۃ کا مبدء خود ہیں، اور پھر اس کا بھی تیقن ہو کہ ایمان کے بعد وہ رحیم بھی ہیں "کانَ بالمؤمنینَ رحیمًا" ولی ہیں، "واللہ ولیّ المؤمنین"، تو ہم اپنے تمام امور ان کے تفویض کرنے میں خوشی سے آمادہ ہو جائیں گے، اور اس تفویض کے ساتھ ہی فکر سے آزاد ہو جائیں گے، طمانیت و مسرت سے ہمارے قلوب پھر جائیں گے، اور کسی مست محبت کے الفاظ میں کہہ اٹھیں گے،

وکلت الی المحبوب امری کلّہ فان شاء احیانی وان شاء اتلفا[1]

توکل اپنی حول و قوۃ سے بری ہونا ہے، اعتصام باللہ ہے، ذوالنون رح نے توکل کی تعریف اسی طرح کی ہے، "التوکّل ترک تدبیر النفس والانخلاع من الحول والقوّت"[2] اور سری سقطی رح نے بھی ان کے ساتھ اتفاق کیا ہے، "التوکّل الانخلاع عن الحول والقوۃ"، ان تعریفوں کا ماخذ، حدیث نبوی: لاحول ولا قوۃ الا باللہ اور قول عزوجل لا قوۃ الا باللہ توکل قلبی عمل ہے

---

[1] میں نے اپنا کام اپنے محبوب کے حوالہ کیا، خواہ اب وہ مجھے زندہ رکھے یا مار ڈالے [2] توکل اپنے نفس کی تدبیر کو چھوڑنا، اور اپنی حول و قوت سے نکل آنا ہے،

یعنی قلب میں یقین جاگزین ہو، کہ مجھ میں اور کسی شے میں نہ اثر ہے، نہ قوت ہے، نہ حرکت ہے، مجھ میں اور ہر شے میں اثر و قوت و حرکت حق تعالیٰ ہی پیدا کرتے ہیں، وہ جس طرح میرے خالق ہیں، میرے افعال کے بھی خالق ہیں، خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ میرے اقتضاء فطرت عین کے مطابق افعال کی تخلیق فرما رہے ہیں، میرا اقتضاء میرا اختیار رہے، لیکن فعل کی تخلیق حق تعالیٰ کی جانب سے ہو رہی ہے، اسلئے اسباب قطعیہ کے استعمال و اختیار کا مجھے حکم ہے، حکم کے تحت میں ان کو استعمال کر رہا ہوں جانتا ہوں کہ اگر مجھے اولاد کی خواہش ہو، تو جماع کو ترک نہیں کر سکتا، بھوک کی تشفی کے لئے نوالہ کا اٹھانا اور اس کا چبانا اور حلق سے نیچے اتارنا قطعی ضروری ہے، تو کل یہاں ترکِ عمل و تعطل کا نام نہیں، علم و حالت کا نام ہے قلبی کیفیت کا نام ہے، اس یقین کا نام ہے، کہ ہاتھ میں قدرت، حرکت، فعل سب حق تعالیٰ ہی کے حکم سے پیدا ہوئے ہیں، ان کی مشیت اور ارادے سے پیدا ہوئے ہیں، وہ چاہیں تو نوالہ منہ تک نہ پہونچے، ہاتھ شل ہو جائے، کھانا بھی چھن جائے، نظر ان کے فعل پر ہے فضل پر ہے، اپنے زور بازو پر نہیں، کسب پر نہیں، دست بکار دل بیار! توکل ترکِ اسباب نہیں، ترکِ رویتِ اسباب ہے[1]

مبادیات کو سمجھ جانے کے بعد رزق کے مسئلہ پر ذرا غور کرو، رزق کا ذمہ حق تعالیٰ نے لیا ہے، "وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا"[2] صرف ذمہ داری پر اکتفا نہیں کیا قسم بھی کھائی ہے، صرف قسم پر اکتفا نہیں کیا، مثال بھی بیان کی ہے، "وفی السماء رزقکم وما توعدون، فورب السماء والارض انہ لحق مثل ما انکم تنطقون"[3] (پارہ ۲۶، رکوع ۱۷) حق تعالیٰ ان لوگوں کو بھی رزق دیتے ہیں، جو غفلت و معصیت میں مبتلا ہیں، فسق و فجور میں چور ہیں، پھر جو ان کی اطاعت و رعایت

---

[1] حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ [2] زمین پر کوئی ایسا چوپایہ نہیں جس کے رزق کا ذمہ اللہ پر نہیں [3] اور آسمان میں ہی روزی تمہاری اور جو تم سے وعدہ کیا گیا، سو قسم ہے آسمان اور زمین کے رب کی کہ یہ بات تحقیقی ہو جیسے کہ تم بولتے ہو

کرتے ہوں، وہ کیسے محروم ہو سکتے ہیں، ! دیکھو جو درخت بوتا ہے، وہی سینچتا بھی ہے، ! خلقت کو وہی مدد دیتا ہے، جو ان کا خالق ہے، مخلوق کے لئے یہ بات کافی ہے، کہ ان کا خالق ان کو کافی ہے (الیس اللہ بکافٍ عبدہ) ایجاد ان سے ہے، دوام امداد بھی ان ہی سے ہے، تخلیق ان سے ہوئی، رزق کا دینا بھی ان کے ذمہ ہے، ! اسکی مثال انسان اپنے نفس میں پاتا ہے، یہ جب کسی کو گھر پر دعوت دیتا ہے، تو ان کے لئے غذا کا بھی انتظام کرتا ہے، حق تعالیٰ نے جب ہمیں اپنی مشیت و ارادے سے پیدا کیا ہے، تو رزق کی ذمہ داری بھی انہی پر ہے، ! انہی کے خوانِ کرم سے ہمیں برگ و نوا حاصل ہے، حق تعالیٰ ہمارے مولیٰ ہیں، آقا ہیں، ہم ان کے عبد ہیں، غلام ہیں، اب آقا پر غلام کا نفقہ ضروری ہے، جس طرح کہ غلام پر آقا کی اطاعت واجب ہے، اگر ہم ان کے ہو رہیں انکے سوا نہ کسی کی عبادت کریں، نہ کسی سے حاجت و مراد برآری چاہیں، تو کیا یہ ممکن ہے وہ اپنا حق ادا نہ کریں[1]؟ اسکی بشارت اس آیۂ کریمہ میں دے رہے ہیں، :

من یتق اللہ یجعل لہ مخرجا و	جو تقویٰ اختیار کرتا ہے اللہ اس کے لئے
یرزقہ من حیث لا یحتسب و	راستہ نکالتے ہیں اور ایسی جگہ سے رزق فراہم
من یتوکل علی اللہ فھو	کرتے ہیں جہاں کسی کا سان گمان بھی نہیں ہوتا،
حسبہ،	جو اللہ پر توکل کرتا ہو اللہ اسکے لئے کافی ہے،

رزق کا وعدہ قطعی، صرف ہمیں اپنا حق عبادت و عبودیت ادا کرنا ہے، پھر ناممکن ہے کہ وہ ہمیں اپنے گھر بلائیں، اور پھر ہمیں اپنے احسانات سے محروم رکھیں، وجود بخشی کریں اور پھر مدد نہ کریں، ہست کریں اور اپنے کرم سے محروم رکھیں، ! اپنا حق (عبادت) ہم سے طلب کریں اور ہمارا حق (رزق) ہمیں نہ دیں[2]! وہ کریم ہیں ان سے معاملہ کرکے ان کی خدمت ادا کرکے کون خسارہ میں رہتا ہے،

---

[1] مثالیں ابو العطا اسکندری رح کی ہیں [2] " " "

"مَنْ ذَا الَّذِی سَالَكَ فَحَرَمْتَهٗ وَاِلَیْكَ فَاَهْلَمْتَهٗ وَتَقَرَّبَ اِلَیْكَ فَاَبْعَدْتَهٗ وَهَرَبَ اِلَیْكَ فَطَرَدْتَهٗ"[1] (راز اسبوع حضرت غوث اعظمؓ)

اسی خیال کے تحت کسی عاشق نے کہا ہے، گمان تو نیست کہ از رزق چارہ نیست اما رزق را تو چارہ نیست ؎

بدنبال روزی چہ باید دوید،
تو بنشیں کہ روزی خود آید پدید،

ایک دوسرے عاشق نے اسی خیال کو یوں ادا کیا ہے:

ہیں توکل کن طمزاں پا دوست رزقِ تو بر تو زند تو عاشق تر است!

بہرحال اتباعِ نبوت اسی میں ہے کہ رزق کی طلب میں کوشش کریں لیکن اجملوا فی الطلب[2] کو پیشِ نظر رکھیں اور یاد رکھیں کہ ہماری طلب رزق کے حصول کا مستقبل سبب یا قطعی علت نہیں، شاہ عبدالحق محدث دہلوی رح شارح فتوح الغیب نے مسئلہ کو اجمالاً خوب ادا کیا ہے "بعد از طلب می یابی اما نہ بطلب می یابی" یہی مفہوم اس شعر میں ادا ہوا ہے:

بجستجوے نیابد کسے مراد دلی کسے مراد بیابد کہ جستجو دارد،

شعر کا مطلب یہ ہے کہ جستجو کو مراد یابی کی مستقل علت قرار نہ دینی چاہئے، کیونکہ معاملہ فضل پر منحصر ہے، ہاں جستجو ضرور کیجائے، عادت الٰہی یہی ہے، کہ حرکت میں برکت دیتے ہیں،

استعانت کا تیسرا طریقہ مصیبتوں میں صبر کرنا ہے،

---

[1] وہ کون ہے جس نے تجھ سے سوال کیا، اور تو نے اس کو محروم رکھا، یا تجھ سے ملتجی ہوا، اور تو نے اس کو بے کار چھوڑا، یا تجھ سے ملاپ چاہا اور تو نے اس کو دور کر دیا، یا تیری طرف دوڑ کر آیا اور تو نے اس کو دھتکار دیا [2] یعنی دنیا کمانے میں دل توڑ کر کوشش نہ کرو،

دنیا دارالحزن ہے، دارالحزن ہے، سجن (قید خانہ) غم کی وادی ہے، شیطان کی دکان[1] جس میں سوا شر و فساد کے کچھ نہیں،

أُفٍّ لِلدُّنیا وایامِها فانّها لِلحُزنِ مخلوقةٌ[2]

هُمُومٌ مهالٌ تنقضی ساعةٌ عن ملکٍ فیها او سوقه

درویش ہو کہ شاہ، امیر ہو کہ گدا سب غم و ہم میں مبتلا ہیں، ہدف بلا ہیں، لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي كَبَدٍ[3] چونکہ حق تعالیٰ ہی ہماری غم سے آزمایش کرتے ہیں، مصیبت میں مبتلا کرتے ہیں، رلاتے اور ہنساتے ہیں وَاَنَّهُ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكَى مارتے اور جلاتے ہیں، وَاَنَّهُ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْيَى، اور غنی کرتے اور فقیر کرتے ہیں وَاَنَّهُ هُوَ اَغْنَى وَاَقْنَى اسلئے حق تعالیٰ ہی ہمیں مصائب سے بچنے کا طریقہ بھی بتاتے ہیں، اور وہ طریقہ صبر ہے کیا حکیمانہ ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ"

ایمان والو موجودہ مصائب پر صبر کرو، دوسروں کے ساتھ صبر و استقلال سے کام لو (صَابِرُوا) اور ایسے کاموں میں ثابت قدم رہو جس کا وقت ابھی نہیں آیا (رَابِطُوا)[4] اور اللہ سے ڈرو اسی میں تمہاری فلاح و بہبودی ہے، یہی نجاح کا راستہ ہے، صرف صبر اور حق تعالیٰ ہی کے حکم پر وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ اور حق تعالیٰ ہی کے لئے وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ بس صرف صبر کرنے ہی سے مصائب کی برداشت سہل ہو جاتی ہے، غم کے بادل چھٹ جاتے ہیں، فکر کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے، اسباب کی راہ سے اگر

---

[1] قول یحییٰ بن معاذ [2] دنیا اور ایام دنیا پر افسوس ہے، کہ وہ حزن و غم کے لئے بنائی گئی ہے اسکے غم ایک گھڑی کے لئے ختم نہیں ہوتے، خواہ بادشاہ کے لئے ہوں یا بازاری آدمی کے لئے [3] ہم نے انسان کو سختی میں پیدا کیا لائیدہ [4] رباط کے معنی اعداء کے مقابلہ میں گھوڑے باندھنے کے ہیں، یعنی مورچہ بندی اور ظاہر ہے کہ مورچہ بندی حفاظت اقدام کے لئے ہوتی ہے" (مولانا اشرف علی تھانوی)

انسان مصائب کو دور کرنا چاہے، غم سے گلو خلاصی حاصل کرنا چاہے، اور راحت کی امید باندھے، تو سوائے حسرت و یاس کے کچھ نہیں ملتا، مولانائے روم نے اسی چیز کو کس خوبی سے ادا فرمایا ہے،

گر گریزی با امید راحتے ، ہم از آنجا پشت آید آفتے

ہیچ کنجے بے درد بے دامے نیست جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

حق تعالیٰ سے اگر محبت ہو، اور مصیبت کو ان ہی کی طرف سے دیکھے، تو مصائب کا آسان ہونا ضروری ہے، اسکی مثال یوں سمجھو کہ تم ایک تاریک کمرے میں ہو، کوئی چیز تمھین آگئی، اور تم تڑپ اٹھے تمھین معلوم نہین کہ مارنے والا کون ہے، جب تم نے چراغ منگوایا اور دیکھا کہ یہ تو تمھارا شیخ ہے، یا باپ ہے، یا کوئی ایسی عزیز، محبوب ہستی ہے، جس سے تم کسی صورت مین آزار کی توقع نہین کر سکتے تو تمھارا یہ جاننا بیشک تمھاری تسلی اور صبر کا باعث ہوگا، کیونکہ تم اس تکلیف مین بھی دقائق لطف کا معائنہ کروگے[۱] اسی طرح وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ مین حق تعالیٰ اپنے بندۂ خاص سے بطریق منت فرما رہے ہین، کہ اپنے پروردگار کی رضا و خوشنودی کے لئے اس کے حکم و بلا پر صبر کر، کیونکہ ایمان کی حلاوت اُس وقت تک حاصل نہیں ہوتی، جب تک کہ تیر بلا کا ہدف نہ بنے، ع

من ساختہ جاں را ہدف تیر بلایت!

اگر تم کو حق تعالیٰ کے بیحد مہربان، رحیم اور ودود ہونے کا یقین ہو جائے، انَّ اللّٰہ بکم لرؤف رحیم پر ایمان ہو، کانَ اللّٰہ غفورًا رحیمًا پر اذعان ہو، اور واللّٰہ ذو الفضل العظیم پر ایقان قائم ہو جائے، تو پھر تم اپنے دکھ درد کو پوشیدہ رحمت سمجھو گے! مثالون سے اس نکتہ کو سمجھو، مشفق باپ اپنے بچے کو پچھنے لگاتا ہے، لیکن دکھ پہنچانا مقصود نہیں ہوتا، فاسد خون جو اس کے بدن مین زہر ہے، آسان طریقہ سے نکال رہا ہے، ماں اپنے چھوٹے بچے کو غلیظ دیکھنا نہیں چاہتی، صابون اور گرم پانی سے

---

[۱] یہ مثال ابو العطار اسکندری نے دی ہے، تعبیر پیر یہان استعمال کی گئی،

اسکو نہلاتی، اسکے جسم کو رگڑتی اور مالش کرتی ہے، بچہ چیختا چلاتا ہے، دکھ محسوس کرتا ہے لیکن ماں کا مقصد آزار پہنچانا نہیں ہوتا، تمھارا خیرخواہ طبیب تمھیں ایا رج دیتا ہے، اور تم اسے ناپسند کرتے ہو لیکن اگر وہ تمھارے اختیار کا اتباع کرے تو شفا تم سے کوسوں بھاگے، اگر تم کو کوئی ایسی چیز نہ دیجائے جس پر تمھارا دم نکل رہا ہو، اور تمھیں یہ اچھی طرح معلوم ہو جائے، کہ یہ نہ دینا عین شفقت و مہربانی کے باعث ہے، تو تم کہوگے کہ یہ نہ دینا ہی میرے حق میں دینا ہے، شیخ ابوالحسن شاذلی نے کیا خوب فرمایا ہے "جان لو کہ اگر حق تعالیٰ تم کو کوئی چیز نہیں عطا فرماتے، تو ان کا یہ نہ دینا بخل کی وجہ سے نہیں، بلکہ عین رحمت ہے، ان کا نہ دینا ہی دینا ہے، لیکن نہ دینے میں دینا وہی سمجھتا ہے، جو صدیق ہے، عَسٰی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّیَجْعَلَ اللّٰہُ فِیْہِ خَیْرًا کَثِیْرًا[1] میں اسی راز کی طرف اشارہ ہے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شدائد پر بھی اسی طرح شکر فرماتے جس طرح کہ نعمتوں پر "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی مَا یَسُاءُ[2] وَیَسُرُّ" صرف ایمان کی ضرورت ہے، اور شدتِ حب کی، ہر مصیبت کے وقت حق تعالیٰ کی جو تجلی ہوتی ہے، مومن کو اس تجلی میں ایسی حلاوت نصیب ہوتی ہے کہ وہ سخت غم کو آسانی سے جھیل لیتا ہے، اور اکثر اوقات غلبۂ تجلی سے اسکو دکھ بھی نہیں محسوس ہوتا، یہ بات اگر تمھاری سمجھ میں نہ آرہی ہو تو زلیخا پر طنز کرنے والی حسین بیبیوں کے حال پر غور کرو، یوسف کے ہوش ربا جمال سے وارفتہ ہو کر انھوں نے اپنا ہاتھ کاٹ لیا، اور خبر بھی نہ ہوئی، کہ درد کیا چیز ہے، فَلَمَّا رَاَیْنَہٗ اَکْبَرْنَہٗ وَقَطَّعْنَ اَیْدِیَھُنَّ[3] زبانِ حال سے وہ کہہ رہی تھیں، ؎

این است کہ خون خوردہ و دل بُردہ بسے را! بسم اللہ اگر تاب نظر است کسے را!

شاید یہی معنی ہیں عرفا کے اس قول کے کہ "انس قرب سے ادراکِ الم مفقود ہو جاتا ہے،"

---

[1] شاید تم کسی چیز کو برا جانو اور اللہ تعالیٰ نے اس میں خیر کثیر رکھی ہو [2] شکر ہے اللہ تعالیٰ کا اس چیز پر جو بری معلوم ہو اور جو خوش نظر آئے [3] پھر جب دیکھا اسکو شششدر رہ گئیں، اور کاٹ ڈالے اپنے ہاتھ،

ایمان اور محبت مین پختہ ہونیکے بعد تم کو بیماریون، بلاؤں، فاقون مین وہ اسرار لطف و رحمت نظر آنے لگین گے، کہ تم کہہ اٹھوگے کہ رسول اللہ نے سچ فرمایا، حفت الجنۃ بالمکارہ و حفت النار بالشہوات[1] بلاؤن اور مصیبتون سے نفس دب جاتا ہے، ذلیل و خوار ہو جاتا ہے، حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، ان سے ربط قائم کرلیتا ہے، اور سبھون سے ٹوٹ جاتا ہے، خلق سے فانی ہو جاتا ہے[2] غم سے زیادہ مؤثر سیرت سازی کے لئے کوئی اور شے نہین، غم ہی کے ذریعہ نفس کی خامیان دور ہوتی ہین، قلب کا تزکیہ ہو جاتا ہے، روح کا تجلیہ ہو جاتا ہے، بلا و غم کی وجہ سے اگر تم نے اپنے امراض قلبی کا معالجہ کرلیا، نفس کی تطہیر مین کامیابی حاصل کرلی، ایمان اور عمل صالح سے مزین ہو گئے، ربط بحق قائم کرلیا، استقامت پیدا کرلی، تو یاد رکھیو کہ غم نے تمھیں "فوز عظیم" کے حاصل کرنے مین مدد دی، اور ایسے غم پر ہزاروں خوشیان قربان ہین، اور وہ خوشیان جن کی وجہ سے تم شہوتون مین گرفتار تھے، ہوا و ہوس کے شکار تھے، ظلمتون میں گھرے ہوئے تھے، اور نور سے دور تھے، حق تعالیٰ سے تمھارا کوئی ربط نہ تھا، شیطان تمھارا قرین تھا، تم پر مسلط تھا، اور اس وعید کے تم مصداق تھے:

وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ[3]

بلا کے اسی فلسفہ سے واقف ہو کر حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا، کہ "افضل عیش" (بہترین زندگی) ہم نے صبر میں پائی، حضرت ابو بکر صدیقؓ بیمار ہوئے، لوگون نے عیادت کی، اور کہا کیا ہم طبیب کو بلائین؟ فرمایا طبیب نے مجھے دیکھ لیا، کہا کہ پھر کیا کہا؟ فرمایا کہ یہ کہا ہے کہ اِنِّیْ فَعَّالٌ لِّمَا اُرِیْدُ[4] معروف کرخیؒ فرمایا کرتے تھے، لیس بصادق فی دعواہ من لم یتقلب فی ضرب مولاہ جو اپنے مولا کی ضرب سے متقلب نہیں ہوتا، وہ سچا غلام نہیں اپنے دعوای عبودیت میں صادق نہیں، بعض عارفین

[1] جنت نفس کو ناگوار ہین اور دوزخ شہوتون (خواہشون) سے گھری ہوئی ہے۔
[2] اور جو کوئی آنکھ چرائے رحمٰن کی یاد سے، ہم اس پر مقرر کر دین ایک شیطان پھر وہی رہے اس کا ساتھی
[3] وہی کرتا ہون جو میں چاہون،

کی جیب مین یہ لکھا رہتا تھا، واصبر لحکم ربک فانک باعیننا[1] مصیبت کے وقت اس پر نظر ڈالتے اور محض اس خیال سے کہ حق تعالیٰ ہماری اس مصیبت کو جانتے ہین، دیکھ رہے ہین، جھومتے رقص کرتے، رسول اللہؐ نے اس آیت پر وجد فرمایا تھا، اور ام المومنین عائشہ صدیقہؓ آپ کے پاؤن پر گر گئی تھین اسی لئے سلف کے بعض بزرگ تعزیتِ مصاب یوں کیا کرتے تھے، اصبر لحکم ربک اسکے ساتھ اس قول نبوی صلعم کا سنا دینا بھی مومن کی خاص تسلی کا باعث ہوگا،

اذا احب اللہ عبدا ابتلاہ	جب اللہ بندہ سے محبت کرتا ہے تو اسکو
فان صبر اجتباہ وان رضی	مصیبت مین مبتلا کرتا ہے اگر وہ صبر کرے
اصطفاہ"	تو اپنا پسندیدہ اور راضی رہو تو برگزیدہ

اب ایک کلی نفسیاتی قانون پر غور کرو، انسان کے لئے مصیبتون اور آفتون کا برداشت کرنا اس وقت کسی قدر آسان اور سہل ہوتا ہے، جب اس کو کسی اچھے بدل کی توقع ہوتی ہے، مثلاً اگر مین اپنے وطن سے دور، اہل وعیال سے بجور کسی جگہ تمام دن محنت ومشقت مین گزار رہا ہون تو واقعی میرے لئے یہ ایک مصیبت ہے، لیکن مین اس کو مصیبت نہین سمجھتا، کیونکہ مہینے کے ختم پر مجھے اس کا معاوضہ معقول تنخواہ کی صورت مین مل جاتا ہے، یہ میرے غمون کو بھلا دیتا ہے، میرے زخمون کے لئے مرہم کا کام دیتا ہے، اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر ان وعدون اور بشارتون پر غور کرو جو قرآن کریم مین اس شخص سے کیجارہی ہین، جو مبتلاے مصیبت ہے، اور صبر کر رہا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ دنیا اور آخرت کی ساری بھلائیان صبر ہی مین رکھی ہین!

امام احمد رضی اللہ عنہ کی تحقیق ہے، کہ قرآن مین صبر کا ذکر نوے جگہ آیا ہے! ہم یہان چند ان بشارتون کا ذکر کرتے ہین، جو صابر کے حق مین آئی ہین، اگر وہ ان کو پیش نظر رکھے، ان پر یقین

---

[1] اور اپنے رب کے حکم پر صبر کر کیونکہ تو ہماری آنکھون کے سامنے ہے،

اذعان کے ساتھ تفکر کرے تو چیخ اٹھے، کہ بلا از دوست عطاست واز عطا نالیدن خطاست!

صبر سے ہم حق تعالیٰ کے محبوب بنتے ہیں اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ[۱]، اور جو حق تعالیٰ کا محبوب ہو اس کو کس چیز سے حزن ہو سکتا ہے، اور کس چیز سے خوف؟ صابر کو حق تعالیٰ سے معیت نصیب ہوتی ہے، اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ[۲]، اور یہ معیت سوکھی معیت نہیں جس کے ساتھ حق تعالیٰ ہوں وہ کیسے ذلیل ہو سکتا ہے، کیسے مقہور ہو سکتا ہے، خلق اس کا کیا بگاڑ سکتی ہے، لَا خَالِقَ لِلْمَخْلُوْقِ مَعَ قُدْرَۃِ الْخَالِقِ! صبر ہی سے امامت و پیشوائی نصیب ہوتی ہے، وَجَعَلْنَا مِنْھُمْ اَئِمَّۃً یَّھْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا[۳]، خلق کی ہدایت کا منصب سپرد ہوتا ہے، صابر کے لئے اس کا صبر اعداء کے مکر و فریب کے مقابلہ میں ایک زبردست سپر ہے وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا یَضُرُّکُمْ کَیْدُھُمْ شَیْئًا[۴]، بالآخر ان پر غالب ہونا اس کے لئے یقینی ہے، فَاصْبِرْ اِنَّ الْعَاقِبَۃَ لِلْمُتَّقِیْنَ[۵]، اس کا اپنے مطلب پر فائز ہونا ضروری ہے، وَتَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ الْحُسْنٰی عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ بِمَا صَبَرُوْا یعنی تیرے پروردگار نے جو وعدہ بنی اسرائیل کے ساتھ کیا تھا یعنی دشمنوں سے نجات اور ملک و حکومت کے عطا کرنے کا وعدہ صبر ہی کی وجہ سے ایفا ہوا، اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَھُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ، سلیمان بن قاسم نے کہا ہے، کہ ہر عمل کا ثواب معلوم ہے، مگر صبر کا اجر "بغیر حساب" ہونے کی وجہ سے نامعلوم و ناقابلِ علم! حق تعالیٰ نے صابروں کے لئے اپنی رحمت، ہدایت اور صلوٰۃ کیجا جمع کی ہیں، اور یہ اکٹھے ان کے سوا کسی اور کو نہیں دیئے وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ اَلَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَۃٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَرَحْمَۃٌ وَ

---

[۱] اللہ صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے [۲] اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے [۳] اور کیے ہم نے ان میں سے پیشوا جو راہ بلاتے تھے ہمارے حکم سے جب وہ صبر کرتے رہے [۴] اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرو تو ان کے مکر سے تمہیں کوئی ضرر نہیں پہونچیگا [۵] پس صبر کرو کیونکہ متقین کا انجام نیک ہوتا ہے

اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُھْتَدُوْنَ[۱]

اگر درد گریز پا، سریع الزوال، فانی درد، صبر کے ساتھ برداشت کر لیا جائے (اور اسکی برداشت ناممکن بھی نہیں کیونکہ ناقابل برداشت تکلیف کسی کو دی بھی نہیں جاتی) تو دیکھو اسکے معاوضہ مین کیا مل رہا ہے، ؟ کن چیزوں کا وعدہ ہو رہا ہے، ؟ اور کون وعدہ کر رہا ہے، ؟ کس کی زبانی وعدہ کیا جا رہا ہے، ؟ اگر تمھارے قلب مین ایمان کی شمع روشن[۲] ہے، اگر وہ "غلاف" مین نہین باندھ دیا گیا ہے، اوندھا نہین ہو گیا ہے، اگر وہ ادراک کی قوت رکھتا ہے، اور ان حقائق کا ادراک کر رہا ہے، تو کیا درد اس کے لئے ایک نعمتِ بے بہا نہیں کیا وہ اس سے متلذذ نہیں ہوگا اس کا مشتاق نہ ہوگا، اور فرطِ اشتیاق مین یہ چیخ اسکی زبان سے نہین نکلیگی،

زہر غم دوست جز شکر نیست — این تیر نصیب ہر جگر نیست!
بدکے دہد آن حبیب جانی — شیرین بود انچہ تلخ می دانی!

اب غور کرو اس حدیث کے مفہوم پر:

یتعاھد اللہ عبدہ بالبلاء — حق تعالیٰ اپنے بندے کی بلا کے ذریعہ
کما یتعاھد الوالد الشفیق — خبر گیری کرتے ہین، اسی طرح جس طرح کہ
ولدہ" — مہربان باپ اپنے بچہ کی خبر گیری کرتا ہے،

---

[۱] اور بشارت دو صابرین کو جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ کہتے ہین کہ ہم اللہ ہی کے ہین، اور اللہ ہی کی طرف رجوع کرنے والے ہین، یہ وہ لوگ ہین جن پر ان کے پروردگار کے صلوات ہین، اور رحمت اور یہی ہدایت یافتہ ہیں،

[۲] ابوسعید سے مرفوعاً روایت ہے کہ دل چار طرح کے ہوتے ہین، (۱) اجرد (برہنہ) اس مین چراغ سا جلتا ہے یہ مومن کا دل ہے (۲) اغلف جسکو غلاف مین باندھ دیا گیا ہے یہ کافر کا دل ہے (۳) منکوس (اوندھا) یہ خالص منافق کا دل ہے (۴) مصفح وہ دل جس مین ایمان و نفاق دونون موجود ہین یعنی زبانی ایمان کا دعویٰ اور دل مین اسکا یقین نہین

صحابۂ کرام کے یہی ادراکات تھے، اور انہی کی قوت سے انھوں نے اپنا سارا تن من دھن اسلام کی راہ میں قربان کر دیا تھا، رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ

صبر کا ادب یہ ہے کہ زبان کو شکوہ شکایت سے روکا جائے، سوائے حق تعالیٰ کے اپنی مصیبت کا کسی سے گلہ نہ کیا جائے، انما اشکو بثی وحزنی الی اللہ[1]!

دردم نہان بہ زطبیبان مدعی
باشد کہ از خزانہ غیبم دوا کنند

غور تو کرو کہ مخلوق سے شکوہ کرنے کے کیا معنی ہیں، یہی نہ کہ ایک رحیم وکریم ذات کا ایک غیر رحیم وغیر کریم ہستی سے شکوہ کیا جا رہا ہے، ایسا شخص کبھی حق تعالیٰ کی اطاعت کی حلاوت اپنے دل میں نہ پائے گا، اس صبر یہ ہے کہ مصیبت کو چھپایا جائے، مَنْ کُنُوْزِ البِرِّ کِتْمَانُ المَصَائِبِ وما صَبَرَ مَنْ بَثَّ[2] (حدیث انس مرفوعاً) لیکن مصیبت میں یا درد کی حالت میں زبان سے ہائے وائے نکل جائے تو یہ منافی صبر نہیں بشرطیکہ ان سے شکوہ شکایت مقصود نہ ہو، اور محض استراحت منظور ہو، کیونکہ کراہنے سے توجہ درد کی طرف سے ہٹ کر اس میں ایک قسم کی کمی محسوس ہوتی ہے، اسی لئے "انین" (نالہ) کی دوسری قسم کے متعلق حکم ہے، کہ لا یکرہ ولا یقدح فی الصبر یعنی صبر کے منافی نہیں، اور پہلی قسم کو بروایت امام احمدؒ قادح صبر قرار دیا گیا ہے،

بلا اور مصیبت کے وقت صبر کے معنی یہی ہیں، کہ توافق بالقضا کیا جائے، گو فطری طور پر درد وحزن ہو رہا ہو اور ہو گا کیسے نہیں، یہ تو اقتضائے بشریت ہے، انسان کامل، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ابراہیم کے انتقال پر فرما رہے تھے، انا بفراقک یا ابراھیم لمحزونون (تیرے فراق نے

---

[1] میں تو کھولتا ہوں اپنا اضطراب وغم اللہ کے سامنے [2] نیکی کا خزانہ مصائب کے چھپانے میں ہے جس نے اپنے مصائب کو ظاہر کر دیا، اس نے صبر نہیں کیا،

اے ابراہیم ہمین محزون کر رکھا ہے) لیکن عقلی صدمہ، نہ ہونا چاہئے یعنی اس مصیبت کے واقعہ کو بے محل اور قبل از وقت خیال نہ کیا جائے، اس کے ساتھ توافق کیا جائے، زبان پر ہو ہر چہ آن خسرو کند شیرین بود، اور دل مین یہ خیال ہو ع جہان دار داند جہان داشتن، اب حکم کے تحت اسباب تعلیہ کا استعمال جائز ہو بلکہ ضروری ہے، اور انسان کی فطرت ہی ایسی واقع ہوئی ہے کہ بغیر چارۂ کار اختیار کرنے کے خاموش نہیں رہتی، لیکن اسباب کے استعمال مین نظر اسباب پر نہ ہو مسبب پر ہو تو اسباب مین اثر پیدا کرتا ہے، علاج کا یہ طریقہ استعمال کیا جائے، اس کے تمام اجزا، کو سمجھ کر ان کی پابندی کیجائے، تو رفتہ رفتہ رضا کا مقام حاصل ہو جاتا ہے، جو راحت کبریٰ ہے، دنیا مین جنت عالیہ ہے،!

استعانت کا چوتھا طریقہ حق تعالیٰ کی نعمتون کا شکر ادا کرنا ہے،

انسان کی زندگی مین غم بھی ہے اور خوشی بھی، رنج بھی ہے اور راحت بھی، ظلمت بھی ہو اور نور بھی، تنویریہ نے اپنی کوری عقل سے دنیا کے مبدء ہی کو شر قرار دیا، اور بالآخر شیطنت (PANDIA BOLISM) کے نظریہ کے حامی بن گئے، ان کے تجربہ مین یہ دنیا بدترین دنیا ثابت ہوئی، سوائے غم و حزن کے کوئی شی انھیں حقیقی نظر نہ آئی، اس کے برخلاف رجائیہ نے اس دنیا کو بہترین دنیا قرار دیا، غم و الم ان کی رائے مین محض منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے ہین، تضاد سے لذت کی کیفیت مین اشتداد پیدا کرتے ہین، حقیقی نہیں اعتباری ہین، لیکن سچ تو یہ ہے کہ اس دنیا مین غم بھی حقیقی ہے، اور خوشی بھی حقیقی، ان مین سے کسی ایک کو التباس قرار دینا خود کو دھوکے مین مبتلا کرنا ہے، حقیقت سے چشم پوشی کرنا ہے، اسکی تصدیق ہر شخص اپنے تجربہ سے ہر روز کر رہا ہے، وہ نہ بلا کو قائم پاتا ہے نہ نعمت کو، ہر دور سے گزر رہا ہے، خوشی کے احساس کا انکار کر سکتا ہے، نہ غم کے ادراک کا، بلا و نعمت کا پایا جانا ان کا محسوس ہونا ہے، اور یہین

بارکلے[1] کی بات صحیح معلوم ہوتی ہے، کہ موجود ہونا دراصل محسوس ہونا ہی ہے، (To be is to be perceived or to be is to be perceived) بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے اسماء جلالی بھی ہیں اور جمالی بھی اور یہ ہر وقت مصروفِ عمل ہیں ایک لحظہ کے لئے معطل اور بے کار نہیں، خیر و شر، رنج و راحت، لذت و الم نعمت بلا انہی کی تجلیات کا نتیجہ ہیں، اور حقیقی ہیں،

انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ بلا سے نجات چاہتا ہے، اور نعمت میں اضافہ، بصیرتِ محمدیؐ نے دونوں کے لئے قلبی طریقے بتلائے ہیں، بلاؤں میں صبر اور نعمتوں میں شکر، قلبِ انسانی میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیتے ہیں، اس کو ایک طرف تو نالہ، فریاد، ماتم سینہ کوبی، یاس و قنوط سے نجات دیتے ہیں، اور دوسری طرف کبر، عجب، فخر، غرور، تجبر سے چھڑاتے ہیں، ان سلبی و مضر جذبات سے نجات پاکر وہ قوت، ہمت اور عمل کا مخزن بن جاتا ہے، اور اس کیلئے کائنات کی تسخیر آسان ہو جاتی ہے، اسکی توانائیاں رائگاں نہیں جاتیں، صحیح جانب لگ جاتی ہیں اور ایک نقطہ پر مرکوز ہو کر حیرت انگیز نتائج پیدا کرتی ہیں، مصیبت میں صرف اتنی احتیاط ضروری ہے، کہ ارادہ بالکل شکستہ نہ ہو جائے، ہمت بالکل ٹوٹ نہ جائے، بلا کا بہادری سے مقابلہ کیا جائے حواس بجا ہوں یہی چیز صبر سے حاصل ہوتی ہے، اور نعمت میں خطرہ اس بات کا لگا رہتا ہے، کہ وہ حق تعالیٰ کو بھول نہ جائے، جو تمام حسنات و محامد کا منبع ہیں، اور اس طرح اس منبع سے دور نہ ہو جائے، اور ظلمتوں میں گرفتار نہ ہو جائے، شکر سے یہ خطرہ رفع ہو جاتا ہے، کیونکہ شکر کی حقیقت یہ ہے کہ نعمت کو حق تعالیٰ کی جانب سے دیکھا جائے، اپنی ذات یا خلق کی طرف اسکی نسبت نہ کیجائے، کیونکہ دراصل حق تعالیٰ ہی "ضار" ہیں، اور نافع، نفع و ضرر انہی کے دستِ قدرت میں ہیں

---

[1] تصوریت کا بانی اٹھارہویں صدی مسیحی کا ایک نہایت فریس اور تیز فہم فلسفی (۱۶۸۵ء تا ۱۷۵۳ء) مادہ کے وجود ہی سے انکار کیا، کائنات غیر مادی روحانی شے ہے اور محض نفوس یا ارواح کی جماعت پر مشتمل ہے۔

گو حواس کی نگاہ کو یہی نظر آتا ہے، کہ نعمت خلق ہی کے ہاتھ سے پہونچ رہی ہے، لیکن چشم بصیرت جانتی ہے، کہ یہ محض بمنزلۂ اسباب و آلاتِ نعمت ہیں، قاسم، مجری و فاعل و مسبب حق تعالیٰ ہی ہیں، وَمَا بِكُم مِّن نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ! جب انسان اس حقیقت کو پیش نظر رکھکر حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے تو وہ اُسکی نعمتوں میں اضافہ کرتے ہیں، یہ اُن کا قطعی وعدہ ہے کسی استثناء کی گنجایش نہیں، لَئِن شَكَرتُم لَأَزِيدَنَّكُم[1] اجابت دعا، رزق و غنا، توبہ و مغفرت کا انحصار اپنی مرضی پر رکھا ہے، لیکن شکر کے عوض زیادتی نعمت کا حصول بلا تخلف ہے، اسی لئے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ نَزَلَتْ اِلَيْهِ نِعْمَةٌ فَلْيَشْكُرْهَا "جس کسی پر نعمت کا نزول ہو، اسکو چاہئے، کہ شکر ادا کرے"

سید مرسلان و مرسل راز — داد فرمان بشکر نعمت و ناز،
گل نعمت برائے ہر کہ شگفت — شکر آن روز و شب بباید گفت

اسی عظیم الشان صداقت کو جس پر نعمتوں کا بقا منحصر ہے، افصح العرب والعجم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور نفسیاتی طریقہ سے ادا فرمایا ہے،

النِّعْمَةُ وَحْشِيَّةٌ قَيِّدُوهَا بِالشُّكْرِ، — نعمت ایک وحشی جانور ہے، شکر کی زنجیر سے اسکو باندھ رکھو،

خاتم ملک وحی و خاتم دین — شکر فرمود بر نحیف و سمین،
باز نعمت چو ہست وحشی را — صید از قید شکر کن ادرا،
چون گذاری تو شکر، نعمت زید — ور شوی ناسپاس بگریزد،

نفسیات کا یہ ایک مسلمہ قانون ہے، کہ انسان کو جب نعمت حاصل ہوتی ہے تو وہ خوش ہوتا ہے، لیکن چند روز بعد یہ نعمت اپنی مانوسیت کی وجہ سے اپنی قدر و قیمت کھو دیتی ہے، اب اس میں کوئی

[1] اگر تم شکر کرو تو یقیناً ہم (نعمتوں میں) اضافہ کرتے ہیں،

ندرت باقی نہین رہتی، اس کے وجود سے اس کو کوئی خاص فرق اپنی زندگی مین محسوس نہین ہوتا، اور باوجود ناز و نعم مین گھرے ہونیکے وہ ضیق محسوس کرتا ہے لیکن اگر یہ مفقود ہو جائے، یا ہاتھ سے چھین لیجائے تو اب اسکو اسکی قدر ہوتی ہے، قدر نعمت بعد زوال اسی صداقت کا اظہار ہے، علاوہ ازین احساس نعمت کا مفقود ہونا گویا نعمت ہی کا مفقود ہونا ہے، اگر نعمت سے مجھے خوشی نہ ہو، کوفت ہو، تعب ہو تو یہ میرے لئے نعمت نہین زحمت ہے، ان حقائق کو سمجھ لینے کے بعد تمھین معلوم ہو گا کہ ازدیادِ نعمت مین شکر کا کتنا دخل ہے، نعمت کے شعور سے نعمت کا بقا ہے، شعور کا فقدان نعمت کا فقدان ہے، اسی لئے احساس نعمت کو زندہ رکھنا چاہئے، اور یہی چیز شکر سے حاصل ہوتی ہے، حضرت حسن بصری شکر کو "جالب" حافظا" کہتے تھے، کیونکہ وہ موجودہ نعمتون کی "حافظ" اور مفقود نعمتوں کی "جالب" ہے، شکر سے نعمت سلب و نقصان سے محفوظ ہو جاتی ہے، اور چونکہ شعور مین نعمتون کے ادراک کی قوت پیدا ہو جاتی ہے، وہ ان چھوٹی چھوٹی عنایتون کا بھی مشاہدہ کرنے لگتا ہے، جو اس کے قبل نظر سے پوشیدہ تھین اسلئے ہم کہہ سکتے ہین، کہ شکر سے نعمتون مین قطعی اضافہ ہوتا ہے الشاکر یستحق المزید (شاکر زیادتی کا مستحق ہے) ایک نفسیاتی صداقت ہے، اسی لئے ہمارے "اسوۂ حسنہ" کو جب بھی کوئی امر خوشی کا پیش آتا، تو شکر الٰہی کی ادائی کے لئے سجدہ میں گر جاتے

(رواہ احمد)

انسان کی کچھ عجیب فطرت ہے نعمتون کو بہت جلد بھول جاتا ہے، اور مصیبتون کا ہمیشہ شکوہ کرتا رہتا ہے، کسی عرب شاعر نے اس پر خوب تہدید کی ہے،

یا ایھا الظالم فی فعلہ والظلم مردود علی من ظلم[1]

---

[1] اے اپنے فعل مین ظلم کے روادار کہنے والے تجھے معلوم ہے کہ ظلم ظالم پر لوٹ کر آتا ہے، کب تک اور کہان تک تو مصیبتون کا شکوہ کرتا رہے گا، اور نعمتون کو بھلاتا جائے گا؟

الیٰ متیٰ وحتّیٰ متیٰ تشکرُوا المصیبات وتنسی النعم

ذرا ہمیں اپنی اُن نعمتوں کو دہرانا چاہیے جن کی طرف ہماری نظر نہیں جاتی، پہلے "نعمت نفع" کو لیجیے، پھر "نعمت دفع" کو، دونوں بیشمار ہیں، "نعمت نفع" میں آدمی اپنے صحیح وسالم قد وقامت پر نظر کرے صحت وعافیت پر غور کرے، ان لذتوں کا خیال کرے جو کھانے پینے اور جنسی خواہشوں کی تکمیل میں اس کو میسر ہیں، "نعمت دفع" کے سلسلہ میں یہ دیکھے کہ وہ اپاہج نہیں ہزاروں بیماریوں سے محفوظ ہے، دشمنوں اور مخالفوں کے شر سے مامون ہے، صاحبِ ایمان پھر نعمت کو ایک اور نقطۂ نظر سے دیکھ سکتا ہے، اسکو "نعمتِ توفیق" بھی حاصل ہے، اور "نعمتِ عصمت" بھی، نعمتِ توفیق یہ کہ اس کو ایمان توحید، صدق واستقامت حاصل ہے نعمت عصمت یہ کہ وہ کفر وشرک، نفاق وارتداد، بدعت وفسق وغفلت سے محفوظ رکھا گیا ہے، اگر ان نعمتوں کی وہ تفصیلات میں جائے، ان کی جزا پر نظر کرے اپنی صلاحیت واستعداد پر غور کرے، یہ دیکھے کہ اس کو ان نعمتوں کا کیا حق ہے، تو بے اختیار چیخ اٹھے،

بے لطفِ تو من قرار نتوانم کرد احسانِ تو شمار نتوانم کرد،
گر بر تنِ من زبان شود ہر موئے یک شکر تو از ہزار نتوانم کرد،

(ابو سعید فضہ)

سچ ہے، ان تعدّوا نعمۃ اللہ لا تحصوھا (اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرو تو گن نہ سکو گے) اب ان لاتعداد احسان کا شکر انسان کیسے ادا کر سکتا ہے، اسی لئے کہا گیا ہے، کہ شکر "ادائے شکر سے اپنے عجز کا جان لینا ہے" ادائے شکر کے ساتھ ہی ایک اور شکر لازم آتا ہے، کیونکہ شکر کی توفیق بھی تو حق تعالیٰ کی جانب سے ہوتی ہے، اور یہ توفیق خود ایک بڑی نعمت ہے، جس کا شکر ضروری ہوا، پھر اس شکر کا شکر وہلمّ جرّا الیٰ نہایۃ اسلئے احسان ومنت باری تعالیٰ کا

مشاہدہ خود شکر ہے، ان کی نعمتوں کا اعتراف خود شکر ہے، ان کے حصول کے بعد مرضیاتِ حق پر قائم رہنے کی دعا خود شکر ہے، ان پر حق تعالیٰ کی ثنا خود شکر ہے!

حق تعالیٰ سے استعانت کے دوسرے طریقے اجمالاً یہ ہیں: ہمیں چاہیے کہ گناہوں کے صدور پر توبہ کریں، حق تعالیٰ مغفرت سے ہماری استعانت فرماتے ہیں انہ کان للاوابین غفوراً وہ رجوع کرنے والے کو معاف کرتے ہیں، کتنا تسکین بخش اور محبت آمیز پیام ہے، انی لغفار لمن تاب وآمن وعمل صالحا ثم اهتدی میں معاف کر دیتا ہوں اس کو جس نے توبہ کی، ایمان لایا، نیک عمل کئے اور پھر اس راستہ پر چلا، توبہ و ندامت سے گناہ کی سیاہی قلب سے محو ہو جاتی ہے، گناہوں سے تنفر پیدا ہو جاتا ہے، نیکیوں سے محبت پیدا ہوتی ہے، اور تائب حق تعالیٰ کا محبوب ہو جاتا ہے ان اللہ یحب التوابین۔

ہم نے اوپر تفصیل سے دکھایا ہے، کہ قوت و اثر اصالۃً صرف حق تعالیٰ ہی کے لئے ثابت ہیں لا قوۃ الا باللہ اسلئے ہماری خوف و رجا کی نسبت صرف حق تعالیٰ ہی سے قائم ہو جاتی ہے اور اس کے قیام کے ساتھ ہی حق تعالیٰ ہمیں مخلوق سے غنی اور بے نیاز کر دیتے ہیں، اور اس غنا کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ ہم اس قاتل جذبہ کے چنگل سے آزاد ہو جاتے ہیں جس نے سگ پرستوں کی زندگی کو سکون و طمانیت سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دیا ہے، یہ خوف کا جذبہ ہے جس نے ان کو سوتے جاگتے ہر وقت پریشان، مضطر اور حواس باختہ کر رکھا ہے، اور جس کی وجہ سے انھیں ہر کونہ میں ایک دام دکھائی دیتا ہے، اور ہر گوشہ میں ایک درندہ!

اگر ہم اس امر میں حق تعالیٰ سے استعانت چاہیں کہ وہ ہمیں یاد رکھیں، اور ہم سے راضی رہیں تو ہمیں چاہیے کہ ہم حق تعالیٰ کو یاد رکھیں اور ان کے ہر حکم و فعل سے راضی ہو جائیں، فاذکرونی اذکرکم مجھے، تم مجھے یاد کرو میں تمھیں یاد کروں گا، اسی لئے حکم فرمایا کہ اذکروا اللہ ذکراً کثیراً، اور ہمارے

راضی ہو جانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ وہ ہم سے راضی ہو جاتے ہین رضی اللہ تعالیٰ عنہ و رضوا عنہ

آنانکہ رضاے حق بجان می جویند — در راہ رضاے او بسر می پویند
ہر یک ہمہ آن کند کہ حق فرماید — حق نیز ہمان کند کہ ایشان گویند

اوپر جو کچھ ہم نے کہا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مذہب یا دین مشتمل ہے دو اجزا پر، عبادت و استعانت پر لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی قلبی تصدیق اور لسانی اقرار سے ہمارے قلوب سے غیر اللہ کی معبودیت و ربوبیت فنا ہو جاتی ہے، اس قلب کی عظمت کا کیا کہنا جس سے غیر اللہ کی معبودیت و ربوبیت فنا ہو کر اللہ کی ربوبیت و معبودیت متمکن ہو گئی ہے جس کے الٰہ قطعاً اللہ ہین یعنی جس کے معبود جس کے مسجود جس کے مطلوب جس کے مقصود قطعاً اللہ ہین جس کے رب جس کے مستعان قطعاً اللہ ہین، اس قلب میں توحید کا جلوہ ہے، ایمان کا نور ہے، وہ نورانی قلب ہے، حق تعالیٰ کا محبوب ہے، اور حق تعالیٰ اس کے وکیل ہین، کفیل ہین، ولی ہین، مولیٰ ہین، نصیر ہین، حفیظ ہین اور ہادی ہین،

اس ضمن مین چند تعریفات یاد رکھو؛ جیسا کہ تم نے دیکھا ہے، ذات اللہ ہی کو الٰہ قرار دینا یعنی معبود و مستعان قرار دینا زبان سے اقرار اور دل سے اسکی تصدیق کرنا، توحید ہے، اس اقرار و تصدیق سے قلب سے شرک کا خروج ہوتا ہے، اور توحید داخل ہو جاتی ہے جس ذات پاک نے یہ پیام ہم تک پہونچایا، (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اسکی رسالت کے اقرار و تصدیق سے دل سے کفر کا خروج ہو جاتا ہے، اور ایمان جلوہ افروز ہو جاتا ہے؛ ایمان مین دو چیزین ہین، اور توحید مین بھی دو چیزین ایمان مین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور صرف اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی الوہیت کی تصدیق ہے، توحید مین اللہ تعالیٰ کی معبودیت و ربوبیت اور ان کے ماتحت بندہ کی عبادت و استعانت کی تصدیق داخل ہے، اس کا زبان سے اقرار اور دل سے انکار یا شک نفاق" ہے، اسکی تصدیق

کے بعد انکار "ارتداد" ہے، یہ مثل شرک کے دین و مذہب کی نفی ہے، بغاوت ہے، اور اسلئے ناقابلِ معافی! اور بدعت بھی بُری بلا ہے، یہ دین مین کسی نئی بات کا پیدا کرنا ہے، جو دین کی بات نہین اسکو دین سمجھنا ہے، غیر شریعت کو شریعت "تبلانا افترا علی اللہ" اور ایک گونہ "ادعاے نبوت" ہے، ابد عتی کو توبہ کم نصیب ہوتی ہے، کیونکہ وہ تو اوس کو مستحسن سمجھ رہا ہے، پھر توبہ کیون کریگا، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کُلّ بدعۃٍ ضلالۃ وکلّ ضلالۃٍ فی النار،

قبل ایمان کفر و شرک سے توبہ لازم ہے، پھر ایمان یعنی لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی قلبی تصدیق اور لسانی اقرار جس سے غیر اللہ کی معبودیت اور ربوبیت فنا ہو کر اللہ کی معبودیت و ربوبیت متمکن ہو جائے، اب نفاق، ارتداد، بدعت، فسق و فجور سے احتراز ایمان اور عمل صالح پر استقامت "یہی دین یا بندگی" جس کے متعلق عارف روم نے کیا خوب کہا ہے ؎

گر تو خواہی حرّی و دل زندگی — بندگی کن بندگی کن بندگی

زندگی مقصود ہر بندگی است — زندگی بے بندگی شرمندگی است

جز خضوع و بندگی و اضطرار — اندرین حضرت ندارد اعتبار

ہر کہ اندر عشق یابد زندگی — کفر باشد پیش او جز بندگی

ذوق باید تا دہد طاعات بر

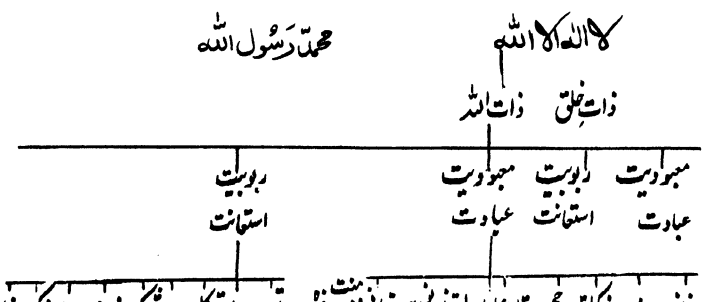
مغز باید تا دہد دانہ شجر،

قل ھٰذہٖ سبیلی ادعوا الی اللہ علی بصیرۃٍ انا ومن اتبعنی وسبحان اللہ وما انا من المشرکین،

(یوسف ع ۱۲)

ضمیمہ

مندرجہ ذیل نقشہ سے دین کے سارے اجزا کی تلخیص پیش نظر ہوجاتی ہے،



ضرورت مترجمین

عربی فارسی انگریزی سے براہ راست شستہ ورفتہ سلیس اردو زبان میں ترجمہ کرنے والوں کی ضرورت ہے، جو مناسب اجرت پر علمی ادبی تاریخی، نیز متفرق علوم وفنون کی کتابوں اور رسائل کے مضامین کا ترجمہ کرسکیں کسی ایک زبان اور اردو کا جاننا کافی ہے علمی قابلیت نیز تجربہ کے متعلق تفصیل سے جواب آنا ضروری ہے،

نوٹ: ہر قسم کی اردو فارسی، عربی، انگریزی کتابیں، مطبوعات: ہندوستان، ایران، مصر، یورپ امریکہ وغیرہ ہماری معرفت نسبتہً ارزاں قیمتوں پر مل سکتی ہیں، شائقین اپنے اسمائے گرامی اور مکمل پتوں سے مطلع فرماویں تاکہ جدید فہرستیں وقتاً فوقتاً ارسال کیجا سکیں،

پتہ ذیل پر خط وکتابت کریں،

شباب کمپنی پوسٹ بکس ۱۲۶ بمبئی نمبر ۳

ظہور الاسرار نامی اور مطہر کڑہ

از

جناب مولوی امتیاز علی خان صاحب عرشی ناظم کتبخانہ رامپور

خواجہ نظامی گنجوی رحمۃ اللہ علیہ کی مثنوی مخزن اسرار شہرۂ آفاق کتابوں میں شمار کیجاتی ہے چونکہ اس میں سلوک و معرفت کے رموز و اسرار، الفاظ فارسی کے پردہ میں ظاہر کئے گئے ہیں، اور سیدھے سادے لفظ اس بارِ گران کو برداشت کرنے کا یارا نہیں رکھتے، اسلئے خواجہ صاحب نے تشبیہ و استعارہ سے جابجا کام لیا ہے،

ہر شخص واقف ہو کہ استعارات و تشبیہات کی خوبی یہ ہے کہ سننے والے کا ذہن اصل مدعا کی طرف کم سے کم وقت میں منتقل ہو جائے، لیکن یہ امر بھی محتاج بیان نہیں، کہ اکثر شاعر کی طبعی ذکاوت اور فطری نزاکت تخیل دو چیزوں کے بعید علاقہ کو قریب دکھانے لگتی ہے، اور اس سبب سے وہ بخیال خود سرعت الفہم تشبیہ یا استعارہ استعمال کرتا ہے لیکن عام ذہن اُس تک جلد نہیں پہونچ سکتے، بنابر ین ناگزیر ہو جاتا ہے، کہ شاعر کا مقصد و مدعا سمجھنے کے لئے غور و خوض اور تلاش و جستجو سے کام لیں، اکثر ادبی کتابوں کی شرحیں اسی غور و خوض اور تلاش و جستجو کا نتیجہ ہیں،

خواجہ نظامی کی مذکورہ مثنوی کی اکثر تشبیہیں اور استعارے اسی قسم کے ہیں، اس پر مستزاد اس کا موضوع ہے، جو نثر میں بھی ادا کیا جائے، تو ہر شخص اوس کی تہ تک پہنچ جانے کا دعویٰ نہیں کر سکتا، اور چونکہ بہتر دلبران کا اظہار "حدیث دیگران" میں زیادہ بہتر خیال کیا گیا ہے، اسلئے دوسرے

معرفت نگاروں کی طرح خواجہ صاحب کے اشعار میں بھی جا بجا تلمیح اور قصہ طلب اشارات ہیں جن کا علم ہر شخص کو ہونا ضروری نہیں، اس بنا پر متعدد اہل علم نے اسکی شرحیں لکھی ہیں،

ان شروح میں سے ایک کتاب ظہور الاسرار نامی، مطبع منشی نولکشور لکھنؤ میں طبع بھی ہو چکی ہے، میرے پیش نظر اس شرح کا جو مطبوعہ نسخہ ہے، وہ مطبع مذکور میں دوسری بار جولائی ۱۸۸۵ء مطابق رمضان ۱۳۰۲ھ میں چھپا تھا،

اس شرح کے دیباچہ میں مصنف کا نام، ظہور الحسن بھوری بن محمد کلیم اللہ بن عظمت اللہ از اولاد سید ابو الحسن عریضی حسنی الحسینی، ظاہر کیا گیا ہے، کتاب کا نام دیباچہ میں مذکور نہیں لیکن ٹائٹل پیج اور خاتمہ میں اسے ظہور الاسرار کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، نیز یہی نام کتاب کے ہر صفحہ کے بالائی گوشہ میں مندرج ہے، اس نام کے پہلے جزو (ظہور) سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، کہ کتاب ظہور الحسن کی تصنیف ہوگی، لیکن سرورق پر کتاب کے نام کے نیچے حسب ذیل عبارت لکھی گئی ہے :-

"متن متین از کنز اسرار حضرت خواجہ نظامی گنجوی است، و این شرح از استاد قدیم و دیرین"

بعد ازاں مصحح نے خاتمۃ الطبع میں شرح کو ظہور الحسن مذکور کی تالیف قرار دینے کے بعد تحریر کیا ہے :-

"ہر چند نسخہ منقول عنہ این شرح کہ خیلی کہنہ زمان بود و تا ہم مقابلہا مخدوش، لیکن تا امکان بشری بصحت پرداختہ شد، و نیز در دیباچہ منقول عنہ بجائے نام مصنف دو سطر از آب سیدگی بخط دیگر بود کہ اصل خط تمام منقول عنہ تفاوتی بین داشت، چونکہ منقول عنہ مرسلہ مولوی محمد نور الحسن صاحب متخلص بذہین رئیس موضع کرن پور، ضلع بجنور، بہمان صورت بود، لہذا

بدان حالت گذاشتہ شد کہ حقیقتش مدرک فنشدہ و نسخۂ دیگر ہم دستیاب نہ گردیدہ کہ بمقابلہ اش تحقیق نام مصنف می شد، و بسبب تبدل خط و احتکاک و اثبات عبارت بجائے نام مصنف پردہ اندروے راز می کشود، اما این قدر بزبان آوردن غیر مصلحت بنود کہ لاقل شرح منقول عنہ از تصنیفات یکے از قدماے کاملین است و بخیالات عالی بالاترین مگر باعث محلوک بودن مقام نام مصنف احتمالی دارد کہ اظہارش قابل انتباہ و آگہی ناظرین است و بس"

(خاتمہ المطبع، صفحہ ۲۵۶، نسخہ نمبر ۲۱۹ نظم فارسی)

اس بیان سے واضح ہوتا ہے، کہ کارپردازان مطبع کو شرح مذکور کا جو نسخہ مولوی نور الحسن صاحب سے دستیاب ہوا تھا، اس مین دیباچہ کے اندر مصنف کے نام کی جگہ سابق تحریر کو مٹا کرنے خط سے پُر کیگئی تھی، اور اگرچہ طرز عبارت و انداز بیان کے ماسوا روشنائی اور روش کتابت بھی اسی طرف اشارہ کر رہے تھے، کہ شرح مذکور ظہور الحسن کے بجائے کسی پُرانے استاذ کی تصنیف ہے، مگر دوسرا نسخہ نہ ملنے کے باعث سے اسکی تصدیق نہ ہو سکی تھی، اسلئے اہل مطبع نے جدید نام باقی رکھتے ہوئے اس شبہہ کا اظہار مناسب خیال کیا،

ظہور الاسرار کے اصل مصنف کا نام

خاتمہ نگار کے اس شبہہ کی صداقت حسن اتفاق سے گذشتہ ہفتہ مجھ پر واضح ہوئی، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مین اپنی تلاش اور تحقیق کے نتائج اہل علم کے روبرو پیش کر دون، تاکہ تواریخ کی ایک عظیم الشان مثال گوشۂ گمنامی مین پڑی رہنے سے بچ سکے، اور ارباب ذوق ظہور الحسن مذکور کے حق مین جو کبھی کے مرحوم ہو چکے ہین، دعاے مغفرت فرمائین،

کتاب خانہ، ریاست رامپور مین مخزن اسرار نظامی کی شرح کے ۳ قلمی نسخے محفوظ ہین،

ان مین سے ایک نسخہ کسی نامعلوم مصنف کی تالیف ہے، بقیہ دو نسخے ایک ہی شرح کے ہین لیکن دیباچہ مین مصنف کا نام دونون مین مختلف ہے، مین نے یہ طے کرنے کے سلسلہ مین کہ ان دونون مین سے کس نسخہ کا نام درست ہے، یہ خیال کیا کہ مطبوعہ شرح کو دیکھون تاکہ اس شارح نے اپنے اس پیشرو شارح کی عبارت کا کوئی ٹکڑا اس کا نام لیکر نقل کیا ہو، تو کسی ایک کتاب کے بیان کی تائید ہو سکے، جب مین نے مطبوعہ نسخہ کی عبارت کو پڑھنا شروع کیا تو ایسا معلوم ہوا کہ مین ابھی قلمی نسخہ مین بعینہٖ یہی عبارت پڑھ رہا تھا، اس خیال کے پیدا ہوتے ہی مین نے قلمی نسخہ سے اوس کا مقابلہ کیا، تو ظاہر ہو گیا، کہ حسب ذیل اختلاف سے قطع نظر کر لیجائے تو مطبوعہ اور قلمی شرح دونون ایک ہی کتاب کے دو نسخے ہین،

مذکورہ اختلاف حسب ذیل ہے :-

(۱) مطبوعہ نسخہ مین حمد و نعت کے بعد تحریر ہے،:

"اما بعد چنین گوید ریزہ چین خانہ علماے دہر جرعہ نوش ساغر فضلاے عصر احقر زمن ظہور الحسن بہوری بن محمد کلیم اللہ بن عظمت اللہ از اولاد سید ابو الحسن عرف یعنی حسنی الحسینی غفر اللہ لہما والیہ (کذا) چون دیدم کہ رغبت بیشتری فضلاے عصر و ابناے دہر الخ" (ص ۳)

یہی عبارت قلمی نسخہ مین اس طرح ہے :-

"اما بعد چنین گوید ریزہ چین خوان علما، دہر و جرعہ نوش ساغر فضلا، عصر، اضعف عباد اللہ القوی، محمد بن قوام الدین بن رستم بن احمد بن محمود بدر خزانۃ البلخی المعروف بکری غفر اللہ لہ ولوالدیہ واحسن الیہما والیہ، کہ چون دیدم رغبت بیشتری از فضلا، دہر الخ" (ورق ۱ الف)

مصنف کے نام کے اختلاف کے علاوہ کتاب مین جا بجا بہت معمولی لفظی اختلافات بھی پائے جاتے ہین، مثلاً مطبوعہ نسخہ مین مندرج ہے :

چنانکہ غواص لآلی نظم و نثر افضل العصر مولانا معین الدین ہانسوی کہ درین علم و فضل بے نظیر و در معانی بیان بے بدیل بودہ، و در بدائع الحکایات گفتہ" (ص۴)

قلمی مین یہ عبارت اس طرح ہے :

"چنانکہ غواص لآلی نظم و نثر، افضل العصر، مولنا معیث الدین ہانسہ کہ در عصر بعلم و فضل بے نظیر و در معانی و بیان بے بدیل بود، در بدائع الحکایات گفتہ" (ورق ۱ ب)

لیکن ہر صاحب عقل جانتا ہے، کہ اختلاف لفظی کا منشار کاتبون کی بے توجہی یا سہو و نسیان ہوتا ہے، اور شاید ہی کسی کتاب کا کوئی قلمی نسخہ ایسا دستیاب ہو سکے جو اسی کتاب کے دوسرے قلمی نسخہ سے لفظ بہ لفظ مطابق ہو، اسلئے یہ قابل لحاظ قرار نہیں دیا جا سکتا، البتہ پہلا اختلاف اہم ہے، لیکن اسکی حقیقت صرف اس امر کے بیان کر دینے سے ظاہر ہو جاتی ہے، کہ ہمارا ایک قلمی نسخہ (نمبر ۶۰ فن پند و نصائح فارسی) ۱۰۵۵ھ کا نسخہ ہے، اور اس مین مصنف کا نام محمد بن قوام الدین السلجی تحریر ہے، دوسرا نسخہ (نمبر ۵۹ فن مذکور) بلا تاریخ ہے لیکن کاغذ و شنائی اور خط کے انداز سے پتہ چلتا ہے، کہ نمبر ۶۰ سے پرانا ہے، اس مین بھی کم از کم ظہور الحسن نام نہیں ملتا، لہذا یہ کہا جا سکتا ہے، کہ کسی ظہور الحسن نے اصل مصنف کا نام حک کر کے اسکی جگہ اپنا نام لکھکر کتاب کو اپنانے کی ناکام کوشش کی ہے، ورنہ فی الحقیقت یہ شرح سلجی کی تصنیف ہے، اور اسی کے نام سے اس کا حوالہ مخزن اسرار کی دوسری نامعلوم المصنف کی شرح مین دیا گیا ہے، مثلاً مولنا نظامی نعت مہتر عالم صلی اللہ علیہ وسلم مین ارشاد فرماتے ہین :

نخستہ اوّل کہ الف نقش بست بر در مجوبۂ احمد نشست،

محمد بلخی جس کی شرح ظہور الاسرار کے نام سے طبع ہوئی ہے، اور اس وقت زیر بحث ہے، "تختۂ اوّل" کی شرح کرتا ہے :

"تختہ" لوح محفوظ را گویند "اوّل کہ الف نقش بست" یعنی اوّل چیزے کہ قلم بر لوح محفوظ نبشت الف بود، (نسخہ قلمی نمبری ۷۰ ورق ۲۲، الف)

ظہور الاسرار میں بھی بعینہٖ یہی عبارت درج ہے، صرف اس قدر فرق ہے، کہ اس میں "اوّل کہ الف نقش بست" کی جگہ "اوّل نقش بست" ہے، (نسخہ مطبوعہ ص ۳۵)

نامعلوم المصنف کی شرح مخزن اسرار (نسخہ قلمی نمبر ۶۱، فن پند و نصائح فارسی) میں یہ تشریح محمد بلخی کی طرف منسوب ہے، اس شرح کے الفاظ یہ ہیں :

"و اینچہ در شرح محمد بلخی آوردہ کہ تختۂ اوّل لوح محفوظ را گویند یعنی اوّل قلم کہ بر لوح محفوظ نوشت الف بود" (شرح مذکور ورق ۹ ب)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ عبارت شرح محمد بلخی کی ہے، علاوہ ازیں مناجات دوم کے اس شعر کی شرح میں کہ

ہم تو پذیری کہ ز باغ تو ایم　　قمری طوق سگ داغ تو ایم

شرح نامعلوم المصنف میں مندرج ہے،

"در شرح محمد بلخی درین مقام آوردہ کہ خواجہ احمد معشوق سالہا در ریاضت مشغول بود، از ہاتف آوازی شنید کہ تو سگ درگاہ مائی، مسرور شد، برما ورفت و گفت، مبارکباد کہ درچندین سال مراسگ درگاہ خطاب شد، گفت : الحمد للہ! اما مشغولی زیادہ کن کہ مرتبہ ازان عالی تر شود، ہمچنان کرد تا آوازے شنید کہ "معشوق درگاہ مائی" بجز آنکہ از خلوت بیرون آمد، اورا احمد معشوق میخوانند" (شرح مذکور۔ ورق ۹، الف)

یہی عبارت باختلافِ یسیر ہمارے نسخہ شرح بلخی مین (ورق ۱۲۱ الف) موجود ہے، اور بعینہٖ ظہور الاسرار (ص ۳۴) مین پائی جاتی ہے، یہ اس بات کی دوسری روشن دلیل ہے، کہ اصل مین شرح محمد بلخی کی تصنیف ہے،

شرح نامعلوم المصنف مین اور مقامات پر بھی بلخی کا حوالہ دیا گیا ہے، لیکن طوالت کے خوف سے مین نقل نہیں کرنا چاہتا، حاصل کلام یہ ہے کہ جو شرح ظہور الاسرار کے نام سے شائع ہوئی ہے، اسکی عبارتین دوسرے مصنف کی شرح مین شرح محمد بلخی کے نام سے نقل کی گئی ہین، جو ہمارے نسخہ نمبری ۶۰ کے دیباچہ کی رو سے بھی محمد بلخی ہی کی طرف منسوب ہے،

شرح بلخی کا سالِ تالیف اب یہ مسئلہ زیرِ بحث آتا ہے، کہ شرح محمد بلخی کس سنہ مین لکھی گئی، اسپرنگر نے کتاب خانہ ہاے شاہ اودھ کی فہرست (ج ۱ ص ۵۲۱ و ۵۲۲) مین لکھا ہے، کہ زیرِ نظر نسخہ کے آخر مین حسب ذیل بیت تاریخی درج ہے، جس سے ۱۰۹۱ھ نکلتا ہے،

بفکر اندر شدم از بہر تاریخ ولم گفتا: زہے شرح گلستان

ڈاکٹر ریو نے (فہرستِ کتبِ فارسی محفوظہ در برٹش میوزیم، ج ۲ ص ۸۳۵ ب) بلخی کی شرح کے ایک نسخہ کی کیفیت لکھتے ہوئے اسپرنگر کے مذکورۂ بالا بیان کا حوالہ دیا ہے، مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے، کہ ہمارے نسخہ کے سرورق پر ایک نوٹ ہے جس مین کسی نے کتاب کی خرید کی تاریخ ثبت کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ یہ کتاب ۱۰۸۹ھ مین خرید ہوئی تھی، اس لئے میرا خیال یہ ہے، کہ ہمارا نسخہ بلخی کی شرح کا پہلا نسخہ (Recension) ہے، ریو کا مقصد یہ ہے کہ اسپرنگر کے نسخہ کی تاریخ ہے، تو صحیح، لیکن وہ اس شرح کی پہلی ترتیب کی تاریخ ظاہر نہیں کرتی، بلکہ معلوم یہ ہوتا ہے، کہ بلخی نے اسے ۱۰۹۱ھ سے قبل تالیف کیا تھا، بعد ازان اس پر نظر ثانی ۱۰۹۱ھ مین کی، اسی لئے برٹش میوزیم کے نسخہ کو ابتدائی نسخہ قرار دینا چاہیے،

ڈاکٹر اتھے (فہرست کتب فارسی، انڈیا آفس نمبر ۹۹) نے بھی اسپرنگر اور ریو کے نسخون کے متعلق یہی طے کیا ہے کہ اول الذکر کا مخطوطہ نسخۂ ثانی کی تاریخ تالیف ظاہر کرتا ہے، اور ثانی الذکر کی تاریخ خرید سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح ہے، کہ شرح مذکور کی پہلی ترتیب ۱۰۹۰ھ سے قبل عمل مین آئی تھی، مسٹر آئی وناف نے (فہرست کتبخانہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال۔ ۴۶۹، مطبوعہ ۱۹۲۴ء) ۱۰۹۱ھ تاریخ تالیف تسلیم کرکے، دوسری فہرستون کے حوالہ پر اکتفا کیا ہے،

مجھے حیرت ہے کہ ڈاکٹر اسپرنگر جیسے خوردہ بین نقاد نے مذکورۂ بالا الفاظ تاریخ، رہتے شرح گلستان کو شرح مخزن اسرار کی تاریخ تالیف کیون قرار دیا، اور اس سے زیادہ تعجب ہے ریو اور اتھے کی اس خوش اعتقادی پر کہ ان دونون نے اسپرنگر کے بیان کو کس طرح مان لیا، ان مین سے کسی کی سمجھ مین یہ نہ آیا، کہ یہ تو کسی شرح گلستان سعدی کی تالیف کی تاریخ ہے، کسی شاعر نے صحیح کہا ہے :

خشت اول چون نہد معمار کج تا ثریا می رود دیوار کج،

اگر اسپرنگر کے متبعین اوس کے قول کو نہ مانتے، تو انھین برٹش میوزیم کے نسخہ کی تاریخ خرید کی موجودگی مین کسی تاویل کی ضرورت نہ پڑتی، کاش یہ محققین یورپ جن کا قلم اسلامیات کی تنقید مین شمشیر برّان کا کام کرتا ہے، شرح کے اوراق مین تاریخ تلاش کرتے، اور دیکھتے، کہ خود شارح نے بھی اپنے زمانہ کی طرف اشارہ کیا ہے یا نہین، ؟ اگر وہ ایسا کرتے تو یہ غلطی مین مبتلا نہ رہتے،

شرح بلخی کے مطالعہ کرنے سے اسکی تالیف کا زمانہ ہی نہین، بلکہ سال بھی معلوم ہو جاتا ہے کیونکہ دوران شرح مین بلخی نے جابجا اپنے معاصرین کا تذکرہ ایسے لفظون مین کیا ہے، جن سے اونکی معاصرت ظاہر ہوتی ہے، نیز ایک جگہ سلیمانی سنہ مین اور دوسری جگہ ہجری سنہ کے ذریعہ سال تصنیف

بھی ظاہر کیا ہے، سب سے پہلے ہم یہ چاہتے ہین، کہ اوس کے عصر سے متعلق بیانات کا جائزہ لین،

(۱) شرح کے دیباچہ مین بلخی نے خواجہ نظامی کے کلام کے اشکال اور حسن قبول پر مولانا مغیث الدین ہانسوی کی کتاب، بدائع الحکایات کے مندرجۂ ذیل اشعار سے استدلال کیا ہے، وہ لکھتا ہے :-

"چنانچہ غواص لآلی نظم و نثر، افضل العصر مولانا مغیث الدین ہانسوی (ہانسہ) کہ درین عصر بعلم و فضل بے نظیر و در معانی و بیان بے بدل بودہ، در بدائع الحکایات گفتہ :

ہنر دوشناسندۂ مثنوی	ازانہاست این نکتۂ معنوی
کہ کس گام در رتبۂ سیر او	نزد، فی نظامی و فی غیر او
نظامی کہ استاد این شیوہ بود	دلش طوبیٰ فضل را میوہ بود
بہ بسیار گفتن مگر جہد داشت	کہ آمیزش موم با شہد داشت
سخن را تصفح بغایت نکرد	بسنجیدہ گفتن کفایت نہ کرد
ولی چون بمنطق قبولیش بود	ہمہ خارہایش رطب می نمود
خدا کردہ بودش قبولی عطا	کہ از زیر آن بر نیاید خطا
خدا پردہ پوش است در ہر دلی	نمود آنچہ بودش خطا مشکلی،
ولی بعض ابیات یا نیمہ	کہ عقل است در وی سراسیمہ
ازان ہاست، حقا کہ آب حیات	شود زندہ زو گر پزیرد ممات
اگر جمع و فتر نبود ی مراد	سخن را ہمو دادہ بود داد"

(صفحہ ۲ شرح مطبوعہ)[۱]

---

[۱] اس عبارت کی تصحیح مین مطبوعہ اور قلمی نسخے دونون سے کام لیا ہے، یہان اس امر کا اظہار مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ مطبوعہ مین شاعر کا نام مولنا معین الدین ہانسوی اور کتاب کا نام بدیع الحکایات درج ہے، اور پانچو شعر مین بجائے "تصفح" کے "تفحص" لکھا گیا ہے،

مولانا مغیثِ ہانسوی یا مغیث الدین ہانسہ، شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی (متوفی ۷۵۷ھ) کے معاصرین، یہ بہت تیز طبع شاعر تھے، ایک روز شیخ نصیر الدین چراغِ دہلی پر قوال سے یہ شعر سُن کر وجد طاری ہو گیا:

جفا بر عاشقان گفتی نخواہم کرد ہم کردی　　قلم بر بیدلان گفتی نخواہم راند ہم راندی

مولینا مغیث نے یہ قصہ سُن کر ایک رسالہ لکھا جس میں اس شعر کے مطلب سے بحث تھی، اور شیخ پر اعتراض کیا تھا، کہ انھوں نے کیوں اس لغو شعر پر سر دُھنا،

اخبار الاخیار (ص ۹۳ مطبع احمدی دہلی ۱۳۴۰ھ) میں شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے، اور خزینۃ الاصفیاء (۳۴۳) میں مفتی غلام سرور لاہوری نے اس واقعہ کو بتفصیل لکھا ہے،

تذکرہ مصنفین دہلی (ص ۱۸) میں شاہ عبد الحق محدث دہلوی نے بالفاظِ ذیل مغیث کا ذکر کیا ہے:

"در ہمان جزو زمان (عہد فیروز شاہ تغلق مراد ہے) مغیث ہانسوی نیز شخصے بود کہ بعالم فضیلت نسبتی داشت، در بیان صنائع و بدائع رسالہ دارد، اما مشہور نیست، و ذکر ازین در نیز در ذکر شیخ نصیر الدین محمود رفتہ است"

مولانا حکیم عبد الحی صاحب مرحوم نے نزہۃ الخواطر (ص ۱۶۹) میں مغیث کو فیروز شاہ خلجی (متوفی ۶۹۵ھ) کا معاصر قرار دیا ہے، یہ سہو ہے، اسلئے کہ انھوں نے اپنے بیان کی سند میں محدث دہلوی کے مذکورۂ بالا رسالہ کا حوالہ دیا ہے، اور اس میں مغیث کا تذکرہ مظہر کرٹہ کے بعد آیا ہے، جو بالاتفاق فیروز شاہ تغلق کے دربار کا شاعر ہے،

بہر حال نجفی اس کو افضل العصر کا خطاب دیتا ہے، اور درین عصر بے نظیر بتاتا ہے جس سے یہ نتیجہ نکالنا درست ہے کہ نجفی کا زمانہ آٹھویں صدی ہجری ہے،

(۲) مخزن اسرار کے شعر:

مرکب این بادیہ دین است و بس چارۂ این کار ہمین است و بس

کی شرح مین بلخی لکھتا ہے،:

"وعزیزی از خدمت شیخ الاسلام رکن الحق والدین ابوالفتح قدس اللہ سرہ العزیز سماع دارد کہ الخ" (ص ۳۳۳ نسخہ نمبر ۶ و ۴، ۳۰ نسخہ نمبر ۵۹ و ص ۲۰۱ نسخہ مطبوعہ)

میری رائے مین یہ شیخ رکن الدین ابوالفتح ملتانی نہیں ہین جنھون نے ۷۳۵ھ مین انتقال فرمایا ہے، بلکہ خواجہ نظام الدین اولیا کے مرید شیخ رکن الدین جعفر ہین، تذکرون مین انکی کنیت مذکور نہین، اسلئے بعض بزرگون کو رکن الدین ملتانی مکنی بابی الفتح کا گمان ہوگا،

بہرحال شارح ان کا قول اپنے کسی دوست یا عزیز کی زبانی روایت کرتا ہے، جس سے یہ خیال کرنا بیجا نہیں کہ خود شارح ابوالفتح کے عہد سے قریب ہے، اور عادۃً ایسا کم دیکھا گیا ہے کہ جو شخص کسی صدی کی ابتدا مین فوت ہو چکا ہو، اس کے شاگرد دوسری آنے والی صدی مین ہون اسلئے یہ نتیجہ بعید از قیاس نہیں کہ شارح آٹھوین صدی مین موجود تھا،

ان کے ماسوا شرح مین ضیاءالدین بخشی (متوفی ۷۵۱ھ) مولنا حمیدالدین قلندر (متوفی ۷۶۸ھ) ملک احمد بن امیر خسرو اور مولانا خواجگی (متوفی ۷۱۹ھ) کا بھی ذکر ہے، اور چونکہ کتاب مین کسی ایسے شخص کا حوالہ نہیں ہے، جو آٹھوین صدی مین موجود نہ ہو، اس لئے ہمارے اس خیال کو مزید تقویت پہنچتی ہے، کہ بلخی آٹھوین صدی کا عالم ہے،

تذکرۂ معاصرین کے بعد ایسے بیانات کا جائزہ لینا چاہیے، جن مین سنین کا ذکر آیا ہے،

مخزن کے شعر:

ملک سلیمان مطلب، کان کجا است ملک ہمان است سلیمان کجا است

کی شرح میں لکھا ہے :

"از گاہ حضرت سلیمان علیہ السلام تا این وقت دو ہزار و دو بست و ہفتاد و یک سال گزشتہ است" (ورق ۱۲۳ ب۔ "نسخہ قلمی نمبری ۶۰ و ۱۲۲۰ الف، نسخہ نمبری ۵۹)

شعر مندرجۂ ذیل کی شرح میں سنہ ہجری لکھا ہے :

در کفِ این ملک یساری نبود، در رہِ این خاک غباری نبود

"بدانکہ درین وقت کہ از ہجرت پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم ہفصد و نود و پنج سال است الخ"

(نمبر ۵۹ ورق ۱۴۰ ب و ۶۰ ص ۱۵۴ ب و ۱۵۵ نسخہ مطبوعہ)

اس سنہ سے روز روشن کی طرح ظاہر ہوجاتا ہے، کہ شرح مخزن اسرار مجنی ۸۹۵ھ یا اسکے کچھ بعد اتمام کو پہنچی ہے،

اب آپ ایک ستم ظریفی ظہور الحسن صاحب کی ملاحظہ فرمائیے، سابق اقتباس میں مجنی نے سلیمان علیہ السلام سے متعلق جو مدت ظاہر کی تھی، اس میں آپنے تغیر فرمایا ہے، اور لکھتے ہیں :۔

"ازان گاہ سلیمان علیہ السلام تا این وقت یکہزار و دو بست و ہفتاد و پنج سال گذشتہ است" (ص ۱۴۹)

ان کو یہ سوچنا چاہئے تھا کہ اگر سلیمانی سنہ کو وہ جون کا تون چھوڑ دیں گے، تب بھی اتنا حسابی ہر جگہ کہاں ہے، کہ اسکی غلطی کو پکڑ سکے، انھیں تو دوسری عبارت کا ۸۹۵ھ بدلنا تھا مگر سوئے قسمت سے یہ بن نہ پڑا، چنانچہ مطبوعہ نسخہ میں یہ مقام ان کی غمازی کے لئے علی حالہ باقی ہے، جس سے ایک طرف تو محققین یورپ کے بیانات کی غلطی ظاہر ہوتی ہے، اور دوسری طرف یہ ثابت ہوجاتا ہے، کہ کتاب ۱۲۷۵ھ میں نہیں، بلکہ اس سے صدیوں پہلے ۸۹۵ھ میں تالیف ہوئی تھی

(باقی)

علیت اور انسانی آزادی

الف۔ ۱۹ ویں صدی کا ڈراؤنا خواب

از پروفیسر مقتدیٰ الرحمٰن صاحب مرحوم

مرحوم معارف کے پرانے مضمون نگار تھے، اپنی وفات سے چند دن پیشتر انھوں نے یہ مضمون اشاعت کے لیے بھیجا تھا لیکن ابھی اسکی نوبت نہ آئی تھی، کہ گذشتہ مارچ میں خود مرحوم کی کتاب زندگی کا ورق آخر ہو گیا۔ اس لئے حسرت و افسوس کے ساتھ معارف کے صفحات میں آج مرحوم کی یہ آخری قلمی یادگار پیش کی جاتی ہے۔

"م"

ہر پڑھا لکھا شخص جانتا ہے کہ آج کل کے ماہرین طبیعیات "جبر و اختیار و قدر" کی پرانی بحث پر نئے سرے سے غور کر رہے ہیں۔ اس بحث میں، بہ قول ایڈنگٹن "اب تک تو معلوم ہوتا تھا کہ طبیعیات بہت شد و مد کے ساتھ تقدیر کی طرف دار ہے"، لیکن اب، خود اسی کی رائے میں طبیعیات "شد و مد کے ساتھ" نہیں تو کم از کم فیصلہ کن طور پر اختیار (ارادے کی آزادی) کی حامی ہے۔ وہ کہتا ہے: سائنس کے نقطۂ نظر سے ایک نئی صورت حال پیدا ہوئی ہے۔ نظریۂ قدر[1] کی وجہ سے طبیعیات اب کسی جبری قانون کے نظام کی پابند نہیں رہی"۔ عوام پر اس قسم کے بیانات کے دور رس اثرات کی دل چسپ مثال اس ریویو میں ملتی ہے جو مسز ڈگس ڈیل[2] کی کتاب "سوانح اے۔ جے۔ بالفور، ہر مجسٹی لٹریری پیلیمنٹ، بابت ۱۹ ستمبر ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔ سیاسی میدان میں بالفور کی تلون مزاجی پر بحث کرتے ہوئے ریویو کرنیوالا سوال کرتا ہے:

---

[1] QUANTUM THEORY [2] MRS. DUGSDALE

کس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک ایسا آدمی جس کی زندگی اس طرح مسلسل نہ ہو، ایک ہی وقت میں جمہور کا مبغوض بھی ہو، اور محترم بھی؟" اسکے خیال میں اس کی توجیہ اس افتراض سے کی جا سکتی ہے کہ "جمہور نے اپنے آپ کو بالفور کے مطابق بنا لیا، اور یہ کہ زمانہ آخر کار اس ترقی کرنے والے ذہن کے ساتھ ہو گیا، جو اتنا عرصہ اس کے آگے رہا۔" جمہور کی نگاہوں میں بالفور کی وقعت کی اس تبدیلی کی جو توجیہ ان جملوں میں کی گئی ہے، اس کی صحت یا غلطی سے ہمیں سروکار نہیں، ہماری موجودہ بحث کے لئے اس میں دلچسپ بات یہ ہے کہ یو کرنے والے نے اپنے نظریہ کی تائید میں سائنس کی موجودہ ترقی کو پیش کیا ہے۔ اس نے نہایت متانت سے دعوی کیا ہے کہ "حقیقت یہ ہے کہ جدید زمانہ کی طبیعیات سے اس کی کچھ تائید ہوتی ہے۔ اب اس کے سامنے فطرت میں احتمال کی شہادت ہے۔ اور ایسی دنیا ہے جس میں علت و معلول کے تشفی بخش قوانین جاری نہیں رہے، لہذا اب اس کے نزدیک اشیاء پر جو غور و فکر ہم کرتے ہیں، اس سے یہ اشیاء متاثر ہوتی ہیں، ہمارا فکر جس قدر معین ہوتا جاتا ہے اسی قدر یقینی یہ اشیاء ہوتی جاتی ہیں۔ اگر یہ خیال صحیح ہے، تو معاصر عقلی دنیا پر ایسے ذہن کے اثرات کی کیا حدود مقرر کی جا سکتی ہیں، جو آرتھر بالفور کے ذہن کی طرح، زور دار ہے، جامع الکل ہے، منقش ہے اور شگفتہ ہے"؟ اس میں شبہ نہیں کہ یہ قدری طبیعیات پر مبنی سائنٹیفک فکر کا حیرت انگیز استعمال ہے۔ بعد کے اوراق میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ انسانی افراد کے ایک دوسرے پر عمل کے نظریہ کی یہ تائید نامناسب بھی ہے اور حیرت انگیز بھی۔

اس میں کلام نہیں کہ قانون علت و معلول[1] (یہ انیسویں صدی کا بہت دل پسند جملہ ہے) کا یہ پہلو سائنس کے فلسفی مزاج ماہرین کی بحثوں میں بہت نمایاں ہے۔ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ ایک زمانہ میں سائنس کے ماہرین ہم سے کہا کرتے تھے کہ "آزاد ارادہ (اختیار) ایک دھوکا ہے۔ ہم جو کچھ بھی کرتے

---

[1] LAW OF CAUSATION

ہیں، مجبور کرتے ہیں۔ اگر ہم برے ہیں تو یہ مجبوری برے ہیں، اور اگر ہم نیک ہیں تو یہ کوئی فخر کی بات نہیں۔ اب آج کل بالعموم فرض کیا جاتا ہے کہ یہ تمام نتیجے قبل از وقت تھے، اور یہ کہ اگر حیاتیات کے ماہرین ہم کو آزادی اور اختیار سے محروم ماننے پر مجبور تھے، تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ مادے کی ساخت سے پوری طرح واقف نہ تھے، اب ہمارے زمانہ میں طبیعیات کے ماہرین ہماری مدد پر کمربستہ ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اگر کوئی برقیہ[۱] آزادی کے ساتھ نقل و حرکت کر سکتا ہے، تو ایک انسان بھی اپنی نقل و حرکت اور اپنے ارادے میں یقیناً آزاد ہے۔ آزاد ارادے کے وجدان کے حقوق کا یہ اعلان کسی نہ کسی طرح اس بات پر مبنی ہے کہ یہ وجدان سے مختلف ایک چیز ہے۔ یہ دراصل طبیعیات کے ماہر کے دقیق ترین علم کے مطابق شعور کی نجات ہے۔ بہرحال اس اعلان کے ساتھ ساتھ اب یہ بھی ہوا ہے کہ عام پڑھا لکھا شخص طبیعیات کے ماہر کو اس قابل بھی سمجھتا ہے کہ وہ اسے بتائے کہ اگر کوئی شخص ۱۱ اگست ۱۹۹۹ء کو ایک خاص مقام سے سورج کو دیکھ رہا ہو، تو اس کا تجربہ کیا ہوگا، اور یہ کہ اگلی عالمی جنگ میں غیر مصافی شخص کے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔

یہ صورتِ حال بہت عجیب و غریب ہے۔ ایک طرف تو سائنس، حیاتی کیمیا[۲]، فعلیات اور طبیعیات کے ماہرین پر ہمارا اعتماد برابر بڑھ رہا ہے۔ ہم توقع رکھتے ہیں کہ یہ ہمیں بتائیں کہ ایک نئی بہتر دنیا کے لئے کیسے مردوں اور کیسی عورتوں کو پیدا کرنا چاہئے، اور یہ کہ اگر ہم ان کے مشوروں پر عمل نہ کریں گے تو ہمارے اخلاف کا کیا حشر ہوگا۔ دوسری طرف یہ معلوم کر کے ہمیں بہت خوشی ہوتی ہے کہ طبیعیات کا ماہر گزشتہ چند برسوں کی بہ نسبت اب آج کل کم یقین کے ساتھ جانتا ہے، یا جان سکتا ہے، کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔ سائنس بالعموم، اور مخصوص سائنسوں کے بالخصوص ماہروں کو جو رتبہ آجکل دیا جا رہا ہے، وہ بہت حیرت انگیز ہے۔ عام پڑھے لکھے شخص ان کو علم کا مخزن اور کائنات کے روحانی

---

۱ ELECTRON ۲ BIO.CHEMISTRY

عنصر کا محافظ، خیال کرتے ہیں۔ یہ سب، یا ان میں سے بعض، عرصہ سے عباے پیغمبری کے متمنی ہیں۔ اب آج کل تو ہم نے ان کو پیغمبر بنا ہی دیا ہے۔ گزشتہ زمانہ میں دینیات کے عالموں کا دعوی تھا کہ عالم بالا کی چیزوں کے متعلق وہی لوگ زیادہ ادعا کے ساتھ گفتگو کر سکتے ہیں۔ لیکن اب آج کل یہی علما، سائنس کے ان ماہرین کے غاشیہ بردار ہیں، جو سائنس کی تعلیمات کو عام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ صورتِ حال طرب انگیزی سے خالی نہیں۔

دیکارت، کپلر، گلیلیو اور نیوٹن کی تحقیقات نے جبری قانون کے نظام کی بنیاد رکھی، اور اس نظام کو قریب تین صدیوں تک طبیعیات کے ماہرین بلا چون وچرا تسلیم کرتے رہے، طبیعیات کی تمام ترقی اس افتراض کے مطابق یا اس پر موقوف تھی کہ مادے کی حرکتیں بعض قابلِ تحقیق قوانین کے مطابق ہوتی ہیں۔ لہذا اگر ایک محدود وقت (یہ کتنا ہی قلیل ہو) کے متعلق ہم کو کافی معلومات حاصل ہیں، تو تمام گذشتہ اور آیندہ صورتوں کو دریافت کر لینا نظراً ممکن ہے۔

عوام الناس کے عقیدوں پر اس عظیم الشان نظریہ کا اثر بہت کم ہوا۔ خیال یہ تھا کہ اس جبری نظام کا اطلاق صرف مادے پر ہو سکتا ہے۔ اور حقیقت میں بھی اس کا اطلاق بے جان مادے پر ہی کیا گیا۔ انسانی افراد کو اس سے بالاتر مانا گیا اگرچہ غالباً کسی کو بھی صاف علم نہ تھا کہ اس برتری کا سرچشمہ یا اس کی وسعت کیا ہے۔

ارتقاء کے حیاتیاتی نظریہ کی آمد سے ایک بڑا تغیر پیدا ہوا کہ انسان کی برتری کا خاتمہ ہو گیا۔ عوام یا کم از کم گرجاؤں اور عبادت گاہوں کے اجتماعوں کو معلوم ہونے لگا کہ بعض سائنٹفک نظریئے ایسے پیدا ہو رہے ہیں، جو ان کے مذہبی اور اخلاقی عقیدوں کے منافات ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہم نہایت اطمینان کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ عام لکھے پڑھے شخص کو جو دلچسپی نظریۂ قدر کے ساتھ ہے وہ اس یقین کا نتیجہ ہے کہ "جبر و اختیار کی پرانی بحث پر اس سے نئی روشنی پڑتی ہے۔ اس کے نزدیک اصول عدم تعین[1] اس نظریہ کو مختصر بیان

---

[1] PRINCIPLE OF INDETERMINACY

کرتا ہے۔ اس بحث کی طرف عام لوگوں کی توجہ گزشتہ صدی کے دوسرے نصف میں ارتقائی حیاتیات کے عروج کی وجہ سے منعطف ہوئی۔ اصل انواع کے متعلق ڈارون کے نظریہ کو طبعی انتخاب کا نام دیا گیا۔ اس نام ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ ارتقائی حیاتیات اس عقیدہ کے تسلیم کر لئے جانے پر مبنی ہے کہ انواعِ حیوانات جن میں انسان بھی شامل ہے طبعی قوانین کے مطابق پیدا ہوتی اور بڑھتی ہیں۔ ڈارون کے عقیدوں کو ہکسلے نے بہت رواج دیا۔ اس کا ایمان تھا کہ "قانون کی حکومت کو میکانکی اور کیمیائی مظاہر سے حیاتیاتی ترقی کے مظاہر تک پھیلایا جا سکتا ہے، اور اس طرح انسانی افراد کی ذہنی زندگی بھی اس کے دائرہ میں لائی جا سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں اس کے مشہور ترین لکچروں میں سے ایک لکچر سے کچھ جملے نقل کرنے مناسب ہوں گے۔ یہ لکچر اس نے ۸ نومبر ۱۸۶۸ء کو ایڈنبرا میں "زندگی کی طبعی بنیاد" کے عنوان سے دیا۔ وہ اپنے سننے والوں کو قائل کرنا چاہتا تھا کہ جو نخزایہ[1] بعض نباتات کے سادہ حیاتی افعال کی بنا ہے، وہ بعینہٖ وہی ہے، جو کسی حیوان کا ہے، بلکہ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ یہ نخزایہ کسی اور حیوان کے نخزایہ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے"۔ اس طرح یہ کہنا مناسب نہ ہوگا کہ "ہر حیاتی فعل ..... اس نخزایہ کی سالماتی[2] قوتوں کا نتیجہ ہے، جو اس فعل کو ظاہر کرتا ہے"۔ اس نے دعویٰ کیا: "جن خیالات کا اس وقت میں اظہار کر رہا ہوں اور انکے متعلق جو خیالات آپ کے ذہن میں آ رہے ہیں، وہ سب زندگی کے اس مادہ میں سالماتی تغیرات کا نتیجہ ہیں، جو ہمارے دیگر حیاتی مظاہر کا سرچشمہ ہے"۔ اس نے فخریہ کہا کہ وہ مادی اصطلاحات استعمال کر رہا ہے "اتنا ہی فخر اس کو اس بات پر تھا کہ وہ "اس مادی فلسفہ کا ابطال کر رہا ہے"۔ "جس میں بہت سی سنگین غلطیاں ہیں"۔ اس کا اصرار تھا کہ صحیح منطق مادی اصطلاحات اور مادی فلسفہ کے ابطال کے اس اتحاد کی متقاضی ہے"۔ اس اصرار میں ایک نکتہ تھا۔ اس نے بیان کیا کہ "میرا ارادہ یہ تھا کہ میں آپ حضرات کو حیاتی مظاہر کے میدان سے گزار کر اس مادی دلدل کی طرف لے جاؤں،

---

[1] Protoplasm [2] Molecular

جس میں آپ حضرات اس وقت اپنے آپ کو پھنسا ہوا پاتے ہیں۔ اس کے بعد میرا منشا تھا کہ میں آپ کو وہ راستہ دکھاؤں جس سے آپ میری رائے میں اس دلدل سے نجات پا سکتے ہیں۔ یہ راستہ اس طرح ملتا ہے کہ ہم تسلیم کرلیں کہ ہم "علت و معلول کے متعلق سوائے اس کے اور کچھ نہیں جانتے کہ یہ واقعات کے تعاقب و تسلسل کی ایک خاص ترتیب کا دوسرا نام ہے"۔

یکسلے کا نقطۂ نظر اس قدر عجیب و غریب، اس قدر نیا، اور اس کے ہم عصر ماہرین سائنس کے ہاں اس قدر مقبول ہے کہ یہاں اس خطبہ کا اہم حصہ نقل کر دینا مناسب ہوگا،

زندگی کے متعلق ایک خیال تو یہ ہے کہ یہ مادی سالمات کی ایک خاص ترتیب کا دوسرا نام ہے۔ اسی کے متعلق پرانا عقیدہ یہ ہے کہ ایک ہستی، بہ نام آرکے اوس[1]، ہر جاندار جسم کے اندر مادے کی حاکم و رہنما ہے۔ میں آپ سے دریافت کرتا ہوں کہ ان دونوں عقیدوں میں سوائے اس کے اور کیا فرق ہے کہ اور جگہوں کی طرح یہاں بھی مادے اور قانون نے روح اور خود روئی[2] کو نگل لیا ہے۔ جس طرح یہ امر یقینی ہے کہ ہر مستقبل ماضی و حال سے پیدا ہوتا ہے، اسی طرح یہ بھی یقینی ہے کہ آیندہ زمانہ کے فعلیات مادے اور قانون کے حدود کو اتنا وسیع کر لینگے کہ یہ پورے علم حیثیت اور فعل کے مساوی ہو جائیں گے۔

میرا خیال یہ ہے کہ اس بڑی سچائی کا شعور آج کل کے بہترین دماغوں کے لیے ایک ڈراؤنا خواب ہے۔ یہ لوگ اس چیز کی ترقی سے جس کو وہ مادیت سمجھتے ہیں، ویسے ہی ڈرے ہوئے ہیں، اور اس پر ان کو ویسا ہی بے بس غصہ آتا ہے، جیسے کہ اس وحشی کو اسوقت آتا ہے، جب وہ سورج گہن کے وقت سورج کی سطح پر چاند کا سایہ پھیلتا ہوا دیکھتا ہے،

---

[1] Archaeus. [2] Spontaneity.

معلوم ہوتا ہے کہ مادے کی بڑھتی ہوئی موج ان کی روحوں کو ڈبو دیگی۔ اور قانون کی سخت گرفت ان کی آزادی کو جکڑ دے گی، ان کو اندیشہ ہے کہ کہیں انسان کی اخلاقی فطرت عقل کی اس ترقی کی وجہ سے کم قیمت نہ ہو جائے۔"

اس پر زور تقریر کے بعد ہکسلے خیال ظاہر کرتا ہے کہ ان ہی خوف زدہ لوگوں کو ہیوم نے یہ کہکر چڑھایا ہے کہ "ان بتوں کے سامنے دہشت زدہ ہو کر گر رہے ہیں جنکو خود ان کے ہاتھوں نے بنایا ہے۔" ان بتوں کے نام "مادہ" اور "روح" ہیں ہکسلے سوال کرتا ہے: "اس دہشت ناک چیز یعنی "مادے" کے متعلق ہم سوائے اس کے اور کیا جانتے ہیں کہ یہ ایک نامعلوم چیز کا نام ہے، جو خود ہمارے شعور کی حالتوں کی علت ہے؟" پھر "اس روح کے متعلق جس کی مفروضہ تباہی پر یہ تمام ماتم ہو رہا ہے۔ ہمیں سوائے اس کے اور کیا علم ہے کہ..... یہ بھی ایک نامعلوم فرضی علت یا حالت یا احوال شعور کا نام ہے؟" اس لئے وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ "مادہ اور روح طبعی مظاہر کے مجموعات کے خیالی طبقات کے نام ہیں۔"

لیکن یہ خیال رکھنا چاہیے کہ چند ہی صفحے قبل ہکسلے نے نہایت وثوق کے ساتھ بیان کیا ہے کہ جو شخص سائنس کی تاریخ سے واقف ہے وہ تسلیم کریگا کہ گزشتہ زمانہ میں گزشتہ زمانے سے زیادہ اب ہمارے زمانہ میں، اس کی ترقی اس چیز کی حدود کی توسیع کے ہم معنی رہی ہے جس کو ہم مادہ اور تعلیل[1] کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ فکر انسانی کے ہر شعبے میں سے وہ چیز برابر خارج ہوتی چلی جا رہی ہے جس کو روح اور خود روی کہا جاتا ہے۔" لہذا ہکسلے کی رائے میں سائنس کی ترقی "طبعی مظاہر کے مجموعات کے خیالی طبقات" کی حدود کی توسیع کے ہم معنی تھی ہے، اور برابر رہے گی۔ اسی کو ہکسلے "مادے

[1] Causation ۔

کتب خانہ جامعہ عثمانیہ ۶۶۹ ھ

کی حدود کی توسیع" کہتا ہے، اور میرا خیال ہے کہ وہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ یہ بیان ایک حد تک نامناسب ہے۔ ہمسلے کے تخیل کی اس پرواز کی وجہ سے اس کے دلائل کے بڑے بڑے نکتے دریافت کرنے ذرا دشوار ہو جاتے ہیں۔ ہم صاف طور پر نہیں بتا سکتے کہ وہ کس بات کی حمایت کر رہا ہے، اور کس بات کا مخالف ہے، اور اس کی رائے میں دوسروں نے کس بات کی حمایت کی ہے، اور کس کی مخالفت۔ تاہم بعض باتیں صاف دکھائی دے جاتی ہیں جن پر بحث مناسب ہوگی۔ وہ اس عقیدے کا مخالف ہے کہ کوئی "آہنی قانون" ہے جس سے انسانی افعال لازماً پیدا ہوتے ہیں۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اب آجکل انسانی افعال کو کلیتہً فعلیاتی اصطلاحات میں بیان کیا جا سکتا ہے، یا کم از کم یہ کہ علم کی ترقی کے بعد ان کا یہ بیان آگے چلکر ممکن ہو جائے گا۔ اس طرح ان کو طبعی قوانین کی مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ جس عقیدے کو اس نے رد کیا ہے، اس کے بجائے اس نے یہ عقیدہ پیش کیا ہے کہ طبعی قوانین صرف وہ باتیں بیان کرتے ہیں، جو واقع ہونگی نہ وہ جو لازماً واقع ہونی چاہئیں۔ اس کے نزدیک یہ کہنا صحیح ہے کہ "ایک بے سہارا پتھر نیچے گرے گا"، اور یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ "بے سہارے پتھر کو لازماً نیچے گرنا چاہیے"۔ سب کے آخر میں اس نے احتجاج کیا ہے، "لیکن جب جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے، ہم "ہوگا" کو "لازماً ہونا چاہیے" سے بدلتے ہیں، تو ہم لزوم و وجوب کا خیال داخل کرتے ہیں، جو مشاہدے میں آنے والے واقعات میں یقیناً نہیں ہوتا، اور نہ ہمارے پاس کوئی سند ہے کہ ہم اسے کہیں اور پالیں گے۔ میں بذاتِ خود اس بن بلائے مہمان کو رد کرتا ہوں، اور اس پر لعنت بھیجتا ہوں، واقعے میں واقف ہوں، قانون کو میں جانتا ہوں، لیکن یہ لزوم و وجوب خود میرے ذہن کے خالی خولی سایہ کے علاوہ اور کیا چیز ہے؟

یہ مختصراً وہ طریقہ ہے، جس سے ہمسلے نے اس ڈراؤنے خواب سے نجات پائی ہے، جس جن کو اس نے اتارا ہے، وہ یہ "مادی عقیدہ ہے کہ دنیا میں مادے، قوت اور وجوب و لزوم کے سوائے اور کچھ

نہیں"۔ لیکن اس جن کو اتارنے کے دوران میں وہ دعویٰ کرنے پر مجبور ہوا ہے کہ انسانی افعال کو کلیتہً فعلیاتی قوانین کی صورت میں بیان کیا جا سکتا ہے جس "وجوب و لزوم" کو اس نے رد کیا ہے، اور جس پر اس نے لعنت بھیجی ہے، وہ طبیعی وجوب و لزوم ہے۔ یہ بتانا غیر معمولی طور پر مشکل ہے کہ اس تردید سے ہکسلے کا منشا کیا ہے۔ چند صفحے قبل ہی اس نے اعلان کیا ہے کہ "میرے نزدیک یہ بات واضح کی جا سکتی ہے کہ ہر چیز کو مادی اور لازمی علت کا معلول ثابت کرنا بالکل ممکن ہے: اور یہ کہ انسانی منطق یہ ثابت نہیں کر سکتی کہ انسان کا کوئی فعل حقیقتہً خود رو ہے"۔ اس فقرے میں لفظ "لازمی" کے کیا معنی لئے جانے چاہئیں؟ جب ہمیں یاد آتا ہے کہ ہکسلے کے ہاں طبیعی وجوب و لزوم کا خیال بے معنی ہے تو "مادی اور لازمی علت" میں "مادی" کے ساتھ "لازمی" کو ملانا ناقابل توجیہ رہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "قانون کے بالکل جائز تخیل میں لزوم کا خیال بالکل ناجائز طور پر ٹھونسا گیا ہے"۔ کسی اور جگہ اس نے بیان کیا ہے کہ اس کی "بنیاد منطقی ہے نہ کہ طبیعی"۔ ان تمام باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ منقولہ بالا بیان میں ہکسلے "مادی اور لازمی علت" سہواً لکھ گیا ہے۔ بہر حال لزوم کی طبیعی بنیاد سے انکار کر کے ہکسلے نے اس ڈراؤنے خواب سے خلاصی پانے کی کوشش کی ہے، جو مادے کی بڑھتی ہوئی موج کی "بڑی سچائی" سے پیدا ہوا تھا اور جس کی وجہ سے خطرہ تھا کہ کہیں ہماری روحیں اس سیلاب میں بہ نہ جائیں۔

پھر جب ہم کو خیال آتا ہے کہ ہکسلے انسان کو ذی شعور شین سمجھتا ہے، تو مادیت سے اس کی خلاصی اور بڑا معمہ بن جاتی ہے۔ اس کا اصرار ہے کہ اس کا شمار مادیت کے حامیوں میں نہ ہونا چاہئے کیونکہ خود اس کے قول کے مطابق "اگر کوئی ذہن ایسا موجود نہیں، جو مادے کے وجود کو متصور کر سکتا ہو، تو مادے کا یہ وجود میری سمجھ میں نہیں آتا"۔ یہ بیان اس عقیدے کو ثابت کرنے کے فوراً ہی بعد پایا جاتا ہے کہ "انسانی افراد اور دیگر حیوانات کے تمام احوال و شعور دماغی مادے کے سالماتی تغیرات سے براہ راست پیدا ہوتے ہیں"۔ یہ دعویٰ موجودہ بحث کے لئے اس قدر اہم ہے کہ اس کو مکمل طور پر نقل کرنا

مناسب ہوگا۔

"مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حیوانوں کی طرح انسانوں میں بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی حالتِ شعور عضویہ کے مادے کی حرکات کے تغیر پیدا کر سکتی ہے۔ اگر یہ تمام دعوی بے بنیاد نہیں، تو نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ہماری ذہنی حالتیں عضویئے کے از خود پیدا ہونے والے تغیرات کی محض شعوری علامات ہیں۔ مثلاً جس احساس کو ہم ارادہ کہتے ہیں، وہ ارادی فعل کی علت نہیں، بلکہ دماغ کی اس حالت کی علامت ہے، جو اس فعل کی قریب ترین علت ہے، ہم ایسی ذہنی شعور مشین ہیں جو "اختیار" کی بہت زیادہ غلط طور پر استعمال ہونے والی اصطلاح کے واحد معنوں میں با اختیار بھی ہیں، کیونکہ بہت سی چیزوں سے ہم اپنی مرضی کے مطابق کام کر سکتے ہیں۔ لیکن باوجود اس کے ہم علت و معلول کے اس بڑے سلسلے کے حصے بھی ہیں، جو غیر منقطع تسلسل کے ساتھ اس چیز کو مرکب کرتا ہے۔ جو وجود کا مجموعہ اب ہے، پہلے تھا، اور آئندہ رہے گا۔"

اس بیان کے مطابق انسانی افراد "علت و معلول کے بڑے سلسلے کے حصے" ہیں، جن سے وجود کا مجموعہ مرکب ہوتا ہے یعنی کہ انسانی افراد فطرت سے تعلق رکھتے ہیں، اور فطرت مادی علتوں کا غیر منقطع تسلسل ہے، ہماری ذہنی حالتیں ان تغیرات کی شعوری علامتیں ہیں، جو جاندار عضویئے یعنی علت و معلول کے بڑے سلسلے کے ایک حصے میں از خود پیدا ہوتے ہیں۔ ہمارے ارادے من جملہ ان علتوں کے نہیں۔ ارادہ دماغی حالت کی ایک علامت ہے۔ ان تمام دعووں کو انتہائی یقین کے ساتھ اس "ڈراؤنے خواب" کی مناسب بنیاد سمجھا جا سکتا ہے جو بہ قول ہکسلے، ۱۹ ویں صدی کے "بہترین ذہنوں" کو ستا رہا تھا۔ لیکن سوال ہو سکتا ہے کہ شعور کیا ہے؟ ہکسلے جواب دے گا کہ شعور مادی عضویہ کا بعدی[1] مظہر یا حاصل[2] ہے۔ لیکن اس کے تمام

---

[1] PRODUCT [2] EPI-PHENOMENON

ہی اس کا عقیدہ تھا کہ اگر کوئی ایسا ذہن موجود نہیں، جو مادے کے وجود کو متصور کر سکے" تو یہ وجود ناقابل تصور ہے۔ اب اگر ذہنی حالتیں عضویہ کے تغیرات کی شعوری علامات ہیں، اور اگر عضویہ مادی ہونے کی وجہ سے، سوائے ذہن کے اور کوئی وجود نہیں رکھ سکتا، تو یہ معلوم کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ "ذہنی حالتوں" سے ہماری کیا مراد ہو سکتی ہے، اور یہ تصور کرنا ناممکن ہو جاتا ہے کہ ذہنی حالتوں کو اس شعور سے کیا تعلق ہے جس میں وہ جسمانی تغیرات کی علامات ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ ہکسلے نے یہ دریافت کرنے کی کبھی تکلیف گوارا نہ کی کہ علامت کسے کہتے ہیں، اور نہ اس نے اس پر غور کیا کہ "اظہار" سے کیا مراد ہے۔ اگر وہ ایسا کر لیتا، تو وہ بہت سے اُن نمایاں تضادات سے بچ جاتا، جن میں وہ "ڈراؤنے خواب" سے بچنے، ذی شعور مشین کے اپنے عقیدے کے نتیجوں کو واضح کرنے، اور اس سبق کو بروئے عمل لانے کی کوشش میں گرفتار ہوا جس کو پڑھانے سے کبھی وہ نہ تھکا، یعنی یہ کہ "ہم میں سے ہر ایک کا فرض ہے کہ دنیا کے جس چھوٹے سے کونے پر وہ اثر ڈال سکتا ہے، اس کو پہلے کی بہ نسبت کم مصیبت زدہ اور کم جاہل بنانے کی کوشش کرے"۔ اس فرض کو ادا کرنے کے لئے اس کے نزدیک، یہ عقیدہ ضروری ہے کہ اول، ہم فطرت کے نظام کو معین کر سکتے ہیں، اور دوم، یہ کہ "واقعات و حادثات کی تعیین کے لئے ہمارا ارادہ بہت اہمیت رکھتا ہے"۔ بیس برس سے زائد گزرنے کے بعد ۱۸۹۲ء میں جب اس نے اس تقریر کو دوبارہ شائع کیا ہے، تو اس نے یہ حیرت انگیز حاشیہ اضافہ کیا" یا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ جسمانی حالت، ارادہ جس کا اظہار ہے"۔ یہ حاشیہ اس وجہ سے حیرت انگیز ہے کہ متن کے منافی ہے، حالانکہ اس کو بہ طور صحیح تر کے پیش کیا گیا ہے۔ اگر واقعات و حادثات کی تعیین کے لئے ہمارا ارادہ اہمیت رکھتا ہے، تو فرض کیا جا سکتا ہے کہ جسمانی حالت ارادہ کا اظہار ہے، بہ شرطیکہ لفظ "ارادہ" کا استعمال ہمارے لئے ناگزیر ہو۔ لیکن حاشیہ کی رو سے ارادہ جسمانی حالت کا اظہار ہے۔ اکثر اوقات ہکسلے کی زبان استعارہ پھسلی ہوتی ہے کہ اس کے اصلی مافی الضمیر کو معلوم کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ لیکن یہاں احتمال

اس بات کا ہے کہ وہ کہنا یہ چاہتا ہے کہ انسانی جسموں کی طبیعی حالتیں فطری مظاہر کے علّی اجزا ہیں۔ یہ تاویل ہکسلے کے اس عقیدے کے بالکل مطابق ہے کہ ارادہ ارادی فعل کی علت نہیں، بلکہ ایک احساس ہے، جو دیگر ذہنی حالتوں کی طرح جسم میں از خود پیدا ہونے والے تغیرات کی محض شعوری علامت ہے۔ لیکن اس تاویل اور دوسری شرط میں مطابقت پیدا نہیں کی جاسکتی، یعنی یہ کہ ہمارا ارادہ واقعات و حادثات کے راستے کی تعیین کے لئے اہم ہے۔ یہ یقیناً بدیہی ہے، اس لئے کہ چونکہ ارادہ ایک جسمانی حالت کا محض اظہار ہے، لہٰذا یہ جسمانی حالت کسی اور جسمانی حالت کا نتیجہ ہونی چاہئے۔ اور اس سے اور جسمانی حالتیں پیدا ہونی چاہئیں۔ "یہ علت و معلول کے بڑے سلسلے" کا حصہ بن جائیں گی، اور اس طرح یہ وہ ہوجائیں گی، جو یہ یقیناً زمانہ آیندہ میں بننے والی ہیں"۔ اس لحاظ سے یہ بیان بے معنی ہوجاتا ہے کہ ہم اپنا فرض ادا کرکے اپنے چھوٹے سے کونے پر اثر کرسکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہکسلے نے طبعی قانون کی کلیت پر تو زور دیا ہے لیکن خود اس قانون کی ماہیت کو اس نے ہاتھ نہیں لگایا۔ انسانی افعال بالکل انہی معنوں میں آزاد ہیں جنمیں کہ بے سہارا پتھر نیچے کی طرف گرنے کے لئے آزاد ہے۔

اب اگر مذہبی پیشوا روحانی آزادی کی حمایت میں ہکسلے کو اپنا حلیف نہیں سمجھتے تو تعجب نہ ہونا چاہئے، ہم پوچھتے ہیں کہ ہمارے ارادے کے اہم بننے کیلئے کس چیز کی ضرورت ہے؟ اگر "مادہ" اور "روح" دونوں فطری مظاہر کے خیالی طبقات" کے نام ہی ہیں، تو ان میں تمیز کرنے سے کیا حاصل ہے؟ تماشا یہ ہے کہ خود ہکسلے تسلیم کرتا تھا کہ یہ سب محض اصطلاحات کے کھیل ہیں۔ وہ کہتا ہے: "مادی مظاہر کو روحانی اصطلاحات یا روحانی مظاہر کو مادی اصطلاحات میں بیان کرنے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ مادے کو فکر کی ایک شکل اور فکر کو مادے کی ایک خاصیت سمجھا جاسکتا ہے۔ ان دونوں بیانات میں اضافی صداقت ہے"۔ یہاں ہکسلے کے بیان کے ابہام کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی پائی جاتی ہے کہ اس کو یہ معلوم نہ ہوا کہ اگر ڈراؤنے خواب کی کوئی علت ہے، تو اس نے اس علت کو رفع نہیں کیا۔ "علت و معلول کا بڑا سلسلہ" وجود کے مجموعے کو

مرکب کرتا ہے، اس سلسلہ کو اندھا دھند "مادہ" یا "روح" کہنے سے ان سوالات پر کوئی روشنی نہیں پڑتی، جو کمسلے کے ہم عصر لوگوں کے لئے اتنے دلچسپ تھے۔ خود کمسلے کے لئے صرف یہ اعتقاد کافی تھا کہ "ہم اپنا فرض ادا کر سکتے ہیں"۔ یہ اعتقاد وہ یقیناً رکھتا تھا، اس کو یہ سوال کرنے کا کبھی خیال نہ آیا کہ اپنا فرض ادا کرنے کے تصور میں اور کیا چیز شامل ہے۔ اس نے صرف یہ فرض کر لینا کافی سمجھا کہ وہ ان معنوں میں "آزاد ارادے" کا مالک ہے کہ "ہم جو کچھ چاہیں کر سکتے ہیں"۔ مختصر یہ کہ کمسلے نے اس مسئلہ کے اصلی نکتہ کو نہ پہچانا۔ اس نے اس ڈراؤنے خواب سے ان معنوں میں خلاصی پائی کہ اس نے یہ خواب دیکھا ہی نہیں۔

ڈارون کے نظریہ طبعی انتخاب کے حامیوں میں شریک ہونے سے کچھ برس پہلے جے۔ ایس مل نے سوال اٹھایا تھا کہ "کیا انسانی کردار کو کسی سائنس کا موضوع بنانا ممکن ہے؟" اس کا خیال تھا کہ اگر اس کا جواب اثبات میں دیا جاتا ہے تو گویا ہم فرض کر لیتے ہیں کہ انسانی افعال بھی دیگر فطری واقعات کی طرح قابلِ تبدل قوانین کے تابع ہیں"۔ اس بیان میں خود اس نتیجہ کو فرض کر لینے کا میلان پایا جاتا ہے جس کو ہم ثابت کرنا چاہتے ہیں، کیونکہ اگر "انسانی افعال" "دیگر فطری واقعات" میں شمار کئے جاتے ہیں، اور تمام فطری واقعات کو "قابلِ تبدل قوانین کے تابع سمجھ لیا جاتا ہے، تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ہم کو معلوم ہے کہ مل نے فطری واقعات کو ان قوانین کے تابع ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس نے پہلے تو یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ انسانی افعال "قابلِ تبدل قوانین کے تابع ہیں" پھر اس سے نتیجہ نکالا کہ یہ افعال فطری کے سلسلہ میں شامل ہیں[1]

جہاں تک مجھے علم ہے مل نے کہیں بھی صراحۃً یہ بیان نہیں کیا کہ پیشینگوئی سائنس کی غایت ہے۔ لیکن اس کا اصرار تھا کہ پیشینگوئی کی قابلیت قانون قدرت کی علامت ہے، وہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ قابلِ انکشاف قوانینِ قدرت موجود ہیں، اور یہ کہ ان قوانین کو یقیناً صحیح طور پر معلوم کیا جا سکتا ہے۔ یہ قوانین

---

[1] ہمارا ارادہ بالکل ان ہی معنوں میں ہمارے جسمانی افعال کی علت ہے، جن میں سردی برف کی، یا چنگاری بارود کے بھڑک اٹھنے کی"۔ دیکھو منطق، کتاب سوم، باب پنجم، بند دوم۔

اس کے نزدیک قوانین[1] علیہ ہیں۔ مل کی رائے میں علی تعلق ایسا تعلق ہے، جو ہمیشہ باقی رہے گا، نہ کہ جو گزشتہ زمانہ میں باقی رہا ہے۔ لہذا یہ تعلق غیر مشروط ہونا چاہیے، یعنی سکتہ عام قابل تخیل حالات میں پایا جانا چاہیے۔ علی قانون ان معنوں میں لزوم کے خیال کو شامل ہوتا ہے کہ اس میں ایک غیر مشروط اور ناقابل تبدل تعلق بیان کیا جاتا ہے۔ یہ سوال کہ انسانی افعال لازم و واجب ہوتے ہیں۔ اس سوال کے برابر ہے کہ کیا کسی انسانی فعل اور اس واقعہ میں جس سے کہ یہ فعل پیدا ہوتا ہے، کوئی غیر مشروط تعلق پایا جاتا ہے؟ مل لکھتا ہے "جب ہم کہتے ہیں کہ تمام انسانی افعال لازماً پیدا ہوتے ہیں، تو ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی رکاوٹ نہ ہو، تو یہ یقیناً پیدا ہوں گے۔" مل فرض کرتا ہے کہ یہ پیشینگوئی نظری طور پر ممکن ہے کہ "کیا یقیناً پیدا ہوگا" اور یہ کہ جس بات کی پیشینگوئی ہوئی ہے، وہ یقیناً پیدا ہوگی، بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ بعض انسانی افعال کی پیشینگوئی ہو سکتی ہے، اور بعض کی نہیں لیکن مل استدلال کرتا ہے کہ "جو شخص ہمارے محرکات اور ان سے ہماری عادی اثر پذیری سے واقف ہے، وہ پیشینگوئی کر سکتا ہے کہ ہم کیا کرنے کا ارادہ کریں گے۔" یہ دعوی مل کے نزدیک ان واقعات کی محض تاویل، یا ان کی شبیہ ہے جو ہر شخص کے معائنہ میں آتے ہیں بہ شرطیکہ وہ ان کا معاینہ کرنا چاہے۔ اس کے متعلق تمام شبہات واقعات کی پیچیدگی کا نتیجہ ہوں گے، یا پھر اس بات کا کہ انسانی افعال کے مقدمات، یعنی فاعل کی سیرت اور اس کے محرکات کو معلوم کرنا بہت دشوار ہے، لیکن یہ دشواری عمل کی ہے، نہ کہ اصول کی۔

لہذا مل کا نتیجہ یہ ہے کہ انسانی افعال لازمی ہوتے ہیں، بہ شرطیکہ ہم "لازمی" کے صحیح معنی لیں۔ ہم کو اس افتراض سے بہ احتیاط بچنا چاہیے کہ "مقدم اور تالی" میں کوئی ربط ہے، یا کہ مقدم تالی پر کوئی پراسرار جبر استعمال کرتا ہے۔ مل کے نزدیک یہ غلط عقیدہ کہ "علتیں اپنے معلولات کو کسی پراسرار ربط سے کھینچتی ہیں"، اس خیال پر اعتراض کی بنیاد ہے کہ انسانی افعال لازمی ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں "الف" "ب" کی علت ہے۔

---

[1] CAUSAL LAWS

کی غلط تحلیل انسانی افعال کے متعلق صحیح عقیدے کی تردید کا باعث ہوئی ہے۔ غلط عقیدہ یہ ہے کہ ہم اپنی سیرت کو بدلنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ صحیح خیال یہ ہے کہ اگر ہم چاہیں تو ہم اپنی سیرت کو بدل سکتے ہیں۔ یہ خواہش اس فعل کا مقدمہ ہے جس سے کہ فعل بطور معلول پیدا ہوتا ہے، انسانی افعال کی تعلیل کے متعلق مل نے تین عقیدے بیان کئے ہیں: پہلا عقیدۂ لزوم ہے، جو صحیح معنوں میں سمجھا جائے یہ خود اس کا عقیدہ ہے، اسکو اس نے فلسفیانہ لزوم کا عقیدہ کہا ہے۔ دوسرا عقیدۂ لزوم ہے جسکے غلط معنی لئے جاتے ہیں، اس میں اور تقدیر کے عقیدے میں تمیز مشکل ہے، اس عقیدہ کا یہ دعوی غلط ہے، کہ کوئی اور قوت نہ کہ ہم خود اپنی سیرت کو بناتے ہیں، لہذا اگر ہم اسکو بدلنا چاہیں تو بھی نہیں بدل سکتے، ہم تقدیر و قسمت کے خلاف خواہ مخواہ لڑتے ہیں، مل کا اصرار ہے کہ اسکا عقیدہ انسانوں کو کسی اور کا غلام نہیں بناتا، تیسرا عقیدہ آزاد ارادہ (اختیار) کا ہے اس عقیدے کے مطابق انسانی افعال آزاد ہو سکتے ہیں، اور جب یہ آزاد ہوتے ہیں تو یہ بلا علت ہوتے ہیں، اس لحاظ سے ایک آزاد فعل بکسلے کے معنوں میں خود رو ہوتا ہے، مل اس عقیدہ سے متفق نہیں لیکن اس کا خیال ہے کہ اس میں صداقت کا وہ حصہ شامل ہے، جو لفظ لزوم کی نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے، یعنی خود اپنی سیرت کی تشکیل میں ذہن کی طاقت تعاون"۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انسانی فعل کے متعلق مل کا عقیدہ بالکل صاف ہے، تاہم اس نے بکسلے کی بہ نسبت، زیادہ صفائی سے یہ دیکھ لیا تھا کہ قانون حکومت کی توسیع، کم از کم بظاہر ان حالات کے متعلق عوام کے خیال کے منافی ہے جنمیں اخلاقی فعل ممکن بنتا ہے، جس طریقہ سے اس نے منافات کو رفع کرنے کی کوشش کی وہ موجودہ بحث کیلئے بہت سبق آموز ہے، مل کو یہ دکھا دینا کافی معلوم ہوا کہ مقدم اور تالی، محرک اور فعل کے درمیان کوئی پوشیدہ رابطہ، یا کوئی مخصوص تعلق نہیں۔ ایک اہم جملہ میں مل نے بیان کیا ہے: "اگر لزوم میں اس قسم کا رابطہ فرض کیا جاتا ہے، تو یہ عقیدہ نہ صرف انسانی فعل پر بلکہ بیجان اشیاء پر بھی قابل اطلاق نہیں، یہ کہنے کی بہ نسبت کہ ذہن پر لزوم مسلط ہے، یہ کہنا صحیح تر ہوگا کہ مادہ پر لزوم مسلط ہے"۔ اس طرح مل اس نتیجے پر پہنچا کہ ذہنی واقعات اور طبیعی واقعات دونوں میں ایک ہی طرح کا تعلق پایا جاتا ہے، اور دونوں صورتوں میں مساوی صحت کے ساتھ اس تعلق کی پیشینگوئی کی جا سکتی ہے۔

تلخیص و تبصرہ

ترجمہ سے متعلق شیخ عنایت اللہ صاحب دہلوی کے خیالات

ذیل کی سطرون میں اردو زبان کے مایۂ ناز مترجم اور ممتاز ادیب محترمی جناب شیخ عنایت اللہ صاحب بی اے، دہلوی (سابق ناظم دارالترجمہ حیدرآباد دکن) کے وہ ارشادات گرامی درج کئے جاتے ہین جو انھون نے راقم حرف کو فن ترجمہ کے متعلق بطور پند و نصیحت عطا کئے ہین، موصوف کے اس قسم کے خیالات آج سے گیارہ برس پہلے حیدرآباد دکن کے کسی رسالہ مین شائع ہوئے تھے، مگر ان کا بیان ہے کہ وہ نہ چھپنے کے برابر تھے، اسلئے ازراہ لطف و کرم انھون نے راقم سطور کے استفادہ کی غرض سے ان خیالات پر پھر نظر ثانی کی ہے، ہم موصوف کے بے حد شکر گذار ہو کر ذیل مین ان خیالات کو معارف کے ناظرین کے لئے بھی درج کرتے ہین،

ترجمہ کا آئیڈیل کیا ہونا چاہئے؟

آئیڈیل درحقیقت کسی چیز مین کمال کے ایک ذہنی تصور یا نمونے کا نام ہے، ذہن مختلف ہین اسلئے کمال کے نمونے بھی ان مین مختلف ہین، ترجمے کے آئیڈیل کی دو صورتیں میرے ذہن مین ہین

(۱) بعض لوگ بالخصوص یورپ کی درس گاہون کے تعلیم یافتہ اصحاب ترجمہ کا کمال اس مین سمجھتے ہین کہ لفظ کی جگہ لفظ ہو بلکہ ایک ہی لفظ کی جگہ ایک ہی لفظ ہو، فقرون کی نحوی ترکیب بھی جہان تک ممکن ہو، انگریزی کے مطابق ہو، اس میں اردو کے قواعد صرف و نحو سے بھی کہین کہین قدم ڈگ جائے تو مضائقہ نہین،

انگریزی دانی ایسی اردو کے سمجھنے کے لئے کافی ہے، اور یہی وہ راستہ ہے جو منزل مقصود تک پہنچا سکتا ہے، یہی وہ طریقہ ہے جو کمزور اردو زبان کو توانا و طاقتور بنا سکتا ہے، بغیر اس کے اردو ایک علمی زبان نہیں بن سکتی، یہ لوگ اردو کو اپنی طرف سے اصلاح کا مستحق سمجھکر مغربی علوم کی قربان گاہ پر اسے ذبح کرنا کارِ ثواب جانتے ہیں، مگر بہرکیف ان کا یہ آئیڈیل ایسا ہے کہ ظاہر ہیں وہ کیسا ہی تکلیف دہ ہو، مگر کہیں نہ کہیں اسے ماننا ضرور پڑتا ہے،

(۲) دوسرا آئیڈیل ترجمہ کا یہ ہے کہ اپنی عبارت میں کسی حال میں بھی ادب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے، یہ آئیڈیل پہلے آئیڈیل کو اپنی زبان کی تخریب و تحقیر کا موجب قرار دیتا ہے، پاؤں پھیلانے میں چادر کو اتنا نہیں تانا چاہیے کہ چادر پھٹ جائے، اس دوسرے آئیڈیل کے ماننے والوں کے نزدیک ایسی کتابوں کے ترجموں کا جو مطلقاً اصطلاحی علوم کی نہیں ہیں، بہترین طریقہ یہ ہے کہ انگریزی فقرے کا مفہوم بالکل صحیح طور پر سمجھا جائے، اور پھر اس مفہوم کو اپنی زبان میں اس طرح ادا کیا جائے کہ عبارت شروع ہی سے اپنی زبان کی لکھی ہوئی معلوم ہو، اور جو ادبی محاسن اصل میں موجود ہیں، وہی حتی الامکان اردو ترجمے میں بھی ہوں، یہ کام اکثر موقعوں پر نہایت دشوار ہوتا ہے، غیر زبان کے بعض مفہوم ایسے ہوتے ہیں کہ ہزار کوشش کیجئے، مگر جس صورت میں وہ سمجھ میں آئے ہیں، بعینہٖ اسی صورت میں اپنی زبان میں یا تو ادا نہیں ہوتے، اور اگر ادا ہو بھی جائیں، تو ان کی طرف سے اطمینان نہیں ہوتا، بہرکیف دشواریاں سخت ہیں، اور ان کی وجہ ظاہر ہے انگریزی زبان میں جو صدہا برس کی منجھی ہوئی زبان ہے، الفاظ کی کثرت اور ہر چیز کو منطقی اسلوب پر بے کم و کاست آسانی سے بیان کرنے کی ایسی ترکیبیں موجود ہیں، جو ہماری زبان میں نسبتہً کم ہیں، اس آئیڈیل کے ماننے والے اردو کو کچے شیشے کا ایک ظرف سمجھتے ہیں، جو زیادہ گرم یا سرد پانی بھرنے سے ٹوٹ جانے کا اندیشہ رکھتا ہے، یہ لوگ اپنی زبان کی پاسداری میں مفہوم میں خفیف سی کمی بیشی پیدا ہو جانے کو بھی بڑا گناہ نہیں سمجھتے،

اگر اس سے اردو عبارت کی شان میں کوئی فرق نہ آتا ہو،

میرے خیال میں پہلے آئیڈیل میں بعض امور کی پابندی سے بالخصوص اصطلاحی علوم میں مثلاً یا ضنی سائنس، قانون وغیرہ میں گریز کرنا باعث ہے، دوسرا آئیڈیل ایسی کتابوں کے ترجموں میں پیش نظر رکھنا ضروری ہے جن کا ادب سے زیادہ تعلق ہو، مثلاً تاریخ، جغرافیہ، فلسفہ کی بعض شاخیں اور سیرت وغیرہ،

ترجمہ کے اچھے بُرے ہونے کا اندازہ دو طریقوں سے ہوتا ہے، ایک یہ کہ صرف ترجمہ پڑھتے چلے جائیے، اگر مطلب صاف سمجھ میں آرہا ہے، بیان کی خوبی اور قوت دونوں چیزیں عبارت میں موجود ہیں، اور اس کا علم بھی ہے، کہ ترجمہ پڑھ رہے ہیں، تو ایسے ترجمہ کی تعریف بے اختیار زبان سے نکلیگی اور وہ اچھا ترجمہ کہلائے گا، اور اگر بیان میں کوئی خوبی نہیں ہے اور عبارت میں بے ربط فقرے غیر مانوس الفاظ کریہ الصوت جملے، حل طلب ترکیبیں ہوں، تو ترجمہ خواہ اصل مفہوم سے کتنا ہی قریب ہو، خراب ترجمہ سمجھا جائے گا،

دوسرا طریقہ اندازہ کرنے کا (اور خدا اس سے پناہ میں رکھے) یہ ہے کہ ترجمہ کا اصل سے مقابلہ کرتے ہوئے چلئے، اس طریقہ میں دو زبانوں کے فرق کی وجہ سے مشکل سے کوئی ترجمہ ایسا نظر آئے گا جس میں اعتراض کی گنجایش نہ نکلتی ہو، اس صورت میں ایک مدرسہ کا لڑکا بھی ایک عالم کے ترجمہ پر حرف گیری کر سکیگا، اور یہ حرف گیری ایسی ہوگی جس کا جواب دینا مشکل ہو جائیگا، ایسے ترجمہ کی خوبی اور خرابی کا اندازہ کرنے کے لئے صرف ماہرین فن کا قول قول فیصل سمجھا جاسکتا ہے، وہی اس بات کو دیکھ سکتے ہیں، کہ اچھے ترجمہ میں نہ تو زبان محاورے سے گری ہے، اور نہ مصنف کا کوئی خیال چھوٹا ہے، عام ناظرین کو جب ترجمہ کے سمجھنے میں ذرا بھی مشکل پیدا ہوگی، تو وہ فوراً ترجمہ اور مترجم دونوں پر لعنت بھیجیں گے، بڑا کمال ترجمے کا یہی ہے، کہ وہ اپنے مفہوم کا واضح اور صحیح نقش پیدا کرے، اور یہ نقش حتی الامکان اصل زبان کے نقش کے مطابق ہو،

مترجم کا فرض ہے کہ وہ اصل کا صحیح مطلب سمجھکر اسکو اپنی زبان مین صفائی اور سلاست سے بیان کرے، اور جہان تک ممکن ہو مطلب سے نہ ہٹے، اور اپنی زبان کی خوبیون سے بے پروا نہ ہو، اس طرز پر ترجمہ کرنے مین بڑی مشکلات ہین، انگریزی سے اردو کے ترجمہ مین مترجم کو جو چیز سب سے زیادہ پریشان کرتی ہے، وہ انگریزی زبان کے (Participles) اور (Gerunds) اور ایک ہی فقرہ مین جملہ کے ساتھ جملہ جوڑکر بہت دور جاکر جزتکالنے کی مشکل صورتین ہین، اردو نو عمر اور کم مایہ زبان ہے، اس مین اسم و فعل جسقدر قریب ہوگا، اسی قدر زبان فصیح ہوگی، جس قدر ضمیرین کم آئین گی، اسی قدر مطلب جلد سمجھ مین آئے گا، بار بار پیچھے مڑکر دیکھنا نہ پڑے گا، جدید طرز کی انگریزی مین بھی لمبے فقرون سے پرہیز ہونے لگا ہے لیکن پرانے انشا پردازون کے ہان فقرون کا طول قیامت خیز ہوتا ہے، اور اب بھی اگر ضرورت ہو تو اس سے پرہیز نہین،

ایسی صورتون مین مترجم کا یہ کام ہے کہ وہ فقرون کو اس کے اجزا مین تحلیل کرے، پھر اپنے قواعد کے مطابق ان مین سے چند کو جوڑکر جہان جڑسکین، اور چند کو جو نہ جڑسکین انھین مستقل فقرے بناکر ترجمہ کرے، درخت بھی ہے، اور درخت کی بہت سی شاخین بھی ہین، پورا درخت مع شاخون کے اپنی زبان مین نہین اترتا، اسلئے بعض شاخون کے علٰحدہ پودے لگانے پڑتے ہین، مترجم کی خوبی اس مین ہے کہ یہ پودے درخت ہی کے سایہ مین اس طرح رہین، کہ انکی شاخین معلوم ہونے لگین، اس طرح آپ مطلب صاف کر دین گے، اور نہ مصنف کو آپ سے شکایت ہوگی، اور نہ ترجمہ پڑھنے والے کو، مگر اس طرز کے لیے ضروری ہے کہ اپنی زبان پر پوری قدرت ہو ورنہ بیجا کمی بیشی اور غلط فہمی کا آنا ممکن ہے،

اس کے علاوہ مترجم کے لئے ایک بات اور نہایت ضروری ہے، اکثر دیکھنے مین آیا ہے

کہ دو فقروں کا جو یکے بعد دیگرے آئے ہین، صحیح ترجمہ ہوگیا ہے لیکن جو ربط دونون فقرون مین انگریزی مین ہے، وہ ترجمہ مین پیدا نہیں ہوا، یہ ترجمہ کا سخت عیب اور مترجم کی نالائقی سمجھی جاتی ہے، تھوڑی سی توجہ سے دوسرے فقرے میں لفظون کے الٹ پھیر سے یہ عیب رفع ہوسکتا ہے اسی طرح ایک پیراگراف کو دوسرے پیراگراف سے جہان تعلق ہو اپنی زبان مین بھی ان کے متعلق کرنے میں غفلت نہ کیجائے۔ اور اس خیال کی طرف جس کے سلسلہ میں دوسرا پیراگراف آیا ہے کچھ اشارہ کرکے ترجمہ شروع کیا جائے، یہ زیادتی نہ ہوگی، بلکہ ضرورت ہوگی، ضمیروں پر بھروسہ نہ کیا جائے اردو زبان اسکی بہت کم متحمل ہے، انگریزی مصنف اپنی زبان پر قادر ہے، مترجم کو بھی وہی قدرت پیدا کرنی ہے، اس سے غفلت نہ کرنی چاہئے، مطلب اس کا ہے، زبان اپنی ہے، اس لئے جب تک پورے طور پہ مصنف کے ہم خیال نہ بن جائے گا، اس کے مفہوم کو بیان کرنے سے قاصر رہے گا، ترجمہ مین محنت سے جی چرانا اور بے پروائی کرنا گناہ ہے،

بہت سی ایسی خامیان ہین، جن کی وجہ سے ترجموں کو پڑھکر سمجھنا دشوار ہوجاتا ہے، گو ترجمہ اپنی ہی زبان مین ہوتا ہے، مگر جب تک زیادہ غور نہ کیجئے، مصنف کا مطلب سمجھ مین نہین آتا اور کوشش وتضیع اوقات کے بعد جب سمجھ میں آیا تو معلوم ہوا کہ اس مین تو کچھ بھی نہ تھا، یہ بات تو اس طرح بھی آسانی سے کہی جاسکتی تھی، مگر ہمیشہ یہ کہکر بھی آپ اپنا اطمینان نہین کرسکتے، اگر مترجم نے بات آسان کرکے کہدی ہے، تو مصنف کا کچھ مطلب ضرور چھوڑ دیا ہے، درخت کی بعض شاخون کی تصویر بنانی رہ گئی، بہرکیف اگر ترجمہ پڑھنے والے کو مطلب کے سمجھنے مین زیادہ محنت کرنی پڑی، تو وہ اُسے ناواجب زحمت سمجھکر مترجم کو الزام دیگا، چھوٹی باتون کو بڑا سمجھکر ترجمہ مین زیادہ کوشش کرنا اور بڑے مطلبون کو ادا کرنے مین صرف انگریزی الفاظ کی پابندی سے عبارت کو چیستان بناکر اپنا پیچھا چھڑانا درست نہیں ہے، اگر مترجم خود مطلب

نہیں سمجھا ہے، تو پھر ترجمہ کرنا سراسر بے ایمانی ہے، اگر سمجھ میں آگیا ہے، تو اسکو صحیح صحیح بے تکلف ادا کرنا لازمی ہے، اگر مترجم کو اپنی زبان پر قدرت ہو اور وہ ایک بات کو کئی طرح بیان کرنے پر قادر ہو تو یہ کام آسان ہو، ورنہ اسکے برابر کوئی مشکل اور عبث چیز نہیں، جہاں مطلب سمجھ میں آجائے، وہاں مصنف کے زور بیان سے مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں، ترجمہ میں مترجم زبان کے فرق سے قطع نظر کرکے مصنف کا درجہ رکھتا ہے، جو چیز میں سمجھ گیا، وہ چیز میری ہوگئی، پھر انگریزی عبارت کے خوف سے اپنی زبان بگاڑنے کی ضرورت نہیں،

تھوڑی سی ذہانت اور جرأت سے ترجمہ کے بہت سے عیب رفع ہو سکتے ہیں، یہ جرأت مطالعہ سے پیدا ہوتی ہے، خواہ آپ کیسے ہی ماہر فن ہوں مگر کسی خاص کتاب کا ترجمہ شروع کرنے سے پہلے اسکے مضمون سے ضرور طبیعت کو آشنا کر لیجئے، اس مضمون پر اور کتابیں کبھی مشکل اور کبھی آسان مل جائینگی، ضرورت اسکی ہوگی کہ بہت سا وقت ان کے مطالعہ میں صرف کیجئے، جب مضمون سے آپ مانوس ہو جائیں گے، اور اس پر قدرت ہو جائیگی، تو پھر ترجمہ کے وقت مصنف کے منہ سے بات نکلتے ہی آپ سمجھ جائیں گے، کہ آگے کیا کہنا چاہتا ہے، اس وقت آپ کو ترجمہ کرنا آسان ہو جائے گا، اور جو کچھ لکھئے گا، اس میں صحت، روانی اور بے تکلفی پیدا ہو جائیگی، کسی کتاب کا ترجمہ تا وقتیکہ اس موضوع پر اور دوسری کتابیں پڑھکر تھوڑی بہت قدرت حاصل نہ کرلیں، ہرگز شروع نہ کیجئے، مطالعہ اور مطالعہ بھی زیادہ، اچھا ترجمہ کرنے کے لئے ضروری شرط ہے،

تاریخ کے ترجمہ کا مجھے کسی قدر تجربہ ہے، اسکی نسبت یہ عرض ہے، کہ جس ملک کی تاریخ کا ترجمہ کیجئے، جب تک اس کا جغرافیہ اور جغرافی نقشہ سامنے نہ رکھ لیجئے، ترجمہ شروع نہ کیجئے، میں کبھی کسی تاریخ کا ترجمہ اپنے اطمینان کے قابل نہیں کر سکا، جب تک کہ شہروں، قلعوں، پہاڑوں اور دریاؤں کے موقعے نقشے میں نہ دیکھ لے، آپ کی اس زحمت سے آپ کے ترجمہ کے پڑھنے والے کو

براہ راست کوئی نفع نہیں پہنچا لیکن ترجمہ میں آپ کو مدد مل گئی، اور وہ اس طرح کہ طبیعت بند نہ رہی، جہالت کا بادل چھٹ گیا، واقعات اس طرح قلم سے نکلنے لگے جیسے چشم دید ہوں، اب یہ نہ رہا، کہ مصنف گھوڑے پر سوار ہے، راستہ جانتا ہے، اور مترجم پیدل راہ سے ناواقف ہے، اب مضمون ہمرکابی کا ہو گیا، مگر یہاں یہ خوف ہے، کہ آپ مصنف سے آگے نہ نکل جائیں، اور اپنی معلومات کے زور پر مصنف سے بھی زیادہ نہ لکھ جائیں، ایسا ہوگا، لیکن جب دوبارہ فقرے پر غور کیجئے گا، تو مصنف ہی کے الفاظ مضمون کو صحیح بیان کر دینے کے لئے ترجمہ میں کافی ہو جائیں گے، اسی طرح ان تلمیحات کو جو انگریزی عبارتوں میں علم کی کثرت کی وجہ سے زیادہ آتی ہیں، ترجمہ کرنے سے پہلے کتابوں میں تلاش کر کے اچھی طرح سمجھکر ذہن میں رکھئے، اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ ترجمہ کے وقت خود بخود آپ انھیں اس طرح بیان کر جائیں گے، کہ پڑھنے والے کو مطلب سمجھنے میں دقت نہ ہوگی، محض ایک مختصر سا نوٹ حاشیہ پر یا متن میں یا عبارت ہی کے سلسلہ میں ایک آدھ فقرہ خطوط ہلالی میں کل مضمون کو روشن کر دے گا،

ڈکشنری دیکھنے کو کبھی دل نہ چرائیے، یہ بہت بڑی خطا ہے، ڈکشنری وہ ہیں بکار آمد نہیں ہوتی جہاں لفظ کے معنی نہ معلوم ہوں، بلکہ اچھے لفظ کی تلاش میں بار بار نا امید ہونے کے بعد بھی اسے دیکھنا پڑتا ہے، انگریزی سے اردو ترجمہ کرنے میں ذیل کی کتابوں کو دیکھنا لازمی ہے،

۱۔ ڈکشنری، انگریزی سے انگریزی میں تاکہ انگریزی لفظ کے تمام متون پر عبور ہو جائے، (۲) ڈکشنری انگریزی سے اردو میں تاکہ اردو لفظ معلوم ہو، (۳) انگریزی سے فارسی اور عربی کے لغت تاکہ اردو ڈکشنری میں جو فارسی یا عربی لفظ آئے ہیں، اور کام کے نہیں معلوم ہوتے، ان کے فارسی یا عربی مترادف الفاظ دیکھے جائیں، ممکن ہے کہ کوئی لفظ ڈھنگ کا مل جائے، فارسی اور عربی لغات سے اس بارے میں اچھی مدد مل جاتی ہے، (۴) تلمیحات کی ڈکشنریاں، قصص اصنام جو لغت

کی صورت مین لکھے گئے ہین، بیوگرافیکل ڈکشنریان تاکہ تاریخی لوگون اور مشاہیر کے حالات معلوم ہوسکین، (۵) انسائیکلوپیڈیا جس سے نبرہ کے بہت سے عقدے حل ہوتے ہین، مگر سب نہیں، (۶) اٹلس نئے اور پرانے مشہور شہرون کے خاکے اگر کسی پرانے شہر کا ذکر آیا ہے (۷) مشہور تعیرون کا اگر ذکر آیا ہو تو ان کی تصویرین جہان کہین ملین ضرور دیکھئے، انگریزی مصنف تاریخون مین بہت کچھ نقشون اور تصویرون کی مدد سے عبارتین اس طرح لکھ جاتے ہین، کہ اصل صورت سامنے آجاتی ہے، پھر جس قدر محنت مصنف نے کی ہے، مترجم کو چاہئے کہ اتنی ہی زحمت خود بھی گوارا کرے،

جس مضمون کی کتاب ترجمہ کرنی ہے، اس مضمون سے متعلق دوسری کتابون سے کماحقہ واقفیت پیدا کرنے مین کاہلی، فقرے کا صحیح مفہوم سمجھنے، لفظ کے صحیح معنی معلوم کرنے یا مناسب لفظ کی تلاش مین سستی مترجم کو نالائق ثابت کردیگی، اور اگر مطلب سمجھنے مین غلطی کی ہو تو پھر مرتے دم تک اسکی ندامت سے چھٹکارا نہیں، اگر ہزار فقرے صحیح ترجمہ کئے ہین، اور ایک فقرے کا مطلب غلط سمجھ لیا تو یہ ایک غلطی ہزار صحتون پر بھاری ہوگی، اور بے درد معترض مترجم کی لیاقت کا اندازہ ہمیشہ اسی غلطی سے کریگا، ایسی غلطیون سے مترجم کو ڈرنا اور بچنا چاہئے، ایک منٹ کی غفلت سے مہینون کی محنت غارت ہوجاتی ہے، مگر اچھے سے اچھے مترجمون سے بھی یہ ہوجاتا ہے، غیر معاف کردیتے ہین، مگر اپنا دل معاف نہین کرتا،

ترجمہ مین جلدی نہ کیجئے، مگر پیٹ ایسی بری بلا ہے، کہ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے، جو لوگ ترجمہ کے پیدائشی مریض ہین، وہ ایک ایک فقرے کے سوچنے مین کئی کئی دن صرف کردیتے ہین، ترجمہ کے فقرون کو بار بار کاٹ کر فقرے کی بہتر شکل پیدا کردیتے ہین، اور پھر بھی اطمینان نہین ہوتا، اور کام تو مشق سے آجاتے ہین، مگر ترجمہ مین مشق کے بعد بھی ہنوز روز اوّل کا مضمون رہتا ہے، بعض ذہین مترجم جن کی قوت گرفت بڑھی ہوئی ہوتی ہے، ترجمہ صاف لکھتے چلے جاتے ہین، فقرہ دیر مین لکھتے ہون

مگر کاٹنے کی ضرورت نہیں ہوتی، یہ مستثنیٰ صورتیں ہیں، لیکن میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ جب تک ایک بار ترجمہ کرکے پھر اس ترجمہ کو از سر نو عبارت کے ربط اور فقروں کی روانی کا پورا لحاظ کرکے خود صاف نہ کرے ترجمہ درست اور اچھا نہیں ہوتا، جلدی میں اکثر یہ خرابی پیدا ہوتی ہے، کہ انگریزی کے فقرے اکثر بڑے ہوتے ہیں، پہلی مشکل تو یہ ہوتی ہے کہ انھیں کہاں سے شروع کرے، پھر ایک ہی فقرے میں ذیلی فقرے اتنے ہوتے ہیں کہ اگر ذرا بھی عجلت کی تو بے ربطی کے علاوہ کوئی نہ کوئی بات چھوٹ بھی جائے گی، اور گو مترجم اپنا فقرہ درست کرنے کے بعد مطمئن ہو گیا ہو لیکن ترجمہ ناقص رہتا ہے اور مقابلہ کرنے والے کو اپنا غصہ اُتارنے کے لئے اچھا موقع ملتا ہے،

ترجمہ کرنے کے بعد اس کو پڑھئے، جن کو زیادہ اصلاح منظور ہوتی ہے، وہ اکثر کمرہ بند کرکے زور زور سے پڑھتے ہیں، پڑھنے میں جہاں زبان اٹکتی ہے، سمجھ لیتے ہیں، کہ خامی ہے، اس پھانس کو نکالنے کی کوشش کرتے ہیں، میرے ایک معزز استاد نے ایک مرتبہ نصیحت کی تھی، کہ فقرے کی آواز درست کرلو گے، تو مطلب بھی درست ہو جائے گا، یہ نصیحت زیادہ تر بکار آمد اس وقت ہوتی ہے، جب اپنی زبان ہی میں خود اپنی طرف سے انسان کوئی بات کہتا ہے، ترجمہ کے ساتھ یہ اصول ہمیشہ درست نہیں، لیکن جہاں تک ترجمہ کی زبان کا تعلق ہے، اس نصیحت کا ضرور خیال رکھنا چاہئے،

ترجمہ کو بالعموم آسان کام سمجھا جاتا ہے، جو لوگ اردو کی مشکلوں سے واقف نہیں ہیں، وہ مترجم کی عزت قلم نویس سے زیادہ کرنے کو ایک ناواجب سی بات سمجھتے ہیں، مگر ترجمہ آسان کام نہیں ہے، بالخصوص انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنا اور ایسا ترجمہ کرنا کہ وہ ایک مستقل تصنیف معلوم ہو نہایت دشوار ہے، انگریزی اور اردو زبانوں میں کچھ ایسا اختلاف ہے، کہ اسے بیان کرتے بن نہیں پڑتا، شاید انگریزی اور یورپ کی اور زبانوں میں اتنا فرق نہ ہو، اور وہاں ترجمہ کرنا آسان کام ہو مگر یہ بھی درست نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ انگلستان کے ایک بڑے عالم کا قول ہے کہ اپنا ہی خیال اپنی

زبان مین صحیح طور پر خوبی سے بیان کرنا مشکل ہے، چہ جائیکہ غیر کا خیال غیر زبان مین کیا ہوا اپنی زبان مین ادا کرنا" اس عالم کو اگر اردو اور انگریزی کا فرق معلوم ہوتا، تو شاید وہ اپنے اس قول مین اور بھی زیادہ قوت پیدا کرتا، ترجمہ کی نسبت یہ بھی کسی کا قول ہے اور بہت صحیح ہے، کہ ترجمہ ایسی محنت ہے، جو کسی کے شکریہ کی مستحق نہین، مگر یہ مقولہ مترجم کی ہمدردی میں کہا گیا ہے، مگر اس سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے، کہ شکریہ کا مستحق دراصل مصنف ہے، مترجم کا کام صرف اس کو دوسری زبان مین منتقل کرنے کا ہے، اور یہ کوئی بڑا کام نہین، مگر میرا خیال یہ ہے کہ جہان ایک قوی زبان سے کمزور زبان مین خیالات منتقل کرنے کی خدمت کسی کے سپرد ہوتی ہے، تو یہ خدمت تصنیف سے بھی اکثر مقامات پر چہار چند دشوار ہو جاتی ہے، مترجم کو مصنف سے بھی زیادہ وقت اور دماغ صرف کرنا پڑتا ہے، اور مترجم کی خدمت ایک علمی خدمت ہو جاتی ہے نقل نویسی نہین رہتی، مترجم کو کم وبیش وہی مدارج طے کرنے پڑتے ہین، جو مصنف نے اپنی تصنیف کو پیدا کرنے مین کئے ہین، بلکہ وہ اپنے ترجمے کو اپنی زبان میں وہی عزت بخشنی چاہتا ہے، جو انگریزی زبان مین انگریزی کتاب کی ہے، میرا خیال ہے، کہ جو لوگ ترجمہ کو آسان سمجھتے ہین، اون کو یا تو ترجمہ کا تجربہ نہین، یا علم کی قدر نہین مترجم شکریہ کا مستحق نہ ہو، لیکن اگر دنیا مین مترجم نہ ہوتا، تو روے زمین پر علم کی جھیلین اور دریا تو بہتیرے ہوتے، مگر ان کو ملاکر علم کا بحر ناپیدا کنار بنانے والا کوئی نہ ہوتا، "ص ع"

نفسیاتِ ترغیب

کسی انسان کو کسی کام یا چیز یا تحریک کے لئے ہم کیونکر آمادہ کر سکتے ہین، اور اس کو ترغیب اور شوق دلا سکتے ہین، اسکے نفسیاتی اصول کیا ہین، اس کتاب مین انہی اصول کی تشریح ہے، تجارت اشتہارات اور تقریر و وعظ میں ہر جگہ ان اصول کی رعایت کی ضرورت ہے،

ضخامت ۲۱۱ صفحے، قیمت :- ۴ر

"منیجر"

اخبار علمیہ

ہندوستان کی گرمی مین ٹھنڈک

السٹریٹیڈ ویکلی کے ایک مقالہ سے یہ معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان مین گرمی سے بچنے کے لئے پہاڑون پر آبادی انیسوین صدی کے آغاز سے شروع ہوئی، کوٹنور اور اوٹاکمنڈ سب سے پہلے آباد ہوے، ۱۸۳۰ء مین ولیم منٹگ نے پٹیالہ کے مہاراجہ سے پہاڑ کا وہ علاقہ خریدا جہان آجکل شملہ آباد ہے، اس کے آباد ہوتے ہی انگریزون نے یہان بنگلے بنانے شروع کئے، لیکن جب تک ریل سے آمد ورفت کی سہولتین پیدا نہین ہوئی تھین پہاڑ گرمی کے موسم مین صحیح طور پر تفریح گاہ نہین بن سکے تھے اسلئے جو انگریز پہاڑ پر نہین پہونچ سکتے تھے، وہ بڑے بڑے پنکھون کے نیچے ہی اپنے کو گرمی سے محفوظ پاتے تھے، ان کے بنگلے کا فرش گوبر سے لپا ہوتا تھا، تاکہ گرمی اس میں جذب ہوتی رہے، اوران کے مکان کی کھڑکیون مین سیپ لگی ہوتی تھی، جس سے کمرے لُو سے محفوظ رہتے تھے، ۱۸۴۰ء تک برف کا کوئی کارخانہ ہندوستان مین قائم نہین ہوا تھا، اور ہندوستان مین انگریز امریکہ سے برف منگایا کرتے تھے، امریکن ایجنٹ اکتوبر اور نومبر مین برف کے لئے آرڈر لیکر نیویارک اور بوسٹن کی کمپنیون کو بھیج دیتے تھے، جہان سے یہ کمپنیان برف سے لدے ہوے جہازات ہندوستان ایسے وقت روانہ کرتین، کہ وہ یہان اپریل اور مئی مین پہنچ جایا کرتے تھے اور بندرگاہون سے خاص قسم کی ریل گاڑیون مین برف مختلف مقامات کو بھیجی جاتی

تھی، تین سو روپیے مین ایک ٹن برف ملتی تھی، سنہ ۱۸۳۰ء اور سنہ ۱۸۴۰ء کے درمیان کلکتہ اور بمبئی مین برف کے کارخانے قائم ہوئے اسوقت سے برف ہندوستان مین عام ہوگئی،

تیموریون کے عہد مین پہاڑ تو آباد نہین ہوئے لیکن گرمی سے بچنے کے لئے مختلف قسم کی تدبیرین کی گئین، انھون نے دریاؤن اور جھیلون کے کنارے محلات بنائے، جن مین نہرون کے ذریعہ مختلف حصون مین پانی پہونچایا کرتے تھے، محل کے اردگرد کشادہ اور گھنے باغ ہوتے تھے جہان فوارے بکثرت بنائے جاتے تھے، باغ کی سرسبزی اور شادابی اور فوارون کی پھوہارون سے گرمی کی شدت بڑی حد تک کم ہوجاتی تھی، محل کے اندر بادگیان بھی ہوتی تھین، اور گرمہ کے فصل مین جابجا حمام ہوتے تھے، اور کھلی ہوئی چھتون کے فرش سنگ مرمر کے بنائے جاتے تھے تاکہ دوپہر شام کے وقت جلد ٹھنڈے ہوجائین، کھڑکیون مین منقش جالیان بنی ہوتی تھین، جن سے آفتاب کی شعاعون کی تمازت کم ہوتی رہتی تھی، ان تمام تدابیر کے باوجود گرمی کی زیادتی ہوتی، تو شاہی خاندان کشمیر منتقل ہوجاتا، کشمیر تو اکبر کے عہد ہی مین فتح ہوگیا تھا، لیکن نورجہان کے ہاتھون سے جنت ارضی بن گیا، نورجہان نے اس دور دراز سفر کو خوشگوار بنانے کی غرض سے جابجا کاڑان سرائین بنوائین اور ان مین خوشنما باغات لگائے، چنانچہ دلکشا، حسن ابدال، پنجور، ویری ناگ کے پرفضا باغ اور سرائین اب بھی اسکی یاد تازہ کرتی ہین،

بابر اور ہمایون پانی شورہ سے ٹھنڈا کیا کرتے تھے، جہانگیر اولے استعمال کیا کرتا تھا لیکن شاہجہان کے عہد سے ہمالیہ کے پہاڑون سے آگرہ اور دہلی مین برف برابر پہنچا کرتی تھی، ہمالیہ کے علاقہ کے باجگذار حکمران خراج مین برف ہی ادا کرتے تھے، اور وہ "برفی راجہ" کہلاتے تھے، یہ برف کشتیون پر راوی ہوکر لاہور اور جمنا ہوکر دہلی پہونچتی تھی، منوچی کا بیان ہے کہ سرمور کے راجہ نے اورنگزیب کے عہد مین دہلی کے تمام باشندون کے لئے برف مہیا کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا بشرطیکہ اس سے

خراج لینا بند کر دیا جائے، مگر اورنگزیب نے اس کو قبول نہیں کیا،

ریڈیو کی ابتدا

آج سے چھیالیس سال پہلے مارکونی نے جب ریڈیو ایجاد کیا، تو اسکی آواز شروع مین صرف سو گز تک پھیل سکی لیکن ایک سال کے اندر ہی آواز کو ڈیڑھ میل تک پہونچانے مین کامیابی ہوگئی، پھر تھوڑے ہی عرصہ میں مارکونی نے دریاے برسٹل اور سومرسٹ کے درمیان دس میل تک آواز پہنچا دی، اور اسی زمانہ مین پہلی دفعہ برطانیہ کے بحری حکام نے لاسلکی کو استعمال میں لانے کی کوشش کی، ۱۸۹۸ء مین ٹرینٹی مین لاسلکی لگایا گیا، اور دارالعوام کے اراکین کے سامنے اسکی آواز کا مظاہرہ کیا گیا، جزیرۂ وائٹ سے ملکہ وکٹوریہ نے اسکاٹلینڈ اپنے ولی عہد کے پاس کچھ پیغامات بھیجے اور وہان کے پیغامات سنے، اسی سال لاسلکی کے ذریعہ سے خبرین بھی مشتہر کی گئین،

تیمور کا مقبرہ

ریوٹر کی ایک خبر ہے، کہ روسی ماہرین آثار قدیمہ نے تیمور کے مقبرہ کو کھول دیا ہی، تیمور کی قبر سمرقند کی ایک مسجد مین ہی، جس کا برج نیلے رنگ کی کاشیکاری کا ہے، اور اپنی صنعت کے لحاظ سے دنیا مین مکمل ترین نمونہ سمجھا جاتا ہی، قبر کا تعویذ ایک بہت بڑے سالم سنگ یشب کا ہے، اتنے بڑے سالم سنگ یشب کی مثال کہین اور نہین ہی، ماہرین آثار قدیمہ نے اس پتھر کو ہٹا دیا ہی، اس کے نیچے ان کو ہلکے سفید رنگ کا ایک تابوت ملا ہی، جس میں انکا بیان ہی کہ تیمور کے پوتے الغ بیگ کی لاش ہی[1] لاش ریشمی کپڑون میں لپٹی ہوئی ہی، اور اچھی حالت مین ہی، مگر لاش کا سر جسم سے علحدہ ہی، اسلئے ان ماہرین آثار قدیمہ کی رائے ہی، کہ اس سے یہ خیال کہ الغ بیگ اپنے بیٹے کے ہاتھون قتل ہوا صحیح ثابت ہوتا ہی،

"ص ع"

---

[1] معارف:- یہ بیان صحیح نہین، کیونکہ تیمور کے مقبرہ مین ایک بزرگ میر سید جو تیمور کے دوست تھے دفن ہین

مطبوعاتِ جدیدہ

واقعاتِ اظفری مترجمہ جناب عبدالستار صاحب منشی فاضل تقطیع بڑی ضخامت ۲۰۲ صفحے کاغذ سپید و بیز ٹائپ بہتر قیمت مرقوم نہیں، غالباً مدراس یونیورسٹی سے ملے گی،

یہ کتاب عرصہ ہوا ریویو کے لئے آئی تھی، لیکن ہم کو اب اس کے دیکھنے کا اتفاق ہوا، یہ ایک تیموری شاہزادہ مرزا علی بخت بہادر میر محمد ظہیرالدین المتخلص بہ اظفری گورگانی کی تصنیف ہے، شاہزادہ مذکور اورنگ زیب کی پوتی نواب عفت آرا بیگم کے نواسے اور شاہ عالم ثانی کے ہم جد اور ان کے زمانہ مین تھے، علمی فضیلت کے اعتبار سے تیموری خاندان کے ممتاز ترین افراد مین تھے، اردو اور فارسی کے علاوہ عربی اور ترکی مین بھی مہارت رکھتے تھے، انگریزی بھی جانتے تھے، اردو فارسی اور ترکی تین زبانون مین صاحب دیوان تھے، ان کے علاوہ اس زمانہ کے تمام مروجہ علوم مین دستگاہ حاصل تھی، متعدد کتابون کے مصنف بھی تھے، تیموری خاندان کے دور زوال کی رسم کے مطابق تاج و تخت کے دعوی کے خطرہ سے شاہ عالم ثانی کے زمانہ مین نظربند تھے، قلعہ کی چار دیواری مین ان کی نشوونما ہوئی، غلام قادر روہیلہ کے ہنگامہ میں انھون نے بڑی جانفروشی دکھائی، اسکے صلہ مین شاہ عالم نے بہت کچھ وعدے کئے، رہائی کی امید دلائی، لیکن کسی کا ایفا نہین کیا، رہائی سے مایوسی کے بعد مرزا علی بخت ہندوستان کے راجاؤن اور امرا سے خفیہ خط و کتابت کرکے ۱۲۰۳ھ مین قید سے نکل بھاگے، اورچھ پور، جودھپور، اودے پور، رامپور اور بریلی ہوتے ہوئے لکھنؤ پہونچے، ان سب مقامون کے راجاؤن اور نوابون نے شاہزادہ کے شایانِ شان خدمت و مدارات کی، جے پور

کے راجہ پرتاب سنگھ نے تختِ شاہی بنواکر پیش کرکے شاہ عالم کے مقابلہ مین کھڑا کرنے کی کوشش کی، مگر مرزا علی بخت آمادہ نہ ہوئے۔ اس سفر کے دوران مین ہندوستان کے متعدد امرار نے اپنے یہان آنے کی درخواست کی لیکن شاہزادہ نے لکھنؤ کو پسند کیا، یہ نواب آصف الدولہ کا زمانہ تھا، انھون نے ہاتھون ہاتھ لیا، اور بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ ٹھہرایا، اور شاہزادۂ موصوف اپنے اہل و عیال کو دلی سے بلاکر لکھنؤ مین مقیم ہوگئے، سات سال تک یہان قیام رہا، نواب آصف الدولہ اور سلطنت کے دوسرے ارکان و عمائد نے خدمت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہین رکھا لیکن مرزا علی بخت کو نواب اصفجاہ والیٔ حیدرآباد اور امیر الہند والاجاہ اوّل والیٔ مدراس سے بڑی امیدین تھین، اس لئے ۱۲۱۱ھ مین وہ دکن روانہ ہوگئے، اور مرہٹون کی بدامنی کی وجہ سے بہار، بنگال، اور اڑیسہ کے راستہ سے مدراس پہونچے، والاجاہ نے شایانِ شان پذیرائی اور خدمت کی، اور مرزا علی بخت اپنے اہل و عیال کو لکھنؤ سے بلاکر یہیں مقیم ہوگئے، اور یہیں ۱۲۳۴ھ مین انتقال کیا "واقعاتِ اظفری" اسی سفر و سیاحت کی روئداد ہے، اس مین قلعۂ معلّی کی قید سے نکلنے کے وقت سے مدراس کے قیام تک سفر و حضر مین جو جو واقعات پیش آئے، اور ہندوستان کے ہندو اور مسلمان امراء اور رؤسا نے جس جس طرح کی مدارات و خدمت کی، ان سب کی پوری تفصیل ہے، اس طرح یہ کتاب اس عہد کے بعض حالات کی تاریخ بھی ہے، اور سفرنامہ بھی، اظفری کی سوانح حیات بھی ہے، اور ہندوستان کے امراء اور رؤسا کا تذکرہ بھی، اور اس عہد کی تہذیب کا مرقع بھی، یوں تو پوری کتاب نہایت دلچسپ اور مفید معلومات سے پُر ہے، خاص طور سے وہ عرضداشتیں بہت اہم ہین، جو سفر کے دوران مین مختلف امراء اور رؤسا کی جانب سے اظہارِ عقیدت کے لئے شاہزادہ کی خدمت مین موصول ہوئین، اس سے اندازہ ہوتا ہے، کہ اس زمانہ مین بھی جب کہ تیموری خاندان کا جاہ و جلال ختم ہوچکا تھا، ہندوستان کے امراء مین اسکے شاہزادون کا کیا مرتبہ تھا، اور وہ کس خادمانہ حیثیت سے

اِن سے پیش آتے تھے، اصل کتاب فارسی زبان مین ہے، اس کے قلمی نسخے کمیاب ہین، لائق مترجم نے مدراس یونیورسٹی کے نسخہ سے اس کا ترجمہ کیا ہے، اور مولوی محوی صاحب صدیقی نے اسکی اصلاح و ترمیم کی ہے، اور کتاب پر مفید مقدمہ اور حواشی لکھے ہین، ترجمہ صاف اور سلیس اور کتاب دلچسپی اور معلومات دونون حیثیتون سے پڑھنے کے لائق ہے،

فلسفۂ رہبانیت مؤلفہ جناب مرزا عزیز فیضانی صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۶۴ صفحے، کاغذ سپید، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد عہ، پتہ:- مرزا محبوب عالم، شبلی روڈ اسلامیہ پارک، لاہور،

ترکِ دنیا کے متعلق غلط اور غیر اسلامی تصور نے تصوف اور طریقت کے نام سے دینی عقائد و اعمال اور اسلامی زندگی مین جو بدعتین پیدا کر دی ہین، اور مذہب و اخلاق اور اسلامی زندگی پر جو بُرے اثرات مترتب ہوئے ہین، اس کتاب مین حدیث و سنت کی روشنی مین اسکی پوری تردید کی گئی ہے، کتاب اپنے موضوع پر بہت جامع ہے اور رہبانیت یا غیر اسلامی تصوف کے مفاسد کا کوئی پہلو چھوٹنے نہیں پایا ہے، چنانچہ رہبانیت کی حقیقت، اسکی تاریخ اور اوس سے دینی عقائد و اعمال، اجتماعی زندگی، دنیاوی کاروبار، انسانی آداب و اخلاق اور تہذیب و معاشرت مین پیدا شدہ تمام دینی اور دنیوی مفاسد کی جزوی تفصیلات پر بحث کرکے ان کی پوری تردید کی گئی ہے، اور ترکِ دنیا اور اس سے تعلق کے بارہ مین صحیح اور معتدل اسلامی تعلیم کو پیش کیا گیا ہے، قدیم صوفیاے کرام اور ائمۂ اسلام ابن تیمیہ، ابن قیم، حضرت مجدد الف ثانی اور دوسرے اکابر اور مصلحین کی تصانیف مین اس موضوع پر مفصل مباحث ہین، لائق مؤلف نے حسب ضرورت اس مین اور اضافہ کرکے یہ مفید کتاب لکھی ہے لیکن مباحث مین جا بجا غیر ضروری تطویل ہے، اور کہین کہین آیاتِ قرآنی اور احادیث نبوی مین کتابت کی غلطیان رہ گئی ہین، کتاب اپنے مباحث کے اعتبار سے پڑھنے کے لائق ہے،

مبادی سیاسیات، مؤلفہ جناب ہارون خان صاحب شروانی صدر شعبہ تاریخ و سیاسیات جامعہ عثمانیہ تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۸ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد صہ، پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی،

مبادیاتِ سیاسیات مؤلف کی مشہور کتاب ہے، اس کا پہلا اڈیشن ۱۹۳۰ء میں چھپا تھا، ادھر چند برسوں میں سیاست کی دنیا بہت کچھ بدل گئی تھی، اس لئے ۱۹۳۹ء میں لائق مؤلف نے اس میں ضروری حذف و اضافے کرکے اس کو دوبارہ مرتب کیا، اس کے دو حصے ہیں، پہلے حصہ میں مملکت کی تاریخ اس کے متعلق سیاسی نظریے اور فلسفیانہ مباحث ہیں، دوسرے حصہ میں مملکت کے نظام اسکے اجزاء اسکی بین الاقوامی ہیئت کی تفصیل، اور مملکتوں کے نظام سے اسکی توضیح و تشریح ہے، اس سلسلہ میں ہندوستان کے دفاق پر بھی تبصرہ ہے، آخر میں ریاست حیدرآباد کے جدید دستور کا خلاصہ ہے، اس موضوع پر دوسری زبانوں کی تصانیف کے مقابلہ میں تو اس کتاب کی حیثیت ضرور مبادی ہی کی ہے، لیکن اردو میں اسے نصابی کہہ سکتے ہیں، لائق مؤلف نے اس میں اختصار و جامعیت کے ساتھ سیاسیات کے جملہ مسائل و مباحث کو قلمبند کر دیا ہے، اس کی یہ خصوصیت قابلِ ذکر ہے، کہ اس میں جابجا اسلامی اصولِ سیاسیات پر بھی بحث کی گئی ہے، جس سے عموماً اس قسم کی کتابیں خالی ہوتی ہیں، مؤلف کا یہ اسوۂ حسنہ ان تمام فنون پر لکھنے والوں کے لئے جن کے آثار اسلامی شریعت یا اسلامی تاریخ میں موجود ہیں، لائق تقلید ہے، اس کتاب کو بھی لکھے ہوئے دو سال ہو گئے، اور اس مدت میں دنیائے سیاست کا نقشہ ہی بدل گیا ہے، تاہم بہت سے بنیادی مسائل ہر زمانہ کے لئے یکساں ہیں، اس لئے اس کتاب کا افادہ اپنی جگہ پر قائم ہے،

"م"

جلد ۴۸ ماہ رجب المرجب ۱۳۶۰ھ مطابق ماہ اگست سنہ ۱۹۴۱ء عدد ۲

مضامین

شذرات	سید سلیمان ندوی	
ظہور الاسرار نامی اور مطرکڑہ،	جناب مولوی امتیاز علی خاں صاحب عرشی، ناظم کتبخانۂ رامپور،	۸۵-۹۷
قصص الحق،	پروفیسر سید نواب علی صاحب سابق وزیر تعلیم ریاست جوناگڈھ،	۹۸-۱۱۱
مجمع النفائس،	جناب اقبال انصاری ایم اے ریسرچ اسکالر پی ایچ ڈی، لکھنؤ یونیورسٹی،	۱۱۲-۱۳۰
عربی زبان کے جدید رجحانات،	"ص ع"	۱۳۱-۱۳۸
اخبار علمیہ،		۱۳۹-۱۴۲
حشر جذبات،	جناب ثاقب، کانپوری،	۱۴۳
غزل،	جناب شاہد صدیقی، اکبرآبادی،	۱۴۴
رباعی	جناب اختر صہبائی،	۱۴۴
رسالوں کے سالنامے اور خاص نمبر،	"م"	۱۴۵-۱۵۰
نئے رسالے،	〃	۱۵۰-۱۵۵
مطبوعات جدیدہ،	〃	۱۵۶-۱۶۰

شذرات

یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ فرنگی محل کے ممتاز عالم مولانا عنایت اللہ صاحب فرنگی محلی نے ۶-جولائی ۱۹۴۱ء کو دفعۃً وفات پائی، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ مرحوم ابھی ۲۴-۲۵-۲۶-جون کو ہمارے ساتھ بھوپال میں عربی مدارس کی اصلاح کے کام میں شریک تھے، وہیں دردِ شکم میں مبتلا ہوئے جس کے باعث وہ کئی دن تک وہاں علیل رہے، سوءِ ہضم، تسلسل بول اور ضعفِ قلب کے عوارض ان کو پہلے سے لاحق تھے، بھوپال میں مرض کی تخفیف کے بعد وہ لکھنؤ روانہ ہوئے اور میں بھی ان ہی کی وجہ سے ان ہی کے ساتھ لکھنؤ تک آیا، لکھنؤ اسٹیشن پر پہنچ کر مرحوم نے مجھ سے کہا کہ میں آپ کی زحمتوں اور خدمتوں کا شکریہ اس لئے نہیں ادا کروں گا کہ میں آپ کو اپنے سے علٰحدہ نہیں سمجھتا، یہ کہہ سُنکر سلام کے بعد ہم دونوں الگ ہوگئے، یہ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ سلامِ رخصت آخری سلام ہے،

مرحوم فرنگی محل کے خانوادہ میں تنہا جامع علوم و فنون ہستی باقی رہ گئے تھے، معقولات اور منقولات پر ان کو یکساں دسترس حاصل تھی، مسائل پر وہ مبصرانہ اور ناقدانہ نظر رکھتے تھے، اردو میں تاریخ، حدیث و رجال پر کئی رسالے لکھے تھے، مدرسۂ نظامیہ کے صدر مدرس اور اچھے مدرس تھے، سیاسیات سے بھی دلچسپی رکھتے تھے، خلافت اور مسلم لیگ کے کاموں میں حصہ لیتے رہتے تھے، کل ۵۴ برس کی عمر پائی، اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی عنایتوں سے سرفراز فرمائے،

خدا خدا کر کے حیات شبلی کی تالیف نو سو ۹۰۰ صفحوں میں جا کر تمام ہوئی، یہ نہ صرف مولنا شبلی کی زندگی کی شخصی تاریخ ہی بلکہ اُن کے زمانہ کے چالیس سال کی قومی زندگی کی تاریخ ہے، کتاب مطبع کے سپرد کر دی گئی ہے، اور اس وقت تک اس کے ڈیڑھ سو صفحوں کی کتابت ہو چکی ہے، کاغذ کی گرانی سے ڈر لگتا ہے کہ اس ضخامت کی کتاب جلد نہ چھپ سکے،

مقالات شبلی کی آخری قسط خطبات شبلی کے نام سے چھپ کر پوری ہو گئی، اس حصہ میں مولنا کی وہ تقریریں ہیں جو انھوں نے علی گڈھ ایجوکیشنل کانفرنس اور ندوہ کے جلسوں اور عام مجمعوں میں کیں، افسوس ہے کہ ان کی یہ تقریریں بہت کم محفوظ رہیں، تاہم جو کچھ مل سکیں وہ ان اوراق میں جمع کر دی گئیں،

دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن کے علمی کارناموں کا ذکر بار بار آیا ہے، دائرہ نے اس سال بہت سی نادر کتابیں شائع کی ہیں، جن میں سے رسائل ابن ہیثم اور رسائل طوسی علم مناظر اور ریاضیات میں کتاب المعتبر ابو البرکات بغدادی فلسفہ میں، میزان الحکمۃ خازنی طبیعیات میں تاریخ منتظم ابن جوزی تاریخ میں الکفایہ فی علم الروایہ حاکم اصول حدیث میں بہت اہم کتابیں ہیں، اس سلسلہ میں ایک اور نہایت اہم کتاب کی چھپائی شروع ہو گئی ہے، یعنی امام بخاری کی تاریخ کبیر جو علم رجال کی مستند اور اولین کتاب ہے، دائرہ کو ان کتابوں کی اشاعت پر مبارکباد دی جا سکتی ہے،

ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد دکن نے اردو کی ایک عظیم الشان خدمت اپنے ذمہ

لی ہے، یعنی ایک اردو انسائیکلو پیڈیا کی ترتیب واشاعت، حیدرآباد میں جدید وقدیم علوم و فنون کے اساتذہ اور ماہرین کی بہت بڑی جماعت موجود ہے جن کی موجودگی میں اس کام کے انجام کی پوری توقع کی جاسکتی ہے، ادارۂ مذکور نے علوم وفنون کی تقسیم اور ان کے ذمہ دار اڈیٹروں کے نام کا انتخاب کرلیا ہے، اور حیدرآباد کے باہر علماء اور اہل علم سے حصول امداد کی کوشش بھی وہ کر رہا ہے، ضرورت ہے کہ اردو کے ہمدرد اور بہی خواہ اس کام میں اس کی ہمت بڑھائیں ادارۂ مذکور سے رفعت منزل حیدرآباد دکن کے پتہ سے خط وکتابت کی جاسکتی ہے۔

پشاور میں عربی کا ایک مدرسہ رفیع الاسلام ہے، مدرسۂ مذکور کی ملکیت میں ایک نادر کتابخانہ ہے جس میں ۶ ہزار کتابیں ہیں جنمیں بہت سی قلمی کتابیں بھی ہیں، پشاور کے قیام میں اس کتاب خانہ کا ذکر میں نے سنا لیکن دیکھنے کی نوبت نہیں آئی، معارف کے مئی نمبر ۱۹۳۵ء میں تاریخ محمود شاہی کا ذکر ہے جس کا نسخہ نہیں ملتا، مدرسۂ مذکور کے مہتمم صاحب مولوی فضل صمدانی صاحب نے مجھے مطلع کیا ہے کہ اس کتاب کا نسخہ ان کے کتابخانہ میں موجود ہے، اسی طرح جولائی اور اگست کے پرچہ میں مطہر کڑہ کی جس شرح ظہور الاسرار کا ذکر ہے اس کا نسخہ بھی اس میں موجود ہے کتاب کا نام فخر الاسرار اور مصنف کا نام مطہر بن قوام بن رستم بن احمد بن محمود البلخی المعروف بکرنی ہے

مقالات

ظہور الاسرار نامی اور مظہر کرڑہ

از

جناب مولوی امتیاز علی خاں صاحب عرشی ناظم کتب خانہ رامپور

(۲)

بلخی کے نام کی تحقیق شرح کے عام نسخون مین مصنف کا نام محمد بن قوام بن رستم بن احمد بن محمود بدر خزانۃ البلخی المعروف بکرئی ملتا ہے،

صاحب کشف الظنون (ج ۵ ص ۴۶۶ طبع یورپ) نے صرف "بدر البلخی" لکھا ہے اسپرنگر نے مذکورۂ بالا مکمل نام درج کیا ہے، مگر ایک تو۔ بدر خزانۃ۔ کو نہ سمجھکر اس کے محاذین علامت استفہام بڑھائی ہے، اور دوسرے ازراہ سہل المعروف بکرئی کو غلط سمجھے ہین، اور اس لئے شارح کا عرف بکرئی بتاتے ہین، حالانکہ ایک ادنی عربی طالب علم بھی یہ جانتا ہے، کہ حرف الباء پر پیوزیشن کا کام کر رہا ہے، جزو کلمہ نہین اصل مین اس کا عرف کرئی لکھنا چاہئے تھا،

ڈاکٹر ریو کے نسخہ مین "بدر حرانۃ" تھا، اس کو انھون نے برکلیس مین صحیح کر دیا ہے، علاوہ ازین شارح کا عرف ان کے خیال مین کرخی ہے، جو اغلباً ان کی قرات کی غلطی ہے، اگرچہ امکان یہ بھی ہے کہ خود کاتب نے لکھا ہو،

ڈاکٹر اپٹے کے نسخہ میں "المعروف بکرئی" مندرج ہے، اسلئے ان کو بھی وہی دھوکا ہوا جو اسپرنگر نے کھایا تھا، کہ شارح کا عرف بکرئی ہے، لیکن یہ اپنے پیشرو ڈاکٹر ریو کا بھی احترام علمی ملحوظ رکھنا چاہتے ہیں، اسلئے اپنے اور اسپرنگر کے نسخہ پر بھروسہ نہیں کرتے، اور یہ بھی آگے چل کر لکھدیتے ہیں، کہ یا جیسا کہ ریو کے نسخہ میں ہے، اس کا عرف کرخی تھا،

روسی مستشرق ڈاکٹر آئیوناف نے اسپرنگر اور اپٹے کا ساتھ دیکر اس کو بکرئی لکھا ہے،

فہرست کتاب خانہ آصفیہ، حیدرآباد (ج ۳ ص ۶۲۸) میں بھی مصنف کو "معروف بہ کرخی" تسلیم کیا گیا ہے،

کتاب خانہ ریاست رامپور کے نسخوں میں سے جو نسخہ ۱۰۵۵ھ کا نوشتہ ہے اس میں مصنف کا نام اس طرح لکھا گیا ہے:-

"محمد بن قوام الدین بن رستم بن احمد بن محمود بدر خزانۃ البلخی المعروف بکری الخ" (ورق ۱۔ الف)

نسخہ نمبری ۵۹ میں یہ نام قدرے اختلاف کے ساتھ اس طرح ملتا ہے،:

"مظہر بن قوام بن رستم (بن) احمد بن محمود البلخی المعروف بکری" (ورق ۲۔ الف)

عرف کی حقیقت میری ناقص رائے یہ ہے کہ شرح مخزن اسرار کے مصنف کا عرف کرخی یا کرکئی ہے، نہ بکرئی اور نہ کرخی، اور یہ کرکہ کی طرف نسبت ہے جہاں تک تاریخی ثبوت کا تعلق ہے اس سے آئندہ بحث ہوگی، یہاں صرف لسانی حیثیت سے یہ دیکھنا ہے، کہ کیا بکرئی درست ہے یا کرکئی ہمارے دونوں نسخوں میں اس لفظ کی کتابت ہے بکری اسلئے یہ بہکر کی طرف نسبت ہو سکتی ہے، اگر کاف کو مشدد پڑھا جائے، اور ہائے مخلوط کو بجز عربی ساقط کر دیا جائے لیکن دوسرے تمام نسخوں میں بکرئی تحریر ہے، اسلئے یہ قیاس نادرست قرار پائے گا، مزید برآں ہا کے اصلی ہونے کی صورت میں لازم ہوگا، کہ ایک ہائے جارہ اور ہو، اور وہ کسی نسخہ میں بھی نہیں، لہذا اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ

لفظ مذکور یا سے نسبت اور ایسے اسم سے مرکب ہوا ہے جس میں ک آخر ضرور ہیں،

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے، میری دانست میں یہ کڑہ کی طرف منسوب ہے، جو عام طور پر پرانی تاریخوں میں کڑہ مانکپور کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، یہ الہ آباد کے قریب واقع ہے، اور مغلوں کے عہد تک مشہور شہروں میں گنا جاتا تھا،

قاعدہ یہ ہے کہ ایسے اسماء کیساتھ ی نسبت لگانے کی صورت میں جو ہ پر ختم ہوتے ہیں، ہ کو ساقط کرکے اوس کے بجائے ؤ لکھا جاتا ہے، مثلاً امروہہ کی نسبت امروی، سامانہ کی سامانوی، تتہ کی تتوی بعض اوقات ہ حذف کردی جاتی ہے، مثلاً مکہ کی نسبت مکی، مدینہ کی مدنی، بنگالہ کی بنگالی، سکندرہ کی سکندری لیکن پرانی کتابوں میں یہ بھی دیکھا گیا ہے، کہ آخر کی ہ کو ء سے بدل دیتے ہیں، جیسے گنگوہ سے گنگوئی، بدایونی (ج ۲ ص ۵) کے یہاں نظر آتا ہے، اور حکیم احمد تتوی کو طبقات اکبری (قلمی ص ۲۵۳) میں تتئی لکھا ہے،

مذکورۂ بالا قاعدہ کے ماتحت لفظ کڑہ کی صحیح نسبت کڑوی ہونا چاہئے، چنانچہ حکیم عبدالحی صاحب مرحوم نے نزہتہ الخواطر کے صفحات ۱۹، ۴۳، ۱۷۱، اور ۱۷۴ پر کڑہ کے رہنے والے علما کو الکروی ہی لکھا ہے،

لیکن پرانی تصنیفات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ کڑہ کے رہنے والے عالم اپنی نسبت الکروی کے بجائے الکرئی لکھا کرتے تھے، سردست اس بیان کی شہادت میں کتبخانہ ریاست رامپور کے دو قلمی نسخوں کو پیش کیا جاسکتا ہے،

۱) کتاب ثمرۃ الفوائد فارسی (فن حدیث نمبر ۶۶) ہے، حمد و نعت کے بعد مصنف لکھتا ہے،

"اما بعد می گوید خاکپائے درویشان احمد محی الدین ابن سید محمد غوث المدعو بہ حیو قدس اللہ سرہٗ العزیز العینی مجدا[1] الکرئی مسکنا"

---

[1] غالباً جدا کو کاتب نے مجدا لکھا ہے،

(۲) وسیلۃ الطالبین الی محجۃ رب العالمین فارسی (اورادنمبر ۴۱) ہے، اس کا مصنف دیباچہ مین تحریر کرتا ہے:

"وبعدی گوید متعلم فقیر خاکپائے صغیر وکبیر کمال عزکرنی"

مصنف کا پورا نام مخدوم کمال الدین عرف شیخ کالو ہے، دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شیخ حسام الدین مانکپوری، خلیفہ قطب العالم نور الدین احمد بن عمر بن اسعد لاہوری کا مرید ہے اسلئے یہ یقیناً کڑہ مانکپور کا باشندہ تھا جس کو اس نے الکرنی سے ظاہر کیا ہے،

بنا برین اسپر نگر ایٹے اور آئونات کے نسخون مین المعروف بکرنی اسی کڑہ مانکپور کی طرف نسبت قرار پائے گی، اور چونکہ یہ قدیم رواج کے مطابق ہے، اسلئے اس کو غلط بھی نہین کہا جاسکے گا، اب الکرنی رہ جاتا ہے، جیسا کہ ہمارے کتاب خانہ کے دونوں نسخون مین ہے ہیری دانست مین کاتب اصل کی غلطی سے الکرنی کی جگہ الکرمی ثبت ہوگیا ہے، اور یا کتاب کے کسی نسخہ مین خود مصنف نے نگی سکندری وغیرہ کے ماتحت الکرمی بحذف ہ آخر لکھا ہے،

بہرحال یقین ہے کہ شرح مخزن اسرار کا مصنف کرنی یعنی کڑہ مانک پور کا باشندہ ہو، مگر اس کے خاندان کا اصل وطن بلخ تھا، اسی لئے وہ اپنے آپ کو البلخی بھی لکھتا ہے،

لقب کی حقیقت | بدر الخزانۃ کے بارے مین میری رائے یہ ہے، کہ یہ شارح کا لقب ہے جو اصل مین بدر الدین تھا، موجودہ نسخون کے منقول عنہ مین "الدین" کو خطی مشابہت کے باعث الخزانۃ یا الخزانۃ پڑھا گیا ہوگا، اس کے بعد سے یہی لفظ مروج ہوگیا،

صاحب کشف الظنون نے صرف بدر البلخی لکھا ہے، جس سے اس خیال کو تقویت ہوتی ہے، کہ بدر مصنف کا لقب ہے، اور چونکہ عربی مصنفین عام طور پر لقب سے "الدین" کو حذف کرکے اس کا پہلا جزو ذکر کردیتے ہین، اس لئے ہم یہ مان لینے مین، ذرا بھی تامل نہین کرتے کہ

صاحبِ کشف کا مقصد "بدر الدین البلخی" ہے،

اصل نام کی تحقیق اب ہمین نسخہ، کتاب خانہ رام پور، نمبری ۵۹ کی طرف متوجہ ہو جانا چاہیئے اس مین تمام دوسرے نسخون کے خلاف مصنف کا نام مظہر بن قوام درج ہے، اگر ہم تھوڑی دیر کیلئے تمام نسخون سے یہ کہکر قطع نظر کرلین، کہ یہ سب ایک اصل سے منقول ہونے کے سبب سے ایک نسخہ کے برابر ہین، اور اسلئے نسخہ، نمبری ۵۹ کے مقابلہ مین ان کے بیان کو ترجیح نہین دیجا سکتی، تو پھر ہم یہ جستجو کرنے پر مجبور ہون گے، کہ یہ مظہر کرئی کون شخص ہے،

تذکرہ کی کتابون مین ایک صاحبِ علم و فضل شاعر مظہر کڑہ کا ذکر نظر آتا ہے، اورنٹیل کالج میگزین، ماہ مئی ۱۹۳۵ء مین پروفیسر محمد وحید مرزا صاحب نے اس کے دیوان کے ایک نسخہ کے سلسلے مین، جو حکیم آشفتہ صاحب لکھنوی کی ملک ہے، ایک مقالہ سپردِ قلم فرمایا تھا، اس مقالہ کے ساتھ فاضل محترم مولانا محمد شفیع صاحب پرنسپل اورنٹیل کالج لاہور نے تمام اُن کتابون کے اقتباسات شامل کردیے ہین جن مین مظہر کڑہ کا تذکرہ ہے، اور تبخانۂ ملا صوفی مازندرانی سے اس کے قصائد و غزلیات کے اشعار بطور ضمیمہ نقل فرمائے ہین،

جولائی ۱۹۳۵ء کے رسالہ معارف، اعظم گڈھ مین مخدومی نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمن خانصاحب شروانی نے ایک مضمون تحریر کیا ہے، جس میں مظہر کے قصائد کے ایک جدید نسخہ کی اطلاع دیتے ہوئے اس کے حالاتِ زندگی پر اس کے کلام کی روشنی میں نظر ڈالی ہے، مذکورۂ بالا مضامین کا خلاصہ یہ ہے کہ

> مظہر کڑہ مانکپور کا باشندہ تھا، جو الہ آباد کے قریب اس عہد مین صوبہ کا صدر مقام تھا، باپ کا نام معلوم نہین لیکن وہ بھی شاعر اور شاہِ وقت کے دربار سے منسلک تھا، مظہر نے مختلف علوم و فنون کی باضابطہ تعلیم حاصل کی تھی اور شعر گوئی کیساتھ ساتھ علوم کا درس بھی دیتا تھا،

یہ فیروز شاہ تغلق اور اس کے عہد کے امراء کی سرکاروں کا مداح تھا، چنانچہ عین الملک کی طرف سے اسکو صلہ مین جاگیر بھی عطا ہوئی تھی،

کہا جاتا ہے کہ خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی سے شرف ارادت حاصل تھا، اس لئے انکی وفات پر ایک مرثیہ بھی لکھا ہے، جو دیوان مین موجود ہے، لیکن شجرۂ منظومہ مین نظام الدین اولیا کے بعد رکن حقیقت نام ملتا ہے، جو کسی رکن الدین کی طرف اشارہ ہے، اس کا دیوان عرصہ تک غیر مرتب پڑا رہا، مولانا محمد صوفی مازندرانی نے گجرات مین اس غیر مرتب دیوان کا ایک نسخہ پایا، اور اوس کو مرتب کرکے شائع کیا، اس نسبت سے اس کو بعض تذکرہ نویسون نے گجراتی لکھدیا ہے،

سنہ وفات کا پتہ نہیں چلتا، لیکن اسکے ایک قصیدہ مین ۷۷۰ھ کا ذکر آگیا ہے، نیز دوسرے قصیدہ سے جو محمد شاہ بن فیروز شاہ تغلق کی مدح میں ہے، یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ یہ ۷۸۹ھ تک جو شاہ مذکور کی تخت نشینی کا سال ہے بقید حیات تھا،

اسکی تصنیفات مین دیوان کے علاوہ ایک رسالہ نصیب اخوان ہے، جو ۷۷۰ھ مین نصاب الصبیان فراہی کے جواب مین لکھا گیا تھا،

اس کے کلام مین جن شعراء کا تذکرہ ملتا ہے، وہ سعدی، جمال الدین، نزاری، کمال اصفہانی، بدیع الہمدانی، رضی نیشاپوری، معزی، عنصری، فردوسی، انوری، خاقانی، فرید، عسجدی عمعق، سنائی، ہمام، ظہیر وغیرہ ہین" (انتہی ملخصاً)

مظہر کرٹہ کے مذکورۂ بالا خلاصہ حالات کو سامنے رکھکر جب شرح میں مندرج سوانحی اشارات کو دیکھا جائے، تو دونون ایک شخصیت پر منطبق ہو جاتے ہین،

(۱) اولاً یہ کہ مظہر کرٹہ شاعر، اور مظہر المعروف بکرٹی کا زمانہ ایک ہے، صرف یہ فرق ہے

قصائد سے معلوم ہوتا ہے، کہ مظہر شاعر ۸۹۷ھ تک بقید حیات تھا، جو محمد شاہ کی تخت نشینی کا سال ہے، اور شرح سے پتہ چلتا ہے، کہ مظہر کرناٹکی ۹۰۵ھ تک زندہ تھا، جو شرح کا سنہ تالیف ہے، اور ظاہر ہے کہ جو شخص ۸۹۷ھ میں زندہ ہو، وہ چھ سال بعد تک زندہ رہکر ۹۰۵ھ کو پا سکتا ہے،

(۲) دوئم یہ کہ قصائد مین مظہر شاعر نے جن شعراء کا ذکر کیا ہے، مظہر کرناٹکی نے شرح مین اون مین سے متعدد شعراء کے اشعار کو سند مین پیش کیا ہے، مثلاً فردوسی، انوری، خاقانی، ظہیر، سعدی، سنائی، جلال الدین رومی، مولانا جمال الدین، فرق یہ ہے کہ قصائد مین امیر خسرو اور حسن سجزی، وغیرہ کا ذکر نہین، برخلاف اس کے شرح مین ان دونون بزرگون کا بارہا حوالہ ملتا ہے، شارح خسرو کو امیر خسرو ترک اللہ کہتا ہے، ایک مقام پر ملک احمد پسر امیر خسرو ترک اللہ کا ایک شعر بھی نقل کیا ہے، جو حسب ذیل ہے، (صفحہ ۸۴ مطبوعہ و صفحہ ۱۲۰ نسخہ قلمی نمبر ۶۰)

از تیغ آبدار بدہ آب در وغا از ہیبت تو خشک شود خصم را دہان

ان کے ماسوا ضیاء بخشی، (۸۵۱ھ) مغیث ہانسوی، حمید قلندر (۸۶۸ھ) اور مولانا خواجگی (۸۱۹ھ) کا تذکرہ بھی قصائد مین نہین ہے، مگر استشہاد کے ذیل مین ملتا ہے،

لیکن یہ فرق بھی چندان قابل لحاظ نہین، کیونکہ فخر کے موقع پر جن شعراء کا تذکرہ نہین کیا جا سکتا، استشہاد کے وقت وہ ذکر مین آسکتے ہین، بنا برین ممکن ہو کہ مظہر نے ایک جگہ اہم مرتبہ والے شعراء کو پیش کیا ہو، اور اسی نے شرح مین اپنے مطلب کے ثبوت مین اپنے پیشرو اور معاصرین سے نسبتہً کم رتبہ والون سے مدد لی ہو،

(۳) سیوم یہ کہ مظہر کرناٹکی نے ایک مقام پر دماغ کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے،:-

"واین را در نصاب العقلاء شرح گفتہ ایم درین محل بتمامی نتوان گفت"

(شرح مخزن، نسخہ مطبوعہ صفحہ ۵۲)

اسی قسم کی ایک کتاب نصیب اخوان جو فراہی کی نصاب الصبیان کا جواب ہے، مظہر کرناٹہ کی تصنیف خیال کی گئی ہے، ممکن ہو کہ یہ دونوں نام ایک ہی کتاب کے متن اور شرح کے ہوں؛ لیکن یہ تو اغلب ہے کہ یہ ایک ہی موضوع کی دو کتابیں ہوں،

اور چونکہ مظہر کرناٹہ کی نصیب اخوان ۱۰۰۶ھ کی تصنیف ہے اور مظہر کرمی نے شرح مین نصاب العقلاء کا تذکرہ ۱۰۰۹ھ میں کیا ہے اس لئے دونوں کے ایک شخص کی تصنیف ہونے پر کوئی تاریخی اعتراض وارد نہین ہوتا،

(۴) چہارم یہ کہ مظہر کرناٹہ نے اپنے ایک قصیدہ مین نظام الدین اولیاء کے بعد کسی رکن حقیقت کا ذکر کیا ہے، مظہر کرمی نے اپنی شرح میں شیخ رکن الدین ابو الفتح کا ذکر کیا ہے، میرے نزدیک یہ رکن حقیقت اور رکن الدین ابو الفتح مولانا رکن الدین جعفر ہین، جو خواجہ نظام الدین اولیاء کے مرید تھے، مرآۃ الاسرار[1] مین لکھا ہے، کہ صاحب ذوق وشوق اور مبتلاے سماع تھے، خوشنویس بھی تھے اسلئے اکثر سلطان المشائخ کے لئے کتابین نقل کیا کرتے تھے،

(۵) پنجم یہ کہ مظہر کرناٹہ شاعر بھی تھا اور صاحب علم وفضل بھی، مظہر کرمی مین بھی یہ دونوں صفتین موجود ہین، اس کے صاحب علم ہونے کا ثبوت یہ ہو کہ وہ شرح میں مصابیح، صحاح جوہری، تفسیر ابو سعود، تفسیر لباب، تفسیر عمدہ، شرح تلخیص المفتاح، کتاب طبائع الحیوان، تاج الاسامی، دستور الافاضل، جوامع الحکایات عوفی، جامع الصنائع، تہذیب المصادر، فتح الباری شرح الجامع الصحیح للبخاری، امالی قالی، اور تفسیر کشاف وغیرہ عربی و فارسی کتابون کے حوالے اور اقتباسات پیش کرتا ہے، اور شاعری کی دلیل یہ ہے کہ کتاب کے دیباچہ میں حسب ذیل حمدیہ اشعار بدون انتساب مذکور ہین،

---

[1] مرآۃ الاسرار قلمی، ورق ۱، ۲، تصنیف شیخ عبد الرحمن چشتی، جو ۱۰۶۵ھ مین تمام ہوئی،

فحمداً لہ تحمد الہ علی ما کسانا رداء النعمۃ
وشکراً لہ تحمد الہ علی ما ھدانا لشکر النعمۃ

معرفت آموز شناسندگان معصیت آمرز ہراسندگان،
عقدہ کشائے دل ہر غم کشی شادکن سینۂ ہر ناخوشی،

ان کے بعد نعت مین بھی کچھ شعر بدون انتساب درج کئے ہین جو تاوقتیکہ یہ معلوم نہ ہو جائے کہ کس شاعر کے ہین، خود شارح ہی کے خیال کئے جاسکین گے،

ان اشعار کے ماسوا کتاب میں ایک شعر مظہر کے نام کے تحت بھی مذکور ہے، خواجہ نظامی رحمۃ اللہ علیہ کے شعر:

گبند پوسیدہ کہ پایندہ نیست جز بخلاف تو گرایندہ نیست

کے سلسلہ مین لکھا ہے، کہ ملک الکلام خاقانی بھی اس مضمون کو اس طرح ادا فرماتے ہین:-

آرزوے کہ از جہان خواہیم بدہد زانکہ مست بے خراست
لیکن آن دادہ را بہشیاری داستاند کہ نیک بدگراست

اس کے بعد لکھا ہے کہ افضل العصر مولانا مظہر فرماید، بیت،

در سخاوت بکو دکان ماند بدہد زود، زود بستاند

(نسخہ رامپور نمبر ۵۹)

ہمارے دوسرے نسخہ، نمبری ۶۰ (ص ۲۴۹) مین مظہر کو مظفر لکھا ہے، مگر اس کے ساتھ لفظ فرماید کی جگہ گوید ہے، نسخہ مطبوعہ مین (۱۵۰) "افضل العصر مولانا ظہیر گوید" مندرج ہے، میری راے مین یہ لفظ مظہر ہے، اور اصل نسخہ مین عبارت ہوگی "بندۂ احقر مظہر گوید" کسی ناقل کتاب نے ازراہ تعظیم اسکو بدل کر افضل العصر مولانا فرماید کر دیا، اور کسی نے افضل العصر مولانا گوید رکھا، جو اصحاب عربی زبان سے

واقف ہین، انھون نے اس قسم کا تغیر عربی کتابون کے دیباچون مین بارہا دیکھا ہوگا، کہ مصنف نے جہان اپنے لئے انکسار کے الفاظ لکھے تھے، وہان شاگردون نے کتاب نقل کرتے وقت تعظیمی لفظ درج کئے ہین،

اگر یہ قیاس صحیح ہو، تو پھر مظہر کرڑی شارح کتاب کے مظہر کرڑہ، شاعر ہونے مین کوئی شبہہ باقی نہین رہتا، لیکن یہان یہ امر واضح کر دینا مناسب ہوگا، کہ مین نے نسخۂ مطبوعہ کے ظہیر کے پیش نظر سرسری طور پر دیوانِ ظہیر فاریابی کو دیکھا تھا، اور اس مین یہ شعر نہیں پایا، اگر کسی وسیع النظر بزرگ کو دیوان ظہیر کے بالاستیعاب مطالعہ سے یہ شعر ملجائے تو پھر میرا قیاس اس شعر پر مبنی نہ ہوگا، بلکہ اس سے پہلے جو وجوہ مین لکھ چکا ہون، ان پر میری رائے کی بنیاد قائم رہے گی،

نتیجہ بحث | نتیجہ بحث یہ ہے کہ ظہورالاسرار نامی ظہورالحسن بجنوری کی تصنیف نہین ہے، بلکہ یہ بدرالدین مظہر بن قوام بن رستم بن محمود البلخی الکرڑی نے ۹۵۰ھ مین تالیف کی تھی، مختلف وجوہ کی بنا پر میرا قیاس یہ ہے کہ یہ مظہر کرڑی وہی شخص ہے، جو فیروز شاہ تغلق کے زمانہ مین بنام مظہر کرڑہ شعر گوئی کے وصف سے موصوف تھا، اور جس کا دیوان قصائد حال ہی مین دو جگہ دستیاب ہوا ہے، یہ اصلاً بلخ کا ہے لیکن اس کا باپ کرڑہ مانکپور مین آباد ہو گیا تھا، اسلئے یہ اپنے آپ کو "البلخی الکرڑی" لکھتا ہے، اس نے حسب ذیل کتابین یادگار چھوڑی تھین،

(۱) دیوان اشعار (۲) شرح سکندر نامۂ بری و بحری (۳) شرح مخزن اسرار (۴) نصیب اخوان (۵) نصاب العقلاء،

ان مین سے نمبر ۱ و ۳ و ۴، اب بھی دستیاب ہوتی ہین، بقیہ کا پتہ نہین،

شرح مخزن کے بعض فوائد | قیاس و قیاس کی الجھنون مین پڑنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس شرح کے بعض دلچسپ اور مفید بیانون کو ذیل مین درج کیا جائے، مولنا نظامی کے شعر:-

شیشہ زگل آب شکر می فشاند ، شمع بدستار چہ زری فشاند ،

کے تحت مین شارح لکھتا ہے ، کہ "می ہرچند تلخ است باعتبار تلذیذ شیرین بود ، ونیز در ہند ، می از شکر و گل می سازند وآن را عرق گل گویند ، چنانکہ مولانا جمال الدین استباجی (؟) گوید" :

بنوشم از کفِ خوبانِ دہلی ، شرابی آنچنان کز گل چکد خوی

(ص ۳۷ ، نسخہ نمبر ۵۹)

(۲) زلیخا کے سلسلہ مین لکھا ہے ، کہ در مصر بادشاہ را عزیز گویند ، چنانک در روم قیصر و در چین خاقان و خفور ، و در شیراز اتابک ، و در عراق کسریٰ ، و در عرب ملک و سلطان ، و در ہند سلطان خوانند"

(ص ۱۴۸ ، نسخہ مذکور)

(۳) ایک مقام پر لفظ "منشور" کی تشریح مین لکھا ہے ، "و منشور در اصطلاح عرف ، دو جود سادات و مثال و فرمان پادشاہ و خلیفہ را ہم گویند ، و این جا فرمان مراد است" ، "و منشور نویس" وبیرا گویند کہ مثال پادشاہ خلیفہ را بنویسد" (ایضاً ص ۱۶۰)

اس بیان سے اُن لوگون کی تائید ہوتی ہے ، جو لفظ مثل (بمعنی فاعل) کو حرف ثا کے ساتھ لکھتے ہین کیونکہ اگرچہ مثل صحیح لفظ نہین لیکن بہر نوع ہے تو اسی لفظ کا مخفف جوث کے ساتھ لکھا جاتا ہے ، پس کوئی وجہ نہین کہ اسکو مسل (سین کیساتھ) لکھکر اصل سے دور کیا جائے ،

(۴) سمن سپید کو لکھا ہے کہ "در ہند سمن سپید را جنبہ (چنبیلی) گویند" (ص ۱۶۲ نسخہ مذکور) اور عود کے متعلق لکھا ہے کہ "از عود ش عود قماری مراد است کہ آنرا ہندی تیلیہ گویند ، در غایت بوئے خوش و سیاہی باشد" (ایضاً ص ۱۶۶) شقاقل کے بارے مین لکھا ہے کہ شقاقل بیخ گزر دستی است کہ بہ ہندی سیالی و ہالی گویند ، (ایضاً ص ۳۰۲)

ان اقتباسون سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ شارح ہندوستان کا رہنے والا تھا ، ورنہ فارسی الفاظ کیلئے

ٹھیٹ ہندی مترادف الفاظ نہ وہ تلاش کرتا، اور نہ اوسے سہولت کے ساتھ یہ الفاظ ملتے،

(۵) شارح نے شیخ سعدی شیرازی کا حوالہ بار ہا دیا ہے، ان مقامات میں سے صرف ایک جگہ تو مصلح الدین سعدی لکھا ہے، باقی تمام مقامات پر "مشرف الدین سعدی" تحریر کیا ہے، اس سے میں یہ خیال کرتا ہوں کہ آٹھویں صدی ہجری میں ہندوستان کے اندر شیخ کا لقب مشرف الدین زبان زد تھا، اور اسی لئے مجھے شبہہ ہے، کہ جہاں کتاب میں مصلح الدین ملتا ہے، وہ خود شارح ہی کا لکھا ہوا ہے کاتب کی تحریر نہیں ہے،

(۶) امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کے بھی بہت سے اشعار جا بجا ملتے ہیں، ان کے نام کے ساتھ تقریباً ہر جگہ "ترک اللہ" لقب ضرور لکھا گیا ہے، یہ لقب حضرت نظام الدین اولیاء نے اپنے ترکی النسل مرید کو عطا فرمایا تھا، چنانچہ ایک قصیدہ میں خود خسرو نے اس کا اظہار کیا ہے، فرماتے ہیں:-

بر زبانت چون خطاب بندہ ترک اللہ رفت دست ترک اللہ بگیرد ہم باللہ اش سپاہ

معلوم ہوتا ہے کہ آٹھویں صدی میں یہ لقب ان کے نام کا جزو لاینفک بن گیا تھا، اور ایسا کبھی نہیں ہوتا تھا کہ امیر خسرو کا نام بلا ترک اللہ کے لیا جائے،

اس ضمن میں یہ تذکرہ بھی بیجا نہ ہوگا کہ شارح نے ایک مقام پر امیر خسرو مرحوم کی مثنوی "دولرانی خضر خان" کے اشعار نقل کئے ہیں، مگر اس کتاب کو "عشق نامہ خضر خان" کے نام سے یاد کیا ہے۔

(۷) شارح نے ایک مقام پر سنہ ہجریہ کے ساتھ چند اور سنین بھی ذکر کئے ہیں جن کا تذکرہ یہاں مناسب ہوگا، وہ لکھتا ہے:

بدانک درین وقت کہ از ہجرت پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم ہفصد نود پنج سال است، از خلقت آدم صلوٰۃ اللہ علیہ تا امروز شش ہزار ہفصد و نود پنج سال گذشتہ است، اما از خلقت جان تا وقت طوفان بر قوم نوح علیہ السلام یک کلہ ہشتاد ہزار سال گذشتہ بود و این تاریخ

علائی و ناصری و غوری است و از طوفان نوح پیغامبر علیہ السلام تا این وقت چہار ہزار چہار صد نود و شش سال شدہ" (نسخہ نمبر ۵۹ ص ۲۸)

اس عبارت میں تاریخ علائی و ناصری و غوری قابل غور ہے،

(۸) ایک مقام پر شارح نے لفظ خرگاہ کے متعلق بڑا دلچسپ تاریخی نکتہ لکھا ہے، کہتا ہے،

"و خرگاہ را سلطان محمد شاہ بن تغلق شاہ نور اللہ مرقدہ خرمگاہ نام کردہ بسبب کراہیت لفظ خر ازان روز باز در دیار دہلی خرمگاہ میگویند" (ایضاً ص ۳۱ و ص ۶۰ و ص ۳۵)

میں نے عہد محمد تغلق کی تاریخوں پر سرسری نظر ڈالی، مگر یہ واقعہ نہیں ملا، اگر حقیقۃً تاریخوں میں اسکا ذکر نہیں آیا ہے، تو محمد تغلق کی خوش ذوقی کی ایک اہم شہادت دستیاب ہوتی ہے، اور اگر مذکور ہے، تو میری نظر نہیں پڑی، تو یہ تاریخ کے بیان کی مزید شہادت قرار پاتی ہے، وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ اَوَّلًا وَّآخِرًا

ضرورت مترجمین

عربی فارسی و انگریزی سے براہ راست شستہ و رفتہ سلیس اردو زبان میں ترجمہ کرنے والوں کی ضرورت ہے، جو مناسب اجرت پر علمی، ادبی، تاریخی، نیز متفرق علوم و فنون کی کتابوں اور رسائل کے مضامین کا ترجمہ کر سکیں، کسی ایک زبان اور اردو کا جاننا کافی ہے، علمی قابلیت نیز تجربہ کے متعلق تفصیل سے جواب آنا ضروری ہے،

نوٹ:- ہر قسم کی اردو، فارسی، عربی، انگریزی کتابیں مطبوعات ہندوستان، ایران، مصر، یورپ، امریکہ وغیرہ ہماری معرفت نسبتہً ارزان قیمتوں پر مل سکتی ہیں، شایقین اپنے اسمائے گرامی اور مکمل پتوں سے مطلع فرمادیں، تاکہ جدید فہرستیں وقتاً فوقتاً ارسال کیجا سکیں،

پتہ ذیل پر خط و کتابت کریں

شباب کمپنی پوسٹ بکس ۱۲۶ بمبئی نمبر ۳

قصص الحق

از

پروفیسر سید نواب علی صاحب سابق وزیر تعلیم ریاست جوناگڈھ

"ہمارے محترم سید نواب علی صاحب سابق وزیر تعلیم جوناگڈھ نے ملازمت سے سبکدوشی کے بعد لکھنے پڑھنے مین بھی قریب قریب خاموشی کی زندگی اختیار کرلی تھی لیکن پھر حالات نے انھیں اس خاموشی کے توڑنے پر مجبور کیا، چنانچہ آج کل وہ قصص قرآنی کے حکم و مصالح اور دوسرے صحیفون کے قصص کے مقابلہ مین اسکی خصوصیات پر ایک کتاب لکھ رہے ہین، جس کا ایک ٹکڑا انھون نے معارف مین اشاعت کے لئے بھیجا ہے، جو ناظرین کے لئے پیش کیا جاتا ہے"

انسان نے جب سے اس عالم رنگ و بو مین قدم رکھا ہے، قدرت کے مناظر و مظاہر خصوصًا اجرام سماوی نے اسے اپنی طرف ایسا متوجہ کرلیا، کہ اس عالم حیرت میں اس نے گوناگون واقعات و حوادث اور فصلون کے انقلابات کو جو اس کے لئے ایک معما بنے ہوئے تھے، خوف و رجا کی رنگین عینک سے دیکھکر عالم خیال مین اپنے لئے ایک نئی دنیا آباد کرکے داستان سرائی شروع کی، اس نئی دنیا کی مخلوق اگرچہ اسی کی طرح چلتی پھرتی، کھاتی پیتی اور لڑتی جھگڑتی تھی، لیکن اس کے واہمہ نے ان کی صورتین عجیب الخلقت اور قوتین مافوق العادۃ تصور کین، پھر گیتون اور نظمون کے ذریعہ سے دیوتا اور دیویان جن اور پری، دیو اور بھوت وغیرہ کا حلقہ دام خیال بن کر مذہبی حیثیت سے تسلیم ہونے لگا، مثلاً اگر ہمالیہ کی برفستانی چوٹیون پر اندر کا اکھاڑا قائم ہے، تو یونان کے المپس پہاڑ

پرزئیس کا پرستان ہے، اگر وادی نیل مین اسائرس اور آئی سس کے آسمانی دربارمین نیک اور بد روحون کا جمگھٹا ہے، تو بابل اور نینوا کے دیوتاؤن مردوخ اور اشور کے طلسمی قلعہ مین عجائبات کا عالم نظر آتا ہے، غرضکہ قدیم انسان کی داستان سرائی کا یہ پہلا دور تھا، جو اسکی دماغی نشو ونما کی عہد طفولیت کا خواب آور افسانہ ہے،

دوسرا دور اس وقت سے شروع ہوتا ہے، جب مشاہیر قوم کے کارنامے ایسے مبالغہ آمیز اور مافوق العادۃ پیرایہ مین بیان کئے گئے کہ ان بزرگون کو جوش غلو مین دیوتاؤن سے ملا دیا یا خود دیوتاؤن کو ان میں حلول کیا ہوا تصور کیا، اس طرح توہم پرستی کے ساتھ اسلاف پرستی بھی جس مین باکمال شعراء کی سحر کاریون نے چار چاند لگا دیئے، مقبول خاص و عام ہو گئی، ہومر کی ایلیڈ، ویاس کی مہابھارت، والمیکی کی رامائن، عجم کے شاہنامے جو رزم و بزم کے مشہور شاہکار ہین، اصل مین ایک ہی قوت متخیلہ کے متلاطم سمندر کی اٹھتی ہوئی موجین ہین، اور جذبات انسانی کی سچی تصویرین، ان مین کہین بلند افکار روشن خیالی اور اخلاق فاضلہ کے رنگ برنگ پھول کھلے ہوئے ہین، اور کہین مزخرفات کے کنکر پتھر، اور لغویات کے کانٹے بچھے ہوئے ہین، مثلاً مہابھارت مین سری کرشن ارجن کو میدان جنگ مین فلسفہ عمل اور وحدت وجود کی الہامی تعلیم جو گیتا کے نام سے مشہور ہے، ایسی دقیقہ سنجی سے دیتے ہین، کہ افلاطون کی اشراقیت اسکے سامنے بازیچۂ اطفال معلوم ہوتی ہے، لیکن پھر اسی مہابھارت مین دیوتاؤن کے شرمناک افسانے جن کا اثر اخلاق پر نہایت برا پڑتا ہے مذکور ہین، اسی طرح ایلیڈ مین یونانیون کے حب وطن، عزم بالجزم اور دلیری اور جانبازی کی داستانین انسانی جذبات عالیہ کی دلکش تصویر کھینچ دیتی ہین، لیکن پھر اسی کتاب مین یونانیون کی معبود اعظم زیس کی بیٹی ہلن کی عصمت فروشی اور جنگ عظیم کا باعث قرار پانا نفرت اور حقارت کے جذبات پیدا کرتی ہین، خصوصاً جب مشرقیت اور مغربیت کا یہ فرق بھی پیش نظر

ہوتا ہے کہ مادر ہند کی مجسمۂ وفا محبت سیتا باوجودیکہ اسکی عصمت راون کے محل مین محفوظ رہتی ہے، جب لنکا کے فتح کے بعد اس کو طعنہ دیا جاتا ہے، تو وہ غیرت مند آگ میں کود کر اپنی عصمت کی شہادت دیتی ہے لیکن فتنہ روزگار یونان کی ہلن اپنے عاشق کے ساتھ مفرور ہو کر عیش و عشرت میں مشغول ہوتی ہے، پھر جب ٹرائے فتح ہو جاتا ہے، اور اوس کا عاشق مجروح ہو جاتا ہے، تو وہ اپنے وطن مین پھر اپنے شوہر کے ساتھ واپس آکر اسی طرح رہنے سہنے لگتی ہے، اسی طرح ٹرائے فتح کر کے جب شاہ یونان اگامنن دس برس کے بعد وطن واپس آتا ہے، تو اسکی ملکہ کلائتم نسٹرا جس نے ان ایام مین شوہر کے ایک عزیز سے آشنائی کر لی تھی، بادشاہ کو غسلخانے مین پھندا ڈالکر جکڑ لیتی ہے، پھر پشت سے اس کا آشنا برسے فاتح ٹرائے کا سر اڑا دیتا ہے، برعکس اس کے مہابھارت مین پرمی شکنتلا کا شوہر، راجہ دشنت اور ماہرو دیتی کا شوہر راجہ نل مدتون ان کو چھوڑ کر ذلیل و خوار رکھتے ہین، لیکن وہ محبت اور وفا کی پتلیان طرح طرح کی تکلیفیں اور مصیبتین برداشت کر کے انہی شوہرون کے نام پر عصمت کے ساتھ جیتی ہین، اور آخر مین پھر اپنے شوہرون سے ملکر مسرت و نیکنامی کے ساتھ زندگی بسر کرتی ہین، سچ کہا گیا ہے کہ مشرقی مشرق ہے اور مغرب مغرب، اور یہ دونون کبھی نہ ملین گے، بیشک بحر ہند بحر روم سے الگ ہی یہان تو آبدار موتی بھی نکلتے ہین، مگر وہان خونخوار دریائی جانور!

ببین تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

داستان سرائی کا تیسرا دور جانورون کی زبان سے امثال و حکایات پر مشتمل ہے، سب سے پہلے ہند قدیم مین یہ طرز اختیار کیا گیا، پنچتنتر اور ہتوپدیش اس صنف کے مشہور مجموعے ہین، اور اگرچہ ان کی غایت اخلاقی تعلیم تھی، لیکن چونکہ عقیدہ تناسخ چرند پرند شجر حجر کیڑے مکوڑے وغیرہ ہر شے مین عمل پیرا یقین کیا جاتا ہے، اسلئے یہ کہانیان اور کہاوتین خاص و عام سب مین مقبول ہوئین

یونان کا ایسپ جو چھٹی صدی قبل مسیح میں حکیم فیثاغورث کا ہمعصر تھا، انسے مستفید ہوا، اور اپنی شہرۂ آفاق کہانیاں لکھیں، پنچتنتر کا ایک جزو نوشیروان عادل کے حکم سے پہلوی زبان میں ترجمہ ہوا، پھر جب مسلمانوں نے ایران فتح کیا تو خلیفہ منصور عباسی کے عہد میں عربی میں ترجمہ کیا گیا اور بعد کو یہی کلیلہ ودمنہ فارسی اور یورپ کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوا،

دنیاے قدیم کے آریہ نسلوں میں جب داستان سرائی کا یہ رنگ تھا، تو سامی نسل کی ایک چھوٹی سی منتخب روزگار قوم بنی اسرائیل نے ایک ایسا طرز اختیار کیا جس کی نوعیت جداگانہ ہے، اس قوم کے مورثِ اعلیٰ حضرت ابراہیمؑ نے اس کو توحید کی تعلیم دی تھی جس کا اثر یہ ہوا کہ جب تعدد الٰہ کا عقیدہ باطل قرار پایا، تو دیوتاؤں اور دیویوں کے قصے کہانیاں لغویات میں داخل ہوگئیں، اب اس قوم کے واقعات وحوادث کی داستانیں مورخانہ حیثیت سے بیان ہونے لگیں، اگرچہ ان پر خرقِ عادات کا رنگ چڑھا ہوتا تھا، یہ رنگ اصنام پرستوں کے میل جول اور بیت المقدس کی تباہی اور یہود کی خانہ ویرانی کی باعث اصلی صحیفوں کے ضائع ہوجانے سے ایسا گہرا ہوگیا، کہ اصلیت پر پردہ پڑگیا، اب مروجہ تورات وانا جیل کی یہ حالت ہے کہ وہ ایک ایسی ہزار دانہ والی تسبیحیں ہیں جن میں سچے اور جھوٹے موتی ایک ساتھ پروئے ہوئے ہیں مثلاً توریت کتاب الملوک اول باب ۸ میں حضرت سلیمانؑ بیت المقدس کو تعمیر کرکے خداوند یہوہ کی تقدیس وتہلیل کرکے توحید وتقویٰ کی تعلیم مؤثر پیرایہ میں دیتے ہیں، لیکن پھر اسی کتاب کے باب ۱۱ میں آپ کی طرف کفر وبت پرستی منسوب ہے، اسی طرح حضرت داؤدؑ کی خدا پرستی اور بزرگی کی شہادت اس کتاب کے باب ۱۲ میں خود خدا دیتا ہے، اور آپ کے نغمات زبور سے مناجات اور خشیتِ الٰہی کی مؤثر تصویر کھینچی جاتی ہے، لیکن پھر کتاب دوم صموئیل باب ۱۱ میں ایک فوجی افسر اوریا کی بیوی سے آپ کا ناجائز تعلق اور شوہر کو قتل کرا کر عورت سے عقد

کر لینے کی لغو داستان بت پرستوں کے دیوتاؤں کے حرکات کی طرح مذکور ہے، خیر توریت میں عصمتِ انبیاء تو خاک میں ملتی ہی ہے لیکن مسئلۂ توحید اصنام پرستوں کے اوہام اور قصّے کہانیوں میں غائب نہیں ہونے پاتا، لیکن انجیل میں یہ حالت بھی نہیں رہتی، حضرت عیسیٰؑ کو ابن اللہ اور ثالث ثلثہ کہا جاتا ہے، جیسے قدیم مصریوں میں اسائرس اسکی بیوی آئی سس اور اس کا بیٹا ہورس مانے جاتے تھے، یا جیسے قدیم یونانیوں میں دیوتاؤں کی تثلیث کا عقیدہ تھا، واقعی انسانی تخیل بھی عجیب چیز ہے،

گاہ مری نگاہ تیز چیر گئی دلِ وجود گاہ الجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں

آخر وہ وقت آیا جب ایک پاک نظر جس کی صفت مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَاطَغٰی تھی دلِ وجود کو چیر کر حقیقت کا آئینہ دار بن گیا اور قدرت کے مناظر و مظاہر اور اقوامِ عالم کے حوادث و واقعات جو توہمات اور خرقِ عادت میں الجھے ہوئے تھے، ایک ہی قادرِ مطلق اور موثرِ حقیقی کے قانون کی پابندی میں منتظم ہو کر اہلِ نظر کے لئے عبرت و بصیرت ہو گئے، اس اجمال کی تفصیل آیندہ اوراق میں بیان ہو گی، یہاں پہلے وہ چند خصوصیتیں ذہن نشین کر لینا چاہئے، جو قصص قرآنی کا خاصہ ہیں،

قصص قرآنی کی خصوصیات سہ گانہ:-

اوّل حسن انتخاب | داستان سرائی انسان کا فطری شوق ہے، اور ہر زمانہ میں ہر قوم نے اپنے مبلغِ علم کے مطابق اس کا اظہار کیا ہے، متقدمین کے یہاں اگر قصص حکایات اور امثال کی کثرت تھی، تو متاخرین کے یہاں ناول، ڈرامہ، افسانہ اور چھوٹی چھوٹی نفسیاتی کہانیوں کے انبار ہیں، قرآن مجید کی تعلیم میں چونکہ فطرتِ انسانی کا لحاظ رکھا گیا ہے، اس لئے قصص بھی مذکور ہیں لیکن وہی قصص جو امم سابقہ کے عروج و زوال اور ان کے افعال کے نتائج سے متعلق ہیں، اس طور سے بیان کئے گئے ہیں جن سے تفکر اور عبرت حاصل ہو، نہ محض داستان سرائی کی لذت، ساتھ ہی وہ تمام

قصے کہانیان اور شاعرانہ خیال بندیان جو عالم خلق و امر کے متعلق دنیا کی دیومالاؤن اور قدما کی مذہبی کتابون مین مذکور ہیں، نظر انداز کرکے ان کے بجاے حقیقت حال کو آشکارا کرنے کے لئے نظام و ترتیب عالم، قواے فطرت اور قوانین قدرت کی طرف انسانی ذہن کو منتقل کرکے موثر پیرایہ میں علوم و معارف کے اکتساب و انکشاف کا شوق دلایا گیا ہے، اس قسم کی آیات قرآن مجید مین ۵۰۰ سے زائد ہین، مثلاً

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَكُمْ مِنْ تُرَابٍ	اور اسکی نشانیون سے ہے یہ کہ تم کو بنایا مٹی سے،
ثُمَّ إِذَا أَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُونَ، و	پھر اب تم انسان ہو، زمین میں پھیلے پڑے
مِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ	اور اسکی نشانیون سے ہے یہ کہ بنا دے تمھارے
أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا	واسطے تمھاری قسم سے جوڑے کہ چین سے رہو
وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً	ان کے پاس اور رکھا تمھارے بیچ مین پیار
إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ	اور مہربانی، البتہ اس مین بہت پتے کی
وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَ	باتین ہین، ان کے لئے جو دھیان کرتے
الْأَرْضِ وَاخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ	ہین، اور اسکی نشانیون سے ہے آسمان
وَأَلْوَانِكُمْ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ	اور زمین کا بنانا، اور طرح طرح کی بولیان
لِلْعَالِمِينَ، وَمِنْ آيَاتِهِ مَنَامُكُمْ	تمھاری، اور رنگ اس مین بہت نشانیان
بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَاؤُكُمْ مِنْ	ہین سمجھنے والون کو، اور اسکی نشانیون سے
فَضْلِهِ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ	ہے تمھارا سونا رات مین اور دن مین، اور
يَسْمَعُونَ وَمِنْ آيَاتِهِ يُرِيكُمُ الْبَرْقَ	تلاش کرنا اوسکے فضل سے، اس میں بہت
خَوْفًا وَطَمَعًا وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاءِ	پتے ہین، ان کو جو سنتے ہین، اور اس کی

مَآءً فَيُحْيِي بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا
إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ
وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ تَقُومَ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ
بِأَمْرِهِ ثُمَّ إِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً مِّنَ
الْأَرْضِ إِذَا أَنتُمْ تَخْرُجُونَ وَلَهُ مَن
فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ كُلٌّ لَّهُ
قَانِتُونَ، وَهُوَ الَّذِي يَبْدَأُ الْخَلْقَ
ثُمَّ يُعِيدُهُ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ
وَلَهُ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ فِي السَّمَاوَاتِ
وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ،
(سورۂ الروم ع ۳)

نشانیون سے ہی یہ کہ دکھلاتا ہی تم کو بجلی
ڈر اور امید کے لئو اور اتارتا ہے آسمان
سے پانی، پھر زندہ کرتا ہے اوس سے
زمین کو مر گئے پیچھے اس مین بہت پتے ہین
ان کے لئو جو سوچتے ہین، اور اسکی نشانیون
سے ہی یہ کہ کھڑا ہے آسمان اور زمین اسکے
حکم سے، پھر جب پکاریگا تم کو ایک بار
زمین مین سے، اسی وقت تم نکل پڑوگے
اور اسی کا ہی جو کوئی ہی آسمان اور زمین
مین سب اسکے حکم کے تابع ہین، اور وہی
ہے جو پہلی بار بناتا ہے، پھر اسکو دہرائیگا
اور وہ آسان ہی اس پر، اور اسکی شان
سب سے اوپر ہی، آسمان اور زمین مین، اور

دوم خوبی تقرر | انسائیکلوپیڈیا برٹینکا کی جلد دوم طبع جدید مین بائبل پر جو فاضلانہ اور مبسوط مضمون تحریر کیا گیا ہی اسکے ایک مقام مین لکھا ہی،

"عرصۂ دراز تک کتب مقدسہ کا مطالعہ جرح وتعدیل کے مستند اصول سے محروم رہا، یہود محض اس عبرانی نسخہ کی پیروی کرتے تھے جس کی نسبت یہ مشہور تھا، کہ غالبًا دوسری عیسوی مین جمع کیا گیا، اور بعد ازان احتیاط سے محفوظ رکھا گیا، لیکن اس نسخے مین چند تحریفین تو ایسی ہین، جو اب صاف نظر آتی ہین، اور غالبًا ایک کافی تعداد تک ایسی تحریفین اور

بھی موجود ہین جن کی شاید اب یا کبھی پورے طور سے قلعی نہ کھل سکے"۔

قرآن مجید نے اس حقیقت کو ساڑھے تیرہ سو برس سے زائد عرصہ گذرا آشکارا کر دیا تھا، حضرت لوطؑ اور ان کی بیٹیون کا فحش قصہ، حضرت ہارونؑ کا گوسالہ بنانا، حضرت داؤدؑ اور قصۂ اوریا، حضرت سلیمانؑ اور بت پرستی غرضکہ اس قسم کی داستانین آج تک مروجہ عہد عتیق مین منقول ہین لیکن قرآن اُن کو محرف اور لغو قرار دیکر تصرف صحیح کے ساتھ ان خاصان خدا کے سچے قصے سناتا ہے، پھر ایک نفسیاتی پہلو بھی ملحوظ رہتا ہے، وہ یہ کہ قصص مین دلکشی زیادہ تر حسن وعشق کی داستانون سے پیدا ہوتی ہے لیکن ان قدیم داستانون کے پھول ناپاک بیانات کے کانٹون سے الجھے ہوتے ہین، خصوصاً جب کہ شعراء نے خواہ وہ دیاس ہون یا ہومر طبع آزمائی کی ہو، قرآن مجید مین اوّل تو اس قسم کے قصص مذکور نہین، اور جہان ذکر ہے، مثلاً سورۂ یوسف، وہان اس کا پورا لحاظ ہے کہ بلیغ انداز سے کانٹون کو اٹھا کر پھول چن لئے جائین، توریت کے قصۂ یوسف اور قرآن کے سورۂ یوسف کا مقابلہ کرو، توریت سفر تکوین کے آخری چودہ ابواب ۳۷ سے ۵۰ تک مین حضرت یوسفؑ کا ذکر ہے، ان مین ایک پورا باب ۳۸، آپکے بھائی یہودا اور اسکی بہو کی حرامکاری کی شرمناک داستان سے سیاہ کیا گیا ہے، قرآن مجید مین حضرت یوسفؑ کے حالات پوری سورت مین مذکور ہین، لیکن توریت کے اس شرمناک باب کے واقعات کا مطلق ذکر نہیں، عزیز مصر کی بیوی کی ہوائے نفسانی کا جہان ذکر ہے وہ چند لفظون مین بیان ہو کر یون ارشاد ہوتا ہے،

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ	البتہ عورت نے فکر کی اسکی، اور وہ عورت کی فکر
اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ	کرتا، اگر نہ ہوتا یہ کہ دیکھے اپنے رب کی قدرت یونہی
عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ	ہوا ہوتا کہ ہم اس سے برائی اور بیحیائی کو ہٹائین
عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ، (یوسف ۳)	البتہ وہ ہمارے برگزیدہ بندون مین ہے،

یہ ہے کلام مجید کی بالا امتیاز شان،

ان ھٰذا القراٰن یقص علیٰ بنی	یہ قرآن سناتا ہے بنی اسرائیل کو بہت چیزیں،
اسرائیل اکثر الذی ھم فیہ	جس میں وہ جھگڑ رہے ہیں، اور بیشک وہ
یختلفون وانہ لھدی و	ہدایت اور رحمت ہے ایمان والوں
رحمۃ للمؤمنین، (نمل ۹۰)	کے واسطے،!

سوم لطف تکرار | قرآن مجید میں ایک ہی قصہ بار بار متعدد سورتوں میں کہیں بطور اجمال اور کہیں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے، اسکی وجہ یہ ہے کہ مقصود اصلی قصہ خوانی نہیں ہے، بلکہ سامع کے ذہن کو مطیعوں پر لطف وانعام خداوندی اور ظالموں پر قہر وعذاب الٰہی کی طرف منتقل کرکے ایک قلبی کیفیت پیدا کرنا ہے، پھر جس جس صورت میں اس قصہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے، نئے نئے اسلوب سے قادر الکلامی کے ساتھ مقصود اصلی کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے جس سے سامع کو لذت تازہ حاصل ہوتی ہے، اس مطلب کی توضیح کے لئے لسان الغیب کے اس شعر پر غور کرو، ؎

یک قصہ بیش نیست غم عشق واین عجب کز ہر کسے کہ می شنوم نامکرر است

ایک اور بھی وجہ ہے وہ یہ کہ ایک ہی قصہ کو بار بار نئے نئے اسلوب سے بیان کرتے وقت اصلیت سے اس طرح پردہ اٹھا دیا جاتا ہے کہ داستان سرائی کی لذت کے ساتھ واقعہ کی تصویر بھی سامنے آجائے، مثلاً حضرت ابراہیمؑ اور قصۂ نار، بنی اسرائیل اور مصر سے اخراج وغیرہ وغیرہ جیسا کہ اس کتاب میں ہم آئندہ بیان کریں گے، یہاں یہ یاد رکھنا چاہئے، کہ قرآن پاک نے جس طور سے امم سابقہ کے قصص کو حسن انتخاب، خوبی تصرف، اور لطف تکرار کے ساتھ بیان کیا ہے، اس کو دوسری صدی ہجری میں کلبی، سدی، مقاتل، ابن سلیمان وغیرہم نے نظر انداز

کرکے تفسیرون میں اسرائیلیات اور لغو احدیث داخل کردین اور قصص قرآنی کے چشمۂ صفا کو ایسا گندلا کردیا، کہ بعد کو اگرچہ محققین علماے کرام کے مساعی جمیلہ نے ان کو لغو اور باطل ٹھہرایا، لیکن شوقِ داستان سرائی اور اعجوبہ پرستی کی جو بلا عام طور سے پھیل گئی تھی، اس کا اثر زائل نہ ہوا، شاہ ولی اللہ صاحب فوز الکبیر مین لکھتے ہین، کہ ایک عارف کا قول ہے کہ جب سے علم تجوید کا رواج ہوا، قرآن کا خشوع وخضوع کے ساتھ پڑھا جاتا رہا، اور جب سے مفسرین نے دور از کار روایات بیان کین، علم تفسیر نادر کا لعدم ہوگیا،

مشاہداتِ خلیل درختون سے پھلون کا گرنا سب ہی دیکھتے ہین لیکن یہ نیوٹن کا دماغ تھا، کہ اس نے ایک مرتبہ باغ میں ایک سیب کو گرتے دیکھکر کشش کا قانون دریافت کرلیا، بوڑھون کا لاٹھی ٹیکے ہوے بازارون میں چلنا، اور مُردون کی لاشون کا لیجانا سب ہی دیکھتے ہین لیکن یہ گوتم کے دیدہ عبرت بین تھے، جن سے وہ ان دردناک نظارون سے ایسا متاثر ہوا، کہ ترکِ علائق کرکے ریاضاتِ شاقہ کے بعد نروان کی فلسفیانہ راہ نجات کی تعلیم دی،

نظارۂ اجرام سماوی تارون کا نکلنا اور غائب ہوجانا، چاند کا چمکنا اور پھر چھپ جانا، آفتاب کا طلوع ہونا اور پھر غروب ہوجانا سب ہی دیکھتے ہین لیکن یہ بت تراش آذر کے فرزند ابراہیم کی نگاہ دوربین تھی، جس نے اجرام سماوی کی بدلتی ہوئی حالتون سے ایک لازوال اور قائم رہنے والے "معشوق" کی جھلک آسمان کے "پردۂ زنگاری" سے دیکھکر لا احب الآفلین کا نعرہ مارا، اور توحید کی شمع اس طور سے روشن کی کہ اس کی لو سے ستارون کی طرح بے شمار شمعین روشن ہوگئین، اور قیامت تک روشن رہین گی، ملکوت السمٰوٰت کا یہ مشاہدہ سورہ انعام مین یون مذکور ہے،

فلما جن علیہ اللیل رأی کوکبا — پھر جب اندھیرا کرلیا، اس پر رات نے

قَالَ هٰذَا رَبِّیْ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ ..... (انعام - ۹)

دیکھا اوس نے ایک ستارا، بولا یہ ہے رب میرا، پھر جب وہ غائب ہوگیا، تو بولا میں پسند نہیں کرتا غائب ہوجانے والون کو،

اگرچہ مروّجہ عہد عتیق کے سفر تکوین میں یہ مشاہدہ مذکور نہیں ہے، لیکن یونانی ترجمہ نسخہ سبینہ کی کتاب جوبلی میں بجنسہٖ موجود ہے، کیا عجیب بات ہے کہ مظاہرہ اجرام سماوی کا معنی خیز واقعہ مروّجہ تورات سے خارج ہے لیکن "قربانی سوختنی" جس کا یہود مین حضرت ابراہیمؑ کے سیکڑون برس بعد رواج ہوا ہے اس کا قصہ یون درج ہے :

قصہ طیور | "ابراہیمؑ نے خداوند سے کہا کیونکر جانون کہ مین اس ملک کا وارث ہونگا، جواب ملا تین برس کی ایک بچھیا اور تین برس کی بکری اور تین برس کا مینڈھا، اور ایک قمری اور ایک کبوتر کا بچہ میرے واسطے لا اور اس نے اس کے واسطے یہ سب لیا، اور ان کو بیچ سے دو ٹکڑے کیے اور ہر ایک ٹکڑا اسکے دوسرے ٹکڑے کے مقابل رکھا، مگر پرندون کے ٹکڑے نہ کیے، تب شکاری پرندے ان لاشون پر اترے پر ابرام انھین ہانکا کیا، ..... اور ایسا ہوا کہ جب سورج ڈوبا اور اندھیرا ہوگیا، تو ایک تنور جس سے دھوان اٹھتا تھا، اور ایک جلتی مشعل ان ٹکڑون کے بیچ مین سے گذر گئی، اسی دن خداوند نے ابرام سے عہد کرکے کہا کہ مین تیری اولاد کو یہ ملک دون گا، (سفر تکوین باب ۱۵)

اب دیکھو قرآن مجید کس طرح اصلیت سے پردہ اٹھاتا ہے، مگر پہلے اس تمہید کو سمجھ لو، حضرت ابراہیمؑ دو ہزار سال قبل مسیح اپنے وطن اور کلدانان سے راہ خدا مین ہجرت کرکے ملک شام مین مقیم ہوتے ہین، اور مصر بھی تشریف لیجاتے ہین، جیسا کہ سفر تکوین مین مذکور ہے، اس

زمانہ کے مصریون مین حیات بعد الموت کا عقیدہ عجیب طور سے پھیلا تھا، وہ اپنے مردون کی لاشون کو عجیب وغریب طریقہ سے جس کی تشریح درج ذیل ہے، اس طرح محفوظ کرتے تھے، کہ آجتک اہرام مصر کے گورستانون سے بجنسہ یہ لاشین جن کو ممی کہتے ہین ہزارون سال کے بعد نکلتی ہین،

ممی بنانے کا طریقہ | آلات وادویہ کے ذریعہ سے مشاق مصری مردے کے دماغ کو پہلے ناک کے راستہ سے خارج کردیتے تھے، پھر پتھر کے ایک چھرے سے جسم کو ایک جانب شگاف دیکر، دل، جگر، پھیپڑا اور آنتین نکال لیتے تھے، اور خوب صاف کرکے شراب مین بھگو کر خوشبو سے معطر کرتے تھے، پھر گوشت کو ادویہ کے ذریعہ سے تحلیل کر دیتے تھے، اور جسم کو خشک کرکے خوشبودار ادویہ بھر کر سی دیتے تھے، پھر ستر دن تک ایک خاص قسم کی دوا مین چھپا دیتے تھے، جس کے بعد غسل دیکر دھجیون سے جن کو ایک قسم کی گوند مین تر کرلیتے تھے، جسم کو اچھی طرح سے لپیٹ دیتے تھے پھر ایک تابوت مین رکھکر بند کر دیتے تھے، اور اس پر دیوتاؤن کی شکلیں بناتے تھے، اور دعائیں لکھدیتے تھے، اور ڈھکنے پر مردہ کا چہرہ نقش کر دیتے تھے، دل، جگر، پھیپڑا اور آنتین جنکو پہلے ہی نکال لیا تھا، ان کو الگ الگ چار گھڑون میں رکھتے تھے، گھڑے پر ایک ایک موکل پرند کا نقش ہوتا تھا، ایک کا سر شکل انسان، دوسرے کا شکل سگ، تیسرے کا شکل شغال، اور چوتھے کا شکل باز. یہ چارون موکل جن کو خا کہتے تھے، گھڑے لئے ہوئے ایک صندوق کے اندر قبر میں رکھدئے جاتے تھے، قدیم مصریون کا عقیدہ تھا، کہ اس طرح سے اگر جسم محفوظ کردیا جائے تو روح جس کو وہ "با" کہتے تھے، (سفید اُلو کی شکل کی چڑیا) چین سے رہتی تھی، اور پھر جسم میں حلول کرتی تھی، اُسائرس دیوتا کی بہشت میں مزے سے رہتے تھی، یہ دیوتا روحون کا بادشاہ ہے، (جیسے ہندوؤن یم راج) اس کے ایک دشمن نے اسکے چودہ ٹکڑے کرڈالے تھے، مگر اسکی دیوی ایسس نے سب سے پہلے لاش کو مذکورہ بالا طریقہ سے محفوظ کرلیا تب وہ اپنے بیٹے ہورس کی مدد سے زندہ ہوکر

آسمان پر چلا گیا، اور اب مردون کی روحین اس کے حضور مین پیش ہوتی ہین، اور اپنے محفوظ جسمون سے تعلق رکھتی ہین،

مذکورۂ بالا تمہید، خاص کر چار مرکل پرند کو پیش نظر رکھکر اب سنئے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جس طرح اپنے وطن مین نظارۂ اجرام سماوی سے اپنی ستارہ پرست قوم کو توحید کی تلقین کی تھی، مصریون کی ان عجیب وغریب ممی اوران کے متعلق عقائد سے متاثر ہوکر خداوند سے یون دعا فرمائی،،!

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ	اور یاد کر جب کہا ابراہیم نے اے پروردگار
تُحْیِ الْمَوْتٰی قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ	میرے دکھلا دے مجھکو کہ کیونکر زندہ کریگا تو مردے
بَلٰی وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ قَالَ فَخُذْ	فرمایا کہ تو نے یقین نہین کیا، کہا کیون نہین
اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ	لیکن اس واسطے چاہتا ہون کہ تسکین
ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی کُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ	ہوجائے میرے دل کو[1] . . . .
جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ	. . . . .
سَعْیًا وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ	. . . . .
حَكِیْمٌ۔	. . . . .

(سورہ البقرہ ۳۵)

حکم ہوتا ہے کہ چار چڑیان لو اور ان کو اپنے سے مانوس کر لو (یعنی بلا لو) پھر پہاڑ پر الگ الگ ان کو چھوڑ آؤ پھر ان کو بلاؤ دیکھو وہ تم سے ملی ہوئی چڑیان مختلف مقامات کوہ سے اڑتی ہوئی جلدی سے تمہارے پاس پہنچ جائین گی، اس مثال سے حضرت ابراہیمؑ کے قلب سلیم کو اطمینان ہوجاتا ہے اور یقین کر لیتے ہین، کہ روحون کی چڑیان بھی اسی طرح اپنے مالک سے جوان کو حقیقی طور پر دانہ پانی

[1] معارف: سید صاحب نے ان آیات کا ترجمہ خود نہین کیا تھا اور آگے چل کر اسکے مختلف فیہ معنی کی تعین فرمائی ہے اسلئے ترجمہ چھوڑ دیا گیا

دیتا ہے، پلی ہوتی ہین، اور خواہ وہ جسم خاکی میں ہون، یا عالم بالا میں وہ انھین جب بلائے شوق کے پرون سے اُڑتی ہوئی اس کے پاس چلی آتی ہین، واقعی ایسے پاکیزہ قلوب جو قیل وقال اور توہمات سے محفوظ ہوتے ہین، ان کی طمانیت خاطر کے لئے ایک ادنیٰ سا اشارہ کافی ہوتا ہے لیکن روایات یہود کا بُرا ہو، جن کی بنا پر ہماری تفاسیر مین بالعموم قصہ طیور مجی کی شون سے بھی زیادہ عجیب نظر آتا ہے، حضرت ابراہیمؑ چار چڑیان لیکر ان کو ذبح کرتے ہین، پھر سب کو ایک میں ملا کر ان کے ٹکڑے پہاڑ پر الگ الگ رکھ آتے ہین، اب ان کو پکارتے ہین، ہر ٹکڑا ہر جزو اڑتا ہوا نظر آتا ہے اور لوٹ پوٹ کر پھر چار دن چڑیان زندہ ہو جاتی ہین، اور حضرت ابراہیمؑ کو مردون کے جی اٹھنے کا یقین آجاتا ہے، سبحان اللہ یہ وہی سفر تکوین کی قربانی سوختنی کے قصہ سے ملتی جلتی داستان ہے، مگر اس پر غور نہین کیا گیا، کہ توریت مین حضرت ابراہیمؑ نے چوپایون کو ٹکڑے کیا تھا، چڑیون کو ٹکڑے نہیں کیا تھا، اصل یہ ہے کہ آیت قرآنی فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ کے معنی حضرت ابن عباسؓ سے قطعهن یعنی ٹکڑے ٹکڑے کر کرنا منقول ہین لیکن عبیدہ سے اجمعهن یعنی جمع کرنے کے مروی ہین، اسلئے اکثر مفسرین نے اسرائیلیات کی دھن مین ٹکڑے والا قصہ درج کر دیا، اور وہی مقبول عام ہو گیا، اور محققین نے دوسرے قول کو ترجیح دی ہے، اور شاہ ولی اللہؒ نے بھی اپنے ترجمۂ فارسی مین "بہم آر ہمہ را" لکھا ہے، امام رازی اپنی تفسیر مین ابو مسلم اصفہانی کا قول یون نقل کرتے ہین، وَالمرادبصرهن اليك الاماله والتمرين على الاجابة یعنی اپنی طرف جھکانا اور ان کو جواب دینے کا خوگر بنانا، اسی لئے شاہ عبد القادر صاحب دہلوی نے اپنے اردو ترجمہ مین چڑیون کو ہلانا لکھا ہے، اور یہی درست ہے، کیا عجیب بات ہے، کہ مولوی نذیر احمد مرحوم جو عجوبہ پرستی کی ہنسی اُڑاتے تھے، خود ہی اعجوبہ پرست بن گئے، اور اپنے ترجمۂ قرآن مین "بوٹی بوٹی کر ڈال" لکھ دیا،

مجمع النفائس

از

جناب اقبال انصاری ایم اے ریسرچ اسکالر پی ایچ ڈی لکھنؤ یونیورسٹی،

یہ تذکرہ خان آرزو کی تصنیف ہے جس مین فارسی شعراء کا حال اور کثیر تعداد مین انکے اشعار درج ہین، یہ کتاب دو جلدون مین بقید حروف تہجی مرتب کی گئی ہے، اور اپنی خصوصیات کے باعث اہل نظر ہے، اسپرنگر کے خیال کے مطابق کتاب کو تذکرۃ الشعراء نہیں کہہ سکتے، بلکہ اس کو سفینہ کہنا زیادہ موزون ہوگا، غالباً اس کا یہ سبب ہے کہ مصنف نے انتخاب کلام کے مقابلہ مین تحقیق حالات مین کمی کی ہے، اور اکثر شعراء کے کلام کا انتخاب زیادہ ہے لیکن ان کی زندگی کے حالات کو نظر انداز کر دیا ہے، مثلاً میر ابوالمعالی، ابوالعلائی، ابراہیم آذر، ملا بیاضی، فہمی سمرقندی اور قاسمی اردستانی وغیرہ کے کلام کا نمونہ تو پیش کیا گیا ہے لیکن ان مین سے ہر ایک کے متعلق محض اتنا لکھنے پر اکتفا کی گئی ہے، "احوالش ہیچ معلوم نیست"۔

خان آرزو دیباچہ مین بیان کرتے ہین کہ ابتداء مین ان کا ارادہ تھا کہ اشعار کا انتخاب بیاض یا سفینہ کی صورت مین کر دیا جائے لیکن پھر خیال ہوا کہ اگر ان شعراء کا کچھ حال بھی لکھدیا جائے تو کتاب اور زیادہ مکمل ہو جائیگی، اس لئے انھون نے کتاب کو تذکرہ کی صورت میں مرتب کیا، چنانچہ لکھتے ہین

"اما بعدی گوید فقیر بانیز بانی خود گرم گفتگو سراج الدین علی آرزو کہ سابق در تتبع برین و دواوین و تذکرہ ہا و سفائن وغیرہ و بر کتب بزرگان مطالعہ می نمود، ہر چہ خوش آمد از صفحۂ خاطر

می نمود، روزے در پیش آشنائے شرح این حال بزبان گذشت کہ خواندہ و فراموش از نسیان ما برابر گشت، اتفاقاً آن عزیز بعد دو سہ روز سفینہ نخیفے پیش فقیر آوردہ تکلیف کرد کہ حالا ہر چہ از اشعار اساتذہ انتخاب شود، برین ثبت باید فرمود، ہر چند حرف مذکور خالی الذہن گفتہ بود لیکن پاس گفتار خود ضرور شد و شروع انتخاب نمود و در سفینہ مذکور.....

قلمی گردید، و درین بین بخاطر رسید کہ پارہ از حالات آن عزیزان ہم اگر مرقوم شود دور نباشد وچون غرض اصلی نوشتن اشعار دلپسند خود است، نہ نوشتن حالات معنی لہذا در تحقیق آن چندان نکوشیدہ، و در تلاش آن چندان ندویدہ..... درین صورت اگر تفاوتے یا غلطے بنظر خوانندگان در آید، عزیزان منصف خردہ بر من نگیرند و بر پوچ نوشتہ مرا نپذیرند"۔

کتاب کے خاتمہ مین بھی لکھا ہے کہ اس کتاب کی اصلی غرض سفینہ ہے نہ کہ تذکرہ۔

"چون مسودہ این تذکرہ سفینہ است و غرض اصلی نوشتن اشعار پسندیدہ خود اینہا را قلمی نمود"۔

اس کتاب کی تدوین مین مؤلف کو بہت محنت کرنی پڑی، چنانچہ متوسطین و متاخرین کے تقریباً سو دیوانون کو جن مین پانسو سے لیکر چالیس ہزار اشعار تک تھے، پڑھ کر اس کتاب کو مرتب کیا،

"یک صد دیوان متوسطین و متاخرین کہ بعضے انہا کم از چہل ہزار و برخے بیش از پانصد نبود انتخاب رسید"۔

آگے لکھتے ہین کہ شعراء کے ترجمہ لکھنے مین انھون نے تقی اوحدی، نصر آبادی، کلمات الشعراء اور تحفہ سامی پر اکتفا کی، اور باوجود کثرت مشاغل اور بغیر کسی معاون کے محض ایک شخص یعنی شیخ مبارک محی الدین سے اس کام کی تکمیل مین مدد لی،

یہ تذکرہ ۱۱۶۴ھ مین مکمل ہوا، مصنف کے ایک شاگرد بیدار نے قطعۂ تاریخ کہا، ؎

این تذکرۂ سخنوران گیہان — بے مثل چون نوشت سراج الدین خان
بیدار بآرزو چنین کرد رقم — گلزار خیال اہل معنی جہان ۱۱۶۴ھ

مکمل تذکرہ جو دو جلدون مین ہے، ۳۵۰ اشعار کے حالات و انتخاب کلام پر مشتمل ہے پہلی جلد مین ۳۰۸ شعرا کا ذکر ہے، جو بایزید بسطامی سے شروع ہوتا ہے، اور میر محمد ماہ صداقت پر ختم ہوتا ہے،

دوسری جلد جس کو اس کا تکملہ کہنا چاہیئے ۹۸ شعرا پر مشتمل ہے، یہ ملا صبائی سے شروع ہوتی اور محمد اشرف یکتا پر ختم ہوتی ہے، کتاب کے آخر مین ایک خاتمہ ہے جس میں ان شعرا کے کلام کا انتخاب دیدیا ہے جن کا بیان پہلے ہو چکا ہے، اکثر ان شعرا کا بھی انتخاب ہے جن کے متعلق مصنف کو کوئی معلومات بہم نہ پہونچ سکین، چنانچہ لکھتے ہین،

"(خاتمہ) در بیان اشعارے کہ نام بعضے از شعرائے آن معلوم نیست و پارۂ کہ معلوم است از احوال آن اطلاع نیست و برخے ازان عالم است کہ نام و احوال شاعر سابق ذکر شدہ و بسبب مناسبت ابیات دیگر بار بسیار خوش آمدن بقلم دادہ ..... اگر شعر بنام شاعر مکرر واقع شدہ باشد معاف باید فرمود"

تذکرہ پر تفصیلی روشنی ڈالنے سے قبل اس بات کو واضح کر دینا ضروری ہے، کہ مجھے مجمع النفائس کا نسخہ پہلے بانکی پور میں ملا تھا، اور اسی کو مطالعہ کرکے میں نے مواد جمع کیا اور مضمون لکھا، لیکن بعد میں ایشیاٹک سوسائٹی بنگال مین دوسرا نسخہ ملا، ایک پنجاب لائبریری میں بھی موجود ہے، ڈاکٹر اسپرنگر نے جو تذکرہ دیکھا تھا، اس میں شعرا کی تعداد ۱۴۱۹ تھی، اور اسی کو سر اوسلے نے بھی لکھا ہے، لیکن مجھے کتاب مین ۳۵۰ شعرا ملے یعنی اسپرنگر اور اوسلے کی بیان کردہ تعداد سے بقدر ۳۱۶ زیادہ

مجمع النفائس کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دورِ آخر کا نہایت مستند اور ضخیم تذکرہ ہے اس مین بادشاہون، شاعرون، علماء و مشائخ سب کا ذکر ہے، کہنے کو تو یہ تذکرہ ہے لیکن درحقیقت اس سے اٹھارہوین صدی کے ہندوستان کی بہت کچھ ادبی اور تاریخی حیثیت کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے خانِ آرزو اورنگزیب کے واقعات اور اس کے سیاسی نقطۂ نظر کو جس وضاحت و صفائی سے بیان کرتا ہے وہ دوسرے سے ناممکن ہے، کیونکہ وہ بادشاہ کے ساتھ خود دکن گیا تھا، عالمگیر اور بہادر شاہ کے بیٹون کی خانہ جنگی، فرخ سیر کی تخت نشینی اور قتل کی تفصیلات جس وثوق سے لکھ سکتا ہے، دوسرا نہ لکھ سکے گا، اس لئے کہ فرخ سیر کے زمانہ مین وہ گوالیار کی وقائع نویسی کی خدمت پر مامور تھا، پھر محمد شاہ کے زمانہ مین ایرانی تورانی نزاع ملک کی روز افزون پریشانی، بیرونی حملے اور طوائف الملوکی کے حالات کو جس یقین کے ساتھ وہ لکھے گا، اور کسی سے ممکن نہیں، اس لئے کہ وہ محمد شاہ کے عہد مین ملک الشعراء تھا، اس تذکرہ کے مطالعہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ زوالِ مغلیہ کے وقت فارسی زبان پر بھی بہت کچھ انحطاط طاری ہو چکا تھا، تاہم ہندوستانی ادبا اسے سنبھالے ہوئے تھے، اور شاعرون اور ادبی صحبتون کے ذریعہ اسے مضبوط بنانے مین مشغول تھے، ہندو مسلمان آپس مین میل جول سے زندگی بسر کرتے تھے، اور ہندو ادبی صحبتون مین مسلمانون کے دوش بدوش رہتے تھے، عام شرفا کے لئے تواضع و خودداری واجبات مین سے تھی، وہ پیسہ گری کو اپنا شیوہ سمجھتے تھے اس لئے اٹھارہوین صدی جیسے پریشانی کے زمانہ مین بھی ادبیات میں کوئی کمی نہیں ہوئی، البتہ نوعیت ضرور بدل گئی، اور اسے بھی زمانہ اور مربیون کے فرق کا نتیجہ سمجھنا چاہیے، اس مین شک نہیں کہ اس صدی مین کوئی ابوالفضل فیضی اور ٹوڈرمل نہیں پیدا ہوا لیکن خانِ آرزو، غلام علی آزاد، اور انند رام مخلص جیسے باکمال پیدا ہوئے جن کی نظیر کم مل سکے گی۔

اس تمہید کے بعد تذکرہ کے بعض اہم پہلوؤن پر تبصرہ کیا جاتا ہے،

(۱) صاحب تذکرہ کے معاصرین

اس لفظ کو اگر ذرا وسعت دیجائے تو میرزا محمد افضل سرخوش، بیدل اور میر عبدالجلیل بلگرامی بھی خان آرزو کے ہمعصرون مین آجاتے ہین، حالانکہ ان حضرات کا بڑھاپا تھا، اور خان آرزو کی جوانی، چنانچہ وہ ان لوگون کا نام نہایت ادب و احترام سے لیتا ہی، ان سے اپنی ملاقات اور اپنے استفادہ کے حالات بیان کرتا ہی، سرخوش کے ضمن مین ہے کہ ایک مرتبہ خان آرزو اُن سے ملنے گیا، اس وقت سرخوش کی بصارت زائل ہوچکی تھی، اسلئے انھون نے اپنی بیاض اپنے بیٹے فضل اللہ کو شعر سنانے کیلئے دی، اس پر خان آرزو نے یہ پر لطف بات کہی، کہ بیٹے کو جو نور چشم کہتے ہین، اسکے یہی معنی ہین، سرخوش نے بھی خان آرزو سے شعر سنانے کی فرمایش کی، انھون نے پاس ادب سے عذر کیا، لیکن اصرار کرنے پر ایک غزل سنائی، جس کا ایک شعر یہ ہے،

افتادگیست مایۂ نشو و نماے من ۔۔۔ تخلم چو گرد باد ز خاک آب میخورد

سرخوش اُسے سُنکر بہت محظوظ ہوئے،

خان آرزو میر عبدالجلیل بلگرامی اور بیدل سے استفادہ کرتا تھا، اور بیدل کے تصرفات کا قدر دان تھا، اس کے اصل معاصرین، والہ آزاد، خوشگو، میر محمد افضل ثابت، سعد اللہ گلشن، علی قلی خان داد، قزلباش خان امید، میر شمس الدین فقیر، اور شیخ علی حزین وغیرہ ہین، ان سب کا نام وہ عزت و احترام سے لیتا ہے، ان سے خلوص و عقیدت کا اظہار کرتا ہے، اور ان مین جو اوصاف مابہ الامتیاز ہین، انھیں واضح کرتا ہے، چنانچہ ثابت کو "سیدے والانسب و فاضل عالی حسب" کے القاب سے یاد کرتا ہے، اور لکھتا ہے، کہ اُن میں خان آرزو میں اگرچہ کبھی کبھی نزاع ہوجایا کرتی تھی، لیکن سچ یہ ہے کہ ان کی مثال اب ناممکن ہی اُن کے فضل و کمال کا اس طرح اظہار کرتا ہے، کہ "میر ثابت کسب فضائل نمودہ، علم شاعری ورد اراسخلافہ شاہجہان آباد دہلی افراختہ، اگرچہ غزل گفتہ اما انچہ گفتہ نہایت متانت دارد"۔

میر غلام علی آزاد کے متعلق لکھا ہے کہ وہ خان آرزو سے اخلاص غائبانہ رکھتے ہیں، آگے چل کر انکی شاعری کے متعلق لکھتا ہے "مشق سخنش رسیدہ تلاشہاے بالادست دارد"۔

خان آرزو کا یہ کمال انصاف ہے، کہ وہ کسی کے متعلق ضرورت سے زیادہ نہیں لکھتا، برما سے بڑے مضمون کو چند سطروں میں نہایت سادہ عبارت میں ادا کر دیتا ہے، اپنے ایک شاگرد خوشگو کے متعلق لکھتا ہے، کہ "شعر را بسیار خوب می گوید، و نبض ناز کی مضمون بدست او افتادہ"۔

حاکم لاہوری کے متعلق جو ملا آفرین لاہوری کے شاگرد تھے اور خان آرزو سے بہت اعتقاد رکھتے تھے لکھتا ہے کہ

"خیلے مشقش رسیدہ، و تلاش معنی تازہ دارد، چند سال پیش ازین دیوان خود را کہ قریب چہار ہزار بیت باشد بنظر فقیر در آورد و بسیار مربوط و مضبوط گفتہ در عالم اخلاص و پاس آشنائی و حسن اخلاق و تمامی وفاق یکہ روزگار است، چند مرتبہ وارد شاہجہان آباد گشتہ، این مرتبہ کہ بسبب ظلم صوبہ دار پنجاب و ضبط جاگیرہاے مردم درین جا رسیدہ نیز ملاقات با حقیر می نماید، عاشق سخنست، خدایش سلامت دارد"۔

علی حزین حد سے زیادہ خود پسند اور نازک مزاج تھے، ان کے متعلق یہ رائے ہے :-

"کاسہ لیسان ہند اعتقادے بیش از بیش در خدمت این عزیز دارند و او خود ہم مثل کلیم و سلیم و غیرہا را مطلق وجودی نگذارد"۔

خان آرزو خود نہایت منکسر مزاج اور سنجیدہ تھا، چنانچہ تذکرہ میں اپنے لئے فقیر بیمقدار، احقر اور عاجز کے علاوہ اور کوئی لفظ استعمال نہیں کرتا، آفرین لاہوری کے ذکر میں ہے کہ وہ خان آرزو سے انتہائی ربط و اخلاص رکھتے تھے، اور اس کو امام سخنوران کہا کرتے تھے، گو واقعہ کے اعتبار سے یہ صحیح ہے لیکن خان آرزو خود اپنے متعلق لکھتا ہے، کہ "بنا بایہ مقتدائے ائمۂ این فن نرسیدہ ام"

قزلباش خان امید بھی خان آرزو کے ہمعصر ہیں، اور نہایت منصف اور تعصب سے بری ہیں،

جس زمانہ مین خانِ آرزو نے حزین کے اشعار پر اعتراضات کئے، اور تنبیہ الغافلین لکھی، لوگون نے اُمید سے کہا، کہ خان نے شیخ پر اعتراضات کئے ہین، اُمید نے کہا کہ شیخ مسلّم الثبوت زباندان ہین لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ خانِ آرزو کے اعتراضات بھی بہت کچھ وزن رکھتے ہین، والہ داغستانی نے اپنے تذکرہ ریاض الشعرا مین تنبیہ الغافلین کا معتدبہ حصہ نقل کیا ہے، اور تقریباً ۶۰ شعرون پر اعتراضات کو صحیح قرار دیا ہے، خانِ آرزو نے اپنے ہمعصرون مین شاہ گلشن، محمد مقیم آزاد، نوازش خان طالع، آفرین لاہوری، زاہد علی خان سخا اور والہ داغستانی وغیرہ معاصرین کا ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ معاصرین مین خانِ آرزو صدر کی حیثیت رکھتے تھے، اور سب انکی عزت واحترام کرتے، اور ان کی زباندانی کے قائل تھے، خوشگو بھی خانِ آرزو کے دورانِ قیام اکبرآباد کی نسبت لکھتا ہے کہ

"شاہ گلشن، مرزا حاتم، عصمت اللہ کامل، محمد مقیم اور ناصر علی کے صاحبزادہ علی عظیم سے صحبت رہا کرتی تھی، اور خانِ آرزو لطف اٹھایا کرتے تھے،

(سفینہ خوشگو قلمی بانکی پور لائبریری)

اساتذہ کے کلام پر اصلاحین | مجمع النفائس کی قیمت عام تذکرون سے اس حیثیت سے بہت زیادہ ہے، کہ اس مین معاصرین اور غیر معاصرین کے کلام پر خانِ آرزو نے اصلاحین بھی دی ہین اور بعض جگہ اعتراضات بھی کئے ہین، گو عنوانِ اعتراض عاجزانہ ہے، چند اصلاحین ملاحظہ ہون

ثابت ؎

تکیہ بر سروزدی مست چو رفتی دُرباغ قامتت کرد دوبالائے رعنائی را

خانِ آرزو کے خیال مین پہلا مصرع اگر یون ہوتا تو بہتر تھا، ع

تکیہ بر سروزدی مست چو رفتی در باغ[1]

---

[1] معارف ان دونون مصرعون مین تو کوئی فرق نہیں ہے،

ایک دوسری جگہ ثابت کے اس شعر پر ؎

با ما اے بیوفا نسازی با ما چہ کہ با خدا نسازی

یہ اصلاح دی ہے، ع با ما بت بیوفا نسازی،

مختلف اصلاحیں :-

سرخوش :

صاحب جوہر رفیق صاحب جوہر شود استخوان ماہی آخر دستہ خنجر شود

خان آرزو، "این مصرع بگمان فقیر آرزو بہتر است" ع

عاقبت دندان ماہی دستہ خنجر شود

میر محمد علی رائج ؎

مگو زیے سر و پایان سرشتہ اند مرا کتاب بازم و ناخوان نوشتہ اند مرا

خان آرزو :- "فقیر آرزو مصرع اول را چنین بہتر می داند" ع

مگو کہ بے سر و بے پا سرشتہ اند مرا

قاسم بیگ :-

چو بحشر گہ در آئی ہمہ چو طفل مکتب فگنند نامہ ہا را ز کف از پئے تماشا

خان آرزو کے خیال میں "بحشر گہ در آئی" کے بجائے، "چو بحشر اندر آئی" زیادہ مناسب ہے،

ریاضی سمرقندی :-

پر از کفر است عالم زان دو چشم و زلف و خال و خط بدین پختست پنداری بنائے نا مسلمانی

خان آرزو کہتے ہیں، کہ جس طرح چشم "دو تا" ہوتی ہے، اسی طرح زلف بھی "دو تا" ہوتی ہے ایسی صورت میں اگر بجائے زلف قد ہوتا تو بہتر تھا،

محمد اسحاق شوکت :-

گر فتادہ محبت بلبلِ ما را تو ان گفتن کہ از خاکسترش صیاد رنگ خانہ می بازد

خانِ آرزو :- "فقیر آرزو گوید بجاے بلبل، قمری مناسب است"

شیفتہ اثر ؎

چراغے از پئے حاجت لالہ روشن کن بہ بوستان کہ قد مگاہ سبز پوشان است

خانِ آرزو کے خیال مین بجائے لالہ کے جام زیادہ مناسب ہے ع

چراغے از پئے حاجت ز جام روشن کن

راقم کی نظر سے بھی ایک جگہ لالہ کے بجائے جام ہی گذرا ہے جس سے شعر مین ایک خاص کیفیت پیدا ہو گئی ہے، جو لالہ مین نہین ہے،

قاآنی کہتا ہے ؎

درین بہار ہر کسے ہوائے راغ دارد بیا و باغ طلعتے خیالِ باغ دارد

بہ تیرہ شب ز جام مے بکف چراغ دارد ہمین دلِ منست و بس کہ در و داغ دارد

جگر چو لالہ پُر ز خون ز عشق گلعذارہا

ناقدانہ اعتراضات | اب خانِ آرزو کے چند ناقدانہ اعتراضات کو ملاحظہ فرمائیے، جو انھون نے ایرانی اور غیر ایرانی شعراء پر کئے ہین، ان سے خانِ آرزو کے مبلغِ علم کا اندازہ ہوتا ہے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی کے مقلد نہ تھے، بلکہ خود مجتہد کی حیثیت رکھتے تھے، اس لئے تنقیدی حیثیت سے بھی ان کا تذکرہ ایک خاص خصوصیت اور امتیاز رکھتا ہے، کہ وہ تذکرہ کے ساتھ نقادی کی کتاب بھی ہے ورنہ کلمات الشعراء، تحفۂ سامی، تذکرۂ طاہر، تذکرۂ خوشگو، خزانۂ عامرہ، سرو آزاد، دیدِ بیضا، ریاض الشعراء وغیرہ تنقیدی پہلو سے بالکل خالی ہین پھر تنقید مین عدل کا دامن مؤلف کے ہاتھ سے

نہین چھوڑا ہے، وہ کلام کی خوبی کا اعتراف کرتے ہین، اور اسکے نقائص پر تنقید کرتے ہین، خواہ کسی کا کلام ہو، اسی کے ساتھ ان نامعقول اعتراضون کا جو اساتذۂ ایران پر کئے گئے ہین رد بھی کرتے ہین جو ایک نقاد کا فرض ہے، ان سب کی مثالین ملاحظہ ہون،

حاجی جعفر خان تبریزی، ؎

وقتِ رفتن شرمے گر بجہد از نعلش — آن شرور گہ رجعت بودش داغ کفل

اعتراضِ آرزو:-

"فقیر آرزو گوید کہ مضمون این قطعہ ماخوذ است از قطعہ ملا عرفی کہ این بیت از آنست:-

قطرہا کش دم رفتن چکد از پیشانی — شبنم آساش نشنید گہ رجعت بکفل،

"و این قسم از حد نوعے از سرقہ است"

ذوقی آردستانی:

از بخت بدم امید فومید شود — گر بنشانم درختِ گل بید شود

بر کلبۂ تارمن نیفتد پرتو، — گر جرم فلک تمام خورشید شود

اعتراضِ آرزو:-

"فقیر آرزو گوید کہ در بیت اول این رباعی مقابلۂ گل با بید مناسب نیست، چہ مقابلۂ بید درخت ثمردار باید"

عماد الدین فقیہ کرمانی ؎

دل عکسِ رخِ خوب تو در آب چو دید — فریاد بر آورد کہ ماہے ماہے

اعتراضِ آرزو:- خان آرزو کہتے ہین کہ اس کا لطف مبتذل ہے، امیر خسرو نے خوب کہا ہے ؎

ماہ من گر تماشا بلبِ بحر آئی — ماہیان شور برآرند کہ ماہے ماہے

کمال اسمٰعیل ؎

چوں بنظارہ آمدم روز شکارِ دلبران دامِ دلِ سبکتگین زلفِ ایاز یافتم

اعتراضِ آرزو :-

"فقیر آرزو گوید کہ لفظ سبکتگین اینجا بیجا واقع شدہ"

حقیقت بھی یہ ہے کہ ایاز کا تعلق محمود سے ہے نہ کہ سبکتگین سے اور اگر سبکتگین سے قارئین کی نظر محمود کی طرف مبذول کرانی ہو، تو یہ بات بہت دور از کار ہوگی،

میرزا گرامی ؎

خواجہ بے فرزند اگر باشد غلامش وارث است ہر چہ داد ہ حق تعالیٰ از برائے بندہ است

اعتراضِ آرزو ؎

"کلیۂ مصرعہ اول مورد نظر است چہ غلام وارث نیست مہذا سوائے فرزند وارثان بسیار اند، و نیز معنی آن نزدیک بمجنون رباعی استادیست کہ در منقبت گفتہ" ؎

بے فرزندے کہ خانہ زادے دارد شک نیست کہ باشدش بجائے فرزند

مخلصائے کاشی ؎

نگاہ گاہ گاہے میکنی ہر دم بسوی من ندانم از سر لطف است یا از کجائیہا

اعتراضِ آرزو :-

"لفظ گاہ گاہے" و ہر دم باہم چندان مناسبت ندارد،

پھر مخلص کاشی ہی کے دوسرے شعر پر یوں اعتراض کرتے ہیں ؎

گوشہ ابروے تیغ فتنہ گفت بیک اشارہ کند جسم را جدا ز ہیولیٰ

اعتراضِ آرزو :-

"فقیر آرزو گوید کہ جسم را مقابلہ با ہیولیٰ نیست، مقابل آن صورت است و صورت چندین نوع است صورت جسمی و صورت شخصی و صورت نوعی پس بہتر چنین است ع

بیک اشارہ نماید جدا صور ز ہیولیٰ

بعض مقامات پر اعتراض کا پہلو طنزیہ ہے، جو متانت و سنجیدگی، اور مزاح کا مرکب ہے، یہ طریقہ خان آرزو کے یہاں بہت شاذ ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بغیر طنز کے اعتراض کی اصلی کیفیت کا اندازہ نہ ہو سکتا، دو مثالیں ملاحظہ ہوں،

(۱) حیدر کلوخ ؎

بجاں دارند مارا از ملامت ہر طرف خلقے چہ خوش بودے کہ مانشناختے کس وکس مارا

اس شعر میں "مانشناختے" بالکل غلط ہے، خان آرزو کو اسی پر اعتراض ہے کہ

"مانشناختے عبارت تازہ است، چوں عزیزان او را مسلم داشتہ اند، شاید روزمرہ باشد"

(۲) تازگی پر بھی اعتراض ہے، تازگی ایک ایرانی شاعر ہے، جس نے عہد کیا تھا، کہ نظم کی تمام کتابوں کا جواب لکھے، چنانچہ فردوسی کے شاہنامہ کا جواب جو اس نے تیس برس میں کہا تھا، تازگی نے ایک ماہ میں کہا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے یہاں بکثرت نقائص موجود ہیں، "در شعر او ردیف و قافیہ و معنی غلط بسیار است"۔

اس کے بعد تازگی کے شاہنامہ سے چند شعر نقل کئے ہیں جس سے خان آرزو کے قول کی تصدیق ہوتی ہے، تازگی ؎

گرفتند تیر و کمان مرد مان فتادند دریکدگر چون دواں

ہمہ پردلان لرزہ زن ہمچو بید کہ ناگہ یکے ببر پر دل رسید

ابر میمنہ تاخت مانند فیل بدستش یکے تیر مانند سیل

کلاہ وزرہ برتنش چون سبد سرش ہمچو سیبے درون سبد
چوانیان یکے سرکش نامدار درونش پر از تیر چون تیر مار
اناقہ بفرقش چو دم رباہ ابر فرق او یک کیانی کلاہ

ان تمام اشعار میں قافیہ ورویف کی غلطیاں موجود ہیں، پھر آگے لکھتا ہے:۔

"فقیر گوید ہرگاہ احوال زبانداں چنین باشد وائے بحال شعرائے ملک دیگر کہ بفارسی سخن رانند درین صورت اگر ہزار غلط از ہندی واقع شود برابر یک غلط اہل زبان نبود، درین وقت مثل این اشعار تازگی راجہ جنگل کشور وکیل ناظم بنگالہ میگوید و در پر گوئی، وخوبگوئی داد سخنوری داد وی دہد و رسم زندگی را تازہ کردہ و میکند،....."

ان تمام اعتراضات کے باوجود جہاں وہ کسی کی جانب سے کوئی نامعقول اعتراض دیکھتے ہیں اس کا پورا رد کرتے ہیں، مثلاً شاہ رضوان محمد حسین کے دیوان سے لوگوں نے یہ شعر نکالا:

گر ساقی کمر در خدمت میخانہ می بندد کہ چون نرگس بہر انگشت خود پیمانہ می بندد

اور اسی مضمون کا شعر حاجی محمد جان قدسی کا پیش کیا،

یک جام خمارم نبرد کاش چو نرگس بودے بہر انگشت مرا ساغر دیگر

ظاہر ہے کہ ان دونوں شعروں میں سرقہ ہے، خان آرزو کہتے ہیں، کہ یہ محض اتفاق ہے، سید حسین خالص کا بھی اسی مضمون کا شعر موجود ہے، ؎

بہر انگشتم چو نرگس کاسۂ دریوزہ است کم بحرص من گدائے ہست در میخانہ ہا

اور لطف یہ ہے کہ محمد اسحاق شوکت نے بھی اسی مضمون کو باندھا ہے، ع

کہ چون نرگس بہر انگشت خود پیمانۂ دارم

اکثر مضمون میں توارد ہو جاتا ہے، چنانچہ آذری و ہلالی دونوں کے یہاں ایک ہی مصرع ہے،

ع بگذار کہ در روے تو بینم خدا را

اور اسی طرح آصف خان جعفر اور ملا نوعی دونون کے یہان ایک ہی مصرعہ ہے ع

کہ کیتائی نہ زیبد جز خدا را

ان باتون سے یہ نتیجہ نکلا کہ جو شخص قادر الکلام ہے، وہ کبھی سرقہ نہیں کر سکتا، جیسا کہ خان آرزو خود بھی کہتا ہے،

"کسیکہ خود قادر بر اختراع معنی و سخن تواند بود، چرا بہ بستن معنی دیگر کہ کم از میتہ خوردن نیست داغ بدنامی بر روے اعتبار خود خواہد نہاد"

بعض دوسری خصوصیات | خان آرزو نے اس تذکرہ مین ان تمام چیزون کو جمع کر دیا ہے جن سے فطرت انسان کو لگاؤ ہی، چنانچہ اس مین بکثرت تقلین، حکایات اور لطائف ہین، اور اس کا التزام رکھا ہے، کہ کسی شاعر کے متعلق جو مشہور لطیفے اور حکایتین ہین، ان کو ضرور بیان کیا ہے، اس سے اس تذکرہ مین ناول کا لطف پیدا ہو گیا ہے، اور اس کے پڑھنے مین طبیعت نہیں گھبراتی، بلکہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے، یہ خصوصیت کسی اور تذکرہ مین نہین، چند مثالین ملاحظہ ہون،

(۱) نعمت خان عالی کے متعلق لکھتا ہے، کہ وہ نہایت ظریف و شوخ تھا، ہجو گوئی مین اپنا جواب نہین رکھتا تھا لیکن اس کے باعث کبھی سخت خفت بھی اٹھاتا تھا، چنانچہ ایک صحبت مین ایک ظریف نے کہا کہ آپ تو واجب التعظیم ہین، عالی نے پوچھا کیون؟ ظریف نے جواب دیا، اسوجہ سے کہ آپ حاجی ہین، عالی نے کہا مین نے کبھی بھی حج نہین کیا، حاجی کیسے ہو گیا، ظریف نے کہا تو آپ ہاجی (ہاے ہوز سے) ہونگے (یعنی ہجو گو) عالی یہ سنکر بہت خفیف ہوا۔

(۳) چندر بھان برہمن نے شاہجہان کے سامنے یہ شعر پڑھا،

مرا دلیست بکفر آشنا کہ چندین بار بکعبہ بُردم و بازش برہمن آوردم

شاہجہان نے اسے سزا دینی چاہی، افضل خان نے کہا کہ حضور شیخ سعدی علیہ الرحمہ کا یہ شعر اسی کے لئے کہا گیا ہے،

خر عیسیٰ اگر بمکہ برند زان بیاید ہنوز خر باشد

(۳) ملا اظہری نابینا ہو گئے تھے، ایک دفعہ شیدا سے ملاقات کرنے گئے، اور یہ شعر جو اپنی بیوی کے متعلق کہا تھا، پڑھا،

خواہ با اظہری و خواہ بہ بیگانہ نشین من ہمین شرم ترا بر تو نگہبان کردم

شیدا نے یہ شعر سنکر کہا، "اندھے کی جورو کا خدا حافظ"

(۴) شیدا نے شراب کی تعریف میں یہ شعر کہا تھا، ؎

چیست دانی بادۂ گلگون مصفا جوہرے حسن را پروردگار و عشق را پیغمبرے

عاقل خان رازی نے اس کے جواب اور شراب کی مذمت میں چند شعر کہے،

چیست دانی بادہ..... یا ورے جہل را پروردگار و فسق را پیغمبرے
حسن را عصمت گداز و عشق را شہوت طراز در طریقت رہزنے و در طبیعت رہبرے
نفس را چون جان مساعد روح را چون نفس ضد نزد کافر مومنے و نزد مومن کافرے
آتش حرص و ہوس از شعلۂ او قطرہ زن ہست در صورت چو آبے و بمعنی آذرے

(۵) ایک مجلس میں کچھ فضلا جمع تھے شعر و شاعری کا تذکرہ چھڑا، اور صائب و کلیم کا موازنہ ہوا کہ ان میں کون بہتر ہے، جلسہ میں علی حزین بھی موجود تھے، انھوں نے کلیم کو صائب پر ترجیح دی، بات کسی طرح طے نہ ہوتی تھی، آخر میں دیوان حافظ سے فال نکالی گئی، یہ مصرع نکلا :ع

کے شعر تر انگیز دخاطر کہ حزین باشد

جو علی حزین کے خلاف تھا، اسے دیکھکر لوگ بہت محظوظ ہوئے، خان آرزو کو معلوم ہوا تو انھوں

نے کہا کہ "سبحان اللہ این از فواور اتفاقات است، بلکہ از جناب لسان الغیب قدس سرہ احقاق است"

(۷) مئی کلال کے ذکر میں ایک لطیفہ ہے، کلال ہندی میں شراب فروش کو کہتے ہیں، اکبر کے زمانہ سے دستور تھا کہ طبقہ کلال میں سے بھی ایک شخص کسی ایک شاہی دروازے کا دربان ہوا کرتا تھا، ایک کلال دربان نے اپنا تخلص مئی رکھا، ایک دفعہ نورجہان نے جہانگیر سے ذکر کیا کہ فلاں کلال شعر خوب کہتا ہے، اور مئی تخلص کرتا ہے، بادشاہ نے کہا سبحان اللہ شعر گوئی ایسی آسان ہوگئی کہ ذلیل طبقوں میں بھی اس کا شوق پیدا ہوگیا، ملکہ نے کلال کو بلوا کر شعر سنوائے، مئی نے بے تامل یہ شعر پڑھا، ؎

مئی بگریہ مرے دار دائے نصیحت گر　　کنارہ گیر کہ امروز روز طوفان است

بادشاہ ہنسے اور کہا ناگفتہ بودیم کہ این را بشاعری چہ نسبت است، درین جا ہم ہمان شیوہ دوربا ش[1] را کہ پیشۂ اوست مراعات کردہ، ایک مرتبہ پھر بادشاہ نے اوس سے شعر سنے، اس نے یہ شعر پڑھا،

من می روم و برق زنان شعلۂ آہم　　اے ہم نفسان دور شوید از سر راہم

بادشاہ نے مسکرا کر کہا دیکھو پھر اپنی فطرت پر آگیا، بھئی چنڈول کو شاعری سے کیا نسبت"

(۸) لامعی کے رنگ میں خانِ آرزو نے ایک رُباعی کہی جس میں انھوں نے چار پھول، چار پیغمبروں کے نام، چار اعضاے بدن اور چار عناصر کو نظم کیا ہے،

گلنار و دو آتش چو عذار ابراہیم　　در خاک چمن لالہ بود دست کلیم

افشردہ قدم چو خضر سبزہ لب آب　　نسرین چو دہان عیسیٰ از فیض نسیم

(۹) حکیم کاظم نے رزم کی تعریف میں یہ شعر کہے تھے، ؎

فشردند پا از دو سر مرد و دار　　چو نقشے کہ در سنگ گیرد قرار

بہر کس رسید نداز اسیف دار　　یکے را دو تا بلکہ کردند چار،

---

[1] معارف: کلالوں کی متعلق دربانی اور چاؤشی کی خدمت ہوتی تھی، جو آگے آگے دور باش کی صدا لگاتے چلتے تھے،

خانِ آرزو نے ازراہ شوخی اپنے احول معشوق کی تعریف مین چند شعر کہے، اور کاظم کے اشعار سے تضمین کی،

بوصفِ بتِ احولِ خویشتن اگر گوش داری بگویم سخن،
چو نازش پئے قتلِ عالم دوید نگاہش زپے تیغ برکف رسید،
بہر جا کہ شمشیر او کار کرد یکے را دو کرد و دو را چار کرد

ان لطیفون اور نقلون نے کتاب کو دلچسپ تو بنا ہی دیا ہے، اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ خانِ آرزو مین کافی شوخی و ظرافت تھی، اس خصوصیت مین بھی مجمع النفائس دوسرے تذکرون سے ممتاز ہے، عموماً تذکرون مین شعراء کے خشک حالات ہوتے ہین، ان مین شوخی و ظرافت کی چاشنی نہین ملتی، خانِ آرزو کے بعد ان کے شاگرد میر تقی میر کے یہان یہ رنگ موجود ہے،

(۵) مجمع النفائس کی ایک خوبی یہ بھی ہے، کہ اس مین علماء و مشائخ، بادشاہون اور امیرون کا بھی ذکر ہے، اور ان کا کلام بھی ملتا ہے، خانِ آرزو علماء و مشائخ کا نام نہایت عزت و احترام سے لیتا ہے، اپنے ذکر مین جس عقیدت و اخلاص کے ساتھ شیخ محمد غوث گوالیاری، اور حضرت نصیر الدین محمود چراغ دہلوی کا نام لیا ہے وہ اسکے پاس ادب کا نمونہ ہے، خواجہ محمد ناصر عندلیب، خواجہ معین الدین چشتی اور جامی اور عطار وغیرہ تمام بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام کے نام مین بھی احترام ملحوظ ہے، اساتذہ کا نام بھی تعظیم و تکریم سے لیتا ہے، مثلاً اوستاد ابو القاسم منصور فردوسی استاد سراج الدین قمری، استاد لامعی ملقب بہ بحر المعالی، استاد ملک قمی، استاد محمد قلی سلیم اور نظامی گنجوی کے نام اس طرح لکھتا ہے،

ملک الکلام دراری سخن را نظام نظامی گنجوی و ہو ابو محمد نظام الدین احمد ابو یوسف بن مؤید المطرزی"

(۶) ایرانی و ہندوستانی امیرون و بادشاہون کے سیاسی حالات ہمین تاریخ مین ملجاتے ہین لیکن ان کی ادبی دلچسپیون کا حال بہت کم ان سے معلوم ہوتا ہے، مثلاً بیرم خان کو ہم ایک مدبر کی حیثیت سے جانتے ہین لیکن وہ ادیب و شاعر بھی تھا، یہ نہین معلوم، خانِ آرزو نے اس کے شعر دیئے ہین، اور شاعری پر تنقید و تبصرہ بھی کیا ہے، لکھتا ہے :-

"شیخے صاحب جوہر مردے بود، خصوصاً در سپاہگری و نشو پردازی نکتہ دانی او از قصیدہ کہ در منقبت گفتہ و مطلعش انیست ظاہر است، ؎

شہے کہ بگذرد از نہ سپہر افسر او اگر غلام علی نیست خاک بر سر او

اسی طرح خانِ اعظم مرزا کوکہ شہنشاہ اکبر سلطان ابراہیم مرزا جاہی تخلص، بادشاہ، شاہ طہماسپ صفوی، کامران مرزا اور ہمایوں بادشاہ کا ذکر اپنے تذکرہ مین کیا ہے، اور ہر ایک کا کلام دیا ہے، اور اس پر رائے ظاہر کی ہے، سام مرزا بن شاہ اسمٰعیل صفوی کے متعلق لکھتا ہے، کہ وہ نہایت جوہر شناس اور فضل و دانش میں ممتاز تھا، تعصب و تہتک سے جو صفویون کا شعار تھا بری تھا، پھر آگے چل کر لکھتا ہے۔

"فقیر آرزو گوید کہ ہیچ شاہزادہ ازین خانوادہ بدین حیثیت و جامعیت بر نخاستہ، در شعر و انشا بدرجہ عالی رسیدہ، در فضل و دانش و مرتبہ و قدر شناسی مثل اوے شاید دیگر بہم نرسیدہ باشد۔ ازین سلسلہ چہ سخن از ہمہ سلاسل سلاطین است، چہ اکثر بادشاہان این سلسلہ متعصب تر و متہتک تر از سنیان بلخ بودند، چنانچہ بر متبع تواریخ ظاہر است و این معنی از جناب سام مرزا خیلے غریب است زیرا کہ جوانی و سلطنت و فضل و کمال آدمی را سیہ مست غفلت میگرداند"۔

اس کے بعد سامی کے منتخب اشعار دیئے ہین جنہین سے بعض نقل کئے جاتے ہین، یہ اشعار خود بڑی حد تک خانِ آرزو کے تبصرہ کی تصدیق کرین گے،

آزردہ شد از چشم من امشب کف پایت — در دا کہ کف پاے ترا چشم رسیدہ است
اے وا ے بر آن عاشق محروم کہ ہرگز — نے با تو سخن گفتہ و نے از تو شنیدہ است

حاصل عمر نثار رہ یارے کردم — شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

سامی نے مرتے وقت یہ وصیت کی تھی، کہ اسکی لوح مزار پر یہ عبارت کندہ کی جائے، اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِیْعًا، اور قبر کے دونون جانب اسکی یہ دو رباعیان لکھی جائین،

سامی زغم زمانہ بے غم می باش — با محنت و درد عشق ہمدم می باش
چون موجب شادی حقیقت مرگ است — گر مرگ رسد تو شاد و خرم می باش

سامی علم مرا و افراشتہ گیر — چرخ فلکت بفرق برداشتہ گیر
کوتاہ سخن تمام روے زمین — آوردہ بدست و باز بگذاشتہ گیر (باقی)

سائنس

انجمن ترقی اردو (ہند) کا ماہانہ رسالہ

جون ۱۹۴۱ء کے چند مضامین

۱۔ ایک اور ایک سو زائد انجن کے ہوائی جہاز (۲) بجلی اور گرج پر ابن سینا کے خیالات (۳) حشرات کی تباہ کاریان اور فائدے (۴) تاریخ زمین کے ماخذوں پر ایک نظر (۵) مچھلی کا تیل (۶) ہماری غذاؤن کے ماخذ (۷) آیوڈین

جولائی ۱۹۴۱ء کے چند مضامین

۱۔ کاغذ سازی (۲) بچہ پر موروثی اثرات (۳) اصول تعلیل اور جدید طبیعیات (۴) ہوائی حملہ اور اور زہریلی گیس،

یہ رسالہ ملکی زبان مین سائنس کا واحد رسالہ ہی جس مین مختلف مضامین کے علاوہ ہر ماہ دلچسپ معلومات سائنس سے متعلق سوال و جواب، سائنس اور صنعت سے متعلق تازہ ترین خبرین اور نئی کتابون پر تبصرے شائع ہوتے ہین، رسالہ مین متعدد بلاک بھی شائع ہوتے ہین، امید ہی کہ علم کے شایقین اور اردو زبان کے بہی خواہ سرپرستی فرمائین گے اشتہارات کے نرخ طلب کئے جا سکتے ہین، چند سالانہ پانچ روپیہ سکہ انگریزی نوٹ کا پرچہ ۸ر

المشتہر: معتمد مجلس ادارت رسالہ سائنس جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

تلخیص و تبصرہ

عربی زبان کے جدید رجحانات

اسلامک کلچر بابت جولائی ۱۹۴۱ء (حیدرآباد دکن) میں عربی زبان کے جدید رجحانات پر ایک پر از معلومات مقالہ شائع ہوا ہے، ذیل میں معارف کے ناظرین کے لئے اسکی تلخیص درج کیجاتی ہے :

مصر میں عربی زبان کے جدید رجحانات کا آغاز ۱۷۹۸ء کے فرانسیسی حملہ کے بعد سے ہوا، اس حملہ نے مشرق و مغرب کو آپس میں ملنے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع دیا، جس سے یورپ کی طرح مصر میں بھی تعلیم کی اشاعت ہونے لگی، اور محمد علی کبیر نے یورپین طرز کے بہت سے اسکول جاری کئے، رفتہ رفتہ ان کی تعداد بڑھنے لگی، چنانچہ ۱۹۰۶ء میں گاؤں کے مدارس کے علاوہ پانچ سو سے زیادہ اسکول ہو گئے جن میں ۹۲ ہزار طلبہ تعلیم پاتے تھے ان میں بیس ہزار لڑکیاں تھیں، پھر سعد زاغلول پاشا کی وزارت تعلیم کے دور میں تعلیم کی اشاعت میں اور زیادہ ترقی ہوئی،

شام کے علاوہ اور دوسرے اسلامی ممالک میں تعلیم کی اشاعت دیر سے شروع ہوئی، سب سے پہلے محمد علی کے لڑکے ابراہیم نے شام میں ابتدائی مکاتب قائم کئے تھے، البتہ بطرس بستانی کا مدرسہ (۱۸۰۹ء تا ۱۸۸۳ء) سے قائم تھا، ۱۸۶۰ء میں امریکہ اور فرانس کے عیسائی مبلغوں کے تینتیس اسکول تھے جن میں تقریباً ایک ہزار طلبہ تعلیم پاتے تھے، ۱۸۶۶ء میں ان

مبلغون نے بیروت مین ایک کالج قائم کیا،

ان تعلیمی اداروں میں جب نصاب کے لئے عربی زبان کی کتابوں کی ضرورت محسوس ہوئی تو بیروت مین ایلی اسمتھ اور اسکے شرکاے کار نے اس کام کے لئے دو عالمون ناصیف یازجی اور بطرس بستانی کی خدمات حاصل کین، مصر مین نصاب کی کتابین لکھنے اور غیر زبانون سے ترجمے کرنے کی خدمت طہطاوی عبداللہ پاشا فکری اور علی مبارک پاشا کے ذمہ کی گئی، پھر جب قسطنطنیہ میں ۱۸۱۶ء اور قاہرہ مین ۱۸۲۲ء مین عربی کے مطبعے قائم ہوئے تو نہ صرف تعلیم اور ترجمے کی اشاعت مین سہولتین پیدا ہوگئین، بلکہ علوم وفنون کی اعلیٰ کتابون اور غیر زبانون کے ترجمے بھی تیزی سے طبع ہونے لگے جس سے تعلیم کی اشاعت مین بڑی مدد ملی، ان کتابون کی اشاعت سے عام تعلیمی بیداری اور علوم وفنون سے دلچسپی کا اظہار ہوتا تھا،

صحافت کے وسیلہ سے اس بیداری مین اور بھی ترقی ہوئی، تعلیم کی اشاعت اور ترقی کے ساتھ، صحافت نگاری بھی پھیلی، محمد علی پاشا نے پہلی دفعہ الوقائع المصریہ جاری کرکے صحافت نگاری کا پرچم لہرایا، پھر خدیو اسماعیل (۱۸۶۳ء-۱۸۷۹ء) کے عہد مین روزانہ اخبارات ورسائل کی مانگ بہت بڑھ گئی، اس عہد کے ممتاز اشخاص نے مثلاً باقلی پاشا، ابراہیم المویلحی بشارہ تقلا اور بعد مین شیخ علی یوسف سید جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہٗ نے عربی زبان کی صحافت نگاری مین بڑی دلچسپی لی، مصر کے سیاسی اور معاشرتی انقلابات بھی اس فن کی ترقی میں معاون ہوئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مصر میں ۱۹۱۴ء مین اخبارات کی اشاعت چار پانچ ہزار سے زیادہ نہ تھی! اور اب بڑھکر چالیس پچاس ہزار تک پہنچ گئی ہے؟ ان کی کثرت اشاعت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ہر ہفتہ پچاس ہزار سے زیادہ اخبارات اور رسائل مصر سے باہر روانہ کئے جاتے ہین، شام نے بھی صحافت نگاری کو فروغ دیا، مگر یہان کے زیادہ تر فضلا، دوسری جگہ منتقل ہو جاتے ہین،

اسلئے عربی زبان کا علمی مرکز مصر ہی رہا،

صحافت نگاری کی مقبولیت اور ترقی سے مصر کے عام لوگ یورپ کی تہذیب و تمدن سے روشناس ہوئے، اور وہاں یوروپین سائنس، فلسفہ، آرٹ اور لٹریچر کی بھی اشاعت ہوئی پھر اس کے اثر سے وہاں کے باشندوں کے معاشرتی اور سیاسی خیالات میں انقلاب ہوا، اور مصری نوجوانوں نے یورپ کی مختلف یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد عربی کلچر کو از سر نو فروغ دینے کے لئے سائنس، قانون اور ادب کی کتابوں کو اپنی زبان میں منتقل کرنا شروع کیا، اور ضرورت زمانہ کے مطابق انھوں نے ترجموں کی زبان نہایت سادہ سلیس اور صاف رکھی، اسکے لئے انھوں نے صرف و نحو کے قواعد کا لحاظ رکھنا غیر ضروری سمجھا، اس اصلاح سے پہلے کی تحریریں مرصع ہوا کرتی تھیں، مگر نوجوان انشا پردازوں نے اس قسم کے اسٹائل سے پرہیز کرنا شروع کیا، کیونکہ ترجمہ میں مسجع اور مقفی عبارتیں کام نہیں دے سکتی تھیں، چنانچہ انھوں نے بدیع الزمان ہمدانی، خوارزمی اور بعض اوقات ابن خلدون کے طرز انشا کا تتبع کیا، اس کے علاوہ عام بول چال میں جس میں صرف و نحو کی زیادہ پابندی نہ تھی، ترکی کے الفاظ استعمال کرنے لگے،

پرانے قواعد سے نوجوان انشا پردازوں کی یہ آزادی جامعہ ازہر کے شیوخ اور ان کے مقلدین کو پسند نہ آئی، اور انھوں نے ان جدید رجحانات کی مخالفت شروع کی، اور اس مخالفت میں عربی کے پرانے لٹریچر کو از سر نو زندہ کرنے کی کوشش کی، اور قدیم اکابر علماء کی غیر مطبوعہ کتابوں کو چھاپ چھاپ کر عربی زبان بولنے والے عوام تک پہونچایا، اور ان کو عربی زبان کے قدیم اصول و قواعد کو قائم رکھنے کی ترغیب دی، لیکن ان کی تمام کوششوں کے باوجود پرانے مقفی اور مسجع طرز میں تبدیلی پیدا ہو کر رہی، چنانچہ نئے ممتاز اخبارات و رسائل مثلاً العروۃ الوثقیٰ (۱۸۸۴ء) المقتطف (۱۸۸۶ء) الہلال اور المنار (۱۸۹۱ء) اور شیخ محمد عبدہ کی تصانیف میں

نثر کی یہ تبدیلی نمایاں نظر آتی ہے، ان اخبارات ورسائل کے مقالہ نگار نحو اور ادب کے پرانے ضوابط کے پابند ضرور رہے، لیکن اپنے کو پرانے طرز انشاء سے بڑی حد تک آزاد کرلیا،

ادب وانشاء کے اس انقلاب میں ان ذہنی تحریکوں کو بڑا دخل ہے، جن کو سید جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہٗ نے شروع کیا تھا، شیخ محمد عبدہٗ نے مصریوں کو پرانی روایات کی زنجیروں سے آزاد کرنے کی کوشش کی، اور اسلام کی ثقافت کے تحفظ کے ساتھ موجودہ تمدن کی ترقیوں سے بھی استفادہ کی تعلیم دی، ان کی تحریک سے ایسا ماحول پیدا ہوگیا، کہ عربی لٹریچر اور اسلامی علوم وفنون کی تجدید اسلام کی شاندار ماضی کے ساتھ ہوسکتی ہے، اس ماحول نے تحریر اور انشاء کیلئے بھی ایک نئی راہ پیدا کردی،

شیخ محمد عبدہٗ کے مقلدین کی بڑی تعداد ہے، جن میں قابل قدر علماء اور فضلاء بھی ہیں، ان مقلدوں کی باضابطہ تنظیم ہے، جس کا آرگن الجریدہ نامی ایک اخبار تھا، یہ اخبار ۱۹۰۷ء میں احمد لطفی کی ادارت میں جاری ہوا، اسکی تحریر میں عربی ادب وانشاء کا ایک خاص طرز نمایاں تھا، شیخ محمد عبدہٗ کے مقلدوں نے قدیم اور جدید رجحانات کے درمیان ایک معتدل راہ اختیار کی، وہ اپنی قوم کو تعلیم، حریت اور آزادی کا سبق دیکر اسکو بلند کرنا چاہتے تھے، اس مقصد کے حصول کے لئے اسلامی خصوصیات کو برقرار رکھتے ہوئے مغربی تمدن کے تمام اصولوں کو اپنی سیاست اور معاشرت بلکہ لٹریچر تک میں رائج کرنا چاہتے تھے، لیکن امتداد زمانہ سے ان مقلدوں میں سیاسی اختلاف پیدا ہوگیا، اور الجریدہ کو بند کردینا پڑا، مگر اس جریدہ نے ملک کے ذہنی نشوونما میں جو تبدیلی پیدا کردی تھی، اس میں برابر ترقی ہوتی رہی،

۱۹۰۸ء میں مصر میں ایک نئی یونیورسٹی قائم ہوئی جس سے جدید خیالات کی تشریح میں بڑی مدد ملی، اور علمی تجدید کو بڑا فروغ ہوا، ۱۹۲۲ء میں علمی تجدید کے حامیوں نے اپنی

تحریک کو پر زور بنانے کے لئے ڈاکٹر محمد حسین ہیکل کی ادارت میں ایک اخبار السیاسۃ جاری کیا، السیاسۃ کے اہلِ قلم اور مقالہ نگاروں نے عربی زبان کی تاریخ اور تنقیدی ادب پر زیادہ زور دیا، ان کے مضامین اور تصانیف میں پہلی دفعہ عرب قومیت کے بجائے مصری قومیت کی اسپرٹ نظر آئی،

اس نئے گروہ میں بھی دو جماعتیں ہیں، ایک جماعت کا خیال ہے کہ مغرب کے وسیع علمی اور سائنٹفک ذرائع سے اسلامی ثقافت کی روح اور اسکی خصوصیات کو نقصان پہنچائے بغیر مشرقی لٹریچر میں ہر طرح کا استفادہ کیا جاسکتا ہے، اس خیال کے حامی ڈاکٹر منصور فہمی، پروفیسر احمد امین، مصطفےٰ عبدالرزاق اور ابراہیم عبدالقادر وغیرہ ہیں، دوسری جماعت کے گویا رہنما ڈاکٹر طٰہٰ حسین ہیں، وہ عربی زبان کا مطالعہ مغرب کی علمی تنقید کے سائنٹفک اصول اور قوانین کے مطابق کرنا چاہتے ہیں، وہ اپنی تنقید میں قدما کی رائے سے اسی حد تک متاثر ہونا پسند کرتے ہیں، جس حد تک وہ موجودہ سائنٹفک اصول کے مطابق ہو، ان کے خیال میں اہلِ عرب کے علمی مشاغل کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھنا ضروری نہیں ہے، جس نقطۂ نظر سے اسکو قدما نے دیکھا ہے، اس خیال کے تحت جب زمانۂ جاہلیت کی شاعری پر انکی کتاب الادب الجاہلی شائع ہوئی، تو اس کی سخت مخالفت ہوئی، کیونکہ اس کتاب میں انھوں نے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے قصوں کو جو اسلام سے پہلے مشہور تھے، ناقابلِ قبول قرار دیا تھا، مصری حکومت نے عوام کی شدید مخالفت کو دیکھ کر اس کتاب کو ضبط کرلیا، لیکن ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اس مخالفت کے باوجود قدما کے طرزِ تنقید کے خلاف ہر قسم کی کوششیں جاری رکھیں، ان کا خیال ہے کہ عربی لٹریچر کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ دینی علوم سے اس کا لگاؤ باقی نہ رہے، کیونکہ کسی لٹریچر کا فروغ اسی وقت ہوسکتا ہے، جب وہ تعصب سے آزاد ہو، خواہ یہ تعصب مذہبی ہو یا سیاسی، لٹریچر کی تاریخ کا مطالعہ آزاد اور ناقدانہ ہونا چاہئے، جس طرح ماہرین نباتات اور حیاتیات اپنے علوم کی

تحقیقات مین کسی خوف اور رعایت کو دخل نہیں دیتے ہیں، عربی زبان کے ادب عالی کے متعلق ان کے خیالات السیاسۃ مین حدیث الاربعاء کے عنوان سے شائع ہوئے، اس میں انھون نے اپنے خاص نقطۂ نظر سے اموی اور عباسی عہد کے طرز زندگی اور شاعری پر تنقید کی ہے، اور اس زمانہ کے ممتاز شعراء مثلاً ابو نواس، بشار بن برد، مطیع بن ایاس، مروان ابن ابی حفصہ کی شاعری کے مختلف پہلوؤن پر روشنی ڈالی ہے، اور قدیم اور جدید خیالات کے انشا پردازون کے متنازعہ امور پر بھی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے،

مصر مین ۱۸۸۲ء اور ۱۹۳۶ء کے درمیان غیر معمولی سیاسی اور معاشرتی انقلابات ہوئے ان انقلابات میں عربی لٹریچر پر یورپین اثر سے بہت زیادہ متاثر ہوا، عربی زبان مین جدید عربی شاعری کا آغاز ہوا جس مین زیادہ تر فرانسیسی اثرات غالب تھے، عثمان جلال نے فرانسیسی شعراء کے گیتون کو عربی شعر کا جامہ پہنانا شروع کیا، جس میں صرف ونحو کی پابندی نہیں تھی، یہ اشعار تھیٹرون، فلمی کمپنیون اور نشر گاہون مین مقبول ضرور ہوئے لیکن ابھی ان مین زیادہ ترقی نہین ہوئی، اور انکی علمی اہمیت بھی تسلیم نہیں کیجاتی ہے،

شاعری میں عموماً بحرین اور عروضی قواعد تو وہی پرانے ہین لیکن بعض جدت پسند شعراء نے جدتین کی ہین، مثلاً شوقی کا یہ شعر،

مال واحتجب وادّعی الغصب
فاعلن فعل فاعلن فعل

ابراہیم ناجی نے عاصفۃ روح میں ایک نئی بحر استعمال کی ہے،

ایّن شطّ الرجا یاعباب الھموم
فاعلاتن فعل فاعلاتن فعل

گو یہ بحریں قدیم بحروں کی محض ترمیم ہیں، پھر بھی عربی زبان کے لئے نئی ہیں، بعض شعراء مثلاً البارودی (محمود پاشا) ۱۸۳۹ء ۔ ۱۹۰۴ء) اور حافظ نے بھی نئے اسٹائل اور طرز میں عہد عباسیہ کے شعراء ہی کی تقلید کی لیکن اپنے عہد کے جدید رجحانات سے بھی متاثر ہوئے، مثلاً بارودی کے ایک قصیدہ کے چند اشعار یہ ہیں،

یا روضۃ النیل لا مستک بائقۃ ولا عدتک سماء ذات اغداق

اصبوا الیہا علی بعد ویعجبنی انی اعیش لہا فی ثوب املاق

وکیف انسی دیارا قد ترکت بہا اہلا کراما لہم عودی واشفاقی

حب الوطنی کا یہ رنگ حافظ کی نظموں اور مرثیوں میں اور بھی تیز ہو جاتا ہے، حافظ نے نہ صرف حب الوطنی کا ترانہ گایا، بلکہ اپنی نظموں میں غربا کی دردناک حالت کی تصویر کھینچی، اور ان سے ہمدردی کا اظہار کیا، جس سے وہ شاعر عوام ہو گیا، حافظ اور شوقی کی نظموں میں زیادہ تر مصری قومی اسپرٹ کا ترانہ تھا، انھوں نے عربوں کے ذہن میں اسلامی اور مصری دونوں تمدنوں کے شاندار ماضی کی یاد تازہ کی، شوقی نے اپنے اشعار میں نئے مضامین اور نئے طرز بھی رائج کئے، اور نہ صرف قدیم قصیدہ کے طرز کو چھوڑ دیا، بلکہ عام بول چال کے الفاظ مصر کی قدیم تاریخ کے غیر مانوس اسماء کبھی بالکل نئے الفاظ مثلاً سیارہ، مطارہ، ریل گاڑی کے لئے، رائج دغادوت عجج آمون کے لئے جبار القرون اور برطانوی شیر کیلئے اللیث استعمال کئے ہیں عربی ادب میں رزمیہ شاعری اور ڈرامہ بھی شوقی کی کوششوں سے شروع ہوا۔

لیکن اس تجدد کے باوجود حافظ اور شوقی کو یورپین طرز کے جدید شاعر نہیں کہا جا سکتا ڈاکٹر محمد حسین ہیکل کا خیال ہے کہ شوقی کی شاعری میں اسلامی اور مغربی فلسفہ کا ایک عمدہ قسم کا امتزاج ہے لیکن ڈاکٹر طہٰ حسین کو اس رائے سے اتفاق نہیں، انکی رائے میں شوقی کی شاعری

کسی خاص تخیل یا شاعرانہ نظریہ کی حامل نہیں، یہ بھی ان کا خیال ہے کہ عربی زبان کی جدید شاعری میں نہ تو قدیم شاعری کا اعلیٰ معیار ہی قائم ہے، اور نہ وہ بالکل جدید ہے، کیونکہ جدید شعراء اپنے عہد کی زندگی کی صحیح ترجمانی نہیں کرتے ہیں، اسکی وجہ یہ ہے کہ ان میں صلاحیت اور ذہنی نشو و نما کا فقدان ہے، شوقی اور حافظ کی شاعری اصلی معنوں میں جدید نہ ہو لیکن انھوں نے اپنی سیاسی اور اخلاقی نظموں کے ذریعہ سے ملک میں قومی سرگرمی اور جوش خوب پھیلایا، اور اپنی قوم کے جذبات کی پوری ترجمانی کی، مغرب کے شعراء کی طرح انھوں نے نہ دنیا کے سامنے کوئی نیا پیام پیش کیا، اور نہ عربوں ہی کو کوئی پیام دیا، وہ قوم کو متاثر نہیں کر سکے، بلکہ خود اس سے متاثر ہو کر ان کے جذبات کے ماتحت رہے، البتہ عربی شاعری کی آیندہ ترقی کے لئے فضا تیار کر دی، ان کی کوششیں اس لئے بھی بار آور کہی جا سکتی ہیں، کہ ان کے اثر سے موجودہ شعراء میں فطری اور حکایتی شاعری کا رجحان بڑھتا جاتا ہے اور بعض نظمیں خاص مقصد سے لکھی جاتی ہیں جن میں تخیل کا تسلسل اور مدعا کی یگانگت باقی رہتی ہے،

غرض عربی شاعری کی تجدید کی کوششیں جاری ہیں، اسکے لئے مجلسیں بھی قائم ہو گئی ہیں، ۱۹۳۶ء میں اسکندریہ میں "شاعری کا جدید اسکول" کے عنوان سے بہت سے لکچر دیئے گئے ہیں جس میں ممتاز فضلاء اور شعراء نے شرکت کی، ان تمام مقررین نے قدیم عروض اور بحروں کے قیود سے آزادی حاصل کر کے غیر مقفی شاعری کی ترغیب دی، اور رزمیہ شاعری اور ڈرامہ پر زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت بتائی، عربی شاعری کے ان مجددین کی کوششیں کس حد تک کامیاب ہوں گی، یہ ابھی نہیں بتایا جا سکتا، لیکن اس کے جدید رجحانات یہ ہیں، کہ اس کی اصلی خصوصیات کے قیام کے ساتھ اسمیں جدید یورپین طرز زیادہ سے زیادہ رائج ہو جائے، (باقی)

(ص۔ع)

اخبار علمیہ

اردو انسائیکلوپیڈیا

ادارۂ ادبیاتِ اردو جس کو ملک کے ذی علم حضرات کی قلمی اعانت اور ذی مرتبہ امرار کی سرپرستی کا شرف حاصل ہو کم و بیش دس سال سے زبان و ملک کی مسلسل خدمت کر رہا ہے اسکا کام مختلف علوم و فنون کے بارہ شعبون مین پھیلا ہوا ہے جس کے زیر نگرانی اب تک بہتر (۷۲) سے زیادہ کتابین شائع ہو کر مقبول ہوئین،

بہت غور اور متعدد صاحبانِ علم و فضل سے تبادلۂ خیال کے بعد اس نے گذشتہ سال اردو انسائیکلوپیڈیا شائع کرنے کا تصفیہ کیا، چونکہ اسکی ترتیب و تالیف کے لئے متعدد علوم و فنون کے ماہرین کے اشتراکِ عمل کی ضرورت تھی، اس لئے سب سے پہلے اُس نے ہندوستان کے متعدد ماہرین علوم و فنون کو قلمی اعانت پر آمادہ کیا،

انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب و تالیف مین اس کا خاص طور پر خیال رکھا جا رہا ہے، کہ مختلف علوم و فنون کے الفاظ ماہرین ہی سے لکھوائے جائین، اس سلسلہ مین ساری انسائیکلوپیڈیا کو مختلف علوم و فنون کے متعدد شعبون مین تقسیم کر دیا گیا ہے، اور ہر شعبہ کی نگرانی ایک ماہر کے تفویض کر دی گئی ہے، جو معاونین کی مدد اور مجلس انتظامی کی عام نگرانی مین شعبے کے جملہ الفاظ پر نوٹ مرتب کر رہا ہے،

فی الوقت حسب ذیل ماہرین اور علما، اپنی نگرانی مین مضامین متعلقہ کا کام شروع کر چکے ہین،

معاشیات ڈاکٹر انور اقبال صاحب قریشی ایم اے آکسن بار ایٹ لا صدر شعبۂ معاشیات جامعہ عثمانیہ

تاریخ پروفیسر ہارون خان صاحب شیروانی ایم اے آکسن بار ایٹ لا صدر شعبۂ تاریخ جامعہ عثمانیہ،

تہذیب و ثقافت ڈاکٹر ایشور ناتھ صاحب ٹپا ایم اے پی ایچ ڈی پروفیسر انڈین کلچر جامعہ عثمانیہ

ریاضی ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی ایم اے پی ایچ ڈی۔

سائنس ڈاکٹر قاضی معین الدین ایم ایس سی پی ایچ ڈی پروفیسر نظام کالج و ڈاکٹر رام لال ایم ایس سی پی ایچ ڈی،

السنۂ قدیم و جدید ڈاکٹر محمد راحت اللہ خان صاحب ایم اے ڈی فل مہتمم کتب خانہ آصفیہ

فلسفہ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی،

تعلیمات و تدریسیات مولوی سجاد مرزا صاحب ایم اے پرنسپل ٹریننگ کالج،

طب ڈاکٹر منور علی صاحب اف ارسی اس و ڈاکٹر قاسم حسین صاحب صدیقی ایم آر سی ایس ایل آر سی پی لندن کارونر بلدہ،

نسائیات مس حبیبی نندی بی اے آنرز آکسن،

کھیل اس ام ہادی بی اے کیمبرج،

اردو زبان و ادب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم اے پی ایچ ڈی و پروفیسر عبد القادر سروری ایم اے ایل ایل بی،

ہندی ادب اور ویدانت پنڈت ونشی دھر ودیالنکار،

کنڑی و مرہٹی وغیرہ رگھوناتھ راؤ بہساری ایم اے وڈی کے بھیم سین راؤ ایم اے،

انڈکس کی ترتیب اور مقالے لکھوائے جانیکا انتظام تیزی کے ساتھ جاری ہے، ان کے علاوہ بہت سے مشاہیر علما، وفضلا ہندوستان کے گوشے گوشے سے دوسرے علوم وفنون کے ضمن مین قلمی اعانت فرما رہے ہین، ان میں سے چند کے نام یہ ہین،

ڈاکٹر محمد باقر ایم اے پی ایچ ڈی لاہور، پروفیسر مسعود حسن رضوی ایم اے لکھنو یونیورسٹی، شاہ بخاری پطرس ایم اے دہلی، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی پونا، پروفیسر رودرالہ آباد وغیرہ۔

ترتیب وتالیف کی نوعیت اور معیار کا صحیح اندازہ پیش کرنے کے لئے زیر اشاعت انسائیکلوپیڈیا کے چند اوراق بطور نمونہ الگ شائع کرکے ہفتہ عشرہ مین صاحبان ذوق ونظر کی خدمت مین بغرض رائے بھیجے جائین گے،

اردو انسائیکلوپیڈیا جیسی علوم وفنون کی ضخیم کتاب کی ترتیب وتدوین کے لئے ابھی ہمین بیسیون ماہرین کی قلمی اعانت درکار ہے، اس لئے ہم بیحد ممنون ہون گے، اگر وہ علما وفضلا جن کا اب تک ہمین تعاون حاصل نہیں ہوا اور جو ازراہ علم دوستی ہمارا ہاتھ بٹانا چاہتے ہین، ہمین مطلع فرمائین کہ انھین کن خاص علوم وفنون سے دلچسپی ہے تاکہ ہم ان کی قابلیتون سے استفادہ کرسکین،

قانون مسعودی

محکمۂ آثار قدیمہ ہند (دہلی) نے بیرونی کی مشہور کتاب قانون مسعودی کو شائع کیا ہے، اس کی تصحیح وترتیب ایک ترکی مستشرق ذکی ولیدی طغان نے کی ہے، اسکی ترتیب کے لئے انھون ذالبیرونی کی تصانیف کی تلاش اور جستجو مین یورپ اور ایشیا کے مختلف حصون کی سیاحت کی، اور کئی سال کی محنت کے بعد قانون مسعودی کو اوٹ کیا، ان کو یورپ مین اس کتاب کا کوئی نا شر نہ ملا تو ہندوستان کے محکمۂ آثار قدیمہ کے ڈائرکٹر جنرل کی طرف رجوع کیا، انھون نے کتاب کی اہمیت کا لحاظ کرکے منظور

غزل

از

جناب شاہد صدیقی اکبرآبادی

اے عشقِ بے نیاز، یہ کیا انقلاب ہے
غم کامیاب ہے نہ خوشی کامیاب ہے

مستی میں، ہر فریبِ خرد، بے نقاب ہے
اس وقت، جو گناہ بھی کیجے ثواب ہے

وہ دور ہیں نگاہِ طلب کامیاب ہے
بڑھ جائے اپنی حد سے تو جلوہ حجاب ہے

فکرِ مآلِ عشق نہ کی ہم نے عشق میں
معلوم تھا کہ خواب ہی تعبیرِ خواب ہے

لطفِ نظر بہ قیدِ نظر چاہتا ہوں میں
میرا سوالِ دید خود اپنا جواب ہے

مجبور ہوں کہ طاقتِ شکرِ ستم نہیں
مسرور ہوں کہ تیرا ستم کامیاب ہے

رسوائیاں ہیں عشق کی معراجِ زندگی
یہ تم نے کیا کہا کہ "زمانہ خراب ہے"

غم پر اثر نہیں ہے کسی انقلاب کا
اور غم بجائے خود اثرِ انقلاب ہے

حاصل ہے لطفِ دید مگر یہ خبر نہیں
تو بے حجاب ہے کہ نظر بے حجاب ہے

شاہدؔ بغیر وجہ نہیں نظمِ کائنات
اس بزمِ ناز میں کوئی دل بایاب ہے

جامِ صہبائی

از جناب اثرؔ صہبائی

صہبائے خم الست مل جائے مجھے!
آگاہیِ رازِ ہست مل جائے مجھے!

باطل مرے پانوں میں نگوں ہو جائے!
ایسا دلِ حق پرست مل جائے مجھے!

باب التقریظ والانتقاد

رسالون کے سالنامے اور خاص نمبر

الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر، مرتبہ مولانا محمد منظور صاحب نعمانی تقطیع بڑی ضخامت ۴۸۰ صفحے کاغذ، کتابت وطباعت بہتر قیمت عاریتہ:- دفتر الفرقان بریلی،

رسالہ الفرقان بریلی اس سے پہلے ہندوستان کے مجددین ومصلحین مین حضرت مجدد الف ثانی، مولانا سید احمد بریلوی اور مولانا اسمٰعیل شہید رحمہم اللہ کے حالات مین خاص نمبر نکال چکا ہے، اب اس نے اس سلسلہ کے مجدد اعظم حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے تذکرہ کی سعادت حاصل کی ہے، تجدیدی وسعت وجامعیت کے لحاظ سے شاہ ولی اللہ صاحب کا مقام بہت بلند ہے، اورنگزیب کے بعد ہندوستان کے مسلمانون پر نہ صرف سیاسی بلکہ مذہبی، اخلاقی، تعلیمی، علمی اور اقتصادی ہر حیثیت سے زوال طاری ہوگیا تھا، مرکزی حکومت کمزور پڑ چکی تھی، ملک مین طوائف الملوکی بپا تھی، ارکان سلطنت میں غیر اسلامی طاقتون کا غلبہ تھا، علماء فکر ونظر سے محروم اور عوام جہل و خرافات مین مبتلا تھے، ہر طبقہ اور ہر شعبہ سے اسلامی روح فنا ہو رہی تھی، اس نازک دور مین شاہ ولی اللہ کا ظہور ہوا، انکی نظرون تمام زوال پذیر گوشون پر تھی، چنانچہ انھون نے دین وملت، عقائد وخیالات، علم وفن، شریعت وطریقت، سیاست واقتصادیات ہر شعبہ مین تجدید واصلاح اور مسلمانون کے مردہ قالب مین روح پھونکنے کی کوشش کی، الفرقان نے ان کارنامون پر

ہندوستان کے ممتاز اصحاب علم کے قلم سے مقالات اور معلومات کا یہ ضخیم مجموعہ فراہم کیا ہے، مولانا مسعود عالم ندوی کا مضمون "امام ولی اللہ دہلوی سے پہلے اسلامی ہند کی دینی حالت اور اس کا تدریجی ارتقا" بڑی تلاش و محنت سے لکھا گیا ہے، اور شاہ صاحب کے تجدیدی کارنامون کے پس منظر کی حیثیت رکھتا ہے، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے منصب تجدید کی حقیقت واضح کرکے اس میں شاہ صاحب کا مقام دکھایا ہے، مولانا مناظر احسن گیلانی کا مبسوط مضمون شاہ صاحب کے تجدیدی کارنامون پر جامع تبصرہ ہے، مولانا عبید اللہ سندھی نے حکمت ولی اللہی کا اجمالی تعارف کرایا ہے، گو اس مضمون کے تمام استنباطات سے ہم کو اتفاق نہیں ہے لیکن مضمون بہت عالمانہ ہے، اور شاہ صاحب کے فلسفہ اور ان کی کتابون پر عمیق غور و فکر کا نتیجہ ہے، مولانا سید سلیمان ندوی کا مضمون "ہندوستان میں اسلامی حکومت کے زوال کا سبب شاہ صاحب کی نظر میں" گو مختصر ہے لیکن اس سے شاہ صاحب کی سیاسی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے، ان مضامین کے علاوہ مولینا سعید احمد اڈیٹر برہان، مولینا ابوالحسن علی ندوی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء، مولینا محمد اویس نگرامی رفیق دار المصنفین، مولانا ابوالنظر امروہوی، مولانا محمد یوسف استاذ جامعہ ڈابھیل، مولینا خیر محمد صاحب صدر مدرس خیر المدارس جالندھر، مولینا منظور نعمانی اڈیٹر الفرقان کے قلم سے شاہ صاحب کی مختلف حیثیتون پر فاضلانہ اور پر از معلومات مضامین ہین، شاہ صاحب کے متعلق متعدد اچھی نظمین بھی ہین، تبرکاً انکی تحریر کا عکس بھی شامل کردیا گیا ہے، معلومات کے اعتبار سے یہ نمبر شاہ صاحب کے حالات مین مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے، اور ارباب علم کے مطالعہ کے لائق ہے

البیان براہین وحی نمبر، مرتبہ جناب مولوی محمد حسین صاحب عرشی تقطیع بڑی ضخامت ۱۸۲ صفحے کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ، پتہ دفتر اتمت مسلمان امرتسر،

بغیر کسی تاویل کے کلام پاک کے وحی الٰہی ہونے کا عقیدہ اسلام کا ایسا بنیادی مسئلہ اور مسلمانون کا ایسا متفقہ عقیدہ ہے، جس سے کسی اسلامی فرقہ کو اختلاف نہین، یہی وجہ ہے کہ اس سے مدیر نگار

کے انکار پر بلا اختلاف ہندوستان کے تمام اسلامی فرقون حنفی، وہابی، اہل قرآن، اہل حدیث، حتی کہ نئے تعلیم یافتہ آزاد خیال مسلمانوں تک نے مدیر مذکور کو ملامت کی، اور اس کے خرافات کے جواب مین مضامین لکھے، رسالہ البیان امرتسر نے ان تمام مضامین کو براہین وحی کے نام سے ایک خاص نمبر مین جمع کر دیا ہے، مضمون نگارون کے نامون پر نظر ڈالنے سے اس کا ثبوت ملتا ہے، کہ اسلام کے بنیادی مسائل پر الحمد للہ آج بھی تمام اسلامی فرقے اور جماعتین متفق ہین، چنانچہ اس نمبر مین مولنا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریا بادی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا منظور نعمانی اڈیٹر الفرقان، مولانا سعید احمد اکبر آبادی اڈیٹر برہان مولینا ادریس نگرامی، مولوی عرشی امرتسری ڈاکٹر تاثیر ایم اے پی ایچ ڈی، سید مقبول احمد ڈپٹی کلکٹر، جناب اقبال سلمانی صاحب جیسے مختلف الخیال اصحاب ایک جماعت مین نظر آتے ہین، یہ مجموعہ نہ صرف خرافات نگار کے جواب کی حیثیت سے بلکہ کلام اللہ اور وحی کے متعلق علمی حیثیت سے بھی مطالعہ کے لائق ہے،

عالمگیر تاریخ نمبر اور سالنامہ | مرتبہ حافظ محمد عالم صاحب تقطیع بڑی ضخامت علی الترتیب ۱۹۲، اور ۲۳۵ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت

تاریخ نمبر ۱۲، سالنامہ عہ، پتہ بازار سید مٹھا لاہور،

رسالہ عالمگیر نے اس سال دو خاص نمبر نکالے ہین، ایک تاریخ نمبر، دوسرا سالنامہ تاریخ نمبر کے بیشتر مضامین تاریخی یا تاریخی رنگ کے ہین، تاریخی مقالات مین "زیب النساء بیگم" پروفیسر سالک ایم اے، "عہد شاہجہانی کا نامور مؤرخ" جناب عبداللہ قریشی "سلطان شہید" حیدر علی صاحب بی اے مفید اور پر از معلومات ہین، مولانا ظفر علی خان کے "تاریخی جواہر ریزے" بھی دلچسپ ہین، تاریخی رنگ کے متعدد شذرے افسانے اور ڈرامے بھی ہین، تاریخی اور ادبی دونون حیثیتون سے یہ نمبر اچھا ہے،

سالنامہ بھی معمول کے مطابق مختلف رنگ اور مذاق کے مضامین کا مجموعہ ہے، یہ نمبر بھی سنجیدہ علمی اور تاریخی مضامین سے خالی نہیں لیکن تاریخ نمبر کے مقابلہ میں یہ مضمون معمولی ہیں تاہم ان میں "حقائق و معارف" مولانا ظفر علی خان"، "مالیاتِ عامہ اور اسلام"، عبدالرحیم شبلی، "مرزا سبزواری" مولوی محوی صدیقی معلومات کے اعتبار سے غنیمت ہیں، ادب اور افسانوں کا حصہ البتہ اچھا ہے، "پنیر کے سوراخ"، فضل حق صاحب قرشی" ڈاکٹر" جناب سالک لکھنوی" حسن سوگوار"، جناب ظفر واسطی "جھگڑے" آسی رام نگری اچھے افسانے ہیں،

نیرنگ خیال اردو مجلس دلی نمبر } مرتبہ جناب حکیم محمد یوسف حسن صاحب تقطیع بڑی ضخامت ۱۵۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت ۸ر، پتہ:-

نیرنگ خیال فیلنگ روڈ لاہور،

دلی کے خوش مذاق ادیب خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی نے اردو زبان کی خدمت کیلئے ایک مجلس قائم کی ہے، اسکے ہفتہ وار جلسون مین مجلس کے ارکان مختلف موضوعون پر مقالات اور نظمین پڑھتے ہین، نیرنگ خیال نے اردو مجلس دلی کے نام سے ان کو ایک خاص نمبر مین جمع کردیا ہے، اس مین زیادہ تر افسانے اور ڈرامے ہین، لیکن ستھرے اور مفید "آغا علینی رشادی کا خواب" اشرف صبوحی صاحب "اور حقیقی دوست"، جناب ماہر دہلوی، موثر اور سبق آموز اور "چار درویش" احترام اللہ صاحب، اور "پھدکتی مینا" دلچسپ ہین، علمی مضامین مین حامد علی صاحب کا مضمون "آثار ضنادید عجم" مفید ہے نظمون کا حصہ بھی اچھا ہے، اس نمبر کے تقریباً تمام مضمون نگار دہلی کے ہین اسلئے ادبی حیثیت سے سب مضامین بلند پایہ ہین،

سالنامہ ساقی مرتبہ جناب شاہد احمد صاحب تقطیع بڑی ضخامت ۲۰۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ پتہ: مؤلف ساقی دہلی،

یہ نمبر افسانون کی کثرت تنوع اور ضخامت کے اعتبار سے پوری کتاب ہے، افسانے بیشتر اچھے افسانہ نگارون کے قلم کے ہین، اور ان مین اختلاف ذوق کا بھی لحاظ رکھا گیا ہی اس کا بڑا حصہ دلچسپ اور پڑھنے کے لائق ہے، ایسے افسانون سے اردو مین افسانہ نگاری کا معیار قائم ہے، ہم نے قریب قریب کل افسانے پڑھے، اعظم کریوی، صادق الخیری، حجاب اسمٰعیل، ممتاز مفتی، بلونت سنگھ عظیم بیگ چغتائی، محمد نصیر الدین، شفیق الرحمٰن اور شرف صبوحی کے افسانے زیادہ پسند آئے،

ادب لطیف افسانہ نمبر مرتبہ چودھری برکت علی و چودھری نذیر احمد صاحبان تقطیع بڑی، ضخامت ۱۵۲ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۱۲ رپیہ:-

مکتبہ اردو لاہور،

یہ نمبر بھی افسانون کے تنوع اور دلچسپی کے اعتبار سے کامیاب ہی، گو اس کے افسانون کی تعداد ساقی سے کم ہے لیکن کیفیت مین اسکے برابر ہے، مختلف مذاق کے بیس بائیس افسانے ہین، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، بلال احمد، اوپندر ناتھ اشک، اختر انصاری، اور شفیق الرحمان کے افسانے خاص طور سے پڑھنے کے لائق ہین،

ہمدرد صحت قدرتی علاج نمبر مرتبہ جناب حکیم حافظ محمد سعید خان دہلوی تقطیع بڑی ضخامت ۱۶۴ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۲ رپیہ:-

ہمدرد منزل لال کنوان دہلی،

ہمدرد صحت ہر سال کسی اہم طبی موضوع پر خاص نمبر نکالتا ہے، اس مرتبہ اوس نے قدرتی علاج کے مختلف طریقون پر یہ نمبر نکالا ہے، تہذیب و تمدن اور فن طب کی روز افزون ترقی نے فطری علاج کو ذہنون سے بالکل فراموش کر دیا ہے، اور اب طبی علاج ناگزیر سا ہو گیا ہی حالانکہ اصل طریقہ علاج یہی ہی خصوصاً صحت کے بقاء و تحفظ کا مدار تو اب بھی بڑی حد تک فطری قوانین

کی پابندی پر ہے، اس نمبر مین پانی، غذا، آرام و سکون، ورزش جسمانی، مالش، صفائی، شعاع آفتاب مختلف رنگون، روزہ اور موسیقی وغیرہ فطری اصولون اور طریقون کے ذریعہ بقاے صحت اور امراض کے علاج پر مفید مضامین ہین، موضوع سے متعلق چند افسانے بھی ہین، یہ نمبر اطبا اور عوام دونون کے مطالعہ کے لائق ہے،

عصمت سالگرہ نمبر، مرتبہ رازق الخیری صاحب تقطیع بڑی ضخامت ۱۳۶ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت ۱۰ مرتبہ:- عصمت بک ڈپو دہلی،

عورتون مین تحریر وانشا، کا مذاق پیدا کرنے مین رسالہ عصمت کو بڑا دخل ہے، اس کے ذریعہ بہت سی خواتین ادبی دنیا مین روشناس ہوئین، یہ رسالہ شروع سے اب تک ایک معتدل روش پر قائم ہے، عورتون کے ذوق کے مضامین اور ان کے لئے مفید اور کارآمد معلومات پیش کرتا ہے، یہ نمبر بھی مضامین ومعلومات کے تنوع کے اعتبار سے عورتون کے مطالعہ کے لائق ہے، ڈاکٹر نصیر الدین احمد صاحب کے قلم سے مختلف قومون اور ملکون مین طلاق کے رواج اور قانون اور اسلامی قانون طلاق سے اسکے موازنہ پر مفید اور پر از معلومات مضمون ہے، البتہ تین طلاق کے مفہوم کی یہ نئی تشریح انکی طبعزاد ہے،

"م"

نئے رسالے

جہان آزاد (فارسی) مرتبہ جناب ع جائی تقطیع بڑی ضخامت ۴۴ صفحے کاغذ سپید اور ٹائپ روشن قیمت سالانہ ۳ روپے پرچہ ۴ رغیر ممالک سے صرف بقدر محصول زیادہ پتہ:- جائگاہ ادارہ دہلی،

ایک زمانہ مین کلکتہ کے مشہور فارسی اخبار جمل المتین نے بڑی شہرت حاصل کی تھی، اس کے بعد پھر ہندوستان سے کوئی قابل ذکر فارسی اخبار ورسالہ نہین نکلا، اب دہلی کے ایک متوطن ایرانی آقاے

ع جباری نے ہندوستان اور اس کے جوار کے فارسی بولنے والے ملکون اور قومون کے درمیان رابطہ اور اتحاد پیدا کرنے اور ایک کو دوسرے کے حالات سے باخبر رکھنے کے لئے جہان آزاد جاری کیا ہے، ہم نے اس کے دو نمبر دیکھے، اس مین موجودہ جنگ کے حالات، اسلامی دنیا کی پوزیشن، متحارب قوتون سے ان کے تعلقات، اور ان پر اس جنگ کے اثرات خصوصاً برطانیہ سے تعلقات پر زیادہ مضامین نظر آئے، بعض علمی و ادبی مضمون بھی ہین لیکن ان کی حیثیت ثانوی ہے، یہ رسالہ اس حیثیت سے ضرور مفید ہے، کہ اس کے ذریعہ ہندوستان مین فارسی زبان کی کچھ نہ کچھ خدمت ہو جائیگی، اور ہندوستان کے مسلمانون اور فارسی بولنے والے اسلامی ملکون کے درمیان ایک ادبی رابطہ پیدا ہو جائیگا،

ذکری مرتبہ مولانا عبداللہ مصری تقطیع بڑی ضخامت ۴۰ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت اوسط، قیمت سالانہ سے رشتہا ہی عہ، پتہ:- آستانہ عالیہ دائرہ شاہ حجت اللہ بہادر گنج الہ آباد،

الہ آباد کے دو دائرہ مدتون علم و فضل اور ارشاد و طریقت کا مرکز رہ چکے ہین، دائرہ شاہ حجت اللہ مین اسکی آخری یادگار مولانا شاہ محمد حسین مرحوم کی ذات تھی، ان کے بعد ان کے خلف الصدق مولانا شاہ محمد ولایت حسین مرحوم نے بڑی حد تک اس منصب کو سنبھالے رکھا لیکن اب وہ بھی اس دنیا سے اٹھ چکے، اور دائرہ شاہ حجت اللہ مین سناٹا تھا، خوشی کا مقام ہے، کہ مولانا مرحوم کے فرزند رشید مولانا محمد فاروقی فاضل مصر نے اپنی خاندانی روایات کو قائم رکھنے کے لئے رسالہ ذکری جاری کیا ہے، اس کا مقصد فلسفہ تصوف کی تشریح و اشاعت اور اس کے ذریعہ موجودہ دور کے الحاد و دہریت کا انسداد اور کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے حقائق کی ترجمانی ہے، ہم نے اس رسالہ کے کئی نمبر دیکھے، اس کے مضامین بڑی حد تک مقصد سے قریب ہین، کتاب اللہ و سنت رسول کی ترجمانی بھی ہے، صوفیانہ حقائق و معارف کی تشریح بھی اور متفرق مفید مذہبی مضامین

بھی دیندار مسلمانوں کے مذہبی معلومات اور ان کی تشفی کے لئے یہ مضامین کافی ہیں لیکن دہریت کے تدارک کیلئے فلسفہ، تصوف کے بجائے اسلامی تعلیمات کی حکیمانہ تشریح، اس کی روشنی میں جدید مسائل کا حل اور اسلام کی روشن تاریخ کو پیش کرنے کی ضرورت ہے، الحاد تصوف کے خلاف نہیں، بلکہ مذہب کے خلاف ہے، تصوف کا درجہ تو مذہب کے بعد آتا ہے، پھر تصوف میں بھی فنی اور نظری تصوف اور "احسان" کے فرق کو جس کا تعلق روح عمل سے ہے، پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے، مجموعی حیثیت سے موجودہ صورت میں بھی یہ رسالہ فائدہ سے خالی نہیں ہے، مولانا محمد میاں کے قلم سے طریقت و شریعت اور اسرار قرآنی کے مضامین اچھے ہیں نغمہ قدوسی خاص ارباب ذوق و وجد کے مذاق کی چیز ہے،

ہندوستانی ادب مرتبہ جناب غلام محمد خان صاحب ایم اے تقطیع بڑی، ضخامت ۶۴ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت سالانہ للہ مرنی پرچہ ہر پتہ منیجر ہندوستانی ادب چنچل گوڑہ حیدرآباد دکن،

حیدرآباد کے نوجوانوں میں اپنی زبان کی سنجیدہ خدمت کا جو جذبہ ہے، ہندوستانی ادب اس کا ایک نمونہ ہے، اس کا مقصد "مشترکہ زبان کی خدمت" ہے جس کی شہادت اس کے مضامین سے ملتی ہے، وہ ادبی حیثیت سے حیدرآباد کے اچھے رسالوں میں شمار ہونے کے لائق ہے، مضامین میں معلومات افادہ و دلچسپی ہر پہلو کا لحاظ ہے مستقل مضامین کے علاوہ "سائنس" "معلومات" اور "دلچسپیاں" کی سرخی کے تحت میں مختلف قسم کے مفید معلومات ہوتے ہیں، ہندوستانی زبان پر عبدالقادر صاحب سروری کا مضمون اچھا ہے، "سلطنت بہمنی کا اخلاقی سرمایہ" عبدالمجید صاحب صدیقی "تحریک نوعمران" ڈاکٹر عبدالمجید صاحب "فارسی زبان کا اثر دکن میں" ڈاکٹر کلیم اللہ حسینی "انصاف کی ضرورت اور اسکی تنقیدی قوت" محمد غوث صاحب ایم اے مفید مضامین ہیں، ادب اور افسانے کا حصہ بھی خاصہ ہے بعض مضامین

کی زبان البتہ کھٹکی، مثلاً "اجرا" کے بجائے "اجرائی" "ہنگی" کی جگہ "ہنگائی" ایک فقرہ ہے "زبان کے مشکل سے آسان کی طرف رفتاری کا ناقابل تردید رجحان" یہ فقرہ یوں زیادہ صاف اور سلیس طریقہ سے ادا ہو سکتا ہے، "مشکل زبان سے آسان زبان کی جانب شدید رجحان" "رفتاری" کا لفظ غلط بھی ہے، اور بے کار بھی، ان خفیف مسامحات سے اس رسالہ کی خوبی پر اثر نہیں پڑتا،

ادیب مرتبہ سید محمد ارتضیٰ صاحب واحدی و فصیح الدین احمد صاحب ایم اے،

تقطیع تقریباً اخباری، ضخامت ۱۲ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت سالانہ سہ

فی پرچہ ۸ر، پتہ:- چاندنی محل، دہلی،

دلی کے پرانے اڈیٹر واحدی صاحب نے یہ رسالہ نکالا ہے، جو ظاہری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے ان کے اسکول کے پرانے رسالوں سے بالکل مختلف ہے، ظاہری صورت بھی دیدہ زیب ہے اور ادبی حیثیت بھی بلند ہے، مضامین زیادہ تر ادبی ہوتے ہیں لیکن ستھرے اور مفید، ایک آدھ علمی اور سنجیدہ مضمون بھی نظر آجاتا ہے، پنڈت دتاتریہ کیفی کا مضمون "ہمارے رسالے" اور "مرکزیت و صوبیت" بھی خواہان اردو اور نوشق اڈیٹروں کے غور و تامل کے لائق ہے، خواجہ محمد شفیع دہلوی کے قلم سے کلام درد کی شرح کا سلسلہ مفید ہے، "دو سو برس پہلے کی دلی کے اہل کمال" خواجہ حسن نظامی دلچسپ ہے، "ہماری زندگی میں شاعری کی اہمیت" اور "مان نہ مان میں تیرا مہمان" اس لحاظ سے خاص طور پر پڑھنے کے لائق ہیں، کہ اول الذکر مضمون مسٹر ایچ جی ایونیز ڈپٹی کمشنر دلی کا ہے، اور دوسرا شاہزادہ احمد علی خان افغانی کا، دونوں نے اردو میں لکھا ہے، مسٹر ایونیز کی اردو نہ صرف صاف اور سلیس بلکہ ادیبانہ ہے، اور احمد خان کے مضمون میں اہل زبان کی زبان کا لطف ہے، ہر نمبر میں مختلف ادبی مضمون اور دلچسپ افسانے اور ڈرامے ہیں، ادبی لحاظ سے ادیب بڑی حد تک اہم بامعنی ہے،

ندائے حرم مرتبہ جناب مولوی ضیاء الدین احمد صاحب تقطیع بڑی ضخامت ۴۰ صفحے،

کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت سالانہ سے رفی پرچہ ۴ رپتہ:- ندائے حرم قرول باغ نئی دہلی،

ہندوستان کے علماء کا مشہور مدرسہ صولتیہ (مکہ معظمہ) ارض حرم میں ستر سال سے دینی علوم کی خدمت انجام دیرہا ہے، ندائے حرم اس کا ہندوستانی ترجمان ہوا وہ مدرسہ کی تبلیغ کی خدمت کیساتھ مفید علمی، مذہبی اور تاریخی مضامین بھی پیش کرتا ہے، "عہد نبوی میں پانچوان کالم" چودھویں صدی میں خط کوفی" اور "اسلام کا نظام دعوت واصلاح" اچھے مضامین ہیں، بصائر وحکم کے تحت میں اڈیٹر کے قلم سے مفید نوٹ ہوتے ہیں، اس رسالہ کی خریداری ہم خرما وہم ثواب ہے،

نوید مشرق مرتبہ سوہن لال صاحب ساحر وجناب درد نکودری، تقطیع بڑی، ضخامت ۲۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت اوسط قیمت سالانہ ۸ رفی پرچہ ۲ رپتہ:-

نوید مشرق پرجیت گنج کپورتھلہ،

یہ رسالہ حال ہی میں کپورتھلہ سے نکلا ہے، اس کی قابل ذکر خصوصیت یہ ہے، کہ ایک خوش مذاق ہندو ادیب نے اردو زبان کی خدمت کے لئے نکالا ہے، اوّل ادبی حیثیت سے آجکل کے عام رسالوں سے بُرا نہیں ہے، مختلف ذوق کے مفید مضامین ہوتے ہیں، شاعبش "سہیل سلاسی" "سوہن لال صاحب" اور شاہزادہ محمد اکبر" کو ثر چاندپوری اچھے مضمون ہیں، افسانوں کا حصہ بھی غنیمت ہوا امید ہے کہ اس کے ذریعہ کپورتھلہ کے اصحاب ذوق میں اردو کا مذاق پیدا ہوگا،

ہمالہ مرتبہ جناب سید حسین صاحب جامعی وعبدالعلیم صاحب آسی تقطیع بڑی، ضخامت ۶۴ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت سالانہ ۱۲ رفی پرچہ ۱- ۱ر

دفتر ہمالہ لہریاسرائے دربھنگہ،

دربھنگہ (صوبہ بہار) میں اردو کے اخبارات ورسالوں کا چرچا کم ہے لیکن اب اس کا مذاق پیدا ہوچلا ہے، ہمالہ اسی کا نتیجہ ہے، ادبی لحاظ سے ابھی اس کا معیار عام رسالوں سے

کسی قدر کم ہے، مضامین میں زیادہ تر افسانے ہیں کہیں کہیں زبان کی غلطیاں بھی نظر آئیں، ہندوستانی زبان کا سمجھنا نسبتہً اچھا مضمون ہے، البتہ نظموں کا حصہ بہتر ہے، گو ابھی یہ رسالہ ابتدائی منزل میں ہے لیکن دربھنگہ کی ادبی فضا کو دیکھتے ہوئے غنیمت ہے، امید ہے کہ رفتہ رفتہ یہ معمولی خامیاں دور ہو جائیں گی، اور اس کے ذریعہ دربھنگہ کے نوجوانوں میں اردو ادب کا مذاق پیدا ہوگا،

تعلیم و تربیت، مرتبہ جناب ڈاکٹر عبد الوحید صاحب بی، ایچ ڈی، تقطیع بڑی، ضخامت ۳۲ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت سالانہ عہ

فی پرچہ ۳ پیسہ:- فیروز سنسنز ۱۹ اسٹریچن روڈ لاہور،

چھوٹے بچوں کا یہ رسالہ حال ہی میں نکلا ہے، جدید اصول کے مطابق مضامین میں بچوں کی علمی و عملی تعلیم، اخلاقی تربیت، عام مفید معلومات اور ذوق و تفریح ہر پہلو کا لحاظ ہے، اور بچوں کی تعلیم و تفریح دونوں اعتبار سے ان کیلئے مفید اور دلچسپ ہے، "م"

تابعین

علم و عمل اور مذہب و اخلاق میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین اور ان کے تربیت یافتہ تابعین کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور صحابۂ کرام کے بعد ان ہی کی زندگی مسلمانوں کے لئے نمونۂ عمل ہے اسلئے سیر الصحابہ کی تکمیل کے بعد دار المصنفین نے اس مقدس گروہ کے حالات کا یہ تازہ مرقع مرتب کیا ہے، اس میں حضرت عمر رضؓ بن عبد العزیز، حضرت حسن رضؓ بصری، حضرت اویس رضؓ قرنی، حضرت امام زین العابدین رضؓ، حضرت امام باقر رضؓ، حضرت امام جعفر صادق رضؓ، حضرت محمد بن حنیفہ رضؓ، حضرت سعید بن مسیب رحؒ، حضرت سعید بن جبیر رضؓ، حضرت محمد بن رضؓ سیرین، حضرت ابن شہاب رضؓ زہری، امام ربیعہ رضؓ رائی، امام مکحول شامی رضؓ، قاضی شریح رحؒ وغیرہ چھیانوے اکابر تابعین رضؓ کے سوانح، انکے علمی، مذہبی، اخلاقی اور عملی مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل ہے،

مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی، ضخامت ۵۶۰ صفحے، قیمت للعہ

مینیجر

مطبوعات جدیدہ

پاکستان اور ہندوستان مرتبہ جناب سید عبدالقدوس صاحب ہاشمی ندوی، تقطیع چھوٹی ضخامت ۳۳۶ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد ۸؍ پتہ:-

دارالاشاعت سیاسیہ شاہراہ عثمانی حیدرآباد دکن،

پاکستان کی تجویز کی موافقت اور مخالفت مین بہت کچھ لکھا جاچکا ہے، یہ کتاب اسکی تائید وحمایت مین ہے، اس میں اس خیال کے مسلمانون کے نقطۂ نظر سے پاکستان کی تجویز کو مذہبی سیاسی اور دلائل اس کے تاریخی اور جغرافی شواہد، اس کے مؤید مسلمانون ہندوؤن اور انگریزون کے بیانات اسکے مختلف نقشے اور تجویزین اعتراضات اور مشکلات کا جواب ہر پہلو کے متعلق معلومات اور دلائل جمع کر دیئے گئے ہین، جو لوگ پاکستان کی تجویز کو سمجھنا چاہتے ہین، ان کے لئے اس مین کافی مواد ہے، ضمناً مسلمانون کے مذہب کلچر اور قومیت وغیرہ کے مباحث بھی آگئے ہین، گو یہ تجویز مسلمانون کی متفقہ آواز نہین ہے، اور بہت سے اربابِ فکر مسلمان اس کو نہ صرف ناممکن العمل بلکہ مسلمانون کی شاندار روایات، انکی خود اعتمادی، اور اسلام کی فاتحانہ اسپرٹ کے خلاف سمجھتے ہین، لیکن اب یہ مسئلہ اس حد تک پہنچ چکا ہے، کہ اسے نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ اس کے حل کے بغیر ہندوستان کی سیاسی گتھی نہین سلجھ سکتی، اس لئے موافقین اور مخالفین دونون کے لئے لائقِ غور ہے، درحقیقت یہ مسئلہ تنگ دل اور تنگ نظر ہندوؤن کا پیدا کردہ ہے انہی نے اسکو بڑھنے اور پھیلنے کا موقع دیا، اب بھی وہ مسلمانون کا اعتماد حاصل کرکے اسکو ختم کرسکتے ہین

پاکستان کا تخیل خواہ کیسا ہی ہو، لیکن موجودہ فضا مین نہ صرف ہندوستان بلکہ اس کے ہر شہر اور ہر گاؤن مین ایک ایک پاکستان بنتا جاتا ہے، جس کا تدارک صرف ہندوؤن کے ہاتھ مین ہے،

محاسن سجاد، مرتبہ مولنا مسعود عالم صاحب ندوی، تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۰ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر قیمت :- عہ رعلاوہ محصول ڈاک، پتہ :- الہلال بک ایجنسی بانکی پور پٹنہ،

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد مرحوم نائب امیر شریعت بہار کی ذات تعارف سے مستغنی ہے، ان کی شخصیت علم وفضل، زہد وورع، فہم وتدبیر، معاملہ فہمی ودوراندیشی، اخلاص وللہیت، قوت عمل ودینی حمیت، قومی درد ایثار وقربانی کے لحاظ سے طبقہ علما مین ممتاز تھی، اوران کی ایمانی فراست کا سکہ نہ صرف علما، بلکہ موجودہ زمانہ کے سیاسیین تک بیٹھا ہوا تھا، انکی زندگی کا بڑا حصہ دین وملت کی بے لوث خدمت مین گذرا، ان کی ذات ملک وملت کے خدمتگذارون کے لئے نمونہ تھی، مولانا مسعود عالم ندوی نے ان کی یادگار مین ان کے احباب اور جاننے والون کے قلم سے ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤن پر مضامین لکھا کر محاسن سجاد کے نام سے انھین شائع کیا ہے، اس مین ان کی سیرت، ذاتی حالات علمی وتعلیمی زندگی، مذہبی وسیاسی خدمات پر تیرہ مضمون ہین جس سے مرحوم کی مجاہدانہ زندگی اوران کے کارنامون کا ہر رُخ سامنے آجاتا ہے، اس مرقع مین جناب راغب احسن صاحب کا مضمون کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے، اس کا نہ ہونا بہتر تھا، مرحوم کا یہ تذکرہ دین وملت کے خدمت گذارون کے لئے سبق کی حیثیت رکھتا ہے،

مقدمہ تاریخ دکن مؤلفہ جناب عبدالمجید صاحب صدیقی استاذ تاریخ، جامعہ عثمانیہ ضخامت ۱۴۴ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ رپتہ سب رس کتاب گھر خیریت آباد حیدرآباد دکن،

اس مقدمہ مین دکن کے ان تمام فرمانروا خانوادون کی تاریخ کا اجمالی نقشہ ہے، جنھون نے تاریخ کے معلوم زمانہ سے لیکر اس وقت تک سرزمین دکن پر حکومت کی، مقدمہ کے شروع مین دکن کی تاریخ پر مختصر تبصرہ ہے، اس کے بعد مختلف دورون کے خانوادون کا حال ہے، پہلے حصہ مین ان ہندو خانوادون کا ذکر ہے، جنھون نے قدیم زمانہ سے لیکر مسلمانون کے پہلے تک حکومت کی، دوسرے حصہ مین درمیانی دور کے مسلمان اور ہندو خانوادون کا حال ہے، تیسرے حصہ مین خاندان پیشوا خاندان آصفیہ اور میسور کے حالات ہین، چوتھے حصہ میں ارکاٹ اور کرنول وغیرہ کی نوابیون کا تذکرہ ہے، ہر خاندان کے شروع مین اسکی مختصر تاریخ، اور اس کے فرمانرواؤں کا پورا شجرہ ہے، جہانتک ہوسکا ہے، ان کے سنین بھی دیدے گئے ہین، یہ مقدمہ درحقیقت اس مفصل تاریخ کا خاکہ ہے جس کی تالیف مولف کے پیش نظر ہے، موجودہ صورت مین بھی یہ مقدمہ دکن کی تاریخ کے مطالعہ مین رہنمائی کا کام دیسکتا ہے،

بیان غالب مرتبہ جناب آغا محمد باقر صاحب ایم اے تقطیع چھوٹی ضخامت ۶۴۰ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد عہ غیر مجلد عہ پتہ شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور،

کلام غالب کی گوناگون خصوصیات کیساتھ اسکی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی متعدد شرحین لکھی جاچکی ہین، اور اب تک اس کا سلسلہ جاری ہے، جناب مرتب نے اس کتاب مین اختصار کے ساتھ ان تمام شرحون کو جمع کر دیا ہے، خود مولف کے الفاظ میں اس کتاب کا مقصد اور اسکی خصوصیت یہ ہے: اس کتاب کی تالیف سے میرا مطلب صرف اس قدر ہے کہ دیوان غالب کی شرح پڑھنے والون کو اگر بالتفصیل نہیں تو مجملاً اس قدر ضرور معلوم ہوجائے کہ مختلف شارحین نے غالب کے ہر شعر کو کس نقطۂ نظر سے دیکھا ہے اور اس کے مفہوم میں کیا کیا شگوفیاں

کی ہین، چنانچہ جن اشعار پر شارحین نے اختلاف کیا ہے، مین نے کوشش کی ہے کہ مختصراً ان کے نقطۂ نظر کو پیش کر دیا جائے، تاکہ پڑھنے والا آسانی سے سمجھ جائے، کہ اس شعر کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہے، طوالت کے خوف سے مین نے اختصار کو مدنظر رکھا ہے لیکن پھر بھی یہ خیال سامنے رہا ہے، کہ کوئی ضروری بات نظر انداز نہ ہونے پائے" اس بیان سے ظاہر ہے کہ مؤلف نے اس میں خود کوئی اضافہ نہین کیا ہی تاہم اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس کے بعد غالب کی اور تمام شرحون کی احتیاج باقی نہین رہتی، اور نفس شرح کی حد تک اس مین وہ تمام ضروری باتین موجود ہین جن کیلئے مختلف شرحون کی ورق گردانی پڑتی ہی،

کمپنی کی حکومت، مؤلفہ جناب باری، تقطیع چھوٹی ضخامت ۳۸۴ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عاریتہ:- مکتبہ اردو، لاہور

اس کتاب کا پہلا اڈیشن آج سے کئی سال پہلے شائع ہوا تھا، معارف مین اس پر ریویو بھی ہو چکا ہے، اب نظر ثانی اور مفید اضافون کے بعد دوسرا اڈیشن شائع ہوا ہے، اس میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے وحشیانہ دور حکومت کی پوری تاریخ ہی، کہ اس نے کن کن پر فریب اور ظالمانہ طریقون سے ہندوستان پر قبضہ کرکے اس کی صنعت و حرفت اور تجارت کو برباد کیا اور اسکی دولت و ثروت چھین کر اسے مفلس و محتاج بنایا، یہ کتاب درحقیقت ایسٹ انڈیا کمپنی کی وحشت و بربریت اور اس کے ہاتھون ہندوستان کی تباہی کی تاریخ ہے، انگریزی مین اس دور کی بہت سی تاریخین ہین، ان مین باسو کی تاریخ ہندوستان مین نصرانی اقتدار کا عروج بہت مستند اور مشہور ہے، یہ کتاب زیادہ تر اسی سے ماخوذ ہے، گو انگریزی کتابون کے مقابلہ مین یہ کتاب بہت مختصر ہے لیکن اردو مین اتنے معلومات بھی نہین ملین گے، اس اعتبار سے یہ کتاب بہت غنیمت ہی اور ہمارے نوجوانون کے پڑھنے کے لائق ہے،

سوگوار شباب از جناب مجنون گورکھپوری تقطیع بڑی ضخامت ۱۳۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت غیر مجلد ۴ مجلد ۶ پتہ ایوان اشاعت گورکھپور،

جناب مجنون گورکھپوری کا یہ افسانہ رسالہ ایوان مین مسلسل نکل چکا ہے، اب انھون نے اُسے کتابی شکل دیدی ہی، مصنف ٹامس ہارڈی سے بہت متاثر ہین، اسلئے اسکی رومانیت اور قنوطیت ان کے افسانون کی خصوصیت بن گئی ہی، یہ افسانہ بھی ہارڈی کے ایک ناول (Far from the Madding Crowd) کے مطالعہ کے اثر کا نتیجہ اور رومانیت اور قنوطیت کے لطیف امتزاج کا دلکش المیہ نمونہ ہی، اس مین مصنف کی فسانہ نگاری کی تمام خصوصیات نمایان ہین، افسانہ کا پلاٹ بھی بہتر ہی، اور مصنف کے قلم کی رنگ آمیزی نے اس کو اور زیادہ دلکش اور مؤثر بنا دیا ہی، حسن کی رعنائیون عشق کی شورش وپاکبازی فطری جذبات کے مد وجزر، نسوانی کردار کی بلندی اس کے ایثار وقربانی، حرمان ونامرادی، واردات محبت کی تمام وجدانی کیفیتون کو نہایت موثر پیرایہ مین بیان کیا گیا ہے، مصنف نے مشتاق اور سائرہ دونون کی سیرتون مین توازن قائم رکھنے کی کوشش کی ہی لیکن مشتاق کے مقابلہ مین سائرہ کا اخلاقی پایہ علانیہ بلند نظر آتا ہے، یہ افسانہ پلاٹ کی خوبی اور ادبی حیثیت دونون لحاظ سے پڑھنے کے لائق ہے،

آسان اردو، شائع کردہ انجمن ترقی اردو حیدرآباد دکن تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۵۸ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۸ر پتہ انجمن ترقی اردو جوبلی ہل بنجارہ روڈ حیدرآباد دکن،

بالغون کی تعلیم کے سلسلہ مین جو کتابین لکھی گئی ہین ان مین عموماً بچون کے ذوق کے قصے درکہانیان ہین جن سے تعلیمی مقصد تو حاصل ہوجاتا ہی لیکن معلومات مین کوئی اضافہ نہیں ہوتا، اس پہلو کو پیش نظر رکھکر یہ رسالہ لکھا گیا ہی، چنانچہ اس مین مختلف زمانون کے آٹھ بڑے اور تاریخی اشخاص کے حالات چند اصلاحی افسانے اور دور جدید کی بعض اہم ایجادات کا مختصر حال، اور آخر مین چند مفید نظمین ہین، زبان سادہ اور آسان ہی، بچون اور بالغون دونون کے لئے یہ رسالہ مفید ہے،

" م "

"جلد ۸۴" ماہ شعبان المعظم ۱۳۶۱ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۴۲ء "عدد ۳"

مضامین

شذرات،	سید سلیمان ندوی،	۱۶۲-۱۶۴
دونوں جہاں کی بادشاہی،	"	۱۶۵-۱۷۰
حافظ جلال الدین سیوطی،	مولوی محمد ادریس صاحب ندوی،	۱۷۱-۱۸۵
	نگرانی رفیق دارالمصنفین،	
محسن کاکوروی اور ان کی خصوصیات،	جناب محمد ابواللیث صاحب صدیقی	۱۸۶-۲۰۵
	ریڈر اردو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ	
مجمع النفائس،	جناب اقبال انصاری ایم اے ریسرچ	۲۰۶-۲۱۷
	اسکالر پی ایچ ڈی لکھنؤ یونیورسٹی،	
عربی زبان کے جدید رجحانات،	"ص ع"	۲۱۸-۲۲۵
اخبار علمیہ،	"	۲۲۶-۲۲۸
جبریل و ابلیس،	پروفیسر محمد اکبر منیر ایم اے،	۲۲۹-۲۳۵
مطبوعات جدیدہ،	"م"	۲۳۶-۲۴۰

مقالات شبلی حصہ ہشتم — مولانا کے قومی و اخباری مضامین کا مجموعہ جو الندوہ مسلم گزٹ اور دوسرے رسائل و اخبارات سے یکجا کئے گئے، ضخامت ۲۰۳ صفحے، قیمت: عہ مر "منیجر"

شذرات

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں ایک "ہسٹاریکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" کی بنیاد ڈالی گئی ہے جس کا مقصد اسلامی تاریخ پر مستند اور محققانہ کتابوں کی اشاعت ہے، اس سلسلہ میں ہندوستان میں عہد اسلامی میں طریق عدالت کی تاریخ پر ایک انگریزی کتاب شائع ہوئی ہے، اس کتاب پر جو ریویو نکلے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کے مباحث خاص اہمیت رکھتے ہیں،

یہ سُنکر بھی خوشی ہوئی کہ اس انسٹی ٹیوٹ کی مالی امداد کے لئے نواب صدر یار جنگ بہادر نے پچاس روپیے ماہوار منظور کئے ہیں، اور نواب مزمل اللہ خاں مرحوم کی ریاست کی طرف سے یکمشت چھ ہزار کی رقم عنایت ہوئی، ان کے علاوہ جناب محمد بشیر احمد صاحب آئی سی ایس نے دو سو پینتیس روپیے پیش کئے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ اِن اوسوں پیاس نہیں بجھ سکتی، ضرورت ہے کہ کم از کم پچاس ہزار کا سرمایہ اس کے لئے الگ کیا جائے، اور اس روپیے کو صرف نام پر نہیں بلکہ کام پر خرچ کیا جائے، اس مجلس کی انتظامیہ کمیٹی نے یہ بھی طے کیا ہے کہ جن مصنفوں کی کتابیں اس سلسلہ میں اشاعت کے لئے منظور کی جائیں گی انکو انکی تصنیف کا معاوضہ بھی دیا جائیگا

ہماری رائے میں ابھی کمیٹی کو اس عالی ہمتی کی ضرورت نہ تھی اگر شروع میں طمع کے بجائے اخلاص کارفرما ہو تو بہتر ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ اس مجلس کے کام کو "عیش" کے طور پر نہیں

بلکہ کاروباری طور پر چلایا جائے جس سے بہت ممکن ہے کہ وہ اپنے پاؤں پر آپ کھڑی ہو جائے

رحمت عالمؐ کی فروخت کے سرمایہ میں بحمداللہ کہ اس وقت تک تین ہزار چھ سو روپے دفتر میں جمع ہو گئے ہیں، کچھ سو مختلف شہروں میں ایجنٹوں کے پاس باقی ہوں گے، جس کے یہ معنی ہیں کہ اس مد میں چار ہزار کے قریب ہو جائیں گے، ابھی ۸۰۰ کے قریب جلدیں اور باقی ہیں، اگر احباب توجہ کریں تو چند ہی روز میں اس کے دوسرے اڈیشن کی ضرورت ہو جائیگی

سب کو معلوم ہے کہ یہ پوری رقم مصارف طبع کی منہائی کے بعد جو کم و بیش ایک ہزار ہے، دارالعلوم ندوہ کے چھوٹے بچوں کے دارالاقامہ کی تعمیر میں صرف ہو گی، اس عمارت کا مختصر سا نقشہ بن گیا ہے، جس میں ۱۳ × ۲۱ کے پانچ کمرے رکھے گئے ہیں، جن کا کم از کم تخمینہ سات ہزار روپیہ ہوتا ہے، یعنی ہماری مد میں ابھی تین ہزار کی کمی ہے، کام تو بہرحال شروع ہو جائیگا جس خدا نے یہاں تک سامان کیا ہے وہ باقی کا بھی سامان کر دے گا، انشاء اللہ تعالیٰ،

رحمت عالمؐ کے ہندی ترجمہ کی جو تجویز تھی خدا کا شکر ہے کہ وہ بھی عمل میں آ رہی ہے، ہندی ترجمہ کا کام پورا ہو گیا اور وہ اس وقت جسٹس مولوی معین الدین صاحب انصاری (رامپور) کے پاس ہے، موصوف اس پر ہندی میں مقدمہ لکھنا چاہتے ہیں، وہاں سے آ جائے تو وہ پریس میں بھیجوا دیا جائے، جن احباب نے اس کے چندہ میں حصہ لینے کا ارادہ ظاہر کیا تھا، ضرورت ہے کہ وہ اب ایفا بھی فرمائیں،

امسال دسمبر میں حیدرآباد میں ملک کی بڑی بڑی علمی و تعلیمی مجلسوں کے جلسے ہیں، آل انڈیا اورینٹل کانفرنس، انڈین ہسٹاریکل کانگریس، اور شاید علی گڈھ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے لائف اجلاس وہاں ہوں گے، امید ہے کہ ملک کے اہلِ علم اور اصحابِ کمال دور دور سے آکر اس میں شرکت کریں گے،

پنجاب کے بعض مسلمان اہلِ علم و اہلِ قلم اصحاب نے آل انڈیا مسلم ہسٹری کانگریس کی بنیاد ڈالی ہے، جس کا اجلاس آیندہ نومبر میں لاہور میں ہو رہا ہے، بہت سے اکابر کے نام اسکی دلچسپی اور ترتیب میں شامل ہیں، جن میں بعض ہمارے احباب بھی ہیں، جن کے اخلاص اور عمل سے بہت کچھ امیدیں ہیں،

ادارۂ معارفِ اسلامیہ لاہور کا پچھلا اجلاس دہلی میں ہوا تھا، جس کی روداد یا چھپ گئی ہے یا چھپ رہی ہے، اور اس کے آیندہ اجلاس کی تجویز دار المصنفین اور طلبائے قدیم ندوۃ العلماء کی دعوت پر لکھنؤ میں ہوئی تھی، لیکن جنگ کے ناگزیر اسباب کی بنا پر اب تک یہ اجلاس منعقد نہ ہو سکا، خیال ہے کہ جنگ کے خاتمہ کے انتظار میں اس جلسہ کو ملتوی نہ کیا جائے، اور ۱۹۴۲ء کے آغاز میں اپریل تک اس کے انعقاد کی کوشش کی جائے، امید ہے کہ دار المصنفین اور ندوۃ العلماء کے علاوہ مسلم یونیورسٹی اور لکھنؤ یونیورسٹی سے بھی اس میں امداد حاصل کی جائے، مصارف کا تخمینہ ہزار بارہ سو ہے،

مقالات

اسلام

دونون جہان کی بادشاہی

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا مین دین اور دنیا دونون کی برکتین لیکر آئے، آپنے صرف آسمانی بادشاہی کی خوشخبری نہین سنائی، بلکہ آسمانی بادشاہی کے ساتھ دنیا کی بادشاہی کی بھی بشارت دی تاکہ دنیا مین خدا کی بندگی بے خوف و خطر کیجا سکے، اور خدا کی بادشاہی دنیا مین قائم ہو،

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا	خدانے اون سے جو ایمان لائے اور اچھے
الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي	عمل کئے، یہ وعدہ کیا کہ وہ ان کو زمین مین
الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ	حاکم بنائے گا جیسا کہ ان کو حاکم بنایا تھا جو
قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي	ان سے پہلے تھے، اور ان کے لئے ان کے
ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ	اس دین کو جس کو اوس نے ان کے واسطے
خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ	پسند کیا ہے جما دیگا اور ان کو ان کی اس
بِيْ شَيْئًا	بے امنی کے بدلہ امن دیگا، میری بندگی
(نور - ۷)	کرین گے، میرا کسی کو ساجھی نہ بنائین گے،

اور اس کے لئے خدا کے نافرمانون سے لڑائی لڑی جائے، تاکہ سارا حکم اوسی ایک کا ہوجائے،

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (انفال-۵) اوران سے لڑتے رہو، یہان تک کہ فساد نہ رہے، اور سب حکم اللہ کا ہوجائے،

قرآن نے خدا کے بعض نیک بندون کی دعا یہ بتائی ہے،

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ (بقرہ-۲۵) اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا مین بھلائی دے، اور آخرت مین بھلائی دے اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا،

آخرت کی بھلائی تو معلوم ہے، لیکن دنیا کی بھلائی ہمارے مفسرون نے یہ بتائی ہے، علم وعبادت، تندرستی، روزی، مال ودولت، فتح ونصرت، اولاد صالح، مگر یہ بھی خدا کے اطلاق کی تحدید ہے، دنیا کی بھلائی دنیا کی ہر وہ بھلائی ہے، جو خدا کی شریعت مین جائز ہے، ایک اور جگہ فرمایا،

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ، (نحل-۴) اور جنھون نے نیک کام کئے ان کے لئے دنیا میں بھلائی ہے، اور آخرت کا گھر سب سے اچھا ہے، اور پرہیزگارون کا گھر کیسا اچھا ہے،

مقصود یہ ہے کہ نیکوکارون کے لئے دنیا کی بھلائی اور عزت بھی ہے، اور آخرت کی بھی، لیکن آخرت کی بھلائی دنیا کی بھلائی سے زیادہ بہتر اور زیادہ خوب ہے،

جن لوگون نے خدا کی راہ مین اپنی جانون کی بازی لگائی ہے، ان کو بشارت ہے،

فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (آل عمران-۱۴۸) تو اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب اور آخرت کا بھلا ثواب عنایت کیا

الْمُحْسِنِيْنَ (آل عمران - ۱۵) اور اللہ نیکی والون کو چاہتا ہے،

دنیا کا ثواب فتح و نصرت، کامیابی و عزت، مال و دولت اور حکومت و سلطنت ہے، جنھون نے خدا کی راہ مین اپنا گھر بار چھوڑا، اور خوشی خوشی ہر طرح کی تکلیف جھیلی، خدا نے ان کو دونون جہان کی نعمتین بخشین،

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ، (نحل - ۶)

اور جنھون نے گھر چھوڑا اللہ کے لئے ستائے جانے کے بعد ہم ان کو دنیا مین اچھا ٹھکانا دین گے، اور بیشک آخرت کی مزدوری سب سے بڑی ہے،

دنیا کا اچھا ٹھکانا، دنیا کی ہر جائز نعمت اور سطوت و حکومت ہے،

ان سب آیتون مین یہ بات خیال کے قابل ہے، کہ ایمان اور نیکی والون کو گو دنیا اور آخرت دونون کی بھلائی کی امید دلائی گئی ہے، مگر ہر جگہ یہ بتا دیا گیا ہے کہ دنیا کی ہر بھلائی سے آخرت کی بھلائی اونچی اچھی اور پائدار ہے، اسی لئے دنیا کی بھلائی ہماری زندگی کا اوّلین مقصد نہین بلکہ ثانوی مقصد ہو یعنی آخرت کے کامون کے صدقہ مین ہو، ورنہ اگر دنیا ہی کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا، تو دنیا تو مل جائے گی مگر آخرت ہاتھ نہ آئیگی،

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا

جو کوئی دنیاوی زندگی اور اوس کی آرایش چاہے تو ہم ان کے عمل ان کو اسی دنیا مین بھر کر دیتے ہین، اور کمی نہین کیجاتی، یہ وہ ہین جن کے لئے آخرت مین دوزخ کے سوا کچھ نہین، اور وہان جو کیا تھا مٹ گیا

يَعْمَلُونَ، (ھود - ۲) اور ان کی کمائی اکارت ہوئی،

مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہو، تو ہم
نَزِدْ لَهُ فِي حَرْثِهِ ج وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ اسکی کھیتی بڑھاتے ہین، اور جو دنیا کی کھیتی
حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَا لَهُ چاہتا ہو تو ہم دنیا مین سے اوس کو کچھ دیتے
فِي الْآخِرَةِ مِنْ نَصِيبٍ ٥ (شوری ۳) ہین، اور آخرت مین اس کا کچھ حصہ نہین،

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا جو کوئی چاہتا ہو دنیاے عاجل کو تو ہم جلد
لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ ثُمَّ دیدیتے ہین جس کو جو چاہتے ہین، پھر ہم
جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ ج يَصْلَاهَا مَذْمُومًا نے اوس کے لئے دوزخ کو بنایا ہے، وہ
مَدْحُورًا ٥ وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَ اس مین داخل ہوگا برا ہو کر ڈھکیلا جاکر،
سَعَى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَئِكَ اور جو کوئی آخرت چاہے، اور اس کی
كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا ٥ پوری کوشش کی، اور وہ ایمان والا ہو
(بنی اسرائیل - ۲) تو وہی ہین جن کی کوششون کی قدر کیجائیگی

مَنْ كَانَ يُرِيدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا تو جو کوئی دنیا کا ثواب چاہتا ہے، تو
فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ (اسکو معلوم ہو کہ اللہ کے پاس دنیا اور
(نساء - ۱۹) آخرت دونون کا ثواب ہے،

پھر وہ کتنا احمق ہے، جو صرف دنیا کے ثواب کا طالب ہے، حالانکہ خدا کے پاس تو دونون جہان کے خزانے ہین،

غرض یہ ہو کہ جو تنہا دنیا کا طالب ہے وہ آخرت سے محروم ہے، لیکن جو آخرت کا طلبگار رہے اسکے لئے دونون گھرون کے دروازے کھلے ہین،

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت حکومت اور سلطنت اور دنیا کی سیاست داری ہی، یہاں تک کہ کتاب اور نبوت کی دولت کے بعد اسی کا درجہ ہی،

فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُمْ مُلْكًا عَظِيمًا (نساء ۷)

تو ہم نے ابراہیم والوں کو کتاب اور حکمت دی، اور بڑی سلطنت بخشی،

حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کو کہتے ہیں،

يَا قَوْمِ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَعَلَ فِيكُمْ أَنْبِيَاءَ وَجَعَلَكُمْ مُلُوكًا، (مائدہ - ۴)

اے میرے لوگو! اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو، جب تم میں نبی بنائے، اور تم کو بادشاہ بنایا،

یہ نعمت کسی کے دینے لینے سے نہیں ملتی اس کا مالک اللہ تعالیٰ ہے، وہ جس کو چاہی دے اور جس سے چاہے چھین لے،

اللَّهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ، (آل عمران ۳)

اے اللہ! اے سلطنت کے مالک! تو جسے چاہے، سلطنت بخشے، اور جس سے چاہے چھین لے،

وہ دیتا کس کو اور چھینتا کس سے ہے، اس کے متعلق اوس نے اپنا قاعدہ کلیہ بتا دیا ہی،

إِنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ إِنَّ فِي هَٰذَا لَبَلَاغًا لِقَوْمٍ عَابِدِينَ (انبیاء - ۷)

بیشک زمین کے مالک میرے صالح بندے ہوتے ہیں، اس اعلان میں خدا کے فرمانبردار بندوں کے لئے پیام ہے،

مسلمانوں کو جب اس نعمت ملنے کی بشارت ملی تھی، تو ساتھ ہی یہ بتا دیا گیا کہ یہ نعمت اُن کے کن کاموں کا معاوضہ ہی، فرمایا،

وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۭ اِنَّ	اور البتہ خدا اسکی مدد کریگا، جو اسکی مدد کرتا ہے،
اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ	بیشک اللہ زبردست قوت والا ہے، وہ کہ ہم
فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ	اگر ان کو زمین میں جما دیں تو وہ نماز کھڑی
اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا	کریں، زکوٰۃ دیں، اچھے کاموں کو کہیں،
عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ	اور برے کاموں سے روکیں اور ہر کام
(حج - ۶)	کا انجام خدا کے اختیار میں ہے،

اور ظاہر ہے کہ جو اچھے کاموں کو کہے گا، اور برے کاموں سے روکے گا، وہ پہلے خود اچھا ہوگا، اور برے کاموں سے باز رہتا ہوگا، خدا کی مدد کرنیکے معنی یہ ہیں کہ خدا کے دین حق کی مدد کیجائے، جو لوگ حق کی مدد کے لئے اٹھتے ہیں، خدا ان کی مدد فرماتا ہے، ان آیتوں سے یہ اشارہ بھی نکلا، کہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں خدا کے قانون کے اجرا کی طاقت ہونی چاہیئے، چنانچہ اسلام میں سارے حدود اور تعزیرات اسی منشار کے مطابق ہیں، زنا کی حد میں فرمایا،

وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ	اور تم کو ان دونوں (زانیوں) پر اللہ کی حد
اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ	جاری کرنے میں کوئی ترس نہ آوے اگر تم اللہ
الْاٰخِرِ ۚ (نور - ۱)	اور پچھلے دن پر یقین رکھتے ہو،

سود کے اسلامی قانون کو جو نہ مانے، اس کو اللہ اور رسول سے لڑائی کیلئے تیار ہونا چاہیئے،

فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ	تو اے سود کھانے والو، اللہ اور اسکے
(بقرہ - ۳۸)	رسول سے لڑنے کے لئے خبردار ہو جاؤ

اسی لئے نجران کے عیسائیوں سے آپنے صلح کا جو معاہدہ کیا تھا، اسکی ایک دفعہ یہ تھی کہ اگر وہ سودی لین دین کرینگے تو یہ معاہدہ ختم ہو جائے گا، (ابو داؤد باب اخذ الجزیہ)

حافظ جلال الدین سیوطی

از

مولوی محمد اویس صاحب ندوی نگرامی رفیق دارالمصنفین

ذیل کے صفحات مین مسلمانون کے جلیل القدر عالم اور کثیر التصانیف مصنف حافظ جلال الدین سیوطی کے حالات پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ہم کو اس کا اعتراف ہے کہ حسب خواہش حافظ سیوطی کا مرقع ہم ناظرین کے سامنے نہ رکھ سکے، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اگلے سوانح نگارون نے ان کے حالات مین بہت اختصار سے کام لیا ہے! بہرحال پیش نظر کتابون مین جو کچھ مل سکا ہے وہ تحقیق کے بعد حاضر خدمت ہے، حافظ سیوطی کی تصنیفات پر تنقید و تبصرہ سے قصداً احتراز کیا گیا ہے، کہ اس مختصر مضمون مین اسکی گنجایش نہین ہے،

معاصرین کے اختلاف کے ضمن مین حافظ سیوطی اور علامہ سخاوی کی شکر رنجی کا جو ذکر آگیا ہے، اس سلسلہ مین یہ امر ذہن نشین رہنا ضروری ہے کہ معاصرت کا ابتلا عجب ابتلا ہے، کم تر لوگ ہین، جو اس سے محفوظ رہے، اس لئے ان مین سے ایک نے دوسرے کے متعلق جو الفاظ استعمال کئے ہین، گو ان مین سے ہر شخص نے اپنے نقطۂ خیال سے صحیح ہی کہا ہو، لیکن ہمارا ان سے متاثر ہونا ضروری نہین ہے!

نام و نسب عبد الرحمن نام، لقب جلال الدین اور ابن الکتب ہے، ابن الکتب کے لقب کی وجہ یہ ہے کہ ان کے والد نے بیوی سے کسی کتاب کے لانے کو کہا، بیوی کتاب لینے کے لئے گئین،

وہیں درود شروع ہوا، اور ولادت ہو گئی، باپ نے اسی مناسبت سے "ابن الکتب" کا لقب عنایت کیا، کنیت ابو الفضل ہے، یہ کنیت ان کے استاذ اور شیخ قاضی القضاۃ عزالدین الکنانی کی رکھی ہوئی ہے، شذرات الذہب میں ہے کہ انھوں نے حافظ سیوطی سے پوچھا کہ تمھاری کنیت کیا ہے، انھوں نے کہا کچھ نہیں فرمایا، "ابو الفضل"۔

پورا نسب نامہ یہ ہے :-

عبدالرحمٰن بن الکمال ابی بکر بن محمد بن سابق الدین بن الفخر عثمان بن ناظر الدین محمد بن سیف الدین خضر بن نجم الدین ابی الصلاح ایوب بن ناصر الدین محمد بن الشیخ ہمام الدین الہمام الخضیری الاسیوطی،

علامہ سخاوی نے الضوء اللامع میں اور شوکانی نے البدر الطالع میں الطولونی کی نسبت کا اضافہ کیا ہے، علامہ سخاوی نے حافظ سیوطی کے والد کے تذکرہ میں ان کے اجداد میں ایک شخص سابق الدین کے ساتھ "الفارسی" کی قید بھی لگائی ہے،

اصل یہ ہے کہ سیوطی نسلاً عجمی ہیں، جیسا کہ انھوں نے خود حسن المحاضرہ میں لکھا ہے، نیز علامہ سخاوی نے سابق الدین کو فارسی بتا کر اسی طرف اشارہ کیا ہے، زاہد کوثری نے سیوطی کے ذیل طبقات الحفاظ ذہبی پر ان کا جو ترجمہ لکھا ہے اس میں ان کے باپ کو عجمی بتلایا ہے، اور انکی والدہ حسب تصریح علامہ سخاوی وصاحب النور السافر تر کی کنیز تھیں،

انساب سمعانی میں ہے، کہ "طولونی" کی نسبت احمد بن طولون کی طرف کی جاتی ہے طولون ایک ترکی غلام تھا، جو مامون کے ساتھ بغداد آیا، ۲۲۰ھ میں اسکے ایک لڑکا پیدا ہوا، جس کا نام احمد رکھا گیا، یہ بیس سال کی عمر میں امیر بائکباک کی فوج میں داخل ہوا، امیر نے احمد بن طولون کی لیاقت دیکھ کر ۲۵۴ھ میں اپنی طرف سے اس کو فوج کا امیر بنا کر مصر بھیجا، ہوسکتا

کہ سیوطی کی والدہ کا تعلق اسی خاندان سے ہے اور ان کے طولونی کہلانے کی یہی وجہ ہو،

یہین سے سیوطی کے خضیری ہونے کا بھی کچھ نشان ملتا ہے، سیوطی نے حسن المحاضرہ مین کہا ہے کہ مجھے اس نسبت کی اصل وجہ نہین معلوم ہے، ہان یہ ضرور علم ہے کہ خضیریہ بغداد کے ایک محلہ کا نام ہے، ممکن ہو کہ اسی محلہ کی طرف نسبت ہو،

یاقوت معجم البلدان مین کہتا ہے کہ خضیریہ بغداد کا ایک محلہ ہے، جو خضیر مولیٰ صاحب الموصل کی جانب منسوب ہے!

قیاس کہتا ہو کہ طولونی خاندان جو بغداد سے مصر آیا، اس کا کچھ تعلق اس محلہ سے تھا، اور اسی تعلق سے سیوطی کا خاندان خضیری کہلایا،

اُسیُوطا | اُسیوط مصر کا ایک زرخیز شہر تھا، جو نیل کے مغربی جانب واقع تھا، یاقوت معجم البلدان مین اپنے زمانہ کے متعلق لکھتا ہے، کہ یہان شکر کا کاروبار بہت زیادہ ہے، اور ساری دنیا مین افیون یہین سے جاتی ہے،

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا مصنف کہتا ہے کہ سیوطی کا خاندان جو پہلے بغداد مین تھا، آخری نشست سے سیوط مین آکر بس گیا، (جلد ۴ صـ ۵۷۳)

علامہ سمعانی انساب مین لکھتے ہین، کہ بعض لوگ اسیوط کے شروع سے الف گرا دیتے ہین،

پیدایش | حافظ سیوطی یکم رجب ۸۴۹ھ مطابق ۳ اکتوبر ۱۴۴۵ء بروز یک شنبہ بعد مغرب قاہرہ مین پیدا ہوئے،

والد | نورالدین اعلیٰ ہمام الدین مشائخ وقت مین سے تھے، نیز دوسرے ارکان خاندان بھی ہمیشہ صاحب مرتبہ رہے، البتہ علم و دین کی خدمت زیادہ تر ان کے والد کمال الدین ابوبکر ہی

کے حصہ میں آئی، یہ تقریباً ۸۷۰ھ کے بعد سیوط میں پیدا ہوئے، اور قاہرہ آنے سے پہلے وہاں کے قاضی رہے، جب قاہرہ آئے تو علامہ قایاتی سے فقہ، اصول، کلام، نحو، معانی اور منطق کی تحصیل کی، ۸۷۹ھ میں اُن سے تدریس کی اجازت حاصل کی، حافظ ابن حجر عسقلانی سے بھی شرف تلمذ حاصل تھا، مختلف کتابیں تصنیف کیں، جامع شیخونی میں فقہ کے استاذ اور جامع طولونی میں خطیب رہے، علامہ شرف الدین المناوی کو جب قلعہ میں کسی خاص مسئلہ پر خطبہ کی ضرورت پیش آتی، تو خطبہ انہی سے لکھواتے تھے، خلیفہ مستکفی باللہ ثانی ان کا بہت احترام کرتا تھا، ان کے پاس برابر اسکی آمد و رفت رہتی، ملک ظاہر جقمق نے مستکفی باللہ کے ذریعہ ان کے پاس دیار مصر کے مفتی ہونے کا پیغام بھیجا، لیکن انھوں نے قبول نہ کیا،

حافظ سیوطی کے والد مستکفی باللہ کے امام بھی تھے، اسی لئے سیوطی کی پرورش مستکفی باللہ ہی کے گھر میں ہوئی، جیسا کہ خود سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں لکھا ہے،

بچپن میں اکابر کی زیارت ان کو بچپن میں ایک بزرگ شیخ محمد مجذوب کے پاس جو جزار مشہد نفیسی کے قریب رہتے تھے، لیجایا گیا، انھوں نے ان کیلئے برکت کی دعا کی،

تین سال کی عمر میں ایک بار اپنے والد کے ساتھ شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانی کی مجلس میں بھی حاضر ہوئے، حیرت ہے کہ سیوطی نے طبقات الحفاظ ذہبی کے ذیل میں اپنے متعلق لکھا ہے کہ

مجھکو حافظ ابن حجر سے اجازت عامہ حاصل ہے، حالانکہ انکی وفات (۸۵۲ھ) کے وقت سیوطی کی عمر تین یا ساڑھے تین سال کی تھی،

والد کا انتقال سیوطی کی عمر ابھی پانچ سال سات ماہ کی تھی، اور سورۂ تحریم تک قرآن پڑھا تھا، کہ شب دوشنبہ ۵ صفر ۸۵۵ھ کو ان کے والد کا انتقال ہو گیا،

والد نے نوعمر لڑکے کے لئے مخلصین کی ایک جماعت کو وصی بنایا تھا، ان میں سے شیخ کمال الدین ابن ہمام اور شیخ شہاب الدین بن طباخ کے نام کتابوں میں مذکور ہیں لیکن آخر الذکر کے حالات نہیں ملتے،

ابن ہمام | علامہ ابن ہمام کے متعلق معلوم ہے کہ ان کا شمار اکابر فقہائے حنفیہ میں ہے ۷۸۸ھ میں پیدا ہوئے، سراج الدین قاری ہدایہ قاضی محب الدین بن الشحنہ وغیرہم سے تحصیل علوم کی، تصوف کا بھی خاص ذوق تھا، ان کے حلقۂ درس سے اکثر اکابر پیدا ہوئے، مثلاً ابن امیر حاج حلبی، محمد بن محمد بن الشحنہ، یوسف الدین بن عمر بن قطلوبغا، تصانیف میں فتح القدیر شرح ہدایہ اور تحریر الاصول اہل علم میں مشہور ہیں،

تعلیم و تربیت | حافظ سیوطی نے اسی جلیل القدر شخصیت کے سایۂ عاطفت میں تعلیم شروع کی انھوں نے سیوطی کو شیخونیہ میں داخل کر دیا، شہاب الدین بن طباخ کی توجہ سے امیر برسبائے جقمقی کی امداد بھی حاصل رہی، آٹھ سال کی عمر میں قرآن شریف ختم کر لیا، اس کے بعد عمدۃ الاحکام منہاج الفقہ الفیہ ابن مالک یاد کیا،

مصر کے علمائے وقت میں سے تقریباً ہر بڑی شخصیت سے ان کو استفادہ کا موقع ملا، حسن المحاضرہ میں اپنے مشائخ کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو بتلاتے ہیں،

ہم ذیل میں اُن بعض اساتذہ کا ذکر کرتے ہیں جن کے متعلق یہ معلوم ہو سکا ہے، کہ سیوطی نے ان سے کیا پڑھا تھا؟

علامہ بلقینی | قاضی القضاۃ علم الدین صالح بن شیخ الاسلام سراج الدین بلقینی کی ۷۹۱ھ میں پیدائش اور چہار شنبہ ۵ رجب ۸۶۸ھ کو وفات ہوئی، حافظ عراقی اور دوسرے اکابر سے تلمذ تھا، اپنے زمانہ میں مذہب شافعی کے زبردست حامیوں میں سے تھے، علامہ سیوطی نے فقہ انہی سے پڑھی اور ان کی زندگی تک ساتھ رہے، بلقینی کے انتقال کے بعد ان کے لڑکے سے پڑھنا شروع کیا، اور

حسب ذیل کتابین ان سے پڑھین،

(۱) تدریب شروع سے وکالہ تک (۲) حاوی صغیر شروع سے حدود تک (۳) منہاج شروع سے زکوٰۃ تک (۴) تکملہ شرح منہاج کا ایک حصہ اور احیاء الموات سے دعایا تک!

انھون نے ۸۶۶ھ مین سیوطی کو درس و افتاء کی اجازت دی،

علامہ شرف الدین مناوی | سیوطی علامہ مناوی کی خدمت مین بھی حاضر ہوئے، یہ ۸۷۹ھ مین پیدا ہوئے شیخ ولی الدین عراقی سے استفادہ کیا، دیار مصریہ کے قاضی رہے، شب دوشنبہ ۱۲ جمادی الآخر ۸۷۱ھ کو انتقال ہوا، علامہ سیوطی نے ان سے منہاج شرح بہجہ اور تفسیر بیضاوی کے بعض حصے پڑھے،

علامہ تقی الدین شمنی حنفی | علامہ شمنی کے پاس چار سال رہے، اور حدیث انہی سے پڑھی، ان کی وفات تک ساتھ ہی رہے حسن المحاضرہ مین ان کا ذکر عجب والہانہ انداز سے کرتے ہین، علامہ شمنی رمضان ۸۰۱ھ مین بمقام اسکندریہ پیدا ہوئے، مشائخ وقت سے تعلیم حاصل کی، قضا حنفیہ کی درخواست کی گئی، مگر قبول نہ کیا، ذالحجہ ۸۷۲ھ مین انتقال ہوا،

علامہ محی الدین کافیجی | سیوطی کے چار سال علامہ کافیجی کی خدمت مین گذرے، یہ معقولات مین اپنے وقت کے "استاذ العالم" تھے، ۸۰۰ھ سے پیشتر کی پیدائش ہے، ۸۷۹ھ مین انتقال ہوا، سیوطی نے ان سے اصول تفسیر اور معانی وغیرہ پڑھا، انھون نے شاگرد کو تحریری اجازت بھی دی،

شیخ سیف الدین حنفی | یہ اپنے زمانہ کے عالم اور بہت ہی متقی بزرگ تھے، ان کے استاذ علامہ ابن ہمام کہا کرتے تھے، کہ یہ دیار مصر کے محقق ہین ۸۰۰ھ مین پیدائش اور ۸۸۱ھ مین انتقال ہوا، سیوطی ان کے یہان کشاف توضیح تلخیص المفتاح اور عضد کے چند سبقون میں شریک ہوئے سیوطی

کہتے ہین، کہ ایک شخص کے سوا جس سے مین نے منہاج کے چند صفحے پڑھے تھے، میرے شیوخ مین سب سے آخر مین انہی کا انتقال ہوا،

شیخ شہاب الدین الشارمساحی یہ فرائض مین اپنے وقت کے امام تھے ابن ملقن سے اجازت پائی تھی، ۸۶۵ھ مین انتقال ہوا، سیوطی نے ان کی آخری عمر میں ان سے فرائض پڑھا،

محمد بن ابراہیم الشروانی الرومی یہ قاہرہ کے طبیب تھے سیوطی نے ان سے طب مین ابن جماعہ کی دو کتابین پڑھی تھیں،

ام ہانی علامہ سیوطی کے مشائخ مین جہان ان نامور علما، کا ذکر آتا ہے، وہان اس عالمہ و فاضلہ کا نام بھی موجود ہے، سیوطی بغیۃ الوعاۃ ص ۱۶۱ مین ان کے متعلق لکھتے ہین، کہ یہ میری شیخ ہین،

اساتذہ کا تعلق حافظ سیوطی کے اساتذہ کو اپنے لائق شاگرد سے خاص تعلق تھا، وہ ان کی قدر کرتے اور ان کی راے پر اعتماد کرتے تھے، حسن المحاضرہ مین اپنے استاذ علامہ شمنی کا ایک واقعہ نقل کرتے ہین، کہ شمنی نے شفا، کے حاشیہ مین واقعہ اسرا، مین ابو الحجاج کی حدیث درج کی، اور اسکو ابن ماجہ کی تخریج بتایا، مین نے بار بار ابن ماجہ دیکھی، مگر یہ حدیث نہ ملی، ابن قانع کی معجم الصحابہ مین تلاش کیا، اس مین یہ حدیث موجود تھی، شیخ سے عرض کیا، انھون نے محض میری سماعت پر اعتماد کرتے ہوئے اپنے نسخہ سے ابن ماجہ کاٹ کر ابن قانع لکھدیا،

علامہ شمنی نے بار بار زبان و قلم سے سیوطی کے علم و فضل کا اعتراف کیا، ان کی تصنیف شرح الفیہ اور جمع الجوامع پر تقریظ لکھی، علامہ بلقینی نے بھی ان کی شرح استعاذہ و بسملہ پر تقریظ لکھی،

شاگرد کو بھی اپنے اساتذہ کا بڑا لحاظ رہتا تھا، علامہ شرف الدین مناوی کی مجلس مین

سیوطی ملا قلی سے آگے بیٹھتے تھے، مناوی کو اس سے تکلیف ہوئی، اور یون نصیحت کی، کہ ہم لوگ چھوٹے تھے، تو ہمیشہ حلقہ کے پیچھے بیٹھتے تھے، سیوطی نے پھر کبھی ایسی غلطی نہ کی،

اسی تعلق کی بنا پر علامہ سیوطی نے اپنے اساتذہ مین سے علامہ مناوی، علامہ شمنی، علامہ سیف الدین حنفی کے انتقال پر بڑے دردناک مرثیے کہے،

حافظ سیوطی مصر کے باہر

علامہ سیوطی کے ذوق علم نے ان کو دوسرے ممالک کے دیکھنے کا بھی موقع بہم پہنچایا اور انھون نے شام، حجاز، ٹکرور اور ہندوستان کے سفر کئے!

سفر حجاز

حجاز کا سفر ۸۶۹ھ (۱۴۶۳ء) مین بحری راستہ سے ہوا، ایام حج مین آب زمزم اس نیت سے پیا کہ فقہ مین علامہ بلقینی کا مرتبہ اور حدیث مین حافظ ابن حجر کا پایہ نصیب ہو، حجاز کے سفر مین بھی علامہ سیوطی استفادہ سے غافل نہ رہے، اور عبد القادر مالکی، نجم بن فہد سے کسب فیض کیا،

مکہ کے زمانہ قیام مین ایک افسوسناک واقعہ پیش آگیا وہ یہ کہ ابن ظہیرہ برہان الدین جو مکہ کے قاضی تھے، سیوطی کے والد کے شاگرد تھے، مکہ اور قاہرہ مین ان سے فقہ، اصول، معانی، اور بیان پڑھا تھا، اس وقت مکہ مین خدا نے ان کو ہر طرح سے سرفراز کیا تھا، ان کے جاہ و جلال اور دولت و حشمت کی وجہ سے لوگ عموماً ان کی مصاحبت مین لگے رہتے، سیوطی کا بیان ہے کہ ابن ظہیرہ کی خواہش تھی کہ جس طرح دوسرے لوگ ان کی چاپلوسی کرتے ہین، مین بھی وہی رنگ اختیار کرون، حالانکہ میری نگاہ مین ابن ظہیرہ میرے والد کے وہی شاگرد تھے، جو اپنے کندھے پر مجھکو بٹھائے ہوے پھرا کرتے تھے، سیوطی کہتے ہین، کہ میرے اور ان کے درمیان یہ چشمک جاری رہی، یہانتک کہ ابن ظہیرہ کے یہان ختم بخاری کی محفل ہوئی، جس مین میرا جانا ہوا

مجھے دیکھکر ابن ظہیرہ نے تواضع اور خاکساری کے متعلق تقریر شروع کردی میں سمجھ گیا کہ یہ مجھ پر تعریض ہے، مین نے حدیث مین چند سوالات ان کے سامنے پیش کئے جس کا وہ کوئی جواب نہ دیسکے، انجام کار ان کو مجھ سے استفادہ کا اقرار کرنا پڑا لیکن درمیانی لوگون نے اختلافات کو بڑھا دیا، یہان تک کہ سیوطی مکہ سے رخصت ہوے، اور ابن ظہیرہ سے ملاقات تک نہین ہوئی، اس کے بعد ابن ظہیرہ قاہرہ آئے، بعض امرا نے چاہا، کہ دونون حضرات کے درمیان صفائی کرادین، مگر سیوطی تیار نہ ہوئے، چند سال کے بعد شیخ عبد القادر بن شعبان الفرضی جو سیوطی کے والد کے یہان ابن ظہیر کے ہم درس تھے، انھون نے ابن ظہیرہ کو خط لکھا کہ وہ جاکر سیوطی سے ملاقات کرین، اور چند کتابین لے آئین، چنانچہ ابن ظہیرہ سیوطی کے پاس آئے، دونون کے دل ایک دوسرے سے صاف ہوئے، اور ابن ظہیرہ نے سیوطی کی ذیل کی تصانیف حاصل کین،

اتقان، الاشباہ والنظائر، تکملہ تفسیر محلی، شرح الفیۃ الحدیث، شرح الفیہ ابن مالک در منثور جزا اول،

ہندوستان کا سفر | ہندوستان کو یہ فخر حاصل ہے کہ اکابر علماے اسلام نے اپنے بابرکت قدمون سے اسکو سرفراز کیا ہے، لوگون کو سُن کر حیرت ہوگی، کہ ہماری مشہور معقولی مفسر اور متکلم اسلام امام رازی بھی ہندوستان آئے تھے[1]،

بہرحال منجملہ ان اکابر کے علامہ جلال الدین سیوطی کی ذات بھی ہے، علامہ نے خود حسن المحاضرہ مین اپنی ہندوستان کی آمد کا ذکر کیا ہے، لیکن باوجود تلاش و تفحص کے یہ نہ معلوم ہوسکا، کہ یہ آمد کب اور ملک کے کس حصہ مین ہوئی تھی؟

یہ بات ضرور معلوم ہے کہ علامہ سیوطی کے زمانہ مین خلافت مصر کو مالوہ کی خلجی سلطنت سے

---

[1] تفسیر کبیر سورہ ہود رکوع ۵،

زیادہ تعلق تھا، چنانچہ ۸۵۸ھ مستنجد باللہ عباسی نے مصر سے شرف الملک حاجب کے ساتھ سلطان کے لئے شاہانہ خلعت بھیجی، سلطان نے مع اہل دربار کے اس کا استقبال کیا، خلعت پہنا اور منبرون پر سلطان کے نام کے ساتھ خلیفہ کا نام بھی پڑھا گیا،

اس تعلق کی بنا پر خیال ہوتا ہے، کہ شاید حافظ سیوطی کی آمد ماوہ کی طرف ہوئی، لیکن یہ محض قیاس ہے،

درس و تدریس اور عہدۂ قضاء

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا مصنف کہتا ہے کہ سفر حجاز سے واپس ہو کر حافظ سیوطی قاہرہ میں مشیر قانونی ہو گئے، لیکن اس عہدہ کے ذکر سے عربی مآخذ خاموش ہین،

۸۶۲ھ سے درس و تدریس اور املا کا کام شروع کیا، اور اسی سال علامہ بلقینی کی کوشش سے جامع شیخونی مین اپنے والد کی جگہ پر کام شروع کیا، اس کے بعد اپنے وصی شہاب الدین ابن طباخ کی کوشش سے جامع ابن طولون مین کچھ دنون املا کرایا، تربۃ برقوق نائب شام مین اپنے ہم وطن ابوالطیب السیوطی کی سفارش سے مشیخۃ التصوف کے عہدے پر فائز رہے، شیخونیہ میں بھی مشیخۃ الحدیث کا مرتبہ ملا، ۸۹۱ھ میں مبیرسیہ مین جلال بکری کے بعد ایک ممتاز جگہ پر مقرر ہوئے، لیکن ایک جماعت سے وہان اختلاف ہو گیا، جس کی وجہ مورخین حافظ سیوطی کی خشک مزاجی بتلاتے ہین، یہان بہت ہی ناگوار شکلین پیش آئین، انجام کار ۱۲ رجب ۹۰۶ھ (فروری ۱۵۰۱ء) کو سلطان ملک عادل طومانیاے اول نے مدرسہ سے ان کو علحدہ کر دیا، ۹۰۹ھ مین دوبارہ یہ جگہ انکی خدمت مین پیش کی گئی، لیکن انھون نے قبول نہ کیا،

حافظ سیوطی نے درس میں طریق املا کو زندہ کرنا چاہا، مگر لوگوں کی بے توجہی دیکھکر خود باز رہے،!

۹۰۲ھ/۱۴۹۶ء میں خلیفہ متوکل نے ایک عظیم الشان عہدہ پیش کیا، یعنی ان کو تمام ممالک اسلامیہ کا قاضی القضاۃ بنا دیا، سب کا عزل و نصب ان کے اختیار میں تھا، غالباً پیرسیہ کی ملازمت کے زمانہ ہی میں یہ عہدہ ملا تھا،

افتاء حافظ سیوطی نے ۸۷۱ھ سے افتاء کا کام شروع کیا، باوجود اپنے دعوی اجتہاد کے فتوی مذہب شافعی پر دیتے تھے، کہتے تھے، کہ سائل مذہب سے دریافت کرتا ہو نہ کہ میرے اجتہاد سے،

نواب صدیق حسن خان مرحوم طبقات کاشغری سے سیوطی کا قول نقل کرتے ہیں، کہ جب میں سوال کا جواب دیتا ہوں، تو میرے سامنے بارگاہ خداوندی میں حاضری کا منظر ہوتا ہے،

اس سے مطلب افتاء میں احتیاط ہے، حافظ سیوطی کے فتاوی الحاوی للفتاوی کے نام سے دو جلدوں میں چھپ گئے ہیں،

تصنیف و تالیف علامہ سیوطی کی سوانح کا یہ باب درحقیقت ایک طویل الذیل باب ہے، اس لئے کہ یہی ان کی زندگی کا اصل کارنامہ ہے، اگر کثرت تصانیف کے لحاظ سے مصنفین کی فہرست بنائی جائے، تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ سیوطی کو اس فہرست کے اولین ناموں میں جگہ دینا ہوگی،

۸۶۶ھ سے ان کی تصنیفی زندگی شروع ہوتی ہے اور پہلی تصنیف استعاذہ اور بسملہ کی شرح ہے، یہ بات واضح رہے کہ سیوطی کا زمانہ ایجاد و ابداع کا زمانہ نہیں، بلکہ جمع، شرح اور تفسیر کا زمانہ ہے، اور سیوطی نے اس سلسلہ میں بہترین نمونہ پیش کیا ہے،

حافظ سیوطی کے شاگرد داؤدی کا بیان ہے کہ سیوطی ایک ایک دن میں تین تین کراسہ

لکھتے تھے، اور اس کے ساتھ حدیث کا املاء کرتے، اور فتاوی بھی لکھتے،

سیوطی نے حسن المحاضرہ مین اپنی تالیفات کو گنایا ہے، اس وقت تک کی مولفات کی تعداد تین سو ہے، ان کے شاگرد داؤدی نے ان کی مصنفات کا استقصاء کیا، تو وہ پانچسو سے زائد نکلین، دوسرے شاگرد ابن ایاس نے تاریخ مصر ۳-۶۳ مین کہا کہ ان کی مصنفات ۶۰۰ ہین، جرمن عالم (دکتور خ ک) نے ان کی کتابون کی فہرست تیار کی جس مین اس کو ۵۶۱ کتابین معلوم ہوسکین،

حسن المحاضرہ کے بعد حافظ سیوطی نے پھر اپنی مصنفات کی فہرست خود مرتب کی، اس مین ۵۳۵ کتابین مع اسماء کتب و تفصیل فن درج ہین، ہم صرف فن وار کتابون کی تعداد درج کرتے ہین،

۱- فن تفسیر و متعلقات قرآن،	۳۷	۶- لغت، نحو، صرف،	۶۳
۲- حدیث اور اس کے متعلقات،	۲۰۴	۷- معانی، بیان، بدیع،	۷
۳- اصول حدیث،	۲۴	۸- ادب، نوادر، انشاء، شعر،	۶۸
۴- فقہ،	۷۳	۹- تاریخ،	۳۰
۵- اصول فقہ، اصول الدین، تصوف،	۱۹	۱۰- مختلف علوم،	۱۰

ان مصنفات مین ضخیم تصانیف کے ساتھ مختصر ترین رسالے بھی شامل ہین،

تصنیفی زندگی مین الزام | علامہ سیوطی پر ان کی تصنیفی زندگی مین الزامات بھی لگائے گئے، چنانچہ علامہ سخاوی کا سب سے بڑا الزام یہ ہے، کہ وہ دوسرون کی کتابون کو اپنا لیتے ہین، اسی سلسلہ مین وہ بیان کرتے ہین، کہ

(۱) سیوطی نے خود میری کتابون کو جب میرے پاس ان کی آمد و رفت تھی اپنا لیا، مثلاً

المخصائص الموجبۃ للظلال، الاسماء النبویۃ الصلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ثم من الانبیاء ان کے سوا اور دوسری کتابین،

(۲) میرے استاذ حافظ ابن حجر عسقلانی کی تصانیف کو اپنانے کی کوشش کی، مثلاً لباب النقول فی اسباب النزول، عین الاصابہ فی معرفۃ الصحابہ النکت البدیعات علی الموضوعات المدرج الی المدرج، وغیرہا،

سخاوی کہتے ہین کہ یہ سب میرے شیخ کی کتابین ہین، کاش سیوطی اسکو مسخ نہ کرتے، اور اصلی حالت پر باقی رہنے دیتے، تو زیادہ نافع ہوتین،

(۳) محمودیہ[1] (شارع قصبہ رضوان مصر) کی قدیم کتابون کو جن سے معاصرین بالکل ناواقف تھے، لیکر اس مین کچھ تبدیل و تغیر کے بعد اپنے نام سے شائع کیا،

علامہ شوکانی نے البدر الطالع مین اس قسم کے تمام الزامات کی تردید کی کوشش کی ہے لیکن وہ اس سے زیادہ نہ کہہ سکے کہ دوسرے کی کتابون سے مضامین کا لینا کوئی عیب کی بات نہیں ہے، یہ مصنفین کا دستور چلا آیا ہے،

خصائص کبریٰ کا سرقہ | اس سلسلہ مین ایک دلچسپ اور قابل تذکرہ بات یہ ہے کہ خود سیوطی کی تصانیف کے ساتھ بھی لوگون نے یہی معاملہ کیا، کہ ان کی پوری تصنیف کو اپنی طرف منسوب کر لیا، یا ان کی کتابون کے مضامین اپنی تصانیف مین درج کر لئے، اور حوالہ نہیں دیا،

معجم المطبوعات العربیہ والمعربہ (جلد ۱ ص ۱۰۷۹) کا جامع یوسف الیاس سرکیس کہتا ہے کہ سیوطی کی خصائص کبریٰ ان کے کسی معاصر نے پا لیا، اور اپنی طرف منسوب کر لیا اس پر سیوطی نے ایک مقالہ الفارق بین المصنف والسارق لکھا، کشف الظنون جلد ۲ ص ۵۶۵ مین ہے، کہ

---

[1] اس مدرسہ اور کتب خانہ کی تفصیل ملاحظہ ہو خطط مقریزی جلد ۴ صفحہ ۲۴۲،

سیوطی کو علامہ قسطلانی سے شکایت تھی، کہ انھون نے المواھب اللدنیہ بالمنح المحمدیہ مین ان کی تصانیف سے فائدہ اٹھایا، لیکن کہین ان کا حوالہ نہیں دیا، سیوطی نے شیخ الاسلام زکریا انصاری کی خدمت مین یہ واقعہ عرض کیا اور کہا کہ قسطلانی کو لازم تھا، کہ وہ میرا حوالہ دیتے! بعد کو قسطلانی نے سیوطی کے پاس آکر معذرت کی،

تصنیفات کا معیار بہرحال علامہ سیوطی کی تصانیف کو خاص حسن قبول حاصل ہوا، اور خود ان کی زندگی مین ہر چہار طرف ان کا شہرہ ہوگیا، لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ پر ثابت ہے، کہ تصنیفی سلسلہ مین سیوطی کا جو کچھ کارنامہ ہے وہ جمع و نقل ہے، صحیح و سقیم کی تفریق کا پورا لحاظ ان کی مصنفات مین نہیں ہے، یہی وجہ ہے، کہ اکثر فرق ضالہ خصوصاً روافض کو انہی کی کتابون سے حوالہ کا موقع ملتا ہے، اور محققین اسی لئے جب تک ان کی تحریر کی تائید مین دوسرا معتبر قول نہ ہو، اسکو قبول نہین کرتے ہین،

شعروشاعری تصنیف و تالیف، درس و تدریس اور افتاء کے ساتھ ساتھ حافظ سیوطی کو شعر و شاعری سے بھی خاص دلچسپی تھی، اس فن مین شہاب منصوری سے تلمذ تھا، علامہ سیوطی نے نظم العقیان (ص ۷، تا ۹) مین ان کا کلام نقل کیا ہے، اور شرح شواہد مغنی اللبیب مین ان کے حالات ذکر کئے ہین،

سیوطی کی شاعری زیادہ تر علمی فوائد اور دینی نصیحتون پر مشتمل ہوتی تھی، وہ مذہباً شافعی اور عقیدۃً حنبلی تھے، اپنے عقائد کو اشعار مین اس طرح بیان کرتے ہین،

نفوض احادیث الصفا ست ولا نشبہا ونعطل
الا رمت الخوض فی تحقیق معضلہ فاقل
ان المفوض سالم معنا تکلفہ المؤول

ایک شخص کو نصیحت کرتے ہین،

ایها السائل قومًا ... ما لهم فی الخیر مذهب

اترک الناس جمیعًا ... والی ربك فارغب

مباحث علیہ پر نظمین بھی کہی ہین، مثلاً تحفۃ المهتدین باسماء المجتهدین، یہ پہلے گذر چکا ہے کہ اپنے اساتذہ کے مرثیے کہنے تاریخ الخلفاء کے آخر مین اپنا ایک قصیدہ درج کیا ہے جسمین خلفاء کے نام اور وفیات درج ہین، ان کا کلام ان کی تصانیف مین منتشر طور پر درج ہے، غالبًا ابھی ایک جگہ جمع نہیں کیا گیا،

(باقی)

ضرورتِ مترجمین

عربی وفارسی و انگریزی سے براہ راست شستہ ورفتہ سلیس اردو زبان مین ترجمہ کرنیوالون کی ضرورت ہے، جو مناسب اجرت پر علمی ادبی تاریخی، نیز متفرق علوم وفنون کی کتابون اور رسائل کے مضامین کا ترجمہ کرسکین، کسی ایک زبان اور اردو کا جاننا کافی ہے، علمی قابلیت نیز تجربہ کے متعلق تفصیل سے جواب آنا ضروری ہے،

نوٹ:- ہر قسم کی اردو فارسی، عربی انگریزی کتابین، مطبوعات، ہندوستان، ایران، مصر، یورپ، امریکہ وغیرہ ہماری معرفت نسبتہً ارزان قیمتون پر مل سکتی ہین، شائقین اپنے اسماء گرامی اور مکمل پتون سے مطلع فرماوین، تاکہ جدید فہرستین وقتاً فوقتاً ارسال کیجاسکین،

پتہ ذیل پر خط وکتابت کرین

شباب کمپنی پوسٹ بکس ۱۲۶ بمبئی نمبر ۳

محسن کاکوروی اور انکی خصوصیات

از

جناب محمد ابو اللیث صاحب صدیقی بدایونی ایم او ایل پروفیسر اردو مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

قدیم اردو شعر و شاعری پر حالی سے لیکر اب تک اس قدر خامہ فرسائی ہو چکی ہے، کہ اعتراضات کی طویل فہرست مین کسی اضافہ کی گنجایش معلوم نہین ہوتی، یہ اعتراضات صرف شاعری پر صادق نہین آتے، شاعری کے علاوہ ادب کی اور اصناف ادب کے علاوہ زندگی کے دوسرے شعبون پر نظر ڈالین، تو پچھلے آٹھ سو سال کی ہندوستان کی تاریخ مین بعض عیوب ان سب میں مشترک نظر آئین گے، ان کو اگر ہم کسی ایک لفظ سے ادا کرنا چاہین، تو وہ "تقلید" ہے، ہمارا ادب اور ادب کے علاوہ دیگر فنون لطیفہ "تقلیدی" ہین، اور تقلیدی ہونے ہی کی وجہ سے ان سے معرکے صادر نہین ہوئے

بے معرکہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومین
جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

ایک مغربی مفکر نے فنون لطیفہ کے ارتقاء کے سلسلہ مین لکھا ہے کہ فنون کی زندگی مین بالعموم دو منزلین پیش آتی ہین، ایک حیات و حرکت عمل کی دوسری جمود و تعطل و سکون کی پہلی منزل کی پیداوار تخلیقی (CREATIVE OR TRADITIONAL) اور دوسری کی تقلیدی (IMITATIVE) ہے، جب کوئی قوم بساط عالم پر اپنے پھریرے جماتی ہے، تو سب سے پہلے تنازع للبقا سے سابقہ پڑتا ہے، جد و جہد عزم و استقلال عمل و کردار کی ضرورت ہوتی ہے، اور اسی وجہ سے قوم مین تمام قوتین اپنی

معراج پر ہوتی ہین، اس وقت ایک خاص قوت سرگرم عمل ہوتی ہے، جسے (Creative Force) یعنی صلاحیت تخلیق کہہ سکتے ہین، اس صلاحیت کی پیداوار تخلیقی ہوتی ہے، اس مین زندگی کی وہ روح ہوتی ہے، جو خود قوم مین موجود ہوتی ہے، جس کی یہ ترجمانی کرتے ہین، قومون کے کارنامون کی طرح ان کے آرٹ اور فن مین بھی معجزہ ہوتا ہے،

لیکن جس طرح قوم کی اور صلاحیتین تکمیل کی ایک خاص منزل پر پہنچکر رک جاتی ہین، اور پھر زوال کا دور شروع ہوتا ہے، اسی طرح (قوت تخلیق Creative Faculty) یعنی قوت تخلیق بھی مردہ ہوجاتی ہے، اور جیسے جیسے عمل و عزم استقلال کی جگہ تن آسانی اور تساہل لے لیتے ہین، اسکے ساتھ ہی ساتھ قوت تخلیق کی جگہ صلاحیت تقلید (Imitative Faculty) ترقی کرتی رہتی ہے، آرٹسٹ اب آرٹ کی تخلیق سے قاصر ہوتا ہے، اس وقت پوری قوم آبا و اجداد کے فراہم کئے ہوئے سرمایہ پر گذر بسر کرتی ہے، چنانچہ آرٹسٹ بھی اپنے پیشرؤن کے کمالات کو نیچ کر کھاتا رہتا ہے، اور انہی کی تقلید کو کمال فن اور معراج تکمیل سمجھتا ہے، جس قدر تقلید یا نقل مکمل اور مطابق اصل ہو، اسی قدر آرٹ مکمل سمجھا جاتا ہے، یہ عالم آرٹ کے سکرات کا عالم ہوتا ہے، اگر ایسے موقع پر قوم کی ناؤ کو کھینے والا میسر نہ ہو، تو قوم کی کشتی زوال کے گرداب مین ہی غرق ہوجاتی ہے، اسی طرح اگر آرٹ کو تباہی سے بچانے والا تخلیقی آرٹ کا علمبردار پیدا نہ ہو، تو آرٹ فنا ہوجاتا ہے،

اس مغربی مصنف نے تخلیقی اور تقلیدی آرٹ کی بحث یورپ کے فنون کے سلسلہ مین کی ہے لیکن یہ بیان ہماری شاعری کے عین مطابق ہے، ہندی مسلمانون کی شاعری کا سرچشمہ عرب ہے، عربی شاعری کی بنیادین جذبات پر قائم ہین، اور حقیقت کی ترجمانی اس کا مقصد ہے، عرب شعراء نے اپنے معرکۃ الآراء قصیدون مین انہی لوگون کی تعریف کی ہے، جو تعریف کے مستحق ہین، بہادرون کی تعریف کی گئی ہے، کہ میدان جنگ مین اپنی واقعی تعریف سنکر ان کے حوصلے بڑھین، اور وہ قوم

کی خاطر فتح حاصل کرین، امیرون اور سردارون کی تعریف کی گئی ہے، کہ ان کے قابل تقلید نمونے دوسرون کے لئے شمع ہدایت کا کام دین، شاعرون کی تعریف کی گئی ہو کہ وہ تخلیقی آرٹ کے قابل تقلید نمونون کے موجد قوم یا قبیلہ کی عزت اور فطرت کے ترجمان تھے، ان قصیدون مین رزم اور بزم کے وہ مناظر ہین، کہ ہر جگہ زندگی کی لہرین کروٹ بدلتی نظر آتی ہین یہ تخلیقی آرٹ کے نمونے ہین،

غزل کی طرف نظر ڈالئے تو صرف ان شاعرون کو غزل گو پائین گے، جو واقعی عشق و عاشقی کی وادی مین نام پا چکے تھے، ان کی شاعری خود ان کے جذبات کا آئینہ ہے، اس مین رسم و تقلید نہین، عرب مین شعر و ادب کے سرچشمے کے یہ سوتے پاک و صاف تھے، لیکن ایران پہنچکر ان کی نوعیت بدل گئی،

ایران کی فتح کے متعلق یہ کہنا صحیح ہے کہ عربون نے اگرچہ سیاسی اعتبار سے ایران کو فتح کر لیا، لیکن ذہنی اعتبار سے ایران نے ہی مسلمانون پر فتح پائی، ان کے فلسفہ جد و جہد کی جگہ نفی خودی اور بے عملی کی تلقین کیجانے لگی، اور جب قوم کی زندگی پر سکون کا افسون طاری ہوا تو شعر و ادب کی نزع کا وقت بھی قریب آگیا، اور بہت جلد تخلیقی آرٹ کی جگہ صرف تقلیدی آرٹ رہ گیا، یہ کیا تھا؟ رسمی شاعری جو باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو ورثہ مین ملتی رہی، بندھے ٹکے جذبات، اور ان کے ادا کے مخصوص انداز اور اسالیب پیش پا افتادہ مضامین، پرانی تشبیہات اور پامال استعارات کے الٹ پھیر کا نام شاعری رہ گیا،

اردو نے اسی رسمی فارسی شاعری کی گود مین آنکھ کھولی، ابتدائی دور مین ہندوستان کے فارسی گو شعرا، جو خود رسمی فارسی شاعری کے علمبردار تھے، محض تفنن طبع کے لئے "زبان ریختہ گاہے گاہے فکر نمودند" ظاہر ہے کہ ان شعرا سے اردو مین بھی وہی مضامین ادا ہوتے ہو جو فارسی شاعری مین عام تھے، دوسرے دور مین دکھنی ادب کو فروغ ہوا، اور کہین کہین

فارسی شاعری کی ابتدا کے ساتھ ہندی شاعری کے اثرات بھی مل گئے لیکن شاعری کے عام مذاق میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، اس کا ایک عام اثر یہی ہے، کہ ابتدائی دکھنی ادب میں مثنویوں کی تعداد بہت ہے، اور سوائے چند مثنویوں کے باقی تمام قصے فارسی کی مشہور مثنویوں کے تراجم یا ان کا خلاصہ ہیں، تشبیہات اور استعارات میں بھی دکن والوں نے کہیں کہیں ملکی شاعری سے فائدہ اٹھایا ہے لیکن دکنی ادب کا کوئی شاہکار جو تخلیقی آرٹ کا نمونہ کہا جاسکے، اب تک ہماری نظر سے نہیں گذرا،

تیسرے دور میں شمالی ہند میں دلی کی بزم شاعری گرم ہے لیکن یہاں کے شعرا بھی فارسی کی تقلید بیجا میں گرفتار ہیں، اور حالی نے اپنے مرثیہ مقدمہ شعر و شاعری میں انہی کا ماتم کیا ہے، چوتھے دور میں لکھنؤ کے شاعر اپنی محفل جماتے ہیں، اور ایک اعتبار سے یہ دلی والوں سے بہتر ہیں ان میں تھوڑا بہت تخلیقی جذبہ کارفرما ہے، کیونکہ سلطنت اودھ کی ابتدا ہے، اور علوم قدیمہ کے احیار کے ساتھ ساتھ شاعری کو بھی دوسرا رنگ دینا مقصود ہے، لیکن اودھ کے ماحول اور معاشرت نے ان شاعروں کو نقصان پہنچایا، اور یہ راہ بھٹک کر رنگینی، ہرزہ گوئی، اور ضلع جگت کی گلیوں میں جا نکلے، لیکن ان میں سے بعض نے واقعی تخلیقی آرٹ کے نمونے پیش کئے، جو نادر اور عدیم المثال ہیں، ایسے جوہر انیس اور محسن کے کلام میں بالعموم پائے جاتے ہیں،

محسن کاکوروی کا کلام دبستان لکھنؤ کی پیداوار ہونے کے باوجود لکھنؤ کے عام رنگ سے جدا ہے، ان کا موضوع نعت ہے، جس سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں ہے، موضوع کا احترام کلام کی بے کیفی و بے رونقی کی پردہ پوشی کرتا ہے، نقاد کو نعت گو سے باز پرس کرنے میں تامل ہوتا ہے، دوسری طرف نعت گو کو اپنی فنی کمزوری چھپانے کیلئے نعت کا پردہ بھی بہت آسانی سے مل جاتا ہے، شاعر ہر مرحلہ پر اپنے معتقدات کی آڑ پکڑتا ہے، اور نقاد جہاں کا تہاں رہجاتا ہے لیکن نعت گوئی کی فضا جتنی وسیع ہے، اتنی ہی اس میں پرواز مشکل ہے، ہر پرواز سے پہلے یہ دیکھنا پڑتا

کہ فضا ساز گار بھی ملے گی یا نہیں، اگر ہمت پرواز مشکل مقام پر پہنچا دے تو بھی اڑنے والے کا یہ کمال ہونا چاہئے، کہ وہ عافیت اور کامیابی کے ساتھ وہاں سے گذر جائے، ان امور کو مدنظر رکھکر جب ہم محسن کا مطالعہ کرتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے، کہ نعت کی وسیع فضا میں انھوں نے خوب خوب پرواز کی ہے، اور بڑے مشکل مقامات بھی انھوں نے انتہائی خوبی و خوبصورتی کے ساتھ طے کئے ہیں، مضمون میں موضوع کے اعتبار سے جدت، اسلامی تصوف اور ہندی روحانیت کا امتزاج، حدیث اور عقائد کی صحت کو ملحوظ رکھتے ہوئے مذاق شاعرانہ کے ساتھ نکتہ آفرینی خلوص و محبت کے اظہار میں تہذیب و متانت کا پاس، ان کے کلام کی عام خوبیاں ہیں، اس پر پورا کلام ہموار اور شگفتہ، مضمون بلند، زبان شستہ و کوثر کی دھلی ہوئی، بندش چست، مثنویوں میں قصیدوں کی سی شان و شوکت، تشبیب و گریز کے کمالات ایسی خصوصیات ہیں، جو شاید ہی معاصرانہ شاعری میں مل سکیں، ان سب کے علاوہ ایک امتیاز جو تنہا محسن کو شاعروں کی صف اوّل میں بٹھا سکتا ہے، ان کی تشبیہات کا ہے، ان کے کلام کا مجموعہ مختصر ہے لیکن اس میں انھوں نے تشبیہ و استعارہ کی وہ داد دی ہے، جو توصیف و تعریف سے مستغنی ہے،

محسن کی نعت میں تخلیقی شان پائی جاتی ہے، یہ اسلئے کہ نعت گوئی اگرچہ ہمیشہ سے موجود تھی لیکن اسے فن کی حیثیت سے کسی اور شاعر نے محسن سے پہلے اختیار نہیں کیا اور جن لوگوں نے عقیدت کی بنا پر صرف نعت گوئی کو اپنا شعار بنایا، انھوں نے کوئی شاعرانہ کمال پیدا نہیں کیا، شعراء کے اردو و فارسی کے جتنے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تذکرے اور تاریخیں راقم السطور کی نظر سے گذریں، ان میں ایسے شعراء کا حال دستیاب نہیں ہوا، جن کا مسلک شعری نعت گوئی رہا ہو اسی ایک بات کو ملحوظ رکھیں تو بھی محسن کا درجہ اس سے کہیں بلند ہو جاتا ہے، جو اب تک انھیں دیا جاتا رہا ہے،

محسن سے پہلے عربی اور فارسی شاعری کے سرمایہ میں نعت گوئی مفقود نہیں ہے، البتہ تعداد وخوبی کے اعتبار سے اُسے ادب میں کوئی ممتاز درجہ حاصل نہیں ہے، غزل گویوں نے بالعموم اپنے دواوین اور کلیات کی ابتدا حمد سے کی ہے، اور حمد کے بعد عموماً نعت اور اکثر اوقات منقبت کو جگہ دی ہے، لیکن یہ چیز کلیۃً رسمی تھی، چنانچہ ہندوستان کے ہندو شعراء جو فارسی اور اردو میں طبع آزمائی کیا کرتے تھے، ان کے کلام میں بھی حمد و نعت اور منقبت کے نمونے موجود ہیں،

نعت گو شعراء کی دوسری قسم ان لوگوں کی ہے، جو شاعر نہیں تھے، اور نہ کبھی شاعرانہ کمال کے مدعی ہوئے، ایسے شعراء بالعموم مسلمان تھے، جن کو رسول کریمؐ کے ساتھ والہانہ الفت تھی، فارسی شعراء سے قطع نظر اردو میں ایسے لوگوں کی کافی تعداد موجود ہے، شہیدی اور اکبر کا نعتیہ کلام عام طور پر میلاد کی مجلسوں میں پڑھا جاتا ہے، اور لکھنے والوں کے جذبات موقع کی مناسبت سے تھوڑی دیر کے لئے سامعین کے قلوب میں اتر جاتے ہیں، ان کے علاوہ اسی قبیل کے بعض اور نعت گو شاعر ہوئے ہیں جن کی طرف عام طور پر توجہ نہیں کی گئی ہے، خود راقم الحروف کے وطن میں دلدار علی صاحب مذاق ایک صوفی بزرگ گزرے ہیں، آپ کا مزار اب تک مرجع خلائق ہے، اور ہر سال مجلس عرس کا انعقاد ہوتا ہے، آپ کا مکمل دیوان موجود ہے، عوام آپ کو مذاق میاں کہتے ہیں، اور آپ کا نعتیہ کلام بڑے ذوق وشوق سے سنتے اور سناتے ہیں، دلورام کوثر کا نعتیہ کلام بھی مشہور ہے، ایک اور بزرگ کے کلام کا قدیم مطبوعہ نسخہ راقم السطور کو دستیاب ہوا ہے، ان کا نام مولوی محمد حسین اور تخلص فقیر تھا، ان کے کلام کا مجموعہ "تحفۂ فقیر" کے نام سے باہتمام منشی شادی لال مطبع زیب کاشی میں چھپا تھا، سنہ طباعت وسنہ تصنیف ۱۸۸۵ء ہے، یہ مختصر مجموعہ جو ۴۲ صفحات پر پھیلا ہوا ہے، غزلوں، مسدس اور تضمینوں پر مشتمل ہے، اسی زمانہ میں ایک اور گمنام شاعر گذرے ہیں، جن کا مجموعۂ کلام نعت "رضوانِ نعت" کے نام سے راقم السطور نے اپنے اوائل عمر میں دیکھا تھا

ان کا نام حکیم سید فضل حق اور تخلص فضل تھا، یہ شنکر لال ساقی کے شاگرد اور قصبہ امبیٹھ ضلع سہارنپور کے رہنے والے تھے، یہ مجموعہ ۴۰ صفحات پر مشتمل ہے، اور ۱۲۹۵ھ ہجری کے قریب زمانہ کی تصنیف ہے،

محسن سے پہلے نعت گوئی کو مستقل فن یا مسلک کی حیثیت سے کسی اردو شاعر نے اختیار نہیں کیا، اور نہ نعت گو شعراء کی طرف کسی نے توجہ کی، محسن نے جب ہوش سنبھالا اور شاعری شروع کی، تو ادب کا تقلیدی دور تھا، یہ ان کا کمال کہئے کہ وہ ان دشواریوں سے گذر کر نعت گوئی کی معراج کمال پر پہونچے،

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ شعر و شاعری میں محسن لکھنؤ کے دبستان ادب سے تعلق رکھتے ہیں، لکھنوی شعراء نے بعض اصناف سخن میں ایسی ترقی کی کہ اسے بھی تخلیقی کا رنگ دیدیا، انیس سے پہلے مرثیہ گوئی کی وہ شہرت اور عظمت نہیں تھی، جو انیس و دبیر کے کارناموں کی بدولت حاصل ہوئی، بلاشبہ ان دونوں کی شاعری میں بعض نوادر ملتے ہیں، اور یہ صحیح ہے کہ انیس و دبیر سے پہلے کسی مرثیہ گو شاعر کو یہ پایہ نصیب نہیں ہوا تھا، لیکن مرثیہ گوئی بحیثیت فن عرصہ سے رائج تھی، یہ نہ سمجھنا چاہئے، کہ ان لوگوں سے پہلے مرثیہ کا مقصد محض رونا یا رلانا تھا، سودا نے اس کی تردید کی ہے، اور بحیثیت فن اسے بہت مشکل بتایا ہے، سودا سے بہت پہلے دکن میں بھی اس کا رواج تھا، میر انیس کا کمال مرثیہ نگاری مسلم لیکن اس فن میں خود ان کے والد میر خلیق بہت اونچے پایہ پر ہیں، بلکہ بعض اہل نظر تو یہاں تک کہتے ہیں کہ بعض مرثیوں میں یہ دھوکا ہوتا ہے، کہ کس کا کہا ہوا ہے،

مرثیہ گوئی کی فنی ترقی دراصل ایران میں ہی شروع ہو گئی تھی، شاہان صفویہ میں شاہ طہماسپ کو ائمہ اور اہل بیت کرام سے بڑی الفت تھی، اور اسی کے اشارہ پر درباری شعراء نے سلاطین کی مدح و ثناء کو چھوڑ کر اہل بیت کرام کی تعریف اور مصائب کربلا کے بیان کو

اپنا فن قرار دیا، اس سلسلہ مین سب سے زیادہ شہرت محتشم کاشی کو حاصل ہوئی جس کا ہفت بند اپنی خوبیون مین بے نظیر ہے، محتشم کی پیروی اور تقلید دوسرے شعراء نے کی اور مرثیہ کو مستقل فن کی حیثیت حاصل ہوگئی، اور مرثیہ کے بہت سے اصناف پیدا ہوگئے،

ہندوستان مین مرثیہ گوئی اردو کے ابتدائی دور مین ہی شروع ہوگئی، چنانچہ دکن مین بیجاپور اور گولکنڈہ کے شیعہ سلاطین کی بدولت دکن کے شعراء نے مرثیہ گوئی پر خاص توجہ کی، دکنی شعراء کے مراثی عام طور پر دستیاب نہیں ہوتے، لیکن ان مراثی کی جو بیاضین یورپ کے کتب خانون مین محفوظ ہین، انکے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس صنف کو دکن مین بڑا رواج ہوا، دکھنی مخطوطات کے مؤلف کا بھی یہی خیال ہے، کہ جس طرح دکن کے شعراء نے کم از کم ایک دو مثنویاں ضرور تصنیف یا ترجمہ کی ہین، اسی طرح کبھی نہ کبھی مرثیہ بھی ضرور کہا ہے[1] اور یہ شاید اس وجہ سے کہ ان کے مربی اور محسن سلاطین اثنا عشری تھے، ظاہر ہے، اس دور مین مرثیہ کا بڑا سرمایہ بہم پہونچا ہوگا، لیکن دست بردِ زمانہ سے نہ بچ سکا،

اس کے بعد شمالی ہند کے شعراء مین سودا سے پہلے کم از کم میان مسکین اور سکندر مشہور مرثیہ گو گذرے ہین، سودا نے اپنے "شہر آشوب" مین میان مسکین کے کمال کی طرف اشارہ کیا ہے،

اقساطِ حمل ہو تو کہین مرثیہ ایسا،
پھر کوئی نہ پوچھے میان مسکین کہان ہے

سودا نے خود فن مرثیہ گوئی کی ترقی مین پہلا قدم اٹھایا، اور مرثیہ کو مسدس کے طرز مین لکھکر وسعت پیدا کی، میر تقی میر نے بھی مرثیہ مین طبع آزمائی کی، میر ضاحک اور میر حسن کے مراثی

---

[1] یورپ مین دکھنی مخطوطات نصیر الدین ہاشمی،

عام طور پر دستیاب نہیں ہوتے لیکن انیس کا یہ مصرعہ

پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں،

صاف بول رہا ہے کہ میر حسن صاحب مثنوی نے بھی ضرور مرثیہ کہا ہوگا،

ایک اہم نکتہ اس موقع پر قابلِ غور ہے، مرثیہ کے متعلق سودا نے صاف لکھا ہے کہ اس کا مقصد محض گریہ و بکا نہیں، بلکہ یہ ایک مشکل فن ہے" پس لازم ہے کہ مرثیہ در نظر رکھکر مرثیہ کہوے نہ کہ برائے گریہ عوام اپنے تئیں ماخوذ کرے" اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا، کہ انیس سے پہلے مرثیہ گوئی بحیثیت فن مروج تھی، انیس سے پہلے بھی خلیق، ضمیر، دلگیر اور دبیر نے اس فن کو اپنی اصلاح و اضافہ سے ترقی بخشی، انیس نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اسے معراج پر پہنچا دیا، لیکن اس فن میں انھیں تخلیقی فن کار کا درجہ دینا بہت مشکل ہے، البتہ یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے، کہ مرثیہ تخلیقی فن کے نمونے کی حیثیت سے لکھنوی دبستانِ ادب میں موجود نہیں اور اسی لئے محسن کا نعتیہ کلام بے نظیر ہے،

لکھنوی شاعری کے فریم میں محسن کی تصویر

لکھنؤ کے دبستانِ ادب کے ساتھ بعض خصوصی امتیازات وابستہ ہیں، ان میں سب سے اہم شاعری میں خارجی پہلو کا بیان ہے، متقدمین شعرائے دکن اور دلی کے ہاں شعر کی بنیاد بالعموم جذبات پر ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں روحانیت کے جذبات بھی موجود ہیں، اسی نے میر اور درد کے کلام کو غیر فانی بنا دیا ہے، شام و سحر کی لاکھوں کروٹیں بدلیں اور بدلتی رہیں گی لیکن انسان کے جذبات عشق و محبت، سوز اور درد کسک اور تڑپ نہ کبھی بدلے ہیں، اور نہ بدل سکتے ہیں، ظاہر ہے کہ ایسے اشعار جن میں یہ مضامین نظم ہوں گے ہمیشہ زندہ رہیں گے، لیکن شاعری کو جذبات سے علیحدہ کرکے الفاظ کا کھلونا بنا لیا جائے، جس سے شاعر دل بہلائیں، اور صنعت گری کے نمونے پیش کریں، تو ایسی شاعری کو ثبات نہیں، شاعر

جذبات کے اظہار مین صنعت گری کو دخل دینے پر مجبور ضرور ہے، لیکن نری صنعت گری کو شاعری قرار دینا روا نہین، اور نہ اس نوع کی شاعری کو ہمیشگی نصیب ہو سکتی ہے، لکھنو کی قدیم شاعری بالعموم صنعت گری کے سہارے قائم رہی، اور یہی سبب ہے کہ وہان کے شعراء کی دماغی کاوشون کو لوگ اس نظر سے نہیں دیکھتے جس نظر سے دبستانِ لکھنؤ کے پیرواں کا دیکھا جانا پسند کرتے ہین،

برخلاف اس کے محسن کا کلام جذبات کی غیر فانی بنیادون پر استوار ہے، خلوص اور محبت شیفتگی اور عقیدت جو محسن کی زندگی کے عناصر تھے، انہی سے ان کی شاعری نے ترکیب پائی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اب بھی اس مین معنوی دلکشی پائی جاتی ہے، اس اعتبار سے لکھنوی شعراء مین محسن اپنی آپ مثال ہین،

لکھنویت کا دوسرا اہم عنصر نسائیت ہے، جو لکھنوی معاشرت کے ہر پہلو سے جھلکتا ہے، بیشتر فرمانروایانِ اودھ کو مہ جبینون سے بڑا لگاؤ تھا، پھر امراء اور دیگر آسودہ حال طبقون پر اس کا جو اثر ہوا ہوگا، ظاہر ہے، یہ اثر رفتہ رفتہ اتنا بڑھا کہ زندگی کے ہر پہلو پر محیط ہو گیا، مردون نے عورتون کی بولی مین ان کے جذبات ادا کئے، جس مین انھون نے اپنے دور کی عکاسی کی، اس کی بدولت بعض ایسی مستقل اصنافِ سخن پیدا ہوئین، جو شاعری کے روشن چہرہ پر کسی طرح زیب نہین دیتین، اس قسم کی باتین نعت مین دخل نہین پا سکتی تھین، لیکن تعجب یہ ہے کہ نعت خود کس طرح یہان کی شوخ شاعری مین دخل پا سکی، وہ بھی ایسی نعت اور ایسا نعت گو، جو ہر اعتبار سے ممتاز و منفرد ہے،

لکھنویت کا تیسرا اہم عنصر ابتذال ہے، جو مذکور الصدر دونون عناصر سے ترکیب پاکر ظہور مین آیا، یہ پہلو بعض اوقات اس درجہ نمایان ہو گیا ہے کہ اسے بالعموم لکھنویت کا مترادف سمجھا

جاتا ہے، یہ خامیاں بعض لکھنوی شعراء کے ہاں کم اور بعض کے ہاں نسبتہً زیادہ ہیں، لیکن ایسی مثالیں شاذ ہی ملے گی، جو اس سے محفوظ ہو، اور یہ چیز مضمون اور بیان دونوں میں موجود ہے، محسن کا موضوع خاص نعت تھا، جس کے مقدس و محترم بالشان ہونے میں شبہہ نہیں کیا جاسکتا، زبان ہمیشہ موضوع کی مناسبت سے ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ محسن کی زبان بھی دلکش اور پاکیزہ ہے،

لکھنویت کا ایک اور اہم عنصر صنعت گری ہے، جس کے شوق میں لکھنو والوں نے رعایت لفظی اور ضلع جگت میں کمال پیدا کیا، لکھنو کے بعض اچھے اچھے شاعروں کو اسی شوق نے بدنام کر دیا، آتش جن کی قادرالکلامی میں کوئی شبہہ نہیں، اور آتش جن کے کمالات مسلّم ہیں، اسی بھنور میں پھنس گئے، بعض نے اسمیں اعتدال کو ملحوظ رکھکر تیغی پیدا نہ ہونے دی، اگرچہ ان کے ہاں بھی آورد نے کلام کو پھیکا اور بے مزہ کر دیا ہے، لیکن ایسے لوگ نسبتہً قابلِ معافی ہیں، انیسؔ کم اور دبیرؔ زیادہ اس قسم میں شامل ہیں، ان کے ہاں صنائع و بدائع کلام کی خوبی کو دوبالا کرنے کیلئے اکثر موجود ہیں لیکن نہ ایسے کہ اکتا دینے والے ہوں،

محسن کا کلام بھی بلاشبہہ شاعرانہ صناعی کا نادر نمونہ ہے، تشبیہات، استعارات، کنایے مضمون اور معنی آفرینی سب صنعت گری میں داخل ہیں، اور اس اعتبار سے انھیں آورد اور تصنع سمجھنا چاہیئے، لیکن یہ محسن کا کمالِ شاعرانہ ہے، کہ ان کی آورد بھی کلام میں زور لاکر آمد کا لطف پیدا کر دیتی ہے، تشبیہات، استعارات، اور کنایے آسانی سے فہم کے قابو میں آجاتے ہیں، مضمون آفرینی میں تخیل پرواز کرکے آسمانوں میں غائب نہیں ہوجاتا، صنعت گری کی نمایش اور بھرمار کا شوق پڑھنے والے کے لئے وبالِ جان نہیں بن جاتے، اور مضمون سے علٰحدہ ہوکر محض صنعت برائے صنعت کا عیب بھی نہیں ملتا، یہ چیز بھی محسن کو ان کے معاصرین میں ممتاز کرتی ہے،

با این ہمہ لکھنو نے اصلاحِ زبان کی جو کوشش کی ہے، اس کا اعتراف نہ کرنا ناانصافی

ہوگی، زبان کا تعلق انسانوں سے ہے اور انسان کی زندگی کی طرح زبان بھی ارتقا پذیر ہے، آج اردو سے قدیم کو جس کا نام دکنی ہے صحت کیساتھ پڑھنا اور سمجھنا دشوار ہے، ولی نے اسی دکنی کو اردوے معلی شاہجہان آباد کے موافق اور مطابق کرکے اس کی اصلاح کی، میر و سودا نے اسی محنت کرکے وہ زبان تیار کی جو لکھنو میں شعر و ادب کی محفل کے قیام تک ٹکسالی اور مستند سمجھی جاتی رہی، تاہم اس میں بعض الفاظ اور محاورے ثقیل تھے،

لکھنو والوں نے جو بالطبع نفاست پسند تھے، زبان کو لطیف اور پچکدار بنا دیا، اس سلسلہ میں ناسخ نے سب سے زیادہ زبان کی خدمت کی جس کا اثر دہلی والوں پر بھی ہوا، اور متقدمین کی کی جو باتیں لکھنؤ والوں نے ترک کی تھیں، اساتذۂ دہلی نے بھی عموماً ترک کر دیں،

یہی وجہ ہے کہ لکھنوی شاعری ظاہری حسن و زیور کے اعتبار سے عام طور پر متقدمین کی شاعری سے بہتر ہے، زبان کی صفائی بندش کی چستی، محاورہ اور طرز ادا کا زور، لکھنو کے شعراء کے ہاں عام طور پر موجود ہے محسن بھی اس میں برابر کے شریک ہیں،

اب تک ان امتیازات سے بحث تھی، جن میں لکھنو کے بیشتر اساتذہ شریک ہیں، لیکن جیسا کہ مذکور ہوا محسن کی انفرادی شان اور ان کا اپنا خاص رنگ بھی ہر جگہ نمایاں ہے، ان میں سب سے اہم خلوص و محبت ہے، نعت گوئی ایک طرح کی قصیدہ گوئی ہے، قصیدہ کے باکمالوں نے اس صنف میں خوب خوب داد کمال دی ہے، تخیل کی پرواز الفاظ کی شان و شوکت، تشبیہات و استعارات کی بلندی، تشبیب و گریز کی جدت سے ان باکمالوں نے قصیدے کو ایک دقیق فن بنا دیا تھا، لیکن قصیدے کی بنیاد بیشتر صلۂ دنیوی پر ہے، شاعروں کو قصیدہ لکھتے وقت بالعموم صلہ کا خیال رہتا تھا جس نے ان کے دل سے خلوص اور صداقت کو محو کر دیا، مدح کے مقررہ مضامین، اس میں مبالغہ کی کثرت، طرح طرح سے اظہار مطلب اور کوشش کرکے ممدوح کو

صلہ عطا کرنے پر آمادہ کرنا ان شاعروں کا کام رہ گیا تھا، ان میں اکثر ایسے بھی تھے، جو صلہ نہ پاکر ہجو تیار رکھتے تھے جس کو فی البدیہہ سُنا دینے میں ذرا تامل نہیں کرتے تھے، اسی لئے ان قصیدوں میں اصلیت اور جوش کا فقدان ہے،

محسن کا کلام اس حیثیت سے قابلِ قدر ہے، کہ اسکی بنیاد خلوص و محبت پر رکھی گئی ہے محسن نے اپنی شاعری کو اپنی شہرت عزت یا صلہ کا ذریعہ نہیں بنایا، اپنی تمناؤں کا اظہار خود کس خوبی سے چراغِ کعبہ کے آخر میں کرتے ہیں، رسولِ کریمؐ سے خطاب کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

جس طرح ملا تو اپنے رب سے — انداز سے شوق سے ادب سے
یوں ہی ترے عاصیانِ مہجور، — اکدن ہوں تری لقا سے مسرور
صدقے میں ترے یہ آرزو ہے، — دم میں کریں راہِ آخرت طے،
ہو حشر کا دن خوشی کی تمہید — جس طرح سے صبح صادقِ عید
گزرے مری نعت کے سخن میں — رکھی ہو یہ مثنوی کفن میں
پھولے پھلے گلشنِ تمنا، — عقبیٰ مری پھل ہو پھول دینا
یاں شوق و خلوص و التجا ہو، — واں میں ہوں آپ ہوں خدا ہو

مدیح خیر المرسلین کے آخر میں مناجات کا عنوان ہے،

محسن اب کیجئے گلزارِ مناجات کی سیر — کہ اجابت کا چلا آتا ہے گھرتا بادل،
سب سے اعلیٰ تری سرکار ہو سب سے افضل — میرے ایمانِ مفصل کا یہی ہے مجمل،
ہے تمنا کہ رہے نعت سے تیری خالی — نہ مرا شعر نہ قطعہ نہ قصیدہ نہ غزل،
دین و دنیا میں کسی کا نہ سہارا ہو مجھے — صرف تیرا ہو بھروسہ تری قوت تری بل،
ہو مرا ریشۂ امید وہ نخلِ سرسبز — جسکی ہر شاخ میں ہو پھول ہر اک پھل میں پھل،

آرزو ہو کہ رہے دھیان ترا تا دمِ مرگ — شکل تیری نظر آئے مجھے جب آئے اجل

صفِ محشر میں ترے ساتھ ہو تیرا مداح — ہاتھ مین ہو نئے مستانہ قصیدہ یہ غزل،

کہین جبریل اشارہ ہو کہ ہان بسم اللہ — سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل

ایک رباعی مین فرماتے ہین :-

بندہ کو نگاہِ لطفِ مولا بس ہے — حضرت کا مری لئے وسیلہ بس ہے

مین مشتِ غبار ہون سہارا مجھکو — دامانِ رسولِ مصطفےٰ کا بس ہے

یہ خلوص نعت کے علاوہ ان کی غزلون اور دیگر اصنافِ سخن مین بھی موجود ہے :-

لیکن صرف خلوص و محبت اور اصلیت و صداقت نے محسن کا پایہ بلند نہیں کیا، اس موقع پر یہ امر بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے، کہ ہر موقع پر شاعرانہ انداز بیان کو بڑی خوبی سے نباہا ہے، اور ان دونون کے امتزاج نے ہی ان کے کلام کو پر کیف اور با اثر بنا دیا ہے، یہ امتیاز ان کے ابتدائی عمر کے کلام مین بھی موجود ہے، پہلا قصیدہ گلدستہ رحمت ہے، جو ۱۲۵۸ھ مین تصنیف ہوا، اس وقت ان کی عمر صرف ۱۶ سال کی تھی، اس کا مطلع ہے :

پھر بہار آئی کہ ہونے لگے صحرا گلشن — غنچہ ہے نامِ خدا نافہ آہوے ختن

اس کے بعض اشعار ملاحظہ ہون :-

جملہ انبتہ اللہ نباتاً حسنًا — ان دنون فصلِ بہاری مین ہے طرفہ چمن

رشکِ شمشاد اگا کرتے ہین نخلِ قامت — سروِ گلزارِ زمین پر جو ہوا سایہ فگن

خطِ گلزار ہوا جس نے لکھا خطِ غبار — ہو گیا کاغذِ مکتوبِ زمینِ گلشن

دوسرا مطلع ہے،

ہان مین مفتون ہون اسی رشکِ چمن کا کہ چمن — جسکی صورت سے سدا خارِ ندامت ہے دہن

اسکو بیجا ہے گلستان کا مشبہ کہنا کہئے کیسے کہ وہ ہے لالۂ رُخ و نسرین تن

پورے قصیدہ مین وہ تمام خوبیان جو اچھے قصیدہ گو شعراء کے کلام کا زیور ہین، اس مین جھلکتی ملین گی، کمالِ شاعرانہ کی تفصیل آگے آئیگی۔

محسن کے نعتیہ کلام مین سب سے زیادہ شہرت ان کے مشہور قصیدہ مدیح خیرالمرسلین کو نصیب ہوئی، جو ۱۲۹۳ھ مین تصنیف ہوا، اسی ایک قصیدہ کو سامنے رکھکر محسن کے کلام کا جائزہ لیا جائے، تو بھی ان کی شاعرانہ خوبیان نمایان ہوجاتی ہین، قصیدہ نعت مین ہے، لیکن اس کا مطلع ہے،

سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

اس کے بعد تشبیب مین متھرا، گوکل، کنھیا اور گوپیون کا ذکر کیا ہے، بعض حضرات نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے کہا ہے، کہ نعتِ رسول اکرمؐ کے سلسلہ مین ان چیزون کا بیان بے موقع اور بے محل معلوم ہوتا ہے، اس اعتراض کا پہلا جواب یہ دیا گیا ہے، کہ یہ نظم قصیدے کی صنف سے تعلق رکھتی ہے، اور قصیدے مین تشبیب کے مضمون کی قید نہین، کہین ذکر شباب ہے تو کہین مضامینِ عشقیہ کا بیان، کہین شکایتِ زمانہ ہے اور کہین اپنے حال کا رونا، کسی نے خاص مضمون کی غزل لکھدی ہے، اور کسی نے متفرق مضامین کی غزل، اور بعض ایسے قصیدے بھی موجود ہین، جن میں تشبیب موجود ہی نہین ہے، عربی شاعری مین اس قسم کی بکثرت مثالین موجود ہین،

دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ تشبیب کے پڑھنے کے بعد گریز کا مضمون دیکھکر کسی اعتراض کی گنجائش باقی نہین رہتی، محسن نے خود اسی جواب کو تفصیل کے ساتھ نظم کرتے ہوئے لکھا ہے:-

پڑھے تشبیب مسلمان مہ تمہید و گریز رجعتِ کفر بایمان کا کرے مسئلہ حل
کفر کا خاتمہ بالخیر ہوا ایمان پر شب کا خورشید کے اشراق سے قصہ تفصیل
چشمِ انصاف سے دیکھو تو قصیدے کی شبیہ نیم رُخ تھی اسی رنگت سے ہوئی مستقبل
ظلمت اور اس کے دکار ہ میں ہو طولِ سخن مگر ایمان کی کہئے تو اسی کا تھا محل
غلبہ و سطوتِ ظلمت کے بیان میں مضمر شوکت اس نور کی ہے جس نے کیا ستاصل
کفر و ظلمت کو کہا کس نے کہ ہو دینِ خدا مے و نغمہ کو لکھا کس نے کہ ہو حُسنِ عمل
مدعا یہ ہے کہ اندوہ کی سیہ بختی سے ظلمتِ کفر کا جب ہر میں چھایا بادل
ہوا مبعوث فقط اس کو مٹانے کیلئے ق سیفِ مسلولِ خدا نورِ نبیِ مرسل
مہرِ توحید کی ضَو اوجِ شرف کا مہ نو شمعِ ایجاد کی لَو بزمِ رسالت کا کنول

اسے دوسرے نقطۂ نظر سے دیکھئے تو بجائے عیب کے اس میں ایک خوبی مضمر ہے، پڑھنے والے کو اسلامی تصوف اور ہندی تخیل کا سنگم نظر آتا ہے، جو لوگ سری کرشن کی داستانِ عشق اور اس رومانی فضا سے آشنا ہیں، جو ان کے وجود سے برج کے علاقہ میں موجود تھی وہ اس کی تاثیر کو خوب محسوس کرتے ہوں گے، ہمارے ناقدین نے ہماری عام شاعری پر یہ اعتراض کیا ہے، کہ ہندوستان میں رہ کر بھی ہمارے شاعروں کا تخیل عرب کے بے برگ و گیاہ صحراؤں اور ایران کے "نغمہ زار و سبزہ زار و جوئبار" میں بھٹکتا پھرتا ہے، وہی تشبیہات استعارات اور تلمیحات جو متقدمین شعرائے فارس کے یہاں عام ہیں، وہی ان کا ورثہ ہیں لیکن چونکہ ان کا تعلق براہ راست ایران کی سرزمین تاریخ یا خاص ایرانی تہذیب و معاشرت سے ہے، اس لئے ہندوستانی شاعری میں جس کے مخاطب ہندوستانی ہیں، ان کا شمول لطف کو دوبالا کرنے کے بجائے شاعری کو بے مزہ بنا دیتا ہے، سری کرشن کی داستانِ حیات رومان و محبت

کی کہانی ہے لیکن اس مین ابتذال، رکاکت اور سوقیانہ حالات و واقعات کا شائبہ نہین، بلکہ ہر جگہ خلوص و عقیدت، مذہبیت اور احترام کی جھلک زیادہ ہے، چونکہ ہندوستانی عام طور پر اس قصہ سے واقف ہین، اور بعض رسمین اور تہوار ابھی تک ان پرانے واقعات کی یاد تازہ رکھنے کے لئے منائے جاتے ہین، اس لئے تشبیب مین ان کے ذکر سے رومانی فضا پیدا ہوگئی ہے، جو اثر سے لبریز ہے، کسی اور مضمون سے یہ کیفیت یا تشبیب مین یہ زور پیدا کرنا مشکل تھا،

مضمون کے اعتبار سے اس قصیدے اور محسن کی شاعری کے دوسرے کارنامون کو پرکھئے، تو ان مین سب سے ممتاز صنعت جدت کی نظر آئے گی، جیسا کہ مذکور ہوا، ہماری شاعری بالعموم تقلیدی ہے، اور ہمارے شاعر تقلیدی آرٹسٹ، غزل ہنوز، قصیدہ، مرثیہ، غرض ہر صنف کے مخصوص مضامین پیدا ہوگئے تھے، بقول حالی یہی ہزار بار کی چبائی ہوئی ہڈیان تھیں، جو ہمارے شاعرون کے لئے سرمایۂ افتخار بنی ہوئی تھین، محسن کے معاصرین بھی اس رسمی اور تقلیدی شاعری کے چکر سے آزاد نہ ہو سکے، اسی لئے ان کے یہان ہجر و وصال کی داستانین، شکوے شکایتین، خاص خاص حکایتین، گل و بلبل کے مضامین، مے و مینا کی گردش سے پرانے زمانہ کی یادگارون کا ایک عجائب خانہ نظر آتا ہے، جو رفتہ رفتہ اصلیت سے دور اور ابتذال و رکاکت سے قریب تر آگیا، لیکن محسن نے اپنے دامن کو اپنے ہی پھولون سے بھرا ہے، ایک قصیدے کی تشبیب کے مضامین ملاحظہ ہون،

کبھی ڈوبی کبھی اچھلی مہ نو کی کشتی — بحر اخضر مین تلاطم سے پڑی ہے ہلچل
شاہد کفر ہے کھڑے کا اٹھائے گھونگھٹ — چشم کافر مین لگائے ہوئے کافر بادل
جو گیا بھیس کوئی چرخ لگائے ہے بھبوت — یا کہ بیراگی ہے پربت پہ بچھائے کمبل
جس طرف دیکھئے بیلے کی کھلی ہیں کلیان — لوگ کہتے ہین کہ کرتے ہین فرنگی کونسل

صاف آمادۂ پرواز ہو شاما کی طرح | پر لگائے ہوئے مژگانِ صنم سے کاجل
خوب چھایا ہے سرِ گوکل و متھرا بادل | رنگ میں آج کنہیا کے ہے ڈوبا بادل
شاہدِ گل کا لئے ساتھ ہے ڈولا بادل | برق کہتی ہو مبارک تجھے سہرا بادل
جبتلک برج میں جنا ہو یہ کھلنے کا نہیں | ہو قسم کھائے اٹھاؤ ہوئے گنگا بادل
راجہ اندر ہے پریخانۂ مے کا پانی | نغمۂ نے کا سری کرشن کنہیا بادل

ایسی زالی تشبیب آپ کو اردو کے کسی دوسرے شاعر کے ہاں تلاش سے بھی نہیں ملی گی، ذوق و سودا قصیدے کے بادشاہ ہیں، لیکن ان کی کسی تشبیب میں ایسی جدت اور زور نہیں، یہ مضامین تشبیہات، استعارات اور خیالات جو خالص ہندوستانی فضا کی پیداوار ہیں محسن ہی کا حصہ ہیں، اسی سے معلوم ہوتا ہے، کہ محسن کی پاکیزہ طبیعت عوام کی پامال شاہراہ سے بچکر اپنا راستہ الگ بنانا چاہتی تھی، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے سرزمینِ نعت میں اپنی جدت پسندی سے رنگ رنگ کے پھولوں کا ایک گلزار کھلا دیا ہے،

جدت پسند طبیعت سے ہی مضمون آفرینی کا سلسلہ ملتا ہے، ایرانی شعرا نے اپنے تخیل سے مضمون آفرینی کے نوادر پیش کئے ہیں لیکن اکثر مضمون آفرینی کے شوق میں کوہ کندن و کاہ برآوردن کے مصداق بھٹک کر بہت دور نکل گئے ہیں، ہندوستان کے فارسی گو شعرا میں بیدل اور ان کی تقلید میں اردو شعرا میں غالب نے اس طرف بطور خاص توجہ کی، ابتدائے عمر میں غالب کا کلام اسی شوق کی بدولت معمات سے جا ملا تھا، جب عمر اور مشق نے اصلاح کا ہاتھ رکھا تو سلاست کے راستہ پر آگئے، غالب کے علاوہ بعض اور جدت پسند شاعر اس طرف متوجہ ہوئے، جن میں مومن نے بڑا نام پیدا کیا، لکھنو کی شاعری میں واردات قلب کو اساسی حیثیت نہیں دی گئی، بلکہ پورا زور صنعت گری پر صرف کیا گیا، اور اس شوق نے یہاں تک ترقی کی، کہ

یہان کے بیشتر شعرا معمہ اور چیستان گوئی کی بھول بھلیان مین بھٹکنے لگے، خیال آرائی اور مضمون آفرینی کا اکثر نتیجہ یہی دیکھا گیا ہے کہ شاعر چیستان اور معمے کہنے لگتا ہے، آخر عمر مین محسن کو بھی معمہ گوئی کا شوق پیدا ہوگیا تھا، لیکن ان کی عام شاعری اس عیب سے پاک ہے، اس مین مضمون آفرینی ہے، لیکن اعتدال کا دامن کہین ہاتھ سے نہین چھوٹا ہے، چند مثالون سے اوسکی وضاحت ہوجائیگی،

جگنو پھرتے ہین جو گلبن مین تو آتی ہی نظر — مصحف گل کے حواشی پہ طلائی جدول
سبزۂ چرخ کو اندھیاری لگا کر لایا، — شہسوارِ عربی کے لئے کالا بادل
قبلۂ اہلِ نظر کعبۂ ابروے حضور، — موئے سر قبلہ کو گھیرے ہوئے کالا بادل

مثنوی چراغِ کعبہ مین اس قسم کی بے شمار مثالین ہین،

کاغذین سطور کا تسلسل — ہے کھیت مین چاندنی کے سنبل
شبدیزِ قلم کی شانِ اعلی — جنگل مین براق کے غزالا
تحریک انامل سخنگو — جبریل امین کا زور بازو
از رفعتِ من چہ پرسی — ہر حرف کی عرش پر ہے کرسی

شبِ معراج کا ذکر کرتے ہوئے کس خوبی سے نئے مضمون پیدا کئے ہین:-

بھیگی ہوئی رات آبرو سے — داخل ہوئی کعبہ مین وضو سے
اوڑھے ہوئے لیلیٰ گل اندام — شبنم کی ردا بقصدِ احرام
گویا کہ نہا کے آئی فی الحال — جھک جھک کے نچوڑتی ہوئی بال
کیا سعی صفا سے رنگ فق ہے، — سر سے پا تک عرق عرق ہے،
بے محرمون سے چھپائے چہرہ — پردین کو بنائے منہ کا سہرا،

خوشبو وہ کہ ہار یاسمن کے — لپٹے ہوئے بالوں میں دلھن کے
یا تازہ بسی ہوئی ختن کی — کلیاں یوسف کے پیرہن کی

براق کی صفت :-

چھوٹا سا فرس فرشتہ ہیکل — کھیت اس کا بہشت خلد جنگل
مہ پارہ فلک سے آنے والا — اطلس کو کتان بنانے والا
یوں چرخ سے نکلے وہ سبکرو — فانوس سے جس طرح کہ پرتو
شیشے سے پری چمن سے شبنم — سیپی سے گہر حباب سے دم

سراپائے رسول اکرمؐ کے سلسلہ میں بھی چند شعر دیکھئے :-

ابرو پہ چین مہ شمائل — رکھی ہوئی رحل پر شمائل
واللیل کا ترجمہ ہے گیسو — تفسیر اذا یغشیٰ ہے گیسو
جوہر کا بھرا ہوا خزینہ — آئینہ بے مثال سینہ
رعنائی قامت مناسب — روزی میں اذان وقت مغرب

(باقی)

گلِ رعنا

اردو زبان کی ابتدائی تاریخ اور اس کی شاعری کا آغاز اور عہد بعہد کے اُردو شعراء کے صحیح حالات اور ان کے منتخب اشعار، اردو میں شعراء کا یہ پہلا مکمل تذکرہ ہے جس میں آبِ حیات کی غلطیوں کا ازالہ کیا گیا ہے، ولی سے لے کر حالی اور اکبر تک کے حالات، قیمت: للعہ ۵۴۸ صفحے

"منیجر"

مجمع النفائس

از

جناب اقبال انصاری، ایم اے، ریسرچ اسکالر پی ایچ ڈی لکھنؤ یونیورسٹی

(۲)

کتاب پر تنقیدی نظر | تذکرہ پر تنقیدی نگاہ ڈالنے سے قبل اس زمانہ کے ماحول، سوسائٹی اور خود مصنف پر روشنی ڈالنی ضروری معلوم ہوتی ہے، تاکہ اس کا پس منظر اور مصنف کی شخصیت پورے طور پر سامنے آجائے، اور وہ واقعات بھی واضح ہوجائیں جو اس کتاب کی تالیف کے محرک ہوئے۔

خان آرزو کی صغر سنی میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا، کوئی دوسرا عزیز و بے گانہ ایسا نہ تھا جو اسکی تعلیم و تربیت کرتا، چنانچہ وہ ماں کی خدمت کے ساتھ خود تحصیل علوم کرتا رہا، اس کا باپ عالمگیری دربار میں ایک بڑے منصب پر فائز رہ چکا تھا، اگرچہ وہ سپاہی پیشہ تھا، لیکن ادب و شاعری سے لگاؤ رکھتا تھا، چنانچہ دوران قیام گوالیار میں خان آرزو کو راتوں کو سودا سودا اشعار یاد کرادیا کرتا تھا، جو بعد میں اس کی شاعری کا سرمایہ بنے بہرحال باپ کی قبل از وقت موت نے گھر برباد کردیا، عسرت و تنگدستی کے باوجود ماں نڈر آئے، مگر اس ہوشیار لڑکے کے قدموں میں کوئی لغزش نہ پیدا ہوئی، وہ تمام مصیبتوں کے باوجود گوالیار ہی میں مقیم رہا، ماں کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہ کرتا تھا، مجمع النفائس میں جہاں اپنا ذکر کیا ہے، وہاں اپنی ہر نقل و حرکت کو ماں ہی کے حکم کی تعمیل بتایا ہے، یوں ہی زمانہ گذرتا رہا، غربت و مصیبت کی گود کا پلا ہوا سپاہی علوم کی تحصیل اور گھر کی بگڑی ہوئی

حالت کو سنبھالنے میں پندرہ سولہ برس کے سن تک استقلال سے کام لیتا رہا، اٹھارہ برس میں جبکہ حوادث دنیا کو بہت کچھ دیکھ چکا تھا، عالمگیری لشکر کے ساتھ دکن جانا ہوا، وہاں سے نو مہینے کے بعد لوٹا اس وقت اس کی زندگی میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہوا، سلطنت کی تباہی، بھائی بھائی کی خانہ جنگی اور طوائف الملوکی، دنیا کی بے ثباتی اور جاہ و ثروت کے فریب اس کی نظروں میں بالکل عریاں ہو گئے، اس ماحول نے اس کو اور زیادہ مستقل مزاج متحمل، بردبار اور متواضع و متوکل بنا دیا، میر محمد افضل سرخوش، بیدل، مرزا معز فطرت، میر عبد الجلیل بلگرامی اور ناصر علی سرہندی کی نغمہ سرائیوں نے اخلاقی محاسن نے اس کے مذاق سلیم پر جلا کر کے اسے انتہائی سنجیدہ، حلیم، مہذب، شایستہ اور خلیق بنا دیا اور ابھی اس کی عمر چوبیس ہی پچیس برس کی تھی کہ وہ لوگوں کا معتمد علیہ ہو گیا، فرخ سیر کے زمانہ میں شاہی دربار کی وابستگی نے اسے کافی روشناس اور اس کی ذکاوت و ذہانت نے بزرگوں اور خردوں سب کو اس کی جانب متوجہ کر دیا، اس طرح جلوس محمد شاہی سے قبل ہی خان آرزو نے بہترین عنصر جذب کرنے کے لئے زمین تیار کر لی تھی، محمد شاہ کے تخت نشین ہونے کے بعد اسکی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا، اس دور میں ہندو مسلم کا احساس اور سنی شیعہ جذبات نام کو بھی نہ تھے لیکن ایرانی و ہندوستانی نزاع بہت کچھ جڑ پکڑ چکی تھی اور سوسائٹی پر ایرانی رنگ غالب تھا جس میں انقلاب پیدا کرنے کی ضرورت تھی،

خان آرزو پہلا ہندوستانی ہے جس نے ایران نوازی ترک کر کے ہندوستان کی تعریف کی اور ہندیوں کے رسوم وغیرہ کو جو اب تک ناقابل التفات سمجھے جاتے تھے واضح کیا، فارسی ادب اور اس کے استبداد کا ایوان جو اکبر کے زمانہ سے مستحکم ہو چکا تھا، خان آرزو کے زمانہ تک قائم تھا، چنانچہ ایرانیوں کی قدر و منزلت اس کے باوجود کہ وہ ہندیوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور ان کو گالیاں دیا کرتے تھے باقی تھی، ایرانی مسلم الثبوت استاد مانے جاتے تھے اور زبان کے معاملہ

میں جاہل سے جاہل ایرانی بھی استناد و استشہاد میں پیش کیا جاتا تھا جس دو سو برس کی پرانی اور مضبوط سوسائٹی کا یہ حال ہو اسکا یک قلم قلع قمع کر دینا کوئی معمولی بات تھی، اس میں اس کو عزم راسخ و استقلال کامل سے کام لینا پڑا، اس سلسلہ میں سب سے پہلے اس نے اپنے کو نمایاں کر کے تقرب سلطانی حاصل کیا اور محمد شاہ کے دربار کا ملک الشعرا بنا، اس وقت سے اس کی ہر بات سند مانی جانے لگی اور کلام پر سبحان اللہ کا شور مچنے لگا، اس کے بعد اس نے ادب و شعر کی بنیاد ہندی چیزوں پر رکھی اور اپنے اشعار میں اکثر و بیشتر ہندی الفاظ استعمال کرنے لگا اور اپنے کمال سے ثابت کر دیا کہ ہندی کسی طرح ایرانیوں سے کم نہیں، بلکہ استناد و استشہاد کیلئے ان سے بہتر ہیں، کبھی بیدل و امیر خسرو کے تصرفات کو صحیح مان کر بیدل کی عظمت یوں قائم کی "چوں از راہ قدرت تصرفات نمایاں در فارسی نمودہ، مردم ولایت وکاسۂ لیساں آنہا کہ از اہل ہند اند در کلام ایں بزرگوار سخنہا دارند و فقیر در صحت تصرفات صاحب قدرتان ہند ہیچ سخن نہ دارد بلکہ قائل آن است" (مجمع النفائس) کبھی ایرانیوں کی غلطیاں اور تصرفات دکھا کر دعویٰ کیا کہ "تصرف صاحب قدرتان ہند در فارسی چرا جائز نہ باشد؟" (مثمر)

اس کی اس کوشش نے ہندی فضلا کو وقیع بنا دیا اور وہ خانِ آرزو میں جذب ہوتے گئے، اس کا حلقۂ احباب وسیع ہونے لگا، تلامذہ کی تعداد بڑھنے لگی، ہندوستانی ارباب کمال کے علاوہ خود ایرانی اساتذہ بھی جو شاہی دربار سے متوسل تھے، اس کی باتوں اور دلائل پر قبول کی مہریں ثبت کرنے لگے اور خانِ آرزو درباری شعرا کا سرتاج بن گیا، جب اس کے فضل و کمال کا سکہ لوگوں پر بیٹھ چکا اور تلامذہ کی فوج تیار ہو چکی، اس وقت اقلیم سخن کے اس فرمانروا نے بغاوت کا علم بلند کیا اور اس کے حریف مقابل شیخ علی حزیں سے جنگ کی ٹھہری، شیخ نے ایران نوازی اور اپنی عالی منصبی کے زعم اور ہندوستان سے نفرت کے جذبہ میں دریدہ دہنی

اور ہجو کو سپر بنایا، لیکن اب انقلاب کی زمین تیار ہو چکی تھی، اس لئے لوگ اُن کے دشمن ہو گئے، کشمیریوں نے ہجو کشمیر کا بدلہ لیا، ثباتؔ نے اپنے باپ کی ذلت کے انتقام میں حزیںؔ کے دیوان سے تقریباً پانسو ایسے اشعار نکالے جن کے مضامین شعرائے متقدم کے کلام سے ماخوذ تھے، امراء شیخ کے پہلے ہی سے دشمن تھے، خود خانِ آرزو بھی ان کی گالیوں کا نشانہ بن چکا تھا، چنانچہ اس نے حزیںؔ پر تنبیہ الغافلین لکھ ڈالی، جس میں شیخ کے تقریباً چار سو اشعار پر نکتہ چینی کی اور یہ اعتراضات اپنے تلامذہ کو زبانی یاد کرا دیئے، جہاں شیخ جاتا وہ اعتراضات سنائے جاتے، شیخ بگڑتا اور گالیاں دیتا، یہ چیز خانِ آرزو کے مقصد کے حصول میں نہایت مفید ثابت ہوئی اور ہندیوں میں ایرانیوں کے خلاف نفرت کا جذبہ اتنا بڑھا کہ شیخ کا دہلی میں رہنا دشوار ہو گیا اور وہ وہاں سے نکل گئے، ایک ہندی نژاد کا یہ دلیرانہ اقدام اس قدر کامیاب ثابت ہوا کہ لوگوں کی نظروں میں ایرانیوں کی جہالت، ہندوستان سے ان کی نفرت، ان کے سرقوں اور مبلغ علم کا پردہ فاش ہو گیا، اور روز بروز اُن کی قدر و منزلت لوگوں کی نگاہوں سے گرنے لگی

دوسری طرف خانِ آرزو نے یہ تدبیر کی کہ ایرانی اساتذہ مثلاً عرفی، ظہوری، طالب آملی، زلالی خوانساری، مرزا صائب وغیرہ کے کمالات کا اعتراف کر کے اپنی بے تعصبی ظاہر کی، مثلاً ملا منیر لاہوری کا جواب لکھا اور سراج منیر لکھ کر ایرانی اساتذہ کی اہمیت واضح کی، قدسی کی استادی پر داد سخن دی، تذکرہ مدون کر کے ایرانیوں کے حسن و قبح اور ہندوستانیوں کی اہمیت و شعریت کو ظاہر کیا، ان تمام تصانیف میں خانِ آرزو نے جذبات و ذاتیات کے بجائے اصول کو مدنظر رکھا، اس کی جنگ اگرچہ علی حزیںؔ سے تھی لیکن اس سلسلہ میں اس نے تمام ایرانیوں کے نقائص اور سقم ظاہر کر کے جنگ کو عالمگیر کر دیا، شعر میں ہندی، لاطینی، یونانی اور عربی زبان میں ایرانیوں کے تصرفات، ایران کے مختلف خطوں میں تلفظ کا اختلاف، ان کے یہاں ہندی الفاظ

کا استعمال دکھا کر ہندیوں کا فارسی زبان میں تصرف جائز قرار دیا، اور اس کام کی تکمیل انند رام مخلص سے کرائی، مخلص کو شاعری میں محض "برابر فکر او کسے در ہنود نیست"۔ (ریاض الشعراء) کی سند حاصل نہیں تھی، بلکہ اس کی افتاد طبیعت کچھ ایسی تھی کہ وہ عجائب و غرائب کو بہت پسند کرتا تھا زبان دانی کا مدعی اور اہل زبان سے برابر مقابلہ کیا کرتا تھا، ادبی محفلوں میں اہل ایران کے ساتھ حریفانہ گفتگو کرتا اور ان کے کلام پر تنقید کر کے ہندیوں کا کلام قابل استناد ثابت کرتا،

زوال سلطنت مغلیہ کے وقت فارسی زبان پر بھی کافی اضمحلال طاری ہو چکا تھا، انشا پردازی میں مختلف قسم کی بحثیں و نزاعیں پیدا ہو چکی تھیں، اسی میں ایک نزاع "استعمال الفاظ ہندی در فارسی" کے متعلق تھی، ایک گروہ کا خیال تھا کہ ہندی الفاظ کی آمیزش فصاحت میں فرق پیدا کر دیتی ہے اور دوسری جماعت کا دعویٰ تھا کہ جب ترکی، تورانی، عربی وغیرہ کے میل سے فارسی میں کوئی بدمزگی پیدا نہیں ہوتی، تو ہندی جو فارسی کی ہم نسل ہے، کیوں اس قابل نہیں شمار کی جاتی؟ اس گروہ کے امام "سراج المحققین" خان آرزو تھے، مخلص اس بارہ میں اُن ہی کا پیرو تھا اور خانِ آرزو ہی کے ایما سے ایسی کتابیں تصنیف کیں جن میں ہر حیثیت سے ہندیوں کی فضیلت دکھاتے ہوئے فارسی میں ہندی الفاظ کا استعمال جائز قرار دیا، مرآۃ الاصطلاح میں ایک مقام پر لکھتا ہے "اعتقاد بعض عزیزان است کہ الفاظ ہندی در فارسی آوردن نیست ..... ایں چیزہا برائے خانان و مبتدیان مضائقہ دارد، اہل قدرت و استعداد مختارند" یعنی اسی طرح کا خیال چمنستان میں ظاہر کیا ہے کہ فارسی میں ہندی الفاظ کا استعمال قادر الکلام لوگوں کے لئے جائز ہے، خانِ آرزو نے بھی سینکڑوں جگہ مثمر مجمع النفائس، چراغ ہدایت و سراج اللغۃ وغیرہ میں یہی خیال ظاہر کیا ہے، مخلص اور خان آرزو کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ وارستہ و آزاد بلگرامی کی "ایران پسندی" کے باوجود فضلاء کے معتدبہ حصے نے خانِ آرزو کا ساتھ دیا اور

اور ایران کی فضیلت اور اس کے استبداد کی چولیں ہلا دیں، تذکرہ سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ جنگ کی اصل بنیاد کیا تھی اور اس نے کیونکر ایرانی و ہندوستانی نزاع کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا ایرانیوں کے متکبرانہ برتاؤ کے متعلق لکھتا ہے۔ "نبازم انصاف مرزاے (صائب) مرحوم راوالا قلقچیانِ حال ایران و صاحبان گنج باد آورد کلامِ ہندی را بخاطر نمی آرند۔۔۔۔"! (مجمع النفائس)

خانِ آرزو کی طبیعت میں قدرت نے جدت طرازی، شوخی و ظرافت اور معقول پسندی کا وہ مادہ ودیعت کیا تھا جس کے سبب وہ ہمیشہ ایرانیوں پر غالب اور اُن کی اصل رنگ روپ کو ہمارے سامنے پیش کرتا رہا، اس کا طریقہ تھا کہ جب وہ کسی ایرانی کو فاحش غلطی کرتے ہوے دیکھتا تو اس کی راے سے اتفاق کرتا پھر ان غلطیوں پر تنقید کر کے اسے احمق ثابت کرتا، مثلاً سعید اشرف کا شعر ہے،

داد از رانیاں ہندوستاں ۔۔۔ مارانیاں ہندوستاں

یہ گالی تھی، خانِ موصوف نے اس کا جواب یوں دیا کہ متبر میں جب ہندی الفاظ میں ایرانیوں کے تصرفات دکھائے تو اس شعر کو بھی پیش کیا اور کہا کہ ہندی "مرانی" (مہارانی) بولتے ہیں اور ایرانیوں نے "مارانی" لکھا ہے جو بالکل غلط ہے، کبھی نہایت سنجیدگی سے زبردست چوٹ کر جاتا ہے، مثلاً ایک ایرانی شاعر تازگی نے جس کا ذکر مجمع النفائس میں ہے بکثرت غلطیاں کی ہیں، اس کے متعلق لکھتا ہے، "فقیر گوید ہرگاہ احوالے زباندان چنیں باشد واے بحال مردم شعراے ملک دیگر کہ بہ فارسی سخن رانند، دریں صورت اگر ہزار غلط از ہندی واقع شود برابر یک غلط اہل زبان نہ بود۔۔۔۔"! ایرانیوں کی تلخ باتیں سُن کر پی جاتا تھا، کوئی جواب نہ دیتا اور ان کے کلام کی تنقید میں اس کا بدلہ لیتا تھا لیکن انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا تھا، دوسروں کی غلطیوں کو واضح کرنے کیساتھ اسکو خود اپنی غلطیوں کے اعتراف میں تامل نہ ہوتا تھا

خانِ آرزو نے اساتذہ کی موافقت کرکے اُن پر اعتراض کرکے، ان کے مسلّمات پر نقد وجرح کرکے خود اپنی فروگذاشتوں کو واضح کرکے ایرانی شعراء کا جس جس انداز میں مذاق اڑایا ہے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایرانی ہندیوں کی نظروں سے گر گئے اور خانِ آرزو کی اس کوشش نے سوسائٹی کا رنگ بدل دیا اور یہ بات ثابت کردی کہ ہندوستانی کسی حیثیت سے بھی کسی طرح ایرانی اہل زبان سے کم نہیں ہیں، یہ شرف اور امتیاز صرف خانِ آرزو کو حاصل ہے کہ اس نے اپنے علم وکمال کو اپنے ملک وقوم کی سربلندی کے لئے صرف کیا جس سے فیضی اور ابوالفضل جیسی ہستیاں بھی خالی تھیں، ان کے یہاں وہی درباداری اور خاکہ کشی ہے، اس کے برخلاف خانِ آرزو کے یہاں اور چیزوں کے ساتھ ہندوستانیت ہے، ہندوستان کو وہ اپنا ملک سمجھتا ہے، اپنی پرانی تہذیب ومعاشرت کو مقبول بنانے کی کوشش کرتا ہے، اپنی شاعری وادب کو ہندیوں کی عزت ووقار میں صرف کرتا ہے اور اپنی تحریروں سے ایرانی کبر ونخوت کو ہمیشہ کے لئے ختم کردیتا ہے، یہ ہے وہ بنیاد جس پر یہ کتاب لکھی گئی، ادبی حیثیت سے مصنف کا پایہ معاصر وغیر معاصر تمام تذکرہ نگاروں میں مسلّم ہے اور خود اس کے کارنامے اس کے شاہد ہیں،

ذاتی حیثیت سے خانِ آرزو پاک مشرب، بے ریا، مہذب، زندہ دل، یار باش، متواضع، منکسر اور باوقار انسان تھا، وہ محمد شاہ کے دربار میں جس منصب جلیل پر فائز تھا اس کے اعتبار سے اس کو عوام سے میل جول کم رکھنا چاہئے تھا، لیکن اس کے برعکس اگر ایک طرف محمد شاہ، امیر خاں انجام اور اسحاق خاں شوستری سے اس کی صحبتیں رہا کرتی تھیں تو دوسری طرف وہ اپنے تلامذہ اور عوام سے بھی بعینہٖ اسی طرح ملتا تھا، عجز وانکسار کا یہ حال ہے کہ تذکرہ بھر میں اپنے لئے فقیر، ہیچ مدان، ناچیز، پیر عاصی، عصیاں شعار وخاکسار وغیرہ کے علاوہ کوئی فخریہ لفظ استعمال نہیں کرتا، اپنی تحریروں کو حقیر بتاتا ہے، گو اس کا درجہ اساتذہ کا تھا لیکن ہر جگہ اپنے کو ناقص

ہی لکھتا ہو اور کہتا ہے کہ میں مقتدایانِ فن کی گرد قدم تک بھی نہیں پہنچ سکا ہوں،

خانِ آرزو کی زندگی کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے جیسے لوگ دنیا میں قسمت کے ہاتھوں "تیرِ نیم زرافشان پرویز" کی طرح دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے لئے نہیں پیدا کئے جاتے بلکہ خدا ان کو ابتلا، اور امتحان کے بعد عزت و بزرگی کی مسند پر بٹھاتا ہے کہ مصیبت و آزمائش اصلاح و تربیت کا بہترین وسیلہ ہے، جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے، خانِ آرزو کی عظمت اس کی زندگی اور موت دونوں میں مسلّم رہی، چنانچہ اس کے معاصرین میں آزاد، خوشگو، والہ و نقش علی کے علاوہ متاخر تذکرہ نگاروں میں شفیق، بھگوان داس، درگا داس، علی ابراہیم، حسین قلی خاں عظیم آبادی عبرتی اور احمد علی ہاشمی سندیلوی وغیرہ سبھی اس کے شعر و ادب کا اعتراف کیا ہے، فارسی تذکروں کے علاوہ اردو کے اکثر قدیم و جدید تذکروں میں بھی اس کی شخصیت نہایت ممتاز ہے، چنانچہ میر، میر حسن، گردیزی، قاسم، قائم علی لطف اور مصحفی وغیرہ نہ صرف آرزو کے کمالات کے معترف بلکہ اس سے مرعوب نظر آتے ہیں، میر تو یہاں تک لکھ گئے ہیں "کمالات او شان از حیزۂ بیان بیرون است"، قائم کا بیان ہے کہ "در فضیلت و کمال فوقش متصور نیست"، اور میر حسن کے نزدیک "امیر خسرو کے بعد ایسا صاحبِ کمال کوئی سننے میں نہیں آیا"۔ خانِ آرزو ہی کو یہ شرف حاصل ہے کہ میر سودا، درد اور مظہر جیسے نامور شعراء ان کے زمرۂ تلامذہ میں ہیں، میرا تو ذاتی خیال یہ ہے کہ آرزو کے اور کمالات کو چھوڑ کر تنہا مجمع النفائس ہی ان کو زندگی جاوید دینے کے لئے کافی ہے، یہ کتاب محض تذکرہ ہی نہیں ہے، بلکہ بہترین تنقید، بہترین ظرافت اور بلند پایہ شعر و ادب کا وہ شاہکار ہے جس کی مثال متقدمین و متاخرین کسی کے یہاں نہیں ملتی، اس میں ادب کا وہ تنوع اور چاشنی ہے جو تحفۂ سامی، کلمات الشعراء، تذکرۂ خوشگو، عرفات، تذکرۂ طاہر، خزانۂ عامرہ، سرو آزاد، ریاض الشعراء، سفینۂ بے خبر اور مردم دیدہ وغیرہ کسی میں نہیں

حالانکہ یہ سب تذکرے تھوڑی تقدیم و تاخیر کے ساتھ قریب قریب ایک ہی زمانہ کی پیداوار ہیں، یہ تذکرہ متقدمین و متاخرین کے درمیان حدِ فاصل ہے جس میں اسلاف کا بھی رنگ موجود ہے اور آیندہ نسلوں کے لئے ہدایات بھی ہیں، یہ درمیانی کڑی ہے جو ہم کو گذشتہ اور آیندہ ادب سے روشناس کراتی ہے، ایک انقلابی کارنامہ ہے جو پرانی روش کی تخریب کے بعد ہمیں نئی تعمیر کی ہدایت کرتا ہے، وہ ایسا آئینہ ہے جس میں ہم ماضی و مستقبل کے ادب کا عکس دیکھ سکتے ہیں،

طرزِ تحریر ایسی سادہ اور دلکش ہے کہ اس میں ناول کا لطف آتا ہے، شعراء کی زندگی اور تصانیف پر ریمارک نہایت جامع اور مختصر تنقیدیں نہایت مدلل اور چست اور اصلاحیں نہایت منصفانہ اور ادیبانہ ہیں، اگرچہ بعض مقامات پر ان کا عنوان طنزیہ ہے، غرض مجمع النفائس نہایت عالمانہ، ناقدانہ اور استادانہ تصنیف ہے، تحریر میں صفائی، سادگی اور بے تعصبی پائی جاتی ہے، مصنف کو اگرچہ عربی زبان پر پورا عبور تھا لیکن حتی الوسع عربی کے غریب اور ناموس الفاظ سے اجتناب کیا ہے، یہ دیکھ کر تعجب معلوم ہوتا ہے کہ خانِ آرزو نے اٹھارہویں صدی میں جبکہ مسجع و مرصع عبارتوں کا زور تھا، اس کو ترک کرکے سادہ و سلیس عبارت میں خیالات کا اظہار کیا اور اس کمال کے ساتھ کہ بڑے سے بڑے واقعہ کو چند الفاظ میں بیان کر دیتا ہے اور اس کے چھوٹے چھوٹے جملوں میں معانی و مطالب کے دفتر سمائے ہوتے ہیں، مثلاً اہلی خراسانی کے متعلق لکھتا ہے:

"شاعر زبردست، خوب گو است، جمیع اہل سخن را بر و اعتقاد تمام و اعتماد مالا کلام، در عہد سلطان حسین با قرا بود، عاشق مومن مرزا پسر بادشاہ مذکور۔ تا زمان شاہ اسمٰعیل زندہ بود اہل ولایت ترشیز است کہ وطن مولنا ظہوریست۔۔۔۔"

میرزا ابوالقاسم استرآبادی کے متعلق تحریر کرتا ہے:

"مشہور قندرسکی، کمالات ایں بزرگوار آنچہ نقیر آرزو شنیدہ و در کتاب دیدہ از حیز بیان بیرونست"

میرزا جلال اسیر کے متعلق رقم طراز ہے،

"..... در پاکی نسب و ظہور حسب کاشمس فی وسط النہار است، طبعش اگرچہ مائل بہ شرب مدام افتادہ بود، پیوستہ اوقات را صرف اہل حال و صاحبان کمال مفودہ، شاگرد مولنا فصیح ہروی است ..... اورا بسیار بہ بزرگی یاد کردہ، کلیاتش قریب ہشت ہزار بیت است، نصرآبادی گوید کہ رطب و یابس در کلامش ہست ....."

خان آرزو نے تذکرہ میں کہیں مبالغہ سے کام نہیں لیا ہے، اسحاق خاں شوستری کے ذکر میں البتہ اس کی جھلک ہے اور یہ شاید اس کے مرتبی ہونے کا نتیجہ ہے، جس میں جو عیب ہوتا ہے اسے ظاہر کر دیتا ہے، ملا عطاء اللہ کشمیری اظہار علم میں نہایت بخل و سست سے کام لیتا تھا، اور اپنا کلام کسی کو نہیں دیتا تھا، خان آرزو کا بیان ہے:

"در اظہار علم آں قدر سست دارد کہ روبروے اعزۂ امیرزادہ کہ درس می گوید حرف نمی زند تا مبادا دیگرے مستفید شود، خدایش بیامرزاد و ہمچنیں اشعار خود بہ کسے نمی دہد و گویا نتائج طبعش پس افگندۂ گربہ است کہ پیوستہ نہاں می دارد۔"

ملا آزلالی کا شمار اساتذہ میں ہے لیکن انکے یہاں بکثرت غلطیاں ہیں، خان آرزو اس کو یوں ظاہر کرتا ہے:

"ابیات مثنوی او نامربوط است، خیلے محل تعجب است، انچہ ایں عاجز دیدہ و مطالعہ نمودہ بقدر فہم خود دریافت کردہ اکثر ابیات فی حدو انتہا مربوط نیست و ترکیبات نامانوس در بسیارے از اشعار او چہ مثنوی و چہ قصیدہ بیش از بیش است بلکہ می تواں گفت کہ معنی نہ دارد۔"

خان آرزو نے مجمع النفائس کے دیباچہ میں صرف چار تذکروں کا ذکر کیا، تذکرۂ طاہر

تذکرۂ تقی اوحدی، کلمات الشعرا اور تحفۂ سامی جن سے اس نے اپنے تذکرہ کی تالیف میں مدد لی تھی، لیکن کتاب میں جابجا ان کے علاوہ دوسرے تذکروں، تواریخ اور سفائن کا بھی حوالہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے بھی اس نے استفادہ کیا ہے، مثلاً اکبر کے ذکر میں اکبرنامہ کا نام لیا ہے، بایسنغر کے ذکر میں واقعات بابری کا، عرفی محمد رضائے شکیبی صفاہانی، باقی وباوندی، میرزا اسد اور انیسی وغیرہ کے ذکر میں مآثر رحیمی کا، درویش روغن گر، طالعی، عطار، اللہ اور فخری ہروی کے ذکر میں مجالس النفائس میر علی شیر نوائی کا حوالہ ہے، فقیر، حزیں اور قزل باش خاں امید کے ذکر میں ریاض الشعرا کا نام لیا ہے، حکیم قطران بن منصور الاجل کے ذکر میں دولت شاہ اور عوفی اور مجد الدین نشوی کے ذکر میں لباب الالباب کا حوالہ دیا ہے، ابراہیم آذر، قاسمی اروستائی اور ملا غنی کے ذکر میں سفینہ صائب کا نام لیا ہے، لامعی کے ذکر میں لکھا ہے کہ "نظامی عروضی سمرقندی نے ان کو "دہستانی" لکھا ہے جس سے مراد چہار مقالہ ہی ہو سکتا ہے، کیونکہ نظامی کی دوسری کوئی تصنیف مشہور نہیں ہے، ان کتابوں کے علاوہ جن کا نام یا حوالہ موجود ہے خان آرزو نے اور کتابوں کا بھی ضرور مطالعہ کیا ہوگا،

بعض نقائص ان خصوصیات کے باوجود بمقتضائے بشریت آرزو سے کچھ فروگذاشتیں بھی ہو گئی ہیں، جن کا ذکر ضروری ہے، مثلاً رشید وطواط کے ذکر میں اس کی مشہور و معروف تصنیف حدائق السحر کا کوئی ذکر نہیں ہے، حالانکہ شرف الدین رومی کے ذکر میں ان کی کتاب حدائق الحقائق اور رشید وطواط کی حدائق السحر کا ذکر ہے، اسی طرح حزیں کے حالات میں ان کے متعلق نہ اپنی کوئی رائے ظاہر کی ہے اور نہ اس کی شاعری و مصنفات پر روشنی ڈالی ہے، اتنا لکھ کر نظر انداز کر دیا ہے، "می گویند کہ شاعر مذکور فاضل است و صاحب تصانیف لیکن ہیچ تصنیفے از و در علم حکمت و کلام بہ نظر نیامدہ"، حافظ شیرازی کے بارہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ نہ ہونے کے برابر ہے، عراقی اور فردوسی

دونوں کو مایوس رکھا، فردوسی کے ضمن میں شاہ نامہ اور یوسف زلیخا کا ذکر ہے لیکن اس کا انتخاب بیس اشعار سے زیادہ نہیں دیا ہے، حالانکہ انند رام مخلص کے اشعار کئی صفحوں میں نقل کئے ہیں تعجب ہے کہ شیخ محسن فانی کے ذکر میں اس کے محاسن کلام پر تو روشنی ڈالی ہے "شیخ در فن شعر سرآمد است" اور اس کے دیوان کے اشعار کی صحیح تعداد تک بتائی ہے لیکن اس کی "دبستان" کا ذکر نہیں کیا، بلکہ دیباچہ میں دبستان کو ملا مؤید کی جانب منسوب کر دیا ہے،

"در دبستان ملا موبد مسطور است کہ فرہوش نام پادشاہے بود در عہد آبادیاں ....."

اسی طرح اسدی طوسی صاحب گرشاسپ نامہ کو اس نے فردوسی کا استاد مانا ہے جو غلط ہے، ڈاکٹر ایتھے اور براؤن نے ثابت کیا ہے کہ دو اسدی گذرے ہیں جن کا آپس میں باپ بیٹے کا تعلق تھا اور تخلص اسدی دونوں میں عام تھا، رشید یاسمی نے ثابت کیا ہے کہ ان باپ بیٹوں میں سے کوئی بھی فردوسی کا استاد نہیں تھا، اس لئے کہ فردوسی بڑے اسدی سے تقریباً بیس برس بڑا تھا اور چھوٹا اسدی فردوسی کے مرتے وقت بچہ تھا، اس لئے ان دونوں میں سے کسی کا فردوسی کا استاد ہونا بعید از قیاس ہے، آذر نے بھی یہی غلطی کی ہے، بہرحال تذکرہ کی دوسری خصوصیات کے مقابلہ میں ان خفیف فروگذاشتوں کی کوئی زیادہ اہمیت نہیں ہے خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ خان آرزو کا ارادہ پہلے تذکرہ لکھنے کا تھا ہی نہیں، بلکہ اسے بیاض کی شکل میں رکھنا چاہتا تھا جس کا تذکرہ دیباچہ اور خاتمہ میں موجود ہے، پھر تذکرہ کے ۳۵ شعراء کے حالات میں سے اگر دو چار کے ذکر میں کوئی نقص رہ جائے تو اس کی کوئی حقیقت نہیں،

شعر العجم حصہ سوم

شعرائے متاخرین کا تذکرہ (فغانی سے ابوطالب کلیم تک) معہ تنقید کلام، قیمت: ۶ عہ

تلخیص و تبصرہ

عربی زبان کے جدید رجحانات

(۲)

عربی زبان کے موجودہ فن افسانہ نگاری میں یورپ کے اثرات زیادہ نمایاں ہیں، اس دور سے پہلے عربی لٹریچر میں قصہ نویسی کا کوئی مستقل فن نہ تھا، تاریخی ناولوں کا وجود ضرور تھا، مگر وہ محض مدارس کے طلبہ کی ایک خاص قسم کی تعلیم کے لئے لکھے گئے تھے، اس لئے آرٹ کے نقطۂ نظر سے ان کی حیثیت کچھ بلند نہیں ہے، جرجی زیدان (۱۸۶۱ء - ۱۹۱۴ء) نے متعدد ناول لکھے، لیکن اس کا مقصد بھی ناول کے ذریعہ عوام کی تعلیم تھی، اس لئے ان ناولوں کا اسٹائل اور ان کی زبان علمی ہونے کے بجائے صحافتی ہے، افسانہ نگاری ادب اور صحافت کی درمیانی کڑی ہے، اس لئے صحیفہ نگاروں نے اپنے رسائل اور اخبارات کی توسیع اشاعت کے لئے افسانے اور مسلسل قصے لکھنے شروع کئے، لیکن عربی کے قدیم لٹریچر میں موجودہ مذاق کے مطابق ایسے افسانے نہ تھے جن کے اصول کی وہ تقلید کر سکتے، اس لئے وہ یوروپین زبانوں کے افسانوں کے ترجمے کی طرف متوجہ ہوئے، یہ مذاق پیدا ہونے کے بعد اہل علم نے بھی فرانسیسی، انگریزی، جرمن اور اطالوی زبانوں کے اچھے افسانوں کے ترجمے سے عربی زبان کو مالا مال کرنا شروع کر دیا، اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ عربی بولنے والی جماعت میں اپنے کلچر کو یوروپین کلچر کے معیار کے مطابق بلند اور اعلیٰ دیکھنے کا

خیال پیدا ہوا، پھر بھی عربی افسانوں کا معیار خاطر خواہ بلند نہ ہو سکا، کچھ عرصہ کے بعد ایک روشن خیال طبقہ ان افسانوں کو آرٹ کے نقطۂ نظر سے لکھنے کی طرف متوجہ ہوا، اور منفلوطی کی "العبرات، زیات کی "آلام فرتر" اور "رفائل" اور المزینی کی ابن الطبیعہ کی اشاعت کے بعد یورپین زبانوں کے افسانوں کے ترجمے کے لئے ایک معیار قائم ہو گیا، اسی کے ساتھ بعض اہل قلم مصری طرز کے طبعزاد افسانے لکھنے کی طرف بھی متوجہ ہوئے، الایام ڈاکٹر طہٰ حسین، ابراہیم الکاتب، مزینی، الاطلال، تیمور اور ابنۃ الملوک ابی حدید طبعزاد ناول ہیں، لیکن اب بھی افسانوں کے معیار کو بلند کرنے کی ضرورت ہے، اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر ہیکل بے افسانہ لکھتے وقت فن کے اصول کو ضرور پیش نظر رکھتے ہیں، لیکن دوسرے افسانہ نگار ابھی اس سے بالکل ناواقف ہیں، ان کے افسانوں میں کیرکٹر اور پلاٹ کی تطبیق اصول کے لحاظ سے نہیں ہوتی ہے، اور نہ ابھی وہ افسانوں میں مصری ہیئت اجتماعی کے مختلف طرز زندگی اور خیالات کو پیش کرنے میں کامیاب ہو سکے ہیں، لیکن ان خامیوں کے باوجود قصہ نویسی سے ایک مفید نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اب عربی زبان میں ہر قسم کے خیالات ظاہر کئے جا سکتے ہیں، جس سے عربی نثر کے اسٹائل میں ترقی ہوئی، چنانچہ موجودہ عربی اسٹائل کا انحصار ابن مقفیٰ، جاحظ اور ابن العمید کی تقلید پر نہیں رہا، بلکہ اب ہر اہل قلم کے اسٹائل میں اس کی جداگانہ شخصیت نظر آتی ہے، ڈاکٹر طہٰ حسین کو زبان پر غیر معمولی قدرت ہے، وہ ایک خیال کو مختلف پیرایوں میں ڈیکشن طریقہ سے ادا کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ بالکل صاف اور واضح ہو جاتا ہے، وہ یوروپین زبانوں کے فقروں اور خیالات کو ایسی سادہ اور صاف عربی میں پیش کرتے ہیں کہ اب وہ عربی زبان کے ضروری اجزاء بن گئے ہیں، پروفیسر احمد امین کے طرز انشاء میں صحت، مناسب اور متوازن جملوں کے ساتھ متانت، منطق اور گہرائی ہوتی ہے، مزینی کی تحریروں میں ظرافت کی چاشنی ہوتی ہے، ڈاکٹر ہیکل اور

توفیق حکیم کا طرز فلسفیانہ ہے ادب وانشاء کے ان مختلف اسٹائل سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اب عربی زبان کامیابی سے بلندی کے مدارج طے کر رہی ہے،

ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا نظریہ ہے کہ عربی زبان کا مطالعہ آرٹ کے نقطۂ نظر اور سائنٹفک اصولوں کے مطابق کرنا چاہئے، اس نظریہ کی اہمیت بڑھتی جارہی ہے، چنانچہ مصر کے اہل علم نے عربی کی تصانیف کا موازنہ اور تحلیل کیساتھ انکا مطالعہ شروع کر دیا ہے، اور اب اس کی کوشش ہے کہ عربوں کے علمی کارناموں کا تجزیہ مغرب کے ذہنی رجحانات کی روشنی میں اور عرب شعراء کا موازنہ فرانسیسی اور انگریزی شاعروں سے کیا جائے، یہ کوشش ذہنی نشو ونما کو بلند اور وسیع کرنے میں بہت معاون ہوگی، ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اپنی تصنیف "حدیث الشعر والنثر" میں مختلف عرب شعراء کا ایک دوسرے سے موازنہ کرکے دکھایا ہے، کہ عربی زبان کا پایہ دنیا کے ادب عالی میں کتنا بلند ہے، ان کی دوسری تصنیف "الادب الجاہلی" میں اسلام سے پہلے کے ذہنی رجحانات کا سائنٹفک تجزیہ ہے، پروفیسر احمد امین نے فجر الاسلام اور ضحی الاسلام میں اسلام کے ابتدائی زمانہ سے لیکر عہد عباسیہ تک عربوں کی علمی کاوشوں پر تبصرہ کیا ہے، جدید عربی میں اس قسم کی اور بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن پروفیسر احمد امین کی مذکورۂ بالا تصنیف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر جو حصے ہیں وہ بہت اہم اور لائق توجہ ہیں، اب تک عربی زبان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں صرف واقعات سنین کے ساتھ لکھدیئے گئے ہیں، ایسی کوئی کتاب نہ تھی جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے مختلف پہلوؤں پر مختلف زاویۂ نگاہ سے نظر ڈالی گئی ہو، لیکن اب عربی نثر کے اس جدید دور میں انبیا کی تعلیمات اور مفکروں کے افکار کا گہرا نفسیاتی مطالعہ بھی کیا جاتا ہے، ڈاکٹر ہیکل نے "حیات محمدؐ" میں نہ صرف سیرت لکھی ہے، بلکہ بہت سے فلسفیانہ مباحث بھی چھیڑے ہیں، توفیق حکیم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی تصویر اس طرح دکھائی

ہے، جیسے ایک ڈرامہ نگار اپنے ہیرو کو پیش کرتا ہے، عبدالرحمٰن بدوی نے بطل الابطال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اس عہد کے حالات کی روشنی میں دکھائی ہے،

ان کوششوں کے ساتھ خالص ادبی تحلیل کتابیں بھی لکھی جارہی ہیں، چنانچہ عباس محمود العقاد کی رجعۃ ابی العلاء اور ابن الرومی وحیاتہ من شعرہ اور محمود شاکر کی المتنبی اسی قسم کی مثالیں ہیں، محمود شاکر نے تو متنبی کے حالات میں بہت سی نئی تحقیقات کی ہیں، مثلاً اس واقعہ کو غلط ثابت کیا ہے کہ متنبی ایک سقہ کا لڑکا تھا، ان کی تحقیق میں متنبی علوی سادات میں سے تھا، اور اس کو سیف الدولہ کی بہن سے عشق ہوگیا تھا،

اس قسم کی تصانیف سے نقادوں اور مبصروں کی بھی ایک جماعت پیدا ہوگئی ہے جس نے شعراء اُن کی شاعری اور دوسری جدید تالیفات پر تنقید وتبصرہ کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کر دیا ہے، ان مساعی سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصر کی پوری قوم علمی تجدید کے لئے سرگرم ہے، حکومت کی جانب سے اور بعض نجی کے ایسے ادارے قائم ہیں جن سے اہلِ علم کی ہمت افزائی کے ساتھ عوام کی علمی ضرورتیں بھی پوری ہوتی رہتی ہیں، یونیورسٹی کے اساتذہ اور فضلا نے ایک مجلس قائم کی ہے جہاں سے عوام کے ذہنی نشوونما کے لئے سائنس، فلسفہ اور تاریخ پر مستقل کتابیں اور ترجمے برابر شائع ہوتے رہتے ہیں، یونیورسٹی کے فارغ التحصیل طلبہ کی بھی ایک مجلس ہے جو عربی لٹریچر کی ترقی اور تجدید کے لئے کوشاں ہے، مصر کی وزارتِ تعلیم اور مصری بینک کی علمی کمیٹی کی طرف سے اہل علم وفضل کی ہمت افزائی کے لئے بڑے بڑے انعامات تقسیم ہوتے رہتے ہیں، حکومت نے اہل علم کے لئے ایک لسانی ادارہ (رائل فیلالوجیکل اکیڈمی) قائم کیا ہے، اس ادارہ کے مقاصد حسب ذیل ہیں،

(۱) عربی زبان کی اصلی خصوصیات کو قائم رکھتے ہوئے اس کو اس لائق بنایا جائے کہ

ضرورت زمانہ کے مطابق اس میں آرٹ اور سائنس وغیرہ ہر قسم کے مضامین لکھے جاسکیں،

(۲) عربی میں غیر ملکی زبانوں یا عام بول چال کے جو محاورے نہ ہوں ان کے مترادفات عربی زبان کے اصول وطرز پر بنائے جائیں،

(۳) سائنس، آرٹ اور ادب کی اصطلاحات کا ایک فرہنگ اور ایک ایسا لغت مرتب کیا جائے جس میں الفاظ کی پوری تاریخ اور اس کے مختلف معانی ہوں، اس فرہنگ اور لغت کی تالیف کے علاوہ ایسے الفاظ کی جو مصر اور عرب کے جاہل طبقوں کی مقامی بولیوں میں رائج ہیں تحقیقات کی جائے،

اس ادارہ میں گیارہ کمیٹیاں ہیں جن کے ذریعہ صرف ونحو، مقامی بولیوں اور مختلف علوم وفنون کے وضع اصطلاحات کے اصول وقواعد مرتب ہوتے ہیں، اور پھر مختلف افراد کی تحقیقات اور مجلس اعلیٰ کی رضامندی کے بعد ان کو ادارہ کے رسالہ میں شائع کردیا جاتا ہے، اس رسالہ کی پہلی جلد ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی تھی، اس میں ایسے الفاظ کو از سر نو زندہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی جو مردہ ہوچکے تھے اور مصری سوسائٹی کے موجودہ مذاق کے مطابق نہ تھے، اس لئے اہل علم اور عوام دونوں کی جانب سے اس کی مخالفت ہوئی، سائنس اور آرٹ کی اصطلاحات پر تو انھوں نے اپنی کوئی رائے ظاہر نہیں کی، لیکن ایسے الفاظ پر جن کا تعلق سوسائٹی اور عوام سے تھا سخت اعتراضات کئے گئے، مصر کے اجتماعی حلقوں نے ایسے الفاظ ومحاورات کو استعمال کرنے سے قطعی انکار کردیا، جو جدید اور رائج الوقت الفاظ ومحاورات کی جگہ ادارہ نے وضع کئے تھے اور عذر یہ پیش کیا گیا کہ جدید الفاظ ومحاورات ادارہ کے قائم ہونے سے بہت پہلے عام فہم اور مروج ہوچکے ہیں،

بول چال کے محاوروں اور علمی زبان میں یہ اختلاف کوئی نیا نہیں بلکہ اس وقت سے

چلا آتا ہے، جب سے عربی زبان کی اصلاح کی تحریک شروع ہوئی ہے عربوں کی قوت اور ان کے تمدن کے زوال کے بعد سے دیہاتوں کی مقامی بولیوں اور شہروں کے تعلیم یافتہ طبقہ کی زبان میں فرق پیدا ہوگیا ہے، شہری تعلیم یافتہ صرف ونحو کی پابندی کے ساتھ زبان بولنے کے عادی تھے اور دیہاتی بولیاں ان پابندیوں سے آزاد تھیں، عربوں کے زوال کے بعد علمی زبان بھی دیہاتی بولیوں سے متاثر ہونے لگی، لیکن جب عربوں میں قومیت کا احساس پیدا ہوا تو انھوں نے محسوس کیا کہ مقامی بولیوں کے اختلاف سے عرب قوم کی متحدہ قومیت خطرہ میں پڑ جائیگی، اور ان بولیوں کے بڑھتے ہوئے اثرات سے وہ اپنے آبا و اجداد کی تاریخی اور علمی وراثت سے دور ہوتے جائیں گے، اس کے علاوہ مغربی علوم وفنون کی نامانوس اصطلاحات سے بھی عربی زبان پر بار پڑ رہا تھا، ان اسباب نے اہل علم کو عربی زبان کی اصلاح کی طرف متوجہ کیا اور سب سے پہلے دمشق کی عربک اکیڈمی نے اس کی جانب قدم بڑھایا، اس ادارہ کا ہر ہفتہ جلسہ منعقد ہوتا تھا، جس میں الفاظ کا انتخاب کیا جاتا تھا، اور عام بول چال کی نحوی غلطیوں کو درست کیا جاتا تھا، اس ادارہ کے اثرات محدود تھے، اس لئے مصریوں نے ۱۹۳۲ء میں اسی نوعیت کا ایک بڑا ادارہ اپنے یہاں قائم کیا، اس نے ۱۹۳۵ء میں اپنی علمی کارگذاری کی ایک روداد شائع کی، اس کی اشاعت پر دو جماعتیں پیدا ہوگئیں، ایک جماعت کا خیال ہے کہ ادارہ کا یہ کام نہ ہونا چاہئے کہ وہ پرانے رائج شدہ الفاظ زبان سے نکال کر اس کی جگہ مردہ اور بھولے ہوئے الفاظ دوبارہ رائج اور نئے الفاظ وضع کر کے عوام کو ان کے استعمال پر مجبور کرے، بلکہ اس کا کام یہ ہونا چاہئے کہ عربی زبان میں جن غیر ملکی الفاظ اور اصطلاحات کے مترادفات نہیں ہیں، ان کو وضع کرے، لیکن اس ادارہ کے حامیوں کا خیال ہے کہ اگر غیر ملکی الفاظ کے استعمال کی کثرت کو باقی رکھا گیا اور اس کو روکا نہیں گیا تو عربی زبان نہ صرف اجنبی الفاظ سے

پر ہو جائے گی، بلکہ اس کی اصلی خصوصیات بھی ضائع ہو جائیں گی، اس لئے غیر ملکی الفاظ کے استعمال میں صرف ونحو کے قواعد کی پابندی ضروری ہے، دونوں جماعتوں کے جھگڑے جاری ہیں، لیکن ادارہ صرف ونحو کے قواعد کی اشاعت میں مشغول ہے، اور علمی الفاظ کے معانی ومطالب کی توسیع میں بھی کوشاں ہے، بشرطیکہ اس توسیع سے الفاظ کے اصلی تخیل میں فرق نہ پیدا ہو، غیر ملکی الفاظ کو معرب کرنے کی بھی کوشش جاری ہے،

زبان کی اصلاح کے ساتھ عربی زبان کے نحوی اور لسانی اصولوں میں ترمیم اور تغییر کرنے کی جانب بھی توجہ ہے، اور یہ عام طور سے محسوس کیا جانے لگا ہے کہ جو صرف ونحو مدارس میں پڑھائی جاتی ہے، وہ نقائص سے پر ہے، جامعۂ ازہر کا ایک طالب علم دس سال نحو پڑھنے کے بعد بھی صحیح عبارت پڑھنے اور لکھنے پر قادر نہیں ہوتا، اس کے علاوہ نحو کا تعلق مختلف ہوں، مختلف قسم کی مقامی بولیوں اور کلام پاک کی عبارتوں سے ہوتا ہے جس کا تعلق عوام سے کم ہے، ان کا تعلق صرف اپنی روزمرہ کی بولی سے ہوتا ہے، چنانچہ ایک جماعت کہتی ہے کہ صرف ونحو کے قواعد میں ایسی ترمیم کیوں نہیں کی جاتی جس سے روزمرہ کی گفتگو میں معیار اور توازن قائم ہو جائے، ازہر کی تعلیمی روایات کے لحاظ سے صرف ونحو کے قواعد میں تبدیلی کی گنجائش نہیں ہے، لیکن اب اس کی ضرورت ہے کہ طلبہ اس روایت سے آزاد ہو کر صرف ونحو کے قواعد میں وسعت اور ہمہ گیری پیدا کرنے کی کوشش کریں،

ان تفصیلات کا خلاصہ یہ ہے کہ عربی زبان کے جدید رجحانات کے اسباب حسب ذیل ہیں: (۱) تعلیم کی اشاعت میں تیز رفتاری (۲) یورپین زبانوں کی کتابوں کے ترجمے (۳) صحافت نگاری میں ترقی شیخ محمد عبدہٗ کی تحریک نے بھی علمی تجدید کے لئے ایک خوشگوار فضا پیدا کر دی ہے، اور اب عربی تحریروں کا معیار کافی بلند ہو گیا ہے، قدیم اور جدید کا جھگڑا ختم ہونے کے بعد عربی

لٹریچر اور اس کی تاریخ کے ناقدانہ اور مبصرانہ مطالعہ میں بھی بڑی ترقی ہو رہی ہے، نثر کے مقابلہ میں شاعری کو ابھی فروغ حاصل نہیں ہو سکا ہے، تاہم ان دونوں میں نئے طرز اور مضامین اختیار کئے جا رہے ہیں، لیکن نحوی اور لسانی اصلاح کے سلسلہ میں مصر کے علمی اور معاشرتی حلقوں کے درمیان ابھی تک نزاع قائم ہے،

کسی زبان کی ترقی اور زوال کے اثرات اسکی بولنے والی قوموں کے تمدن اور کلچر پر نمایاں طور سے نظر آتے ہیں، جو قوم تمدن کے منازل طے کر رہی ہوتی ہے، اس کی زبان بھی اسی نوعیت سے متاثر ہوتی رہتی ہے اور عربوں کے تمدن اور مصریوں کے کلچر میں ترقی ہو رہی ہے، اس لئے یہ کہنا کہ عربی لٹریچر تکمیلی شاہراہ پر گامزن ہے محض امیدوں کی دنیا بسانا نہیں ہے، "ص ع"

تابعینؓ

علم و عمل اور مذہب و اخلاق میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین اور ان کے تربیت یافتہ تابعین کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں، صحابۂ کرامؓ کے بعد ان ہی کی زندگی مسلمانوں کیلئے نمونۂ عمل ہے، اس لئے سیر الصحابہؓ کی تکمیل کے بعد دار المصنفین نے اس مقدس گروہ کے حالات کا یہ تازہ مرقع مرتب کیا ہے، اس میں حضرت عمر بن عبد العزیزؒ، حضرت حسن بصریؒ، حضرت اویس قرنیؒ، حضرت امام زین العابدینؒ، حضرت امام باقرؒ، حضرت امام جعفر صادقؒ، حضرت محمد بن حنفیہ، حضرت سعید بن مسیبؒ، حضرت سعید بن جبیرؒ، حضرت محمد بن سیرینؒ، حضرت ابن شہاب زہریؒ، امام ربیعہ رائیؒ، امام مکحولؒ شامی، قاضی شریح وغیرہ جیسا نوے اکابر تابعینؒ کے سوانح، ان کے علمی، مذہبی، اخلاقی اور عملی مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل ہے، مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی، ضخامت ۵۶۰ صفحے، قیمت للعہ

"منیجر"

اخبار علمیہ

اسلامی ممالک کی علمی کوششیں

آجکل عربی زبان کے نوجوان اہلِ قلم کی توجہ کلام پاک کی جانب بہت زیادہ مبذول ہورہی ہے، دوسال ہوئے ڈاکٹر راحت اللہ خاں نے لیزگ سے ایک مقالہ "قرآن مجید کے اثرات عربی شاعری پر" کے عنوان سے شائع کیا تھا، محمد سلیم الجندی دمشقی نے ایک طویل مضمون کلام پاک کے اسٹائل پر لکھا ہے جس کی اشاعت دمشق کے ایک ماہانہ رسالہ میں مسلسل ہورہی ہے، مجلس تحریک قرآن، حیدرآباد دکن سے بچوں کی تفسیر شائع ہوتی ہے، جس کی مقبولیت نہ صرف ہندوستان میں ہے بلکہ مشرقی اور جنوبی افریقہ اور دنیا کے مختلف گوشوں میں اس کی مانگ ہورہی ہے،

کچھ دنوں پہلے پروفیسر کراوس (فواد یونیورسٹی مصر) نے "منتخب رسائل جابر ابن حیان" شائع کی تھی، پروفیسر موصوف نے اس کی پہلی جلد پر ایک مقدمہ لکھا ہے جو چھپ کر قریب قریب تیار ہے، پروفیسر مذکور نے "رسائلِ جاحظ" کو بھی مرتب کیا ہے جو زیر طبع ہے،

قاہرہ میں "الوثائق السیاسیہ" کے چار سو صفحے چھپ چکے ہیں، اس میں عہد نبوی صلعم کی دوسو اتھاسی اور خلفائے راشدین کے زمانہ کی تقریباً ایکسو سیاسی دستاویزیں ہیں، جن سے اس دور کے سیاسی حالات کے متعلق مختلف قسم کی معلومات حاصل ہوتے ہیں، اس کتاب میں بدر، احد اور

یرموک کی لڑائیوں کے نقشے بھی دیئے ہیں، اس میں بعض ایسے خطوط کے عکس بھی ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب ہیں، ان تمام فتوحات کے بھی نقشے ہیں جو عہد نبوی صلعم اور خلفاے راشدین کے زمانہ میں ہوئیں، ان نقشوں سے نہ صرف فتوحات کی تفصیلات روشن ہو جاتی ہیں، بلکہ مقامات کی تعیین بھی پورے طریقہ سے ہو جاتی ہے، یہ کتاب اسلام کے ابتدائی دور سے لے کر نصف صدی ہجری تک کی تاریخ کے لئے بہت ہی اہم اور مفید ہے،

استنبول سے فریدالدین عطار کا "الٰہی نامہ" شائع ہوا ہے، مطبع دائرۃ المعارف (حیدرآباد) میں امام بخاری کی کتاب الکنیٰ اور تاریخ کبیر زیر طبع ہیں، مجلس احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد دکن کی طرف سے حنفی فقہ کے بعض نئے مخطوطات کی تصحیح و ترتیب جاری ہے، اس مجلس کی جانب سے امام ابوحنیفہؒ، امام ابویوسفؒ اور امام محمد شیبانیؒ کی چھ مختلف کتابیں شائع ہو چکی ہیں،

بعض سمندروں، دریاؤں اور قدیم شہروں کا طول و عرض

بحر منجمد کا رقبہ سات کروڑ اسی لاکھ مربع میل ہے، اطلانتک دو کروڑ پچاس لاکھ، بحر ہند ایک کروڑ چالیس لاکھ، بحر جنوبی دو کروڑ پچاس لاکھ، بحر شمالی پچاس لاکھ، بحر روم دس لاکھ، بحر اسود ایک لاکھ ستر ہزار، بحیرۂ بالٹک ایک لاکھ پینسٹھ ہزار مربع میل ہیں، دریاے آمیزن کا طول چار ہزار سات سو میل ہے، مسوری اور مسی سیپی چار ہزار چار سو میل، یانگ ٹی زی کیانگ دو ہزار نو سو اسی، نیل تین ہزار دو سو اکہتر، وہزار پینتیس، فرات ایک ہزار آٹھ سو میل، ڈینیوب ایک ہزار سات سو ساٹھ، دریاے سندھ ایک ہزار چھ سو پچاس، گنگا ایک ہزار پانچ سو پچاس میل، اور ری ایک ہزار چار سو اسی میل طویل ہیں،

پرانے شہروں میں نینوا چودہ میل لمبا اور آٹھ میل چوڑا اور چھیالیس میل کے دور میں تھا،

اس کی فصیل ایک سو فیٹ بلند تھی، اس کی چوڑائی اتنی تھی کہ اس پر تین رتھ ایک ساتھ چل سکتے تھے، بابل فصیل کے اندر پچاس میل تک پھیلا ہوا تھا، اس کی فصیل کے آثار پچھتر فیٹ چوڑے تھے اور بلندی سو فٹ تھی، اس میں سو پھاٹک تھے، کارتھیج انتیس میل کے دور میں تھا، ایتھینس کا طول پچیس میل تھا، اس میں تین لاکھ پچاس ہزار شہری اور چار لاکھ غلام آباد تھے، قدیم روم کی دیوار کا قطر تیرہ میل تھا، اہرام مصر کی انتہائی اونچائی چار سو بیس فیٹ ہے، اسکا ہر ضلع نو سو ترپن فیٹ اور رقبہ گیارہ ایکڑ ہے، اس کے پتھر ساٹھ فیٹ لمبے ہیں، اور اس کی دو سو نو تہیں ہیں، اس کی تعمیر میں تین لاکھ بیس ہزار آدمیوں نے کام کیا، مصر کی مشہور بھول بھلیاں میں تین سو حجرے اور بارہ بڑے کمرے ہیں، مصر کے شہر طیبی کے کھنڈرات ستائیس میل تک پھیلے ہوئے ہیں، ان کھنڈرات میں سو پھاٹک ہیں، ڈیانا کا مندر سو برس میں تعمیر ہوا، ڈلفس کے مندر (یونان) میں اتنی دولت تھی کہ ایک کرور پونڈ ایک وقت میں لوٹا گیا تھا اور نیرو یہاں سے دو سو بت لے گیا تھا،

امریکہ میں غذاؤں کی اصلاح و ترتیب

امریکہ کے عام باشندوں کی غذا کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے گذشتہ جون میں ممالک متحدہ امریکہ کے نو سو ڈاکٹروں اور غذاؤں کے ماہرین کا اجتماع واشنگٹن میں ہوا، جنھوں نے روزمرہ غذاؤں کی ایک فہرست شائع کی ہے جس کی پابندی کرنے سے ان کا خیال ہے کہ امریکہ کے باشندوں کی صحت اور تندرستی قائم رہیگی، روزانہ ایک پائنٹ دودھ (ایک پائنٹ ایک گیلن کے آٹھویں حصہ کے برابر ہوتا ہے) گوشت کی مقدار حسب خواہش ایک انڈا یا اسکی جگہ پر بحری سیم (؟)، دو قسم کی ترکاریاں جنمیں سے ایک کا رنگ سبز ہو یا زرد، دو قسم کے پھل جنمیں سے ایک میں وٹامن سی ہونا چاہئے، روٹی کا آٹا بالکل خالص ہونا چاہئے تھوڑا مکھن بھی ہو جو وٹامن اے کیلئے ضروری ہے، انکے علاوہ ایسی غذائیں بھی ہوں جن سے اشتہا رفع ہو، ان غذاؤں کے اخراجات موجودہ اخراجات سے پانچ گنے زیادہ ہو جائیں گے، "ص ع"

ادبیات

جبریل و ابلیس

از

پروفیسر اکبر مُنیر، ایم، اے،

یہ نظم انجمن حمایت اسلام لاہور کے بائیسویں سالانہ جلسہ اپریل ۱۹۴۱ء میں پڑھی گئی

انتساب: (نوجوان مسلمان کے نام)

فطرت کے انتقام کی خاموش بجلیاں — بھرتی ہین کوند کوند کے پیمانۂ عذاب
آدم ہوا ہے فتنۂ ابلیس کا شکار — ہے شش جہت میں نارِ جہنم کا التہاب
عالم تمام عقلِ فسون ساز کا اسیر — اس مار پیچ پیچ سے کھاتا ہے پیچ و تاب
اے مسلمِ جوان! تجھے اسلام کی قسم — کب تک رہیگا بادۂ غفلت سے مست خواب؟
تاریکیون مین چھپ گیا رخسارِ زندگی — حُسنِ عمل کے نور سے کر اسکو بے حجاب
حُسنِ عمل ہے آئینہ، دینِ مصطفےٰؐ — حُسنِ عمل ہے شیشہ، اسلام کی شراب
مدت سے تیرے حُسنِ عمل کی ہے منتظر — گردون پہ چشم! انجمِ خورشید و ماہتاب
تہذیب کا جہان مین تو آخری امین — جبریلؑ کے پیام کی تو آخری کتاب

اسلام کیا ہے؟ عشق کا پیغامِ آتشیں — اسلام کیا ہے؟ دعوتِ قرآں کا انقلاب
دے شامِ غم کو صبحِ مسرت کی روشنی — اے خنجرِ ہلال ہو شمشیرِ آفتاب
مخمانۂ مجاز سے لا ساغرِ حیات
دے آدمی کو فتنۂ ابلیس سے نجات

جبریل و ابلیس

(شاعر)

شاعرِ شیریں نوا، آہوئے گردوں خرام — فرش پہ اس کا قدم، عرش پہ اسکا مقام
نورِ سخن پروری، پرتوِ پیغمبری — عاشقِ حق کا سرود، عاشقِ حق کا پیام
عشق کی گرمی سے شعر برق فشاں و برق خیز — عشق کی مستی سے شعر، جامِ مئے لعل فام
عشق کے ساغر سے جب چشمِ تخیل ہو مست — خنجرِ تقدیر کو، دیکھتی ہے بے نیام
عشق سے ہے تیز پا، عشق سے ہی تابناک — زندگیِ بے مقام، زندگیِ خوش خرام
عشق چراغِ حیات، عشق شرارِ حیات
عشق کے گلشن سے ہی حسنِ بہارِ حیات

دامنِ کہسار تھا، غیرتِ باغِ خلیلؑ — بن رہی تھی آبجو، آئینہ سلسبیل
نور سے آئینہ پوش، بزمِ جہاں تھی خموش — دے چکی تھی چاند رات دن کو پیامِ رحیل
وادیِ گلزار کو، لگ رہے تھے چار چاند — آتشِ سیال تھے، سبزۂ و کشتِ نخیل
دور فضا میں کہیں، شور ہوا یوں بلند — سیل میں ہوں جس طرح، رادیِ جیحون و نیل
خندۂ ابلیس سے گونج اٹھی کائنات — جنبشِ بیم میں تھے، بال و پرِ جبرئیل

دل تھا ہمہ آرزو، دل تھا ہمہ جستجو
راز کی تھی گفتگو، میں نے سنی ہو بہو

ابلیس

خطۂ مغرب سے پھر اٹھا ہے طوفانِ جنگ
خون سے خاکِ فرنگ ہوتی ہے پھر لالہ رنگ

کوہ و بیابان میں جنگ شہر و خیابان میں جنگ
برف کے تودوں میں جنگ بحر کی موجوں میں جنگ

اٹھے ہیں یورپ کے مرد، لائے ہیں بہر نبرد
نیزہ و تیر و تبر، خنجر و توپ و تفنگ

خون کا سیلاب ہے، آدمِ خاکی کا دل
تیرتا پھرتا ہوں میں، خون میں مثلِ نہنگ

میرا نفس شعلہ ریز، میرا نفس شعلہ خیز
مجھ سے دلوں کی ترنگ مجھ سے دلوں میں امنگ

لاکھوں ہیں فتنے مرے جنبشِ سو میں ایک دو
فتنۂ تہذیب و رنگ، فتنۂ ناموس و ننگ

مشرق و مغرب زمیں سب مرے زیرِ نگیں
میری ہے میں روم و چیں، میری ہے میں چین و فرنگ

مکر سکھاتا ہوں میں فتنے اٹھاتا ہوں میں
برق گراتا ہوں میں آگ لگاتا ہوں میں

وادی و دشت و جبل بن رہی ہیں لالہ زار
آدمِ خاکی کا خون، میری چمن کی بہار

پھیل گئیں شش جہت خون کی رنگینیاں
خوں سے زمیں لعل رنگ خوں سے فلک لعلبار

آدمِ خاکی تھا خام بے خرد و بے مرام
میں نے کیا ہوشیار میں نے کیا پختہ کار

دم سے میرے ہیں بپا پھیلے ہیں جا بجا
محفلِ رقص و سرود، مجمعِ جام و قمار

سایۂ تہذیب میں، پل رہے ہیں علم و فن
کر رہا ہے آدمی، میرا ہنر آشکار

آدمی زادوں کا قتل آدمی زادوں کے ہاتھ
آدم و حوا کی نسل، ہو گئی میرا شکار

تیغ مری زہر دار، برچھی مری مرگ بار
ابر میرا مرگ بار، تیغ مری زہر دار

دشمن انساں ہوں مین فتنہ، دوران ہوں مین
آگ کا دریا ہوں مین، خون کا طوفان ہوں مین

(جبریل)

اے ہمہ فتنہ نگاہ! اے ہمہ برق گناہ!
محفلِ ارض و سما، کفر پہ تیرے گواہ

قلب ترا شعلہ زار، چشم تری مرگ بار
تیر ترا بے خطا، ضرب تری بے پناہ

حال مجھے کچھ بتا، قافلۂ عشق کا
جن کی تھی بانگ درا اشہدان لا الٰہ

امتِ خیر البشر، فتنہ و شر کی سپر
خنجرِ حق کی شہید، دینِ خدا کی سپاہ

شوق تھا جن کا نماز، ذوق تھا جنکا جہاد
تیغ تھی جن کی زبان، تیر تھی جن کی نگاہ

حاملِ تیغ و کتاب، محرمِ موت و حیات
چومتے جن کے قدم، مشتری و مہر و ماہ

جن کا تھا کیف و سرور، اللہ اکبر کا نور
بادشہی مین فقیر، فقر مین شاہونکے شاہ

قافلۂ عشق مست، قافلۂ حق پرست
دوست کی الفت سے مست دوست کی الفت سے مست

(ابلیس)

میرے نفس سے ہے گرم خونِ دلِ کائنات
کرتا ہے جبریل تو اگلے زمانے کی بات

ہو گئے عاشق ترے راہیِ ملکِ عدم
دیر سے ماتم مین ہین، راوی و نیل و فرات

تو نے سکھایا جنھین اشہدان لا الٰہ
مین نے بنایا انھین بندۂ لات و منات

میرے فسون سے وہ آج مرگ ہم آغوش ہین
مرگ ہے اُن کی حیات، مرگ ہے اُن کی ممات

ان کی جبین سے عیاں، غیر کے در کا نشاں ان کے دلون مین نہان تبکدۂ سومنات

دور ہے ابلیس کا مردِ مسلمان کہان!
حاملِ قرآن کہان عاشقِ یزداں کہان!!

ہو چکا ہنگامۂ عشق کا جوش و خروش "اُمتِ مرحوم" کی انجمنین ہین خموش
جذبۂ توحید کو مین نے کیا پاش پاش ضربِ مری بے خراش ضربِ مری بے خروش
کھل گیا فرنگ مین میرے نوا میکدے اُن سے ہی اب ہا و ہو ان سے ہی اب نا و نوش
ساقیِ فرنگ کی، نرگسِ افسون طراز چھینتی ہے دین و دل، لوٹتی ہے عقل و ہوش
بادۂ فرنگ سے، مست ہوئے شیخ و شاب شاب ہین ساغر بکف شیخ ہین لبا بدوش

خنجرِ ابلیس آج، فاتحِ ایام ہے،
جاتا ہون جبریل اب موسمِ آرام ہے،

ابلیس: (تنہا۔ فضائے نیلگوں میں ہنگامِ پرواز)

ملّتِ اسلام کی، ختم ہوئی ہا و ہو ٹوٹ گئے عشق کے، شیشہ و جام و سبو
پھر بھی ہے آنکھوں پہر، دینِ پیمبر کا ڈر آدمِ خاکی کے چاک ہوتے ہین جس سے رفو
جذبۂ حق سے جری، نسل و وطن سے بری پھاندتا ہے شش جہت، روندتا ہی چار سو
وحدتِ ادیان کا وعظ، کرتا ہی یہ شہر شہر وحدتِ انسان کا وعظ، کرتا ہی یہ کو بکو!
دیتی ہی اس کی کتاب، درسِ مساوات کا درسِ مساوات ہی، قتل گہ آبرو
ملک خدا ہی زمیں! آدمی اس کا امیں! فتنۂ صد انقلاب! مرقدِ صد آرزو!
حرمتِ سود و رِبا، پردۂ شرم و حیا محفلِ ابلیس سے، کرتے ہین بیگانہ خو
اس کا نظامِ جہاد، قاتلِ شر و فساد لاتا ہی ذوقِ حیات، دیتا ہی جوشِ نمو

مذہبِ صوم و صلوٰۃ، مذہبِ حج و زکوٰۃ — فتنۂ بے آب و تاب، فتنۂ بے رنگ و بو!
اس کی شریعت تمام، فتنۂ پیکار خیز — اس کی طریقت تمام، فتنۂ پیکار جُو!!
فتنۂ چالاک ہے، ولولۂ لا الٰہ — فتنۂ بیباک ہے، جذبۂ اللہ ہو!!
ڈر ہے یہ فتنہ کہیں، کل کو قیامت نہ ہو
مجمعِ جمہور میں، اس کی امامت نہ ہو

(جبریل - تنہا - بارگاہِ خداوندی میں)

تیرا ہے فرشِ زمیں، تیرا ہی عرشِ بریں — تیری کتاب ہیں، تیرا رسولؐ امیں
ذات تری بے نیاز، ذات تری کارساز — تو ہے جہاں کی پناہ، تو ہی جہاں آفریں
آدمِ سینہ فگار، پھر ہوا اس کا شکار — اٹھا ہے پھر وہ لعیں، کھینچ کے شمشیرِ کیں
پھر ترے خاکی نژاد، پھر ترے قدسی نہاد — تیرے جہاں کے امیں، تیری زمیں کے مکیں
طائرِ بسمل صفت، پنجۂ ابلیس میں — ہوتے ہیں زار و نزار، کھوتے ہیں جانِ حزیں
برگِ خزاں کی طرح، گر رہے ہیں ماہرو — قطرۂ باراں صفت مٹ رہے ہیں نازنیں
تیرتے ہیں خون میں، لوٹتے ہیں خاک میں — سینکڑوں حورانِ عین، لاکھوں غزالانِ چیں
غم سے دلِ آفتاب، جل کے ہوا ہے کباب — درد کے طوفان میں، غرق ہے ماہِ مبیں
چرخ پہ قدسی ترے، رو رہے ہیں شرمسار — خلد میں حوریں تری، رو رہی ہیں شرمگیں
مشعلِ اسلام سے، عشق کے پیغام سے — تو نے جہاں کو دیا، نورِ امید و یقیں
کیا ہوا میرا پیام؟ کیا ہوا قدسی نظام؟ — جس سے تھی بزمِ زمیں، غیرتِ خلدِ بریں

دعوتِ قرآنِ پاک، لائی تھی جو انقلاب

خوش تھے اُسے دیکھ کر، چرخِ مہ و آفتاب

(ندائے غیب)

ہوگیا سینوں میں سرد، عشق کا جوشِ جنوں
عقل کی گردن پہ ہے، آدمِ ناداں کا خوں

خنجرِ تہذیب سے، کٹ رہی ہیں گردنیں
خنجرِ تہذیب سے، ہو رہے ہیں سرنگوں

تیشۂ تہذیب نے، لاکھوں تراشے صنم
پھر بھی نہ حاصل ہوئی، دولتِ امن و سکوں

مسلم کافر ضمیر، لاکھوں بتوں کا اسیر
بن گیا شیدائے دیں، طالبِ دنیائے دوں

عشقِ خداوندِ پاک، ہر صفت تابناک
وادیٔ ظلمات میں آج بھی ہے رہ نموں

اہلِ جہاں کی نجات، عشق کا پیغام ہے
عشق کا پیغامبر، شاہدِ اسلام ہے

ہیں ابھی لاکھوں جہاں، پردۂ تقدیر میں
عقل کی زنجیر میں، عشق کی شمشیر میں

آدم و ابلیس کی، کشمکشِ بے خروش
خاک کو بدلیگی پھر، جوہرِ اکسیر میں

آدمِ قدسی نہاد، پائے گا اپنا سراغ
عشق جہانتاب میں، عشق جہانگیر میں

سینوں میں اُبھریگا پھر، ولولۂ لا الٰہ
غوطہ لگائیں گے دل، آتشِ تکبیر میں

مرگ ہو یا زندگی، عشق کا ہے امتحاں
فتنے ہیں سب آب و گل، عشق کی تعمیر میں

عقل کا صیدِ زبوں، کر رہا ہے غسلِ خوں
پل رہا ہے خون میں، عشق کا جوشِ جنوں

مطبوعات جدیدہ

خدا کی باتیں، مرتبہ و مترجمہ مولانا احمد سعید صاحب دہلوی نائب صدر جمعیۃ علماء ہند دہلی تقطیع بڑی ضخامت ۲۹۸ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت اعلا رتبہ:۔ دینی بک ڈپو اردو بازار دہلی،

اصل عربی میں احادیث قدسی کے کئی مجموعے موجود ہیں ان میں سے بعض کا ترجمہ بھی اردو میں ہو چکا ہے، مولانا نے ان تمام مجموعوں سے انتخاب کر کے اور اس میں بعض احادیث قدسیہ بڑھا کر "خدا کی باتیں" کے نام سے اس کا ترجمہ کیا ہے اس لئے یہ مجموعہ گویا سب مجموعوں کا خلاصہ اور عطر ہے، جا بجا احادیث کے اجمال کی تشریح و توضیح بھی کر دی ہے، اس مجموعہ میں عقائد عبادات معاملات اخلاق اوامر و نواہی اور ترغیب و ترہیب سے متعلق کئی سو صحیح احادیث قدسی ہیں بعض بعض ضعیف حدیثیں بھی شامل ہو گئی ہیں، جن کی کہیں کہیں تصریح کر دی گئی ہے مولانا کے ترجمہ کے متعلق کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے، دیندار مسلمانوں کے لئے یہ مجموعہ ایک قیمتی تحفہ ہے،

ہندوستان اور مسئلہ امارت مؤلفہ مولانا عبد الصمد صاحب رحمانی تقطیع بڑی ضخامت ۱۲۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت: ۱۲ رتبہ: دفتر امارت شرعیہ پھلواری شریف ضلع پٹنہ،

مسلمانوں کی دینی ضروریات کی تکمیل کے لئے ہندوستان میں امارت شرعیہ کے قیام کی ضرورت ایسی بدیہی ہے کہ اس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں، لیکن بدقسمتی سے مسلمانوں

کے دوسرے اختلافی مسائل کی طرح یہ مسئلہ بھی مختلف فیہ بن گیا ہے، اور کچھ لوگ امارت کے لئے سیاسی قوت کو ضروری شرط تصور کرکے ہندوستان میں اسے غیر ضروری سمجھتے ہیں، فاضل مؤلف نے اس کتاب میں کلام اللہ، احادیث نبوی، کتب فقہ، ائمہ و فقہاء کے فتاوی اور اسلامی تاریخ سے امارت شرعیہ کی دینی اہمیت اور ہندوستان میں اس کے قیام کی ضرورت کو دکھایا ہے اور اس کے خلاف جو دلائل دیئے جاتے ہیں ان کی تشفی بخش تردید کی ہے کتاب کے شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے ایک مقدمہ ہے جو بجائے خود اس مسئلہ کی دینی حیثیت اور ضرورت پر ایک مفید تبصرہ ہے، جو لوگ اس کو دین و مذہب کی روشنی میں سمجھنا چاہتے ہیں انھیں ضرور یہ کتاب پڑھنی چاہئے،

دوسری جنگ عظیم، مؤلفہ: جناب محمد مرزا صاحب دہلوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۳۱۲ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت: عہ پتہ: کتب خانہ علم و ادب، دہلی،

آجکل ایک ایسی کتاب کی ضرورت تھی جس سے موجودہ جنگ کے اسباب اور شروع سے اب تک اس کی پوری روداد معلوم ہو سکے، لائق مؤلف نے یہ کتاب لکھ کر اس ضرورت کو پورا کر دیا، اس میں انیسویں صدی کے آغاز سے یورپ کی سیاست پر اس طرح تبصرہ کیا گیا ہے جس سے اس زمانہ کے سیاسی نشیب و فراز اور اس سے پیدا شدہ نتائج گذشتہ جنگ عظیم، موجودہ جنگ کے اسباب اور ۱۵ مئی ۱۹۴۱ء تک اس کی پوری روداد معلوم ہو جاتی ہے، یہ کتاب ہر شخص کے پڑھنے کے لائق ہے، خصوصاً جن لوگوں کو مسلسل اخبار دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوتا انھیں اسے ضرور پڑھنا چاہئے، اس میں اس جنگ کی مسلسل اور پوری تاریخ مل جاتی ہے،

محشر خیال از سجاد انصاری مرحوم تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۲۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت نفیس قیمت مجلد قسم اول سے، قسم دوم عہ غیر مجلد عہ پتہ:- خان الیاس مجیبی

قرول باغ دہلی،

سجاد علی انصاری مرحوم بڑے ذہین، طباع اور خوش مذاق نوجوانوں میں تھے، ادب و انشا کا ان میں ابداعی ملکہ تھا، ان کی انشا، فلسفہ و شاعری کی لطیف آمیزش کا دلکش نمونہ ہے لیکن افسوس ان کی جوانامرگی نے ان کی ادبی صلاحیتوں کو پھولنے پھلنے کا موقع نہ دیا اور ان کی ادبی یادگار چند مضامین ایک ناتمام ڈرامے اور چند نظموں اور غزلوں سے زیادہ نہیں ہے، مرحوم کی وفات کے بعد خواجہ منظور حسین صاحب ایم اے نے "مخمر خیال" کے نام سے ان مضامین کو مرتب کیا تھا اب پندرہ سولہ برس کے بعد اس کا دوسرا ڈیشن شائع ہوا ہے، اس میں ایک ناتمام ڈرامے اور جناب آل احمد صاحب سرور کے مقدمہ کا اضافہ ہے یہ مقدمہ اپنی جگہ پر خود ایک مستقل چیز ہے، مرحوم کی ذہانت و طباعی تجدد اور انقلاب کی جانب منتقل ہو گئی تھی، چنانچہ وہ سوسائٹی کے بہت سے مقرر کردہ حدود و قوانین کے خلاف اپنے جداگانہ نظریئے رکھتے تھے، ان کا مرکز تصور حسن نسوانی اور ان کا مشرب خوش مذاقی اور زندہ دلی تھا ان کے سارے خیالات اسی مرکز کے گرد چکر لگاتے تھے جس سے ان کے بہت کم مضامین خالی ہیں ان کے خیالات رنگین اور قلم شوخ نگار تھا اور اس کی جولانیاں مذہب کے حریم قدس تک پہنچ جاتی ہیں، اس لئے جابجا ان کے خیالات مذہب سے متصادم نظر آتے ہیں، لیکن ان کے بعض سنجیدہ مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں سوے عقیدہ سے زیادہ شوخ نگاری کو دخل تھا، درحقیقت یہ مضامین اس دور زندگی کے ہیں جب انسان رنگین تصورات کی دنیا میں مست رہتا ہے اور خیالات کی آزادی اور اپج ہی کو ہنی کارنامہ تصور کرتا ہے اور اگر علم و ذہانت کی مدد بھی اس میں شامل ہو گئی تو ان خیالات میں علمی شان پیدا ہو جاتی ہے، یہی حال ان مضامین کا ہے اگر مرحوم پختہ عمر کو پہنچتے تو ان کا یہ رنگین فلسفہ بہت کچھ سنجیدگی سے بدل جاتا پھر بھی چونکہ وہ فطرۃً ذہین تھے اس لئے

اس "محشر خیال" میں بھی کہیں کہیں "حقیقت" کی جھلک نظر آجاتی ہے جسے ادبی حکمت کا درجہ دیا جاسکتا ہے، بہرحال یہ مجموعہ اپنے بعض خیالات سے قطع نظر نفس ادبی حیثیت سے اردو ادب میں اختراعی درجہ رکھتا ہے "م"

شمع۔ (ناول) مصنفہ اے۔ آر۔ خاتون دہلوی، ضخامت ۲۵۴ صفحے، لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ، قیمت؟ ملنے کا پتہ جلال منزل، کوچہ پنڈت، دہلی،

یہ ایک ناول ہے جس کو دہلی کی ایک پردہ نشین خاتون نے لکھا ہے، اور یہ اپنی زبان، پلاٹ اور کردار نگاری کے لحاظ سے اردو کے بہت اچھے ناولوں میں شمار کیا جاسکتا ہے، اس کی زبان شروع سے آخر تک شستہ، صاف اور سلیس ہے، تحریر میں کہیں گنجلک، تصنع اور اوپرے الفاظ و ہی استعمال کئے گئے ہیں جو عام طور سے گھروں میں بولے اور سمجھے جاتے ہیں اور تعجب یہ ہے کہ ۲۵۴ صفحے کی کتاب میں الفاظ اور جملوں کی ترکیب میں کہیں فارسی اضافت نہیں پائی جاتی ہے، پلاٹ کے قصہ میں ہندوستانی گھروں کی مختلف قسموں کی معاشرت کی جیتی جاگتی تصویر کھینچی گئی ہے، ایک طرف ایسے گھر کا مرقع ہے جو نئی تعلیم کے اوصاف سے آراستہ ہے اور دوسری طرف ایسے گھر کے سبق آموز اور عبرتناک واقعات ہیں جو پرانی تہذیب کا مقلد ہے، مگر قصہ میں نئی تعلیم کی ترجمانی کو سراہا گیا ہے اور نہ پرانی تہذیب کے ہر پہلو کی خواہ مخواہ تحقیر کی گئی ہے، بلکہ نئی اور پرانی تہذیب کے ملے جلے جلوؤں سے جو گھروں میں معاشرت اور فضا پیدا ہوسکتی ہے ان کو اس طرح روشن کرکے دکھایا گیا ہے کہ وہ ہندوستانی گھروں کے نمونہ ہوسکتے ہیں، پھر اس میں کہیں پند و موعظت کا رنگ پیدا نہیں ہونے پایا ہے اور قصہ کا لطف برابر قائم رہتا ہے، اور معاشرت کے تمام روشن پہلو خود بخود سامنے آجاتے ہیں، پلاٹ کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ شروع سے آخر تک مکالمے میں بیان ہوا ہے جو ناول نگاری کا بہت ہی مشکل فن ہے، مکالمے کی گفتگو بڑی سلیس اور بے تکلفانہ ہے، پلاٹ کے زیادہ واقعات گھر

کی چار دیواری کے اندر ہوتے ہیں، اس لئے وہ ہو بہو ہندوستانی نفسیات اور معاشرت کے مطابق ہیں، ان خصوصیات کے ساتھ ایک ناول میں جو رومانی اور حیرت انگیز واقعات ہونے چاہئیں، ان سے بھی یہ ناول خالی نہیں، شمع اور منصور کی محبت و الفت میں عشق کے سارے کرشمے موجود ہیں، بے قراری، جاں سوزی، مایوسی اور آخر میں محبت کی فتح و کامرانی، مگر ان سب کے حدود متعین ہیں، ہیرو اور ہیروئن کے حرکات و سکنات میں کوئی بات ایسی نہیں پائی جاتی جو ہندوستانی شریف گھرانوں کے بلند معیار تہذیب سے گری ہوئی ہو، مصنف نے ہیروئن کے باپ اختر حسن کی موت کے بعد پھر اس کو جس طرح زندہ کیا ہے وہ پلاٹ کا بہت ہی دلچسپ اور حیرت انگیز واقعہ ہے، ناول کے کردار کے متعلق خود مصنفہ کا اپنا کوئی بیان نہیں ہے، پوری کتاب میں شاید ہی ان کے قلم سے دو چار جملے ایسے ملیں گے جن سے کسی فرد کی اچھائی یا برائی ظاہر ہوتی ہو، مکالمے اور پلاٹ کے واقعات سے اشخاص کے کیرکٹر خود بخود ذہن نشین ہوتے جاتے ہیں، جو ناول نگاری کا بڑا وصف ہے، شمع (ہیروئن) منصور (ہیرو) حلیمہ خانم قمر الحسن، اور طاہر کی سیرت کے مختلف پہلو بہت کامیابی کے ساتھ دکھائے گئے ہیں، طاہر کی ظرافت کا معیار شروع سے آخر تک یکساں قائم رہتا ہے، ممکن نہیں کہ اس کے جملوں اور فقروں سے لبوں پر مسکراہٹ نہ آجائے، اور یہ مسلسل ظرافت کہیں گراں نہیں گذرتی،

میری دنیا از جناب سید عقیل احمد صاحب جعفری تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مرقوم نہیں، یہ غالباً مصنف خیرآباد ضلع سیتاپور سے ملیگی،

مصنف کتاب موروثی شاعر اور مذہب و ملت کا درد رکھنے والے مسلمان ہیں، انکی شاعری کا موضوع قومیات ہی میری دنیا انکی قومی و سیاسی نظموں کا مجموعہ ہے اس میں زیادہ تر سیاسی اور بعض تاریخی اور مذہبی نظمیں ہیں، ان میں شاعری کے مقابلہ میں واقعہ نگاری کو ترجیح دیگئی ہے تاریخی اور مذہبی نظمیں زیادہ مؤثر ہیں" (ص ع)

جلد ۴۲ ماہ رمضان المبارک ۱۳۶۱ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۴۲ء عدد ۴

مضامین

شذرات	سید سلیمان ندوی	۲۴۲-۲۴۴
موجودہ ہندوستان میں کاشتکاروں کے حقوق،		۲۴۵-۲۵۵
تیموری شاہزادوں کا علمی ذوق،	سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب ایم اے آرفیق دار المصنفین	۲۵۶-۲۶۱
حافظ جلال الدین سیوطی،	مولوی محمد ویس صاحب ندوی نگرامی رفیق دار المصنفین	۲۶۲-۲۸۲
محسن کاکوروی اور ان کی خصوصیات،	جناب محمد ابواللیث صاحب صدیقی بدایونی ایم اے لکچرار اردو مسلم یونیورسٹی علیگڈھ	۲۸۳-۲۹۷
مغل یا مونگل،	جناب شیخ عنایت اللہ صاحب بی اے دہلوی	۲۹۸-۳۰۷
اخبار علمیہ،	"ص ع"	۳۰۸-۳۱۱
وعظ جدید،	جناب اسد ملتانی،	۳۱۲-
ماتم فانی،	جناب یحییٰ اعظمی،	۳۱۲-۳۱۳
شور نشور،	جناب نشور واحدی	۳۱۳-۳۱۴
حشر جذبات،	جناب ثاقب کان پوری،	۳۱۴
مطبوعات جدیدہ،	"م"	۳۱۵-۳۲۰

شذرات

اس نمبر کے سرمقالہ میں ایک اہم اسلامی مسئلہ کی تحقیق کی طرف حضرات علمائے کرام کو متوجہ کیا گیا ہے، امید ہے کہ ان میں سے وہ حضرات جو فقہی مسائل میں بصیرت رکھتے ہیں اس کی طرف توجہ فرمائیں گے، بحث صرف خالص فقہی نقطۂ نظر سے ہو، حشو وزوائد اور طعن و طنز سے پرہیز کیا جائے،

رحمتِ عالمؐ کے ہندی ترجمہ کے لئے حسب ذیل اصحاب کی طرف سے امدادی رقمیں وصول ہوئیں،

ایک پروفیسر از حیدرآباد دکن	۱۰۰
ایک پروفیسر از رانچی بہار،	۵۰
عبدالرزاق سیٹھ بن عمر از بمبئی،	۴۰
مجیب الحق صاحب بختیار پور مونگیر،	۱۰
	۲۰۰

اس رقم میں سے اس کے ہندی ترجمہ میں ۱۵۰ روپے خرچ ہوئے، باقی چھپائی میں تقریباً دو سو کی ضرورت ہوگی، ۱۰۰ موجود ہے، باقی ۱۰۰ کی کمی ہے،

مولانا شبلی مرحوم کی مشہور تصنیف الکلام جس میں اسلامی عقائد پر متکلمانہ بحث ہے، بارہا چھپ

چکی ہے لیکن اب دارالمصنفین نے اسکا ایک نیا اڈیشن شائع کیا ہے، جسکے شروع میں اڈیٹر معارف کے قلم سے ایک دیباچہ ہے جسمیں کتاب کے بعض مسائل پر تبصرہ ہے اور کتاب میں جا بجا مفید حواشی ہیں جن سے بہت سی غلط فہمیاں دور ہوتی ہیں، اور اگر کتاب میں کوئی غلطی رہ گئی ہے تو اسکی تصحیح کر دیگئی ہے ان وجوہ سے اب یہ کتاب ان لوگوں کے لئے مفید بلکہ ضروری ہے جن کے پاس اسکا پہلا ایڈیشن ہو،

جس طرح کسی انسانی جسم میں فاسد مادے جمع ہو جاتے ہیں تو بخار، درد اور دوسرے عوارض پیدا ہو جاتے ہیں اور جب وہ فاسد مادے نکل جاتے ہیں تو جسم میں صحت کا نور جھلکنے لگتا ہے اسی طرح لڑائی دنیا کے جسم میں فاسد مادوں کے اجتماع کا لازمی نتیجہ ہے، اس لئے اگر اس وقت دنیا خون میں نہا رہی ہے تو اس سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ممکن ہے کہ وہ اس غسل سے نکھر رہی ہو،

یہ تو صاف نظر آتا ہے کہ جو قومیں اپنی قوت کے غرور میں خدا کو بھولی ہوئی تھیں، اس مشکل کے وقت میں اب اوسی کا سہارا ڈھونڈ رہی ہیں، بالشویک روس ابھی زندہ ہے مگر اس کے ماننے والوں کے ایمان میں فرق پیدا ہو چلا ہے یہاں تک کہ خود اس کو اپنی مذہبی ناطرفداری کا اعلان کرنا پڑا،

جب دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا،

دولت کی بہتات، تمدن کے فساد اور اخلاق کے بگاڑ کا سبب ہے، اس لئے قرآن نے بتایا ہے، اور تاریخ نے اسکی تصدیق کی ہے کہ انسانیت کی بہت سی تمدنی برائیاں دولت کی افراط کا نتیجہ ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ	اور ہم نے کتنی آبادیوں کو جو اپنی دنیا کے عیش
مَعِيشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسَاكِنُهُمْ لَمْ	میں اترا رہی تھیں برباد کر ڈالا، یہ ہیں ان کے
تُسْكَنْ مِنْ بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا ۖ وَ	رہنے کے مقامات جن میں پھر کوئی نہیں بسا
كُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِينَ (قصص ۷)	مگر کم بخت ہم ہی اس کے مالک رہ گئے،

کم نگاہ انسان خدا کے ہاتھ کو گوشت پوست کی صورت میں اپنی طرف بڑھتا ہوا دیکھنا

چاہتا ہے، حالانکہ اس کے انتقام کا ہاتھ آگ، پانی، بجلی، زلزلہ، وبا، لڑائی، غرض ان مختلف شکلوں میں نظر آتا ہے جن سے گنہگار قومیں ہلاک ہوتی رہی ہیں،

تاریخ کے ظاہر بیں بربادشدہ قوموں میں عاد، ثمود، فرعون قوم صالح وغیرہ ناموں کو سنکر غیر تاریخی وجود کا شبہہ کرتے ہیں، حالانکہ غیر تاریخی یہ بھی نہیں، تاہم ان کی تاریخی قوموں میں بھی اس انجام کی مثالیں کم نہیں، قدیم یونانی کیا ہوئے، رومہ کے بسنے والے کہاں ہیں، آثار قبیح کے بہادر کدھر گئے، سیتھینس کہاں ہیں، بابل، نینوی اور مصر میں خدائی کا دعویٰ کرنے والے کدھر گئے، ایران کے پاک نژاد کیانی کس سیلاب میں بہ گئے، سلجوق، غزنی، غوری، دیلم کہاں گئے، کیا ان میں سے ہر قوم قرآن پاک کے دعوی کی شہادت نہیں،

جو کچھ کل ہوا ہے وہ آج بھی ہوگا، عاد، ثمود، فرعون، نمرود کے مثالی پیکر ہر زمانہ میں ہوتے ہیں اور ہر زمانہ میں ہوں گے، ان کے پیکر بدلتے رہتے ہیں لیکن حقیقت نہیں بدلتی اسی طرح قومی بربادیاں بھی ہر زمانہ میں بھیس بدل بدل کر آتی ہیں، مگر اسکی حقیقت عذاب الٰہی ہی کی ہے جو کبھی نہیں بدلیگی غفلت کا ماتا انسان جس طرح ہر مصیبت کو کسی مادی سبب کا نتیجہ بتا کر اپنی جگہ پر مطمئن ہو جاتا ہے اور آخر بربار ہو جاتا ہے، اسی طرح غفلت شعار قومیں بھی مادی اسباب میں چھپی ہوئی حقیقت سے نا آشنا رہ کر فنا ہو جاتی ہیں،

فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ	اور کتنی آبادیوں کو ہم نے ہلاک کر دیا کہ وہ گنہگار تھیں، تو وہ اپنی گری ہوئی چھتوں پر بیکار ہو گئے ہرے کنوؤں اور اونچے محلوں

(حج) سمیت اجڑ گئیں،

مقالات

شریعت اسلام

اور

موجودہ ہندوستان مین کاشتکارونکے حقوق

زمیندار اور کاشتکار اور سرمایہ دار اور مزدور کی جنگ شاید دنیا کی ساری لڑائیون سے زیادہ پرانی ہے، دنیا مین بیسیون مذہب اور تمدن کے اصول بنے اور بگڑے اور سب نے بقدر ضرورت اس مشکل کو حل کرنے کی کوشش کی، مگر اصلاح کے مختصر دور کے بعد وہ مشکل پھر بعینہٖ قائم رہی، ایک زمانہ تھا جب زمیندار و سرمایہ دار برسر عروج تھے، اور وہ جو چاہتے تھے کرتے تھے، لیکن مشینون اور کارخانون کی کثرت اور سرمایہ داری کے عجیب عجیب ہتھکنڈون نے مزدورون اور کسانون کو مجبور کیا کہ وہ اپنے حقوق کی حفاظت کیلئے کمربستہ ہون،

یہودی قوم نے نبوت و سلطنت کی خدائی نعمتون سے محرومی کے بعد جب سے خدا کے غیظ و غضب اور لعنت کی مستحق ٹھہری ہے، دنیا کی ہر آفت اور گمراہی کی رہنمائی کا فرض اپنے ہاتھ مین لے لیا ہے، دنیا کے عظیم الشان مذاہب یہان تک کہ عیسویت اور اسلام مین نخوت و بدہیبی فتنون کی پیدائش کی خدمت انہی نے انجام دی ایک فرانسیسی

نے بائیس برس ہوئے کہا تھا کہ یورپ میں جو فتنہ اٹھتا ہے خوب غور سے دیکھئے تو اس کے اندر کسی نہ کسی یہودی کا ہاتھ ملے گا،

اس وقت یورپ اور امریکہ کے سب سے بڑے دولتمند مہاجن اور سرمایہ دار یہودی ہین، دوسری طرف عوام کی رہبری کا منصب حاصل کرنے کے لئے اور اپنی قوم کے سوا دوسرون کو سرمایہ داری کی لعنت سے بچانے کے لئے بھی انہی کا ہاتھ بلند ہوا، کارل مارکس یہودی کی کتاب اس نئی شریعت کا صحیفہ ہے، روس کا انقلاب انہی کے ہاتھون عمل مین آیا، اور ملک کی اکثریت پر انہی کی کثرت نے قبضہ جمایا،

بہرحال یہ ایک ضمنی بات تھی، اور عجب نہین کہ ان چند سطرون کی خاطر مجھے صفحون کی سخت تنقید برداشت کرنی پڑے،

سوال یہ ہے کہ آیا اسلام جو دین و دنیا دونون کی برکتین لیکر آیا، اور جس کا نظام عمل ہر قسم کے نظامات سے بہتر اور مکمل ہے، وہ اس باب مین کیا کہتا ہے، اس سلسلہ مین سب سے پہلے ایک خاص مسئلہ سے بحث ہے، جس کی اہمیت ہندوستان مین روز بروز بڑھتی جاتی ہے، اور بڑھتی جائے گی، یعنی کسانون اور کاشتکارون کے حقوق، عام متداول کتب فقہ مین یہ مسائل پوری تفصیل سے نہین ملتے، جستہ جستہ علماء کے اشارات اور اجتہادات ہین، اور ایک شخص کا تنہا شریعت کے کسی ایسے مسئلہ پر جس مین اجتہاد و اختلاف کا دروازہ کھلا ہو ذمہ داری کے ساتھ لکھنا مشکل ہے اور لکھا بھی جائے، تو اس کا قبول عام حاصل کرنا اس سے بھی زیادہ مشکل ہے، اسکی شکل یہی ہے کہ ہر فریق اپنے دلائل سے پورے سکون اور ہمدردی کے ساتھ دیانۃً دوسرے کو مطلع کرے تاآنکہ مسئلہ کا ہر پہلو روشن ہو کر صورت مسئلہ منقح ہو جائے اور مسلمانون کے عمل اور کاروبار کے لئے راستہ کھلے،

اتفاقِ وقت سے چند مہینے ہوئے کہ کلکتہ سے ایک استفتا موصول ہوا جس پر بعض علماء کے جوابات تحریر تھے، اسی سلسلہ مین خیال ہوا کہ اسی استفتے کو بنیاد بنا کر تحقیق کا دروازہ کھولا جائے، اور علمائے کاملین سے استصواب کیا جائے، اور درخواست کی جائے کہ وہ اس کے متعلق پوری دیانت اور متانت سے تحریر فرمائین، اس فتوے مین مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کی تحریر بہت مختصر ہے، مجھے معلوم ہے کہ بعض اور علمائے دیوبند و تھانہ بھون نے بھی اس مین وہی رائے ظاہر کی ہے جو جناب مفتی صاحب نے ظاہر کی ہے، مگر ضرورت ہے، کہ اس پر مفصل دلائل پیش کئے جائین، مین نے جناب مفتی صاحب دام فضلہٗ سے زبانی بھی اور تحریراً بھی عرض کیا ہے، کہ وہ فرصت کا وقت نکال کر اس اہم مسئلہ پر توجہ فرمائین کہ آیندہ مسلمانون کی معاشی زندگی کا تعلق اس سے اور بھی روز بروز زیادہ بڑھتا جائے گا، اور کاشتکارون کے حقوق اور وسعت پائین گے،

یہ بات ذہن مین رہے کہ دائمی استمراری بندوبست صرف بنگال و بہار اور یوپی کے دو تین مشرقی اضلاع مین ہے، اس مین اراضی حکومتِ وقت کی براہِ راست ہین جیسا کہ مجھے معلوم ہوا ہے،

والسلام

سید سلیمان ندوی

استفتاء

کیا فرماتے ہین علمائے دین مسائل ذیل مین،

(۱) کاشتکاری پر جسکو عرف مین موروثی کہتے ہین زمیندار کو قانوناً یہ حق حاصل ہے کہ خود اس زمین مین کاشت کرے یا کسی دوسرے سے کاشت کرائے، اور پیداوار کو اپنے تصرف مین لائے

اور جو لگان سرکاری طور پر مقرر ہو چکا ہے، وہی لگان زمیندار کو ادا کرے، زمیندار کو اس مین سوائے لگان مقررہ کے اور کوئی حق نہین، نہ وہ کھیت نکال سکتا ہے اور نہ لگان ہی زیادہ کر سکتا ہے، تو کیا یہ کاشت کاری شرعاً درست ہے یا نہین ؟

(۲) ان اطراف مین موروثی کو رہن بھی رکھتے ہین، اور روپئے سے اپنا کام چلاتے ہین اس قسم کی موروثی رہن رکھنا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

(۳) اگر کسی کاشتکار کا انتقال ہو جائے اور تین لڑکے ایک لڑکی چھوڑے، تو اس کی کاشت کاری سے وراثت جاری ہو گی یا نہین، بصورتِ اوّل تخریج کس طرح ہو گی ؟

الجواب

(۱) موروثی کاشت کا قانوناً کاشت کار مالک ہے، زمیندار نے اس قانون کو قبول کر لیا ہے، اس لئے جب تک قانون رائج ہے، یا یہ قانون نہ بھی ہو، اور زمیندار مقررہ حق لینے پر راضی رہے، تو درست ہے، واللہ اعلم

(۲) رہن جائز ہے مگر اس سے انتفاع ناجائز ہے، واللہ اعلم،

(۳) وراثت جاری ہو گی، اس لئے کہ قانون نے اسکو مالک بنا دیا ہے، واللہ اعلم

ابو البرکات عبد الرؤف عفی عنہ

الجواب

عفت ۱۶ جواب کے تینون نمبر درست نہین، نمبر اول کا جواب یہ ہے کہ یہ قانون غیر شرعی ہے، اور زمیندار کا اسکو تسلیم کرنا خوشی و رضامندی سے نہین ہے، بلکہ مجبوری سے ہے، اس لئے کاشتکار

پر فرض ہے کہ یا تو وہ زمیندار کی حقیقی رضامندی حاصل کرے یا زمین چھوڑ دے (نمبر ۲) کاشت کار زمین کا مالک نہیں اس کو صرف حق کاشت حاصل ہے، جو قانون رائج الوقت نے مثل ملک کے قرار دیدیا ہے، اس لئے حق کاشت کی رہن تو نہیں، مگر موجر کی اجازت حقیقی ہو تو کاشتکار اجارہ پر دیسکتا ہے (نمبر ۳) اس حق کاشت میں وراثت جاری نہیں ہوسکتی، اور قانون نے بھی کاشت کار کو زمین کے رقبہ کا مالک نہیں بنایا ہے، بلکہ اس کے قبضہ کو مستقل کیا ہے، اور وراثت حکم شرعی ہے، وہ کسی قانون خلاف شریعت اساس پر جاری نہیں ہوسکتا،

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ دہلی

ازمولنا عبدالرؤف صاحب

۱۔ جہاں تک میں سمجھ سکا یہ اعتراضات کسی صحیح فقہی اصول پر مبنی نہیں ہیں، اگر ہندوستان دارالحرب ہے، تو مسلمان قوانین کے تسلیم کرنے پر مجبور ہے، اس کے علاوہ اراضیات کے مسئلہ میں زمیندار کا قانون کو قبول کرلینا اور کاشت کار سے بجبر مقررہ حق وصول کرنا زمیندار کی رضامندی کی دلیل ہے،

۲۔ کاشت کار زمین میں ہر طرح کا تصرف کرسکتا ہے، اور مالک وہی ہے جو ملک میں ہر طرح کے تصرف کا حق رکھے، زمیندار حق مقررہ لینے کے سوا زمین میں کوئی تصرف نہیں کرسکتا اسلئے وہ مالک نہیں ہوسکتا،

۳۔ جب کاشت کار مالک ہے، جیسا کہ نمبر ۲ سے معلوم ہوا، تو اس میں شرعاً وراثت بھی جاری ہوگی،

یہ مسائل بڑے اہم ہیں اور اس میں بڑی غلط فہمیاں ہورہی ہیں، اس کا اثر سارے ہندوستان کے مسلمانوں کی معیشت پر پڑے گا، چونکہ جناب مفتی صاحب نے یہ تحریر لکھی ہے اس لئے

امید ہے کہ اس مسئلہ پر وہ زیادہ تعمق نظر سے غور فرمائین گے، اور موجودہ حالات کو پیش نظر رکھکر اس مسئلہ کو صاف فرمائین گے،

اس ملک مین نہ اسلامی قانون رائج ہے، نہ کاشتکار یا زمیندار منفرداً منفرداً اس کو بدل سکتے ہین، اس قانون کے قبل زمیندارون کا صحیح اصول سے زمین کا ہر جگہ مالک ہونا ثابت ہوتا ہے تاریخون سے ثابت ہے کہ بہت جگہ ان کا غاصبانہ قبضہ تھا، یا باغیانہ دخل تھا، قانون نے ملک و حقوق کا ایک فیصلہ کیا، ملک کے باشندے بجبر یا بخوشی اس قانون پر رضامند ہو گئے،

کیا غیر اسلامی ملک مین جہان قانون مسلمانون کے اختیار مین نہ ہو، وہان یہ فتوی دینا جائز ہے، کہ اُس ملک کے قانون کے موافق زمین سے کسی طرح کا انتفاع حاصل کرنا مسلمانون کے لئے جائز نہین ہے، کیا اس طرح کی کوئی نظیر موجود ہے، ؟ اسلئے جب تک قانون بدلا نہ جائے، زمین کا مالک کاشت کار ہے، اسکو قانوناً بیع و شراء و اجارہ و رہن اور ہیئت کا تغیر و تبدل کرنا اور ہر طرح کے تصرف کا اسکو قانوناً حق ہے، زمیندار کو کسی طرح کے تصرف کا کوئی حق نہین، وہ صرف مقررہ مالگذاری لے سکتا ہے، اسی قانون کی بنا پر عرصہ دراز سے عمل ہے، بیع و شراء جاری ہے، اور قانونی طور پر تبدیل ہیئت ہو چکی ہے، اب تو وہ زمیندار ہین، جو زمینداریان خریدتے وقت بھی جانتے تھے، کہ زمین مین تصرف کا ہمین کوئی حق نہین، نہ وہ ملک کا دعوی کرتے ہین نہ کر سکتے ہین، فقط واللہ اعلم

ابو البرکات عبد الرؤف، ار شوال سنہ ۱۳۵۷ھ

۳ ر دسمبر سنہ ۱۹۳۸ء

توضیح | ہندوستان کی کاشت کا مختلف علاقون مین مختلف انتظام ہے، بعض جگہ حکومت بلا واسطہ زمیندارون کے خود کاشت کارون سے خراج وصول کرتی ہے، اور زیادہ مقامات

مین یہ انتظام ہے کہ حکومت حق شاہی زمینداروں سے وصول کرتی ہے، اور زمیندار کاشتکارون سے مالگذاری لیتے ہین،

حکومت کا عام شاہی قبضہ ملک کی اراضی پر تھا، اور کاشت کار حکومت کی اجازت سے (بضرورت کاشت) اس پر متصرف تھے، درمیان مین یہ زمینداروں کا طبقہ کیسے پیدا ہوا، یہ قابل تحقیق ہے، جہان تک تاریخی واقعات سے معلوم ہوتا ہے، زمینداری کے پیدا ہونے کی وجہ مختلف ہے، شاہی زمانہ مین مختلف وجوہ سے کچھ علاقے معزز اشخاص کو دیدیے جاتے تھے، شاہی خراج ان کو دینا پڑتا تھا، کاشتکارون سے مالگذاری وصول کرنا یا کاشت کاری کا بدل دینا ایک سے لیکر دوسرے کو دیدینا، یا بلا واسطہ خود اپنے ہاتھ سے یا اپنے ملازم سے کاشت کرانا یہ سب حق ان کو حاصل تھے، ایسی زمینداریان بعض جگہ وراثتہً کسی خاندان مین چلی آرہی ہین، یا بیع وشرا کی وجہ سے مختلف لوگون مین منتشر ہوگئی ہین، مگر اختیارات وہی باقی ہین، دوسری قسم زمینداری کی یہ ہے کہ شاہی سلطنت جب کمزور ہوگئی، تو مختلف قومین اور طاقتور اشخاص بعض بعض علاقون پر قابض ہوگئے، اور وہان کے کاشتکارون سے جبراً مالیہ وصول کرنے لگے، اور مالک بن گئے،

ایسی زمینداریان ان کے خاندان مین موجود ہین، یا انہی خاندانون کی بچی ہوئی دوسرے خاندانون مین منتقل ہوگئی ہین، یہ قبضہ کرنے والے زیادہ تر ڈاکو اور مفسد لوگ تھے، یا رہے جو اس وقت خودسر ہوکر ہر جگہ ظلم کر رہے تھے، تیسری قسم یہ ہے، کہ انگریزون نے جب ہندوستان پر قبضہ کیا، تو کاشتکارون سے مالیہ وصول کرنے کے لئے ایک ایک محدود علاقہ ایک ایک آدمی کے ساتھ بندوبست ہوتا تھا، میعاد مقررہ کے بعد دوبارہ اسی پہلے آدمی کے ساتھ بندوبست ہوجاتا تھا، کیونکہ وہی علاقہ کے حال سے واقف ہوتا تھا، دوسرے کیساتھ بندوبست کرنے مین

دقتین پیش آتی تھین، البتہ مالیہ کے تخمینہ مین ہر بندوبست کے وقت فرق ہوجاتا تھا، اور اکثر مقدار بڑھادی جاتی تھی، موروثی حق کا قانون جس کو مفتی صاحب ناجائز اور غیر شرعی کہتے ہین، اوسکی بنیاد یہ ہے کہ یہ اخیر قسم کے زمیندار جن کا مالیہ ہر بندوبست کے بعد بڑھ جاتا ہے تنگ آگئے، کاشت کار کا مالیہ وہ بڑھاتے تھے، تو کاشت کار ادا نہین کرسکتا تھا، اور کاشت کاری کرنے پر زیادہ مالیہ کی وجہ سے کوئی راضی نہیں ہوتا تھا، پھر کاشت کار کو یقین نہین تھا، کہ یہ کھیت میرے پاس کبتک رہے گا، اس لئے نہ وہ کھیت مین محنت کرتا تھا اور نہ کھاد وغیرہ مین اپنا خرچ کرکے کھیت کو اچھا بنانے کی کوشش کرتا تھا، اس پریشانی کی وجہ سے خود ان زمینداروں نے حکومت پر بندوبست (پرماننٹ سٹلمنٹ) کے لئے زور ڈالا، اور دائمی بندوبست یہی ہوا کہ حکومت مالیہ نہ بڑھائے، اور نہ نیا بندوبست کرے جو لوگ اتنی (مقررہ) مدت سے علاقہ کا بندوبست کررہے ہین، اور مقررہ مالیہ ادا کررہے ہین، جبتک وہ یہ مالیہ ادا کرتے رہین حکومت اس علاقہ کو دوسرے کیساتھ بندوبست نہین کرسکتی، اسی طرح زمینداروں کو حق نہین ہوگا کہ وہ کاشت کارون کا مالیہ بڑھائین، اور نہ یہ حق ہوگا کہ جبتک وہ مقررہ مالیہ ادا کرتے رہین، اون سے کھیت لیکر دوسرے کو دین، حکومت اور زمیندار کے اتفاق سے بنگال اور بہار مین سب سے پہلے (پرمانٹ سٹلمنٹ) کا قانون نافذ ہوا، اور اسی قانون کی وجہ سے زمیندار اور کاشت کار دونون کی حالت ترقی کرگئی، اور زمین و کاشت بالکل ہی بدل گئی، سو روپیہ کی زمین ہزار کی ہوگئی، اس تجربہ کے بعد تمام ہندوستان کے لئے دائمی بندوبست کا قانون بہتر سمجھا گیا، زمیندارون نے بھی بہتر سمجھا اور کاشتکارون نے بھی،

پرمانٹ سٹلمنٹ کے بعد زمیندار کاشتکارون سے مقررہ مالگذاری کے سوا اور کچھ نہیں لے سکتے تھے، مگر انھون نے یہ شروع کردیا کہ ایک کاشت کار کا وارث جب موروثی کی جگہ قابض ہوتو

وسی سے سلامی کے نام سے ایک بڑی رقم وصول کرتے تھے، یا کاشت کار جب اپنی کاشت دوسرے کے نام سے منتقل کرتا تھا، تو اوس سے سلامی طلب کرتے تھے، دوسرے اور تیسرے قسم کے زمیندارون کو جائز طور پر یہ حق کبھی نہ تھا، اور پرماننٹ سٹلنٹ کے بعد تو صریح طور پر اس قسم کے حق سے وہ خود دست بردار ہو چکے تھے، اور اسی دست برداری کے نتیجہ کے طور پر کاشت کی وراثت یا کاشت کی بیع و شرا کا اختیار کاشت کار کو دیا گیا، پہلی قسم کی زمینداریان بہت کم رہگئی ہین، اور جہان ہے وہ بھی پرماننٹ سٹلنٹ کے ٹوٹ جانے پر راضی نہین ہون گے، حق وراثت کا قانون دائمی بندوبست کی فرع ہے، اور دائمی بندوبست زمیندارون ہی کی کوشش سے ہوا پھر نہ معلوم مفتی صاحب کس بنا پر کہتے ہین کہ زمیندار اس سے راضی نہین ہین،

اگر پرماننٹ سٹلنٹ اٹھ جائے تو بنگال اور بہار مین زمینداری کوئی چیز نہین رہتی، بمبئی، پونا، ناگپور، اڑیسہ، سی پی وغیرہ کی زمینداریان بھی باقی نہ رہین گی، یو پی مین جہان برٹش تحصیل کا علاقہ ہے، وہان بھی یہی حال ہوگا،

صرف ان علاقون مین جہان تعلقہ داری ہے ذرا حالت مختلف ہے، مگر بغیر دائمی بندوبست کے اُن کو کچھ نہین ملتا، زمین خراب ہو جائیگی، پیداوار گھٹ جائیگی، زمین بنجر بن جائیگی، اس لئے زمیندار پرماننٹ سٹلنٹ کا ٹوٹنا گوارا نہین کر سکتے، اگر سٹلنٹ ٹوٹ جائے، تو حکومت کو اختیار ہو جائیگا، کہ وہ جس قدر مکس میں اضافہ کرنا چاہے کر سکتی ہے جس سے زمیندار کاشت کار سب پریشان ہو جائینگے

سٹلنٹ کی رضامندی کے یہ معنی ہین، کہ زمیندار اس بات کو قبول کرتا ہے، کہ وہ کاشتکار پر لگان سٹلنٹ کے معاہدہ کے خلاف نہ اضافہ کر سکتا ہے نہ کاشت کار سے زمین لے سکتا ہے تو اب کاشتکار کی ملکیت مین کیا باقی رہا، جب سٹلنٹ مین یہ طے پا گیا، اور زمیندار کی رضامندی سے بلکہ زمیندار کی خواہش پر طے پایا، کہ وہ کاشت کار کے قبضہ سے کاشت کو لے نہین سکتا، صرف

مقررہ مقدار مالگذاری کی اس کو ملنی چاہئے، اور کاشت کارون کو جب یہ یقین دلایا گیا تو انھون نے محنت اور خرچ کرکے زمین کی حیثیت کو بڑھا دیا، یہ زمینون کو آباد کرایا، جس مین معمولی چیز بمشکل پیدا ہوتی تھی، اوس مین اعلیٰ قسم کی چیزین پیدا ہونے لگین،

مسئلہ شرعی یہ ہے کہ غاصب کے فعل سے شے مغصوب مین زیادہ ترقی ہوجائے، اور زیادہ نفع کا ذریعہ بن جائے، تو غاصب اوس کا مالک ہوجاتا ہے، اور مغصوب منہ اس کا مالک نہین رہتا، تو کاشت کار جس نے حکومت اور زمیندار دونون کی اجازت کے بعد اپنی محنت اور مال سے زمین کو اس قدر ترقی دی ہے اس مین اوس کی ملکیت کیون ثابت نہ ہوگی، اور اس کی محنت کا مالک زمیندار کیون ہوجائے گا، وہ زمیندار اور حکومت کا مقرر کیا ہوا حق زمیندار کو ادا کر رہا ہے، باوجود اس کے اوس کاشت کی پیداوار اس کے لئے کیون حلال وطیب نہ ہوگی،

مذکورۂ بالا وجوہ کے بعد غالباً اس مین تردد کی کوئی وجہ نہین رہی کہ کاشت کا مالک کاشت کار ہے، زمیندار نہیں، اور اوس کو ان تمام تصرفات کا حق ہے جو مالک کو اپنی ملک مین حاصل ہوتا ہے،

ابوالبرکات عبدالرؤف عفی عنہ

قادری دانا پوری

هوالموفق للصواب

جواب کے ہر سہ نمبر صحیح ہین، ملک شرعاً اختصاص الفعل فی حق التصرف کا نام ہے، (بدائع ج ۵ ص ۳۳) اور جب اختصاص مصطلح موروثی کاشتکاری مین کاشت کار کو حاصل ہے، تو ظاہر ہے کہ وہی مالک ہوگا، لہذا اس کا تصرف درست ہوگا، رہن رکھنا اور وراثت کا جاری ہونا سب ملکیت کی فرع ہین،

لہذا ہر دو امر بھی جائز ہون گے، علاوہ ازین ہندوستان کے غیر مسلم مقبوضات کو دارالاسلام کہنا مشکل ہی، اور دارالحرب ہونے کی صورت مین سابق ملکیت باقی نہین رہی، اموال واملاک غنیمت معلوم ہوجاتے ہین، ایسی حالت مین تسلط واستیلا، ید حافظہ وید ناقلہ تملیک کے لئے کافی ہے، البتہ مستامن ہونے کی صورت مین عہود کی رعایت واجب ہے، اور غیر مستامن ہونے کی صورت مین وہ بھی نہیں، عہد کے مطابق قوانین کو تسلیم کرچکنے کے بعد تسلیم کرنے والے مستامن کے لئے جبری وغیر شرعی قانون بتلاکر ناقابل عمل بتلانا محل تامل ہے، واللہ اعلم۔

کتبہ محمد عمیم الاحسان مجددی برکتی عفی عنہ مفتی دارالافتا جامع مسجد ناخدا کلکتہ، یکم ذیقعدہ ۱۳۵۹ھ

دارالعلوم دیوبند کا ماہانہ رسالہ

دارالعلوم

مدت مدید سے مخلص اور دیندار مسلمان اپنے دینی وعلمی مرکز دارالعلوم دیوبند کی طرف سے ایک علمی مذہبی رسالہ کے اجرا پر مصر تھے، الحمد للہ کہ ان کی یہ آرزو پوری ہوگئی اور بلا واسطہ دارالعلوم کی ملکیت والا کابر علماے دیوبند کی سرپرستی ونگرانی مین رسالہ دارالعلوم جاری ہوگیا،

رسالہ کے معیار کی بلندی اور اسکی خوبیون کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اس مین جماعت دیوبند کے جلیل القدر علما کے بیش قیمت مضامین مسلسل شائع ہون گے،

رسالہ دارالعلوم کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ مسلمان جس صحیح اور قابل اعتماد مذہبی رہنمائی کی امید اپنے مذہبی مرکز دارالعلوم دیوبند سے رکھتے ہین، اسی صرف یہی رسالہ پورا کرسکتا ہے،

اس رسالہ کا کوئی تعلق کسی شخص کی ذات سے نہین بلکہ براہ راست دارالعلوم سے ہے یہی اسکی ساکھ اور استحکام کی سب سے بڑی ضمانت ہے مخلص اور دیندار مسلمانون سے توقع ہے کہ وہ اس رسالہ کے معاونین مین شامل ہونا اپنا ایک ضروری جماعتی فریضہ تصور فرمائین گے، کاغذ وغیرہ کی انتہائی گرانی کے باوجود سالانہ چندہ صرف دو روپیہ ہے نمونہ مفت طلب فرمائین، وی پی طلب کرنیکے بجاے اپنا اور اپنے احباب کا چندہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائین

عبدالوحید ناظم ومرتب رسالہ دارالعلوم دیوبند

تیموری شاہزادون کا علمی ذوق

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم اے

"شاہان تیموری کے علمی ذوق کا سلسلہ ناظرین معارف مین پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا تھا، لیکن درمیان مین سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کی طویل علالت کی وجہ سے یہ سلسلہ منقطع ہوگیا تھا، اب اس کا باقی حصہ پیش کیا جاتا ہے، سلسلہ کے لئے نومبر ۱۹۳۷ء کا معارف ملاحظہ ہو"

"م"

ہندوستان مین تیموری سلطنت کے بانی یعنی بابر کی اولاد نرینہ مین ہمایون کے علاوہ آٹھ اور لڑکے پیدا ہوئے، کامران، عسکری، ہندال، الور، باربل، فاروق، شاہ رُخ اور احمد جن مین موخرالذکر پانچون کا انتقال اسی کی زندگی ہی مین ہوگیا تھا، ہمایون، کامران، عسکری اور ہندال اس کے سامنے پروان چڑھے، اور اسکی علم پرور صحبت مین تعلیم و تادیب سے فیضیاب ہوئے، اوس کی موت کے بعد اس کے لڑکون کو وراثت مین تنہا اسکی شجاعت اولوالعزمی اور پامردی نہین، بلکہ علم و ہنر کا شوق اور شعر و شاعری کا ذوق بھی ملا،

مرزا کامران | بابر نے اپنی ہنگامہ پرور زندگی کے باوجود کامران کی مذہبی اور اخلاقی تعلیم کے لئے اپنی مشہور خودنوشت مبین لکھی، اور اس کے ادبی مذاق کے لئے اپنی تزک اس کے مطالعہ مین دی، اوس کے ذوق شعری کو

فروغ دینے کیلئے اپنا منظوم رسالہ والدیہ اور اپنے اشعار تحفے میں بھیجے، اور پھر علم و ہنر کی چاشنی کے لئے جہاں گیا، وہاں کے کتب خانوں سے اوس کے پاس کتابیں بھیجیں، چنانچہ بابر کی کوششیں رائگاں نہیں گئیں، مرزا کامران سخن گوئی و سخن وری کا مالک بنا،

اس کا ایک دیوان زمانہ کی دستبرد سے معلوم نہیں کیسے کتب خانہ خدا بخش خان پٹنہ میں محفوظ رہ گیا ہے، اس میں مرزا کے ترکی و فارسی کلام ہیں، ترکی میں ۳۸ غزلیں، تین قطعات، چھبیس رباعیات، چودہ مثنویات اور کچھ مفردات ہیں، اسی طرح فارسی میں ۲۳ غزلیں، تین قطعات، چار رباعیات، چار چھوٹی چھوٹی مثنویات اور ایک ساقی نامہ ہے، فارسی کلام کو پروفیسر محفوظ الحق صاحب مدظلہ (پریذیڈنسی کالج کلکتہ) نے اڈٹ کرکے ایک پر مغز مقدمہ کیساتھ معارف پریس میں چھپوا کر شائع بھی کردیا ہے جو اس وقت میرے پیش نظر ہے،

میرزا کے کلام میں گہرے مضامین کی جدت اور خیالات کی بلندی نہیں لیکن تغزل کا پورا رنگ موجود ہے، مثلاً:-

بار رقیبان ہمدم و ہمراز دیدم یار را — یارب آسان کن بمن این حالت دشوار را
وہ چہ باشد بے قراران را دہد صبر و قرار — آنکہ می بخشد خرام آن سرو خوش رفتار را
در کلام لعل او نیسان کہ می ریزد گہر — چون نگہ دارم ز گریہ چشم گوہر بار را
غیر جانان در جہان چیزی نپندارد دگر — ہر کہ بردارد ز پیش این پردۂ پندار را
کامران نادیدہ از جز دوست چیزی در نظر — تا بکام خویش دیدم دولت دیدار را

اے قد رعنای تو سرو گلستان حسن — روی دلآرای تو لالہ بستان حسن
روی خوش لطف بہشت تازہ گل باغ — سرو قد دلکشت نخل گلستان حسن
شمس و قمر را نماند، ماہ رخ و نقی — تا تو برآوردہ سر ز گریبان حسن

میرزا جب عشقِ مجازی کے بجائے عشقِ حقیقی کی کیفیات منظوم کرتا ہے، تو نسبتہً زیادہ مؤثر ہو جاتا ہے، مثلاً

زینسانکہ جمالِ خود آراستہ می آئی — در زہد شکست آری در عشق بیفزائی
چون چہرہ بیارائی رخسارہ برافروزی — خود گوئی کجا ماند آئینِ شکیبائی
گر سر بگریبانم در ناظرِ خو بانم — در سینہ تو پنہانی در دیدہ تو پیدائی
از صفحۂ رخسارت صد نکتہ بیاد آید — اے وائے ازان روزی کان رخ بخطا آئی
گفتی کہ مشو دانم گر خوانمت و گر رانم — من بندۂ فرمانم ہر نوع کہ فرمائی
گر دیر نشیں سازد در رہبر دین سازد — ما را بتو دیدار او راست تو ما نائی
سودا کسی دارد با زاین سر بے سامان — جاے ہوسے دارد با زاین دل ہرجائی

میرزا کے کلام میں اس قسم کے صوفیانہ جذبات کی کمی نہیں، دیوان کا آغاز تو ایک ایسی غزل سے ہوا ہے، جس میں شروع سے آخر تک صوفیانہ احساسات اور معتقدات ہیں،

چون مقصود نشد ہیچ کسے رہبر ما — بعد ازین خاکِ درِ پیرِ مغان و سرِ ما
کار ما چون زدرِ بستہ زاہد نہ کشود — بو کہ زین پس ز خرابات کشاید درِ ما
بار گی سست و شبِ تیرہ و رہزن بکمین — دانی گر ہادی لطفت نشود رہبر ما
خو گر فتیم بدرد و غم عشقت بلہوست — دم بدم درد و غمے بر دلِ غم پرور ما
وہ کہ از شوق دلم می طپد و مضطربم — می رسد مژدہ وصلی مگر از دلبر ما
کامران سوختم از آتشِ ہجرانِ کسے — کہ بکویش نرسد ذرۂ خاکسترِ ما

ایک رباعی میں بھی یہی خیالات موجزن ہیں،

یارب ز کرم دری بر دیدہ بکشای — زنگِ غیر از دلِ حزینم بزدای

پیوندِ من از جسدِ علائق بگسل ازہر دو جہان سوی خودم راہ نمائی

ایک قطعہ میں کچھ پند و موعظت بھی ہے،

اے برادر زمن شنو سخنے کہ ازان بہرہ ور شوی شاید

دل بکارِ جہان منہ کہ ازان بارِ غم بر دلِ تو افزاید

کارِ عقبیٰ بساز ورنہ ترا کار و بارِ جہان چہ کار آید

کامران کی ہنگامہ خیز زندگی اور اس کا دردناک انجام نظر کے سامنے ہو تو یہ قطعہ کتنا مؤثر اور عبرت انگیز ہو جاتا ہے، ایک مثنوی کی تمہید میں تو اوس نے شاید اپنی زندگی کا مرقع ہی کھینچ دیا ہے،

تا چہ سازد جہانِ بے سر و بن غافل از مکرِ آسمانِ کہن

رفت کارم ز دست و دست از کار نیست کارم بغیر نالۂ زار

نے ز نخلِ امید من ثمرے، نے ز تخمِ نشاط و عیش برے

نکشاید دلم ز باغ و بہار نیست مقصودِ من ز جملہ نگار

اس کی تمنا تھی کہ

بیا ساقی آن مے کہ خامی رہد ز دنیا و عقبیٰ خلاصی دہد،

اور یہ پوری ہوئی، وہ دنیا کے ہنگامون اور آلودگیون سے کنارہ کش ہو کر ساقی حقیقی کے اصلی میخانہ میں مخمور اور سرشار ہو کر جان بحق ہوا، یعنی اوس کی وفات ایام حج میں ہوئی،

میرزا کی شعر گوئی محض اسکی ذہانت و ذکاوت کا نتیجہ تھی، وہ حالات سے متاثر ہو کر اشعار موزون کرتا، اور کبھی کبھی فی البدیہہ اور برجستہ کہتا تھا چند مثالیں ملاحظہ ہون،

باپ کے مرنے کے بعد زمانہ کی عام روش کے مطابق وہ بھی تخت و تاج کا خواہان ہوا، بابر نے اپنی زندگی مین اوس کو قندھار کی مملکت عطا کی تھی، لیکن اوسکے مرنے کے ساتھ ہی سلطنت کی ہوس مین اوس نے لاہور پر بھی قبضہ کر لیا، ہمایون نے اپنے باپ کی وصیت اور کچھ اپنے مصالح کے خاطر کامران کے خلاف کوئی جارحانہ تدبیر نہ کی، بلکہ ایک فرمان لکھکر اسکو کابل اور قندھار کے علاوہ پنجاب کا بھی مالک بنا دیا، کامران نے متاثر ہو کر شکریہ مین ہمایون کی خدمت مین مندرجۂ ذیل غزل پیش کی،

حسنِ تو دمبدم افزون بادا — طالعت فرخ و میمون بادا
ہر غباری کہ ز راہت خیزد — کحلِ چشمِ منِ محزون بادا
خاک کو ازرہِ لیلیٰ خیزد — جاے او دیدۂ مجنون بادا
بندہ حلقہ بگوشِ تو چو من — صد چو دارا و فریدون بادا
ہر کہ گرد تو چو پرکار نگشت — او ازین دائرہ بیرون بادا
کامران تا کہ جہان راست بقا — خسرو دہر ہمایون بادا

ہمایون نے اس غزل کے صلہ مین کامران کو حصار فیروزہ انعام دیا[1]،

---

[1] اکبرنامہ جلد اول ص ۱۲۵، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی پر وفیسر محفوظ الحق صاحب نے تذکرہ ہفت اقلیم کے استناد سے لکھا ہے، کہ مذکورۂ بالا غزل کے علاوہ یہ غزل بھی اس موقع پر بھیجی تھی،

چشم بر راہ تو داریم شدایا مے چند — وقت آن شد کہ نہی جانبِ ما گامے چند
آنکہ ہرگز نفرست سوی ما پیغامے چند — چہ نشود گر کندم شاد بدشنامے چند
تا کسے میل دلم را برخت پے نبرد — دولتِ وصلِ تو خواہم دلآرامے چند
بہر صید دلِ ما دانۂ خالِ تو بس است — ہر دم از زلف منہ بر سرِ ما دامے چند

مگر دونون بھائیون کی یہ شفقت و محبت بہت دنون تک قائم نہ رہی اپنے اپنے مصالح کی بنا پر دونون ایک دوسرے سے برسرپیکار رہے، اور آپس کے نفاق سے دونون کو بُرے دن دیکھنے نصیب ہوئے، ہمایون کو اپنے باپ کی سلطنت سنبھالنی تھی، وہ چارون طرف سے دشمنون کے نرغہ مین گھرا ہوا تھا اسود دشمنون کو پسپا کرنا، ان کی مملکتون کو تسخیر کرنا اور تیموری سلطنت کی بنیاد رکھنی تھی، اوس کو امید تھی کہ اس کے بھائی اوس کی غمگساری اور رفاقت کرین گے، لیکن کامران نے باپ کی ہمتِ مردانہ اور جوشِ عمل وراثت مین پایا تھا، وہ کیونکر باپ کے تخت و تاج کے حصول مین اپنی قسمت آزمائی نہ کرتا، چنانچہ وہ ہمایون سے الگ ہوکر اس کا حریف بنا، ہمایون نے شیر شاہ سے پے در پے شکستین کھائین، کامران نے ان شکستون سے فائدہ اٹھانا چاہا لیکن وہ اپنی قسمت کے لکھے ہوئے کو کیونکر مٹا سکتا تھا، ہمایون جب تیرہ سال کی آوارہ گردی کے بعد اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کی بازیابی کے لئے لوٹا، تو پہلے اوس نے اپنے بھائیون کے خلاف جنگ کی، کامران اس وقت کابل مین تھا، دونون بھائیون مین سخت جنگ ہوئی، کامران قلعہ مین محصور ہوگیا، مگر ہولناک لڑائیان جاری ہین، جب لڑائی طول کھینچی تو ہمایون نے بھائی کو ایک رقعہ لکھا، جس کو ابوالفضل نے اس طرح درج کیا ہے:

"اے برادر بدخو وائے عزیز جنگ جواز تدبیر این کار (کہ باعث کارزار و موجب قتل آنار مردم بیشمار است) باز آئی، و بر مردم شہرے و لشکرے رحم نمائے، امروز این ہمہ مردم کہ کشتہ می شود فردائے قیامت،

(بقیہ حاشیہ ص ۲۶۰)

ما خوابا تے در ندیم تو با ما منشیں، حیف باشد کہ نشینی تو ببد نامے چند
کامران این نزل نو بہایون بفرست باشد ارسال کند سوے تو افعامے چند

بر و خون آن قوم در گردنت بر دوستِ آن جمع در دامنت

ہمان بہ کہ بر صلح راسے آوری طریق مروت بجائے آوری

مگر کامران نے اپنی اولوالعزمی اور بلند حوصلگی میں سرشار ہو کر یہ شعر لکھ بھیجا،

عروس ملک کسے در کنار گیرد چست کہ بوسہ بر لبِ شمشیر آبدار دہد[1]

اس جنگ میں کامران کو شکست ہوئی لیکن وہ اپنی شکست ماننے کو تیار نہ تھا، موقع موقع سے وہ ہمایوں کے خلاف جنگ کرتا رہا، لیکن قسمت نے اس کا کبھی ساتھ نہ دیا، ایک بار شکست کھا کر سلیم شاہ سوری کے دربار میں پہونچا، وہاں اوس کو امید تھی، کہ ہمایوں کے خلاف اوسکو امداد ملے گی، لیکن یہاں اس کی امید کیا بر آتی، کہ اس کو ہر قسم کی ذلتیں اٹھانی پڑیں سلیم شاہ نے پہلے اسکی علمیت کو نیچا دکھانے کی کوشش کی، تاریخ داؤدی میں ہے،

"مرزا کامران از ملازمت ہمایون بادشاہ فرار نمودہ بہ سلیم شاہ التجا آورد، در مجلسِ اوّل سلیم شاہ برائے آزمایش طبعِ کامران میرزا سہ بیت یکے از اشعار اہلِ عراق دوم از فضلائے ہندوستان راسوم از شعرا افغان آوردہ گفت چگونہ شعر است کامران مرزا گفت از خوبہائے شعری پرسید یا این می فرمایند کہ اشعار کیست، سلیم شاہ گفت می خواہم کہ بدانم کہ این اشعار ہر سہ بیت اشعار کیست، کامران گفت بیت اول کہ خواندید شعر مقل عراق است، بیت دوم از شعرا اہلِ ہندست و بیت سوم شعرا افغان است، سلیم شاہ و جمیع حاضران از کمال فہم و فراست مرزا کامران آفرینہا نمودند"

پھر بھی سلیم شاہ کے درباری اوس سے تمسخر کرنا چاہتے تھے، لیکن وہ اپنی ذہانت اور گویائی سے ان کو خاموش رکھتا تھا، ملا بدایونی لکھتے ہیں :-

---

[1] اکبرنامہ جلد اول ص ۲۲۸

سلیم شاہ گاہے میرزا را طلبیدہ مشاعرہ می کرد و صحبت با خوشی می گذشت و میرزا ازان تکلفات و تواضعات بسیار بجان آمدہ از عمر و زندگی بیزار گشت و فرصت بجست فرار نمود و افغانان باوی بزبان ہندی ہزلے می کردند، و چون بدرباری آمدی گفتند، مورو (مرغ) می آید، میرزا ازیکے مقربان بحضور سلیم شاہ پرسید کہ مورو کرا می گویند او گفت مردے عظیم الشان را می گویند، میرزا گفت برین تقدیر سلیم شاہ خوش مورو باشد و شیر شاہ ازان ہم خوشتر باشد[1]

ایک موقع پر سلیم شاہ نے کامران کو اپنا شعر سنانے کو کہا، کامران نے جل کر برجستہ یہ شعر پڑھا

گردش گردون گردان گردنان را گرد کرد
بر سر اہل تمیزان ناقصان را مرد کرد

سلیم شاہ بہت خفیف ہوا، ملا بدایونی لکھتے ہیں، کہ

"سلیم شاہ فحوائے کلام را دانستہ واین ادا را فرو بردہ بموکلان پنہانی حکم فرمود تا میرزا را چشم بندند نگاہ دارند"[2]

کامران یہاں سے نکلا تو ادھر ادھر بھٹکتا رہا، کابل جا رہا تھا کہ ہمایون کے آدمیوں کے ہاتھوں گرفتار ہوا، کامران نے بے بس ہو کر ایک عرضداشت لکھ بھیجی[3]، لیکن کامران کے دن پورے ہو چکے تھے، اس کا وہی حشر ہوا جو تیموری سلطنت کے ہر نرینہ خوردہ وعویداروں کا

---

[1] منتخب التواریخ جلد اول ص ۳۹۰ [2] ایضاً ص ۳۹۳ [3] اکبر نامہ جلد اول ص ۳۴۲ پر وفیسر محفوظ الحق صاحب نے مسٹر بیوریج کے ایک مضمون (جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن بابتہ ۱۹۰۳ء ص ۱۲۲-۱۱۵) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس عرضداشت کے ساتھ کامران نے معذرت میں ایک غزل بھی بھیجی تھی، مسٹر بیوریج کو یہ غزل اکبر نامہ کے ایک قلمی نسخہ بلگرام میں ملی تھی، لیکن افسوس ہے کہ مسٹر بیوریج نے اس غزل کو اپنے مضمون میں نقل نہیں کیا، اور نہ یہ غزل اکبر نامہ کے مطبوعہ نسخہ میں موجود ہے،

ہوا کیا ہے، اسکی آنکھون کی روشنی زائل کردی گئی، جب اس نعمت سے وہ محروم ہوگیا، تو اسکا محبوب غلام بیگ ملوک اس کے پاس آیا، وہ اوس کے ہاتھون کو اپنی آنکھون سے لگاتا اور یہ شعر پڑھتا تھا،

ہرچند کہ چشم برخت پردہ کشیدہ است
ہنیا است بچشمی کہ بسے روی تو دیدہ است[1]

کتنا حسرتناک شعر ہے، فرشتہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، کہ ہمایون بھی اس کا عبرتناک انجام دیکھنے آیا، ہمایون جب اوس کے پاس پہنچا، تو کامران نے استقبال مین یہ اشعار پڑھے،

زقدر و شوکت سلطان نگشت چیزے کم — زالتفات بہ مہمان سرائے دہقانی
کلاہ گوشۂ دہقان بآفتاب رسید — کہ سایہ برسرش افگند چو تو سلطانی

ان کو سُن کر ہمایون پر گریہ طاری ہوگیا،[2]

کامران کے لئے دنیا اور دنیا کی نیرنگیون مین کوئی دلچسپی باقی نہین رہی تھی، ہمایون جب کابل جارہا تھا تو اوس نے سندھ کے پاس حج بیت اللہ کی اجازت مانگی، جو ملی، بھائی کو رخصت کرنے کے لئے ہمایون جب اوسکے خیمہ مین آیا، تو کامران کی زبان پر پھر دو چھتے ہوے شعر تھے،

کلاہ گوشۂ درویش بر فلک ساید — کہ سایہ ہمچو تو شاہے فگند بر سر او
برجانم از تو ہر چہ رسد جاے منت است — گر ناوک جفا است و گر خنجر ستم

ان اشعار کی خلش ابوالفضل نے بھی محسوس کی ہے، وہ لکھتا ہے:

"اگرچہ بیت ثانی جانب شکر دارد، اما سخن شناس دریابد کہ از شکایت لبریز است،

---

[1] اکبرنامہ جلد اول ص ۳۲۹ [2] فرشتہ ص ۲۴۳ نولکشور پریس،

آنحضرت (کہ جہان مروی و مہربانی بودند) اینہا منظور نداشتہ رقتہا فرمودند[۵۱]

کامران اپنے بچوں کو ہمایوں کے حوالہ کرکے اپنی بیوی جو جگ بیگم کیساتھ حج کو چلا گیا، اور وہین زندگی کے بقیہ دن گذارے، تین بار حج کی سعادت سے مشرف ہوا، آخری بار جب حج کا فریضہ ادا کر رہا تھا، کہ منا کے میدان مین ۱۱ ذی الحجہ ۹۶۴ھ مین اپنے مالک حقیقی سے جا ملا، کامران کی موت کا قطعۂ تاریخ کئی شعراء نے لکھا ہے[۵۲]، مگر ملا بدایونی کو کامران کی ذات سے شاید بڑی دلچسپی تھی، انھون نے خاقانی کے اشعار مین اس کا ماتم کیا ہے،

ہرگز بباغ عہد گیاہے وفا نہ کرد — ہرگز زشست چرخ خدنگے خطا نکرد
خیاط روزگار ببالاے ہیچ کس — پیراہنے نہ دوخت کہ آنرا قبا نکرد
نقدے نہ داد دہر کہ آنرا بدل نشد — نردے نباخت دہر کہ آن را دغا نکرد

---

۵۱ اکبر نامہ جلد اوّل ص ۳۰

۵۲ مولانا قاسم کاہی نے مندرجۂ ذیل قطعہ لکھا:

کامران آنکہ با دشاہی را — کس نہ بودست ہمچو او در خود
شہ زکابل بکعبہ و آنجا — جان بحق داد و تن بخاک سپرد
گفت تاریخ او چنین کاہی — پادشہ کامران بکعبہ مرد

وسیمی نے لکھا،

شہِ کامران خسرو نامدار — کہ در سلطنت سر بکیوان رساند
مجاور شد اندر حرم چند سال — بکلی دل از قید عالم رہاند
ز بعد وقوف حج چارمین — باحرام حج جان بجانان فشاند
چو در خواب وسیمی درآمد بشبے — عنایت نمود و سوی خویش خواند
بگفت ار بپرسندت از فوت ما — بگو شاہ مرحوم در مکہ ماند

گردون در آفتاب سلامت کرا نشاند کورا چو صبح روشن اندک بقا نکرد
خاقانیا بچشم جہان خاک در مگن کو در دو چشم دید ترا پادشا نکرد[1]

میرزا کی شعر گوئی کی تعریف ہر زمانہ کے مورخون اور تذکرہ نویسون نے کی ہے بدایونی نے لکھا ہے :-

"ہمیشہ با علماء و فضلا صحبت می داشت و اشعار او مشہور است"[2]

داؤدی مین ہے :

"مرزا کامران در شعر آرائی و شعر فہمی طبیعت درست داشت"[3]

صاحب ہفت اقلیم کہتا ہے :

"میرزا کامران در مضمار شاعری بر دو مرکب سواری نمودہ"

نواب حسین قلی خان عشق مؤلف تذکرۂ نشتر عشق نے لکھا ہے :

"طبع لطیف و معنی یاب داشت"

اس کے بعد میرزا کی موت پر جو قطعۂ تاریخ درج کیا ہے، اس مین بھی اس کی شعر گوئی کے سلیقہ کی داد ہے،

اختر برج سخن آن نکتہ دان وہ چہ شام از این جہان شد رہگرائے
از سر جاہش بگفتم سال فوت کامران آسود در فردوس ہائے

مجمع النفائس کے مؤلف نے مرزا کامران کے حسب ذیل اشعار کو خاص طور سے پسند کیا ہے،

باز دامان خود آن سرو بالا زدہ است کس بدامانش مگر دست تمنا زدہ است

---

[1] بدایونی جلد اول ص ۴۵۳ [2] ایضاً ص [3] تاریخ داؤدی قلمی نسخہ خدا بخش خان لائبریری پٹنہ،

عیب ما چند کنی قصۂ صنعان بشنو — کہ بیک جلوہ رہش دفتر تر سازد و است
سوے مقصد نشد از ہیچ کسے رہبر ما — بعد ازین خاک در پیر مغان و سر ما

صاحب مخزن الغرائب لکھتے ہین :

"وے طبع موزون داشتہ و شعری چون در مکنون"

صبح گلشن مین ہے :

"طبع مستعیش لطائف سخن را پشت و پناہ"

دیوان کامران کے مرتب پروفیسر محفوظ الحق صاحب رقمطراز ہین :

"میرزا واقعی غزل گو ہے، اور جو کچھ اوس نے کہا قیناً، اس کے کلام مین صفائی اور سلاست کا فی حد تک ہے، گو خیالات مین کوئی ندرت نہین، اور نہ کلام مین چندان شوخی معلوم ہوتی ہے، لیکن طرز ادا قابل ستایش و داد ہے کلام برجستہ و بے تکلف اور نمکین ہے اور بعض اشعار مین تصوف کی بھی چاشنی ہے"[1]

میرزا ابو القاسم شوکتی | مرزا کامران کی اولاد نرینہ مین میرزا ابو القاسم بھی باپ کی طرح شاعر ہوا، شوکتی تخلص رکھتا تھا، ہفت اقلیم کا مؤلف اوس کو فیضی فیاض بتاتا ہے، اوس کے اصلی الفاظ یہ ہین :

"مرزا ابو القاسم در غایت فطنت و ذکا، و در نہایت ملاحت و صفا ..... بشعر گفتن میلی تمام داشتہ و بسخن نیک می رسیدہ و شوکتی تخلص می کردہ، ایں دو بیت مرا و راست"

---

[1] دیوان مرزا کامران مرتبہ پروفیسر محفوظ الحق صاحب،
(مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ)

یار ہر شانہ کہ در زلف بہم سازدہ است نشترِ غم بدل غم زدہ مازدہ است
فضا بگشتن من این قدر شتاب مکن بخواہم از ستمت مرد اضطراب مکن[1]

ریاض الشعراء کا مصنف لکھتا ہے کہ

"زمانہ حالش بزیور دانش و کمال آراستہ و پیراستہ بود"[2]

صبح گلشن مین ہے :

"در بزم و رزم بہیبت و شوکت قدم می گذاشت"[3]

میرزا ابوالقاسم اکبر کے حکم سے قلعہ گوالیار مین مقید رہا، اور آخر مین اوس کے حکم سے قتل کر دیا گیا، فرشتہ کی روایت ہے کہ قتل کے وقت اسکی زبان پر یہ شعر تھا،

فلک بگشتن من این قدر شتاب مکن بخواہم از ستمت مرد اضطراب مکن[4]

اس کے بعد میرزا کامران کی کوئی اولاد نرینہ نہ رہی، اس لئے کسی نے اس کی وفات کا قطعہ تاریخ کہا،

نماند از کامران نام و نشانی[5]

عسکری و ہندال | معاصر مورخون نے عسکری و ہندال کا ذکر شعراء کی حیثیت سے نہیں کیا ہے لیکن بعض تذکرون مین ان دونون کے نام شاعرون کی فہرست مین داخل ہین،

مخزن الغرائب مین ہندال کی ایک رباعی ہے، جو ندرت کے لحاظ سے خوب ہے،

زان قطرۂ شبنم کہ نسیم سحری از ابر جدا کرد بصد حیلہ گری
تا بر رخ گل چکاند از شرمندگی حقا کہ ہزار بار پاکیزہ تری

---

[1] ہفت اقلیم قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی [2] ریاض الشعراء قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی [3] صبح گلشن صفحہ ۳۳۹ [4] فرشتہ جلد ۲ صفحہ ۲۴۱ نولکشور پریس [5] ریاض الشعراء

اسی مین عسکری کے مندرجۂ ذیل اشعار منقول ہین،

چنان بیخود شدم از دوری آن گلعذار امشب — کہ ہر دم گریہ ریزد بے اختیار امشب

چنین کہ خوی گرفتم بآشنائی تو، — ہلاک می کند م آن قدر جدائی تو

گوشہ میخانہ جاے دلکشائی بودہ است — بے تکلف گوشہ میخانہ جاے بودہ است

اے عسکری ارست مدامی خوش باش — ور معتقد بادہ وجامی خوش باش

گفتی بخرابات نباشم بے او — با یار اگر درین مقامے خوش باش

شاہ ابوالمعالی | ہمایون کی اولاد نرینہ مین اکبر کے علاوہ حکیم مرزا بھی تھا، اس شہزادہ کے ذوق علم کا ذکر معاصر مورخون نے نہین کیا ہے لیکن ہمایون کا ایک داماد یعنی جوجک بیگم کی لڑکی اور میرزا حکیم کی بہن فخر النسا کا شوہر میر شاہ ابوالمعالی ایک خوش مذاق شاعر تھا، اور شہیدی تخلص کرتا تھا، مآثر الامرا مین ہے:

"شاہ ابوالمعالی خوش طبع وسلیقہ بشعر موافق داشت"[1]

مرزا دانیال | اکبر کے تین لڑکے تھے سلیم، دانیال اور مراد، جن مین دانیال فارسی اور ہندی کا شاعر تھا، اس کے ذوق شعری کا ذکر کرکے جہانگیر نے اپنی تزک مین لکھا ہے کہ

"بہ تفنگ شکارے کہ بہ تفنگ کنند میل تمام داشت، یکے از تفنگہاے خود را یکہ وجنازہ نام نہادہ بود، این بیت را خود گرفتہ فرمود کہ بر آن نقش کنند"

از شوق شکارے تو شود جان تو تنگ — بر ہر کہ خورد تیر تو یکہ وجنازہ

اسکی ہندی شاعری کے بارے مین وہ رقمطراز ہے:

---

[1] مآثر الامراء جلد سوم ص ۱۹۱ وص ۱۸۶، نیز حالات کیلئے دیکھو اکبرنامہ جلد دوم ص ۱۹۸ و ص ۲۰۶، طبقات اکبری جلد دوم ص ۶۹-۶۵، منتخب التواریخ جلد دوم ص ۶۳-۵۰

"بہ نغمۂ ہندی مائل بود، گاہے بزبان اہل ہند و باصطلاح ایشان شعرے می گفت بدنبود ے[۱]"

دانیال کے دربار مین شاعرون کا ایک مجمع رہتا تھا، انہی مین ملا محمد رضا نوعی (المتوفی ۱۰۰۰ھ) اور میر حسین کفری تھے، ملا رضا خبوشان (خراسان) کے رہنے والے تھے، صغر سنی مین باپ کیساتھ ہندوستان آئے، مگر تھوڑے دنون کے بعد وطن واپس چلے گئے، باپ کی وفات کے بعد پھر ہندوستان آئے، اور مرزا یوسف خان کے دربار مین ملازم ہوئے، اس کے ساتھ کشمیر گئے تو وہان کی بہشت زار مین ان کی طبیعت مین بھی رنگ و بو پیدا ہوا اور طبع آزمائی کرنے لگے، نوعی تخلص رکھا، اشعار خواص و عوام مین مقبول ہونے لگے،

"رفتہ رفتہ بہ تقریبے بہ سمع مبارک شاہزادہ عالی جاہ شاہزادہ دان (یعنی دانیال) شاہ رسید آن قدر دان نکتہ سنجان از روے خواہش نوعی را از میرزا یوسف خان گرفتہ داخل بساط بوسان محفل حشمت و شوکت خود گردانیدہ ..... چون داخل مداحان آن شہزادہ عالی مقدار گردید، قصائد غرا در مدح آن جوان بخت عالی تبار گفت[۲]"

مآثر رحیمی کا مصنف لکھتا ہے:

"شاہزادہ مومی الیہ (یعنی دانیال) را صحبت مولائی مذکور پسند افتادہ در ترقی و تربیت او را کوشیدند و سر بے نیازی او را از فرق فرقد سای گردانیدند[۳]"

دانیال کی فرمایش پر ملا نوعی نے ایک مثنوی "سوز و گداز" لکھی، جس مین ایک ہندو عورت

---

[۱] تزک جہانگیری ص ۱، نولکشور پریس [۲] میخانہ مؤلفہ ملا عبدالنبی مرتبہ پروفیسر محمد شفیع [۳] مآثر رحیمی جلد سوم صفحہ ۶۳۶۔

کے عشق کا قصہ مرقوم ہے، عورت کا شوہر بیاہ کے دن ایک چھت کے گر جانے سے دبکر مرگیا، وہ ستی ہونے چلی تو اکبر نے اسکو روکنا چاہا، لیکن شوہر کے عشق مین وہ آگ مین کود پڑی، اسی واقعہ کو نوعی نے دانیال کی فرمایش پر منظوم کیا ہے[۱]

نوعی کا قابلِ فخر کارنامہ "ساقی نامہ" ہے جس کے صلہ مین میرزا عبدالرحیم خانخانان نے اسکو دس ہزار روپے، اور ہاتھی گھوڑے عنایت کئے تھے[۲]

میر حسین کنزی بھی خراسان کا رہنے والا تھا، تیموریون کی علم نوازی کا شہرہ سن کر ہندوستان آیا، اور شاہزادہ دانیال کے سایۂ عاطفت مین پناہ لی، مآثر رحیمی مین ہے:

"مدتے ملازم شاہزادہ خورشید لوا شاہزادہ دانیال شد، و در ملازمت آن شاہزادہ بختیار کمال تقرب و نزدیکے بہم رسانید، و قصائد غرا بمدح آن شاہزادہ گفتہ"[۳]

شاہزادہ کی وفات کے بعد عبدالرحیم خانخانان کی زر پاشیون سے سیراب ہوا[۴]

پرویز جہانگیر کے لڑکون مین پرویز نے بھی علم و فن کی محفل سجائی، مگر اس محفل کو رونق دینے والے فضلا اور شعرا مین صرف دو نام ہم کو تذکرون مین ملے ہین، میرزا عبداللہ اور حکیم غفور لاہجی، عبداللہ نیشاپور سے ہندوستان آکر پرویز کے دامنِ دولت سے وابستہ ہوا تھا،

حکیم غفور لاہجی طب، حساب، موسیقی اور شاعری کے فن مین یکتاے روزگار تھا، ایران سے ہندوستان آیا، اور دانیال کے دربار کو اپنے فضل و کمال سے پررونق بنایا، پہلے رستمی پھر غفور تخلص کرتا تھا، حساب مین رسالہ اصابع اسکی ایک تالیف ہے[۵] (باقی)

---

[۱] مآثر الکرام جلد دوم صـ۲۳ [۲] مآثر رحیمی جلد سوم صـ۳۵، ساقی نامہ مینا نہ مرتبہ پروفیسر محمد شفیع مین ملاحظہ ہو، نوعی کا ایک دیوان بنگال ایشیاٹک سوسائٹی مین موجود ہے [۳] مآثر رحیمی صـ۱۰۰ جلد سوم اسکے کلام کے نمونے بھی اس کتاب بھی مین گے [۴] ریاض الشعرا۔

حافظ جلال الدین سیوطی

از

جناب مولوی محمد اویس صاحب ندوی نگرامی رفیق دار المصنفین

(۲)

حافظ سیوطی کے اصل علوم | حافظ سیوطی کے اصل علوم، علوم شرعیہ تھے، حکمت و فلسفہ کے سلسلہ مین وہ کہتے ہین، کہ جب سے مین نے حرمتِ فلسفہ کی بابت ابن صلاح کا فتویٰ دیکھا، اس وقت سے مجھکو فلسفہ سے نفرت ہوگئی، اور اپنی توجہ کو علوم شرعیہ کی طرف مبذول کردیا، خدا نے فلسفہ کے عوض مجھ کو حدیث مین وسعتِ نظر اور فہم کامل عنایت کی،

حساب کے متعلق سیوطی کا بیان ہے، کہ میرے لئے اس سے زیادہ سخت اور مشکل کوئی دوسرا علم نہین تھا جب کبھی مجھے حساب کے کسی مسئلہ سے سابقہ پڑا، تو مجھے یہی خیال ہوتا تھا کہ جیسے مین پہاڑ اٹھا رہا ہون،

حافظ سخاوی نے الضوء اللامع مین سیوطی کی اس کمزوری کا بڑا مذاق اڑایا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بقول علامہ شوکانی یہ کوئی عیب نہین ہے اگر انسان کو تمام علوم مین مرتبۂ کمال حاصل نہ ہو، جس شخص کو جس مضمون سے دلچسپی ہوتی ہے اسی مین اسکا ذہن کام کرتا ہے،

سیوطی حسن المحاضرہ مین کہتے ہین، کہ خدا نے مجھے سات علوم مین تبحر عنایت فرمایا ہے، وہ علوم یہ ہین (۱) تفسیر (۲) حدیث (۳) فقہ (۴) نحو (۵) معانی (۶) بیان (۷) بدیع،

سیوطی کا خیال ہے، کہ فقہ کے سوا بقیہ ان تمام علوم مین مجھکو وہ وسعتِ نظر اور بلند مقام

میسر آیا، جو میرے اساتذہ کو بھی نہیں ملا، البتہ فقہ میں میرے استاد بلقینی ہی کا پلہ بھاری ہے،

سیوطی کی جلالت علم کا اندازہ اس سے ہوتا ہے، کہ جب علمائے عصر سے اجتہاد کی بحث چھڑی تو سیوطی نے سب سے سات سوال کئے، جن کا کوئی جواب نہ دے سکا، نواب صدیق حسن خان مرحوم نے طبقات کاشغری کے حوالہ سے اتحاف النبلاء ص ۲۹۱ میں لکھا ہے، کہ ان تمام سوالات کا ماحصل یہ تھا کہ ب ت ث الخ کا واضع کون تھا،

اس کے بالمقابل علمائے عصر نے سیوطی سے پچاس سوالات کئے، تو انھوں نے ہر سوال کا جواب ایک تصنیف کے ذریعہ سے دیا،

اجتہاد کا دعویٰ | علامہ سیوطی کو اپنے علم و فضل کے متعلق جو یقین تھا، اسی کی بنا پر انھوں نے اجتہاد کا دعویٰ کیا، اس اجتہاد کے منصب کی توقع اُن کو پہلے ہی سے تھی، چنانچہ حسن المحاضرہ میں سراج الدین بلقینی کے ترجمہ میں (جن کو وہ آٹھویں صدی کا مجدد مانتے ہیں) کہتے ہیں، کہ ممکن ہے کہ اس نویں صدی میں بھی مصر میں کوئی مجدد پیدا ہو!

ایک رسالہ رسالۃ فیمن یبعث اللہ لھذہ الامۃ علی رأس کل مائۃ[1] میں لکھا ہے، کہ جس طرح امام غزالی کو اپنے مجدد ہونے کا خیال تھا، اسی طرح مجھکو بھی امید ہے کہ میں نویں صدی کا مجدد ہوں گا، اس لئے کہ میں فضل و کمال میں منفرد ہوں، علم اصول لغۃ کو میں نے ایجاد کیا، میری علوم اور میری تصنیفات سارے عالم میں پہنچ گئیں، شام، روم، عجم، حجاز، یمن، حبشہ اور تکرور ہر جگہ میرے علوم اور مصنفات کی رسائی ہے، ان کمالات میں میرا کوئی شریک نہیں ہے،

دوسری جگہ اپنی ایک نظم کا حوالہ دیتے ہیں، جس کا خاتمہ اس شعر پر ہے،

وقد رجوت انی المجدد فیھا ففضل اللہ لیس یجحد

(مجھ کو امید ہے کہ میں اس صدی کا مجدد ہوں، اور اللہ کی نعمت کا انکار نہیں کیا جا سکتا ہے)

---

[1] نسخہ قلمی لیڈن کٹلاگ نمبر ۴، ۲ (Wor ۲۲۲) بحوالہ مقدمہ نظم العقیان از ڈاکٹر فیلپ ہٹی،

بہرحال علامہ سیوطی کو اجتہاد و تجدید کی جو توقع تھی، ان کے نزدیک وہ پوری ہوئی، اس لئے انھوں نے اس کا دعوی کیا، اور حسن المحاضرہ مین اپنا ترجمہ مجتہدین کے سلسلہ مین لکھا اور اس مین صراحۃً یہ کہا کہ میرے لئے اسباب اجتہاد مکمل ہوگئے، نیز رسالہ الکشف عن مجاوز ہذہ الامۃ الالف مین بہت زور و شور سے کہا کہ جو لوگ میرے دعوی اجتہاد کے مخالف ہین اور مجھ سے معارضہ کا خیال رکھتے ہین، اگر وہ ایک جگہ جمع ہون اور مین ایک پھونک ماردون تو سب کے سب پراگندہ ہوکر منتشر ہو جائین،

خود سیوطی کے عہد مین ان کے اجتہاد پر بڑا جھگڑا رہا، اور بقول علامہ سخاوی بعض لوگون نے یہ کہا کہ اجتہاد کا یہ دعوی اپنی غلطیون کی پردہ پوشی کے لئے ہے، لیکن بعد کے علما نے عموماً ان کو مجتہد تسلیم کیا،

ملا علی قاری مرقاۃ ج ۱ ص ۲۴ مین بسلسلہ تجدید و اجتہاد لکھتے ہین، کہ نوین صدی مین حافظ سیوطی منصب تجدید کے زیادہ مستحق ہین، انھون نے تفسیر اور حدیث کو زندہ کیا، علوم شرعیہ مین سے کوئی فن نہین چھوڑا، جس مین ان کی چھوٹی یا بڑی تصنیف نہ ہو، ان کے بعض مخترعات اور زیادات بھی ایسے ہین، کہ جس کی وجہ سے وہ اس کے مستحق ہین، کہ اس صدی کے مجدد مانے جائین،

مولانا عبدالحی صاحبؒ (فرنگی محل) التعلیقات السنیۃ ص ۱۱ مین طبقات ابن شہبہ سے ان کے لئے یہ الفاظ نقل کرتے ہین،

هُوَ مُجَدِّدُ الْمِائَةِ التَّاسِعَةِ — یہ نوین صدی کے مجدد ہین

اجتہاد کی نوعیت علامہ سیوطی کے اس دعوی تجدید و اجتہاد مین ایک غلط فہمی یہ ہوئی، کہ لوگون

لہ نسخہ مخطوطہ کیٹلاگ لیڈن نمبر (۴)، ۴۰، (ج ۳ ص ۴۴۴) بحوالہ مقدمہ نظم العقیان۔

نے عموماً یہ سمجھا کہ یہ اجتہاد مطلق کا دعوی کر رہے ہین، اور لوگون کے نزدیک ائمۂ اربعہ کے بعد اجتہاد مطلق کا مدعی لائق تادیب تھا، حالانکہ سیوطی اپنے کو مجتہد مطلق نہین، بلکہ مجتہد منتسب کہا کرتے تھے،

شعرانی طبقات کے ذیل مین سیوطی سے نقل کرتے ہین، کہ لوگون نے میرے متعلق مشہور کر رکھا ہے، کہ میں نے اجتہاد مطلق کا دعوی کیا ہے، حالانکہ یہ غلط ہے، میرا مطلب یہ ہے کہ مین مجتہد منتسب ہون جب مین مرتبۂ ترجیح کو پہونچا، تو افتا مین ترجیح نووی سے باہر نہین نکلا، اور جب مرتبۂ اجتہاد کو پہونچا، تو افتا مین مذہب شافعی سے الگ نہین ہوا،

نواب صدیق حسن خانؒ طبقات کا شعرانی سے نقل کرتے ہیں، کہ مبحث اجتہاد مین سیوطی سے اور علماے عصر سے مناظرہ ہوا، جس مین سیوطی نے بیان کیا، کہ مجتہد کی دو قسمین ہین، ایک تو مجتہد مطلق، یہ درجہ ائمۂ اربعہ پر ختم ہے، دوسرے مجتہد منتسب یعنی وہ مجتہد جو اپنے فتاوی مین امام منتسب کا پیرو ہے، مجتہد کی یہ قسم تا قیامت باقی رہے گی، اور مین اسی اجتہاد کا مدعی ہون،

معاصرین کا اختلاف علامہ سیوطی کے دعوی اجتہاد نے معاصرین کی نگاہ مین ان کو مبغوض بنا دیا، اور علما کی ایک جماعت کو ان سے سخت قسم کا اختلاف ہو گیا، اس جماعت کے سرخیل علامہ سخاوی تھے،

علامہ سخاوی سیوطی کے استاذ تھے، حافظ سیوطی نے نظم و نثر مین علامہ سخاوی کی تعریف و توصیف بھی کی ہے، خود علامہ سخاوی نے بھی سیوطی کو اچھے الفاظ سے یاد کیا ہے، ڈاکٹر فیلپ ہٹی (Dr. Philip K. Hitti) نے نظم العقیان کے مقدمہ مین علامہ سخاوی کی التبر المسبوک ص، ۳۵ سے ذیل کی عبارت نقل کی ہے جس مین حافظ سیوطی کی مدح و ستایش

پوری طرح موجود ہے، اس کتاب مین سخاوی سیوطی کے والد کا ترجمہ لکھتے ہوئے کہتے ہین؛

وھو والد الفاضل جلال الدین عبد الرحمن احد من اکثر من الرد علیّ ومدحنی نظماً ونثراً نفع اللہ بہ،	یہ فاضل جلال الدین عبد الرحمن کے والد ہین، جلال الدین ان لوگون مین سے ہین، جو اکثر میرے پاس آمد و رفت رکھتے ہین، نظم و نثر مین میری تعریف کی ہے، خدا ان کے ذریعہ سے نفع پہنچائے

تعلقات مین یہ یکسانی اور یکرنگی برابر موجود رہی، لیکن حسب روایت مؤرخین حافظ سیوطی کے ذوق ادعا نے اس کا خاتمہ کر دیا،

زاہد کوثری ذیل تذکرۃ الحفاظ ذہبی کے دیباچہ مین لکھتے ہین:

وَمَا ذنب السخاوی الیہ الا قلۃ صبرہ ازاء الدعاوی العریضۃ،	سخاوی کا اس کے سوا اور کوئی گناہ نہ تھا کہ وہ سیوطی کے بلند بانگ دعووں پر ضبط نہ کر سکے!

ان اختلافات مین یہانتک نوبت پہنچی کہ ایک دوسرے کے زبان و قلم سے ایسی باتین نکلین کہ آج بھی ان کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے،

سخاوی الضوء اللامع مین سیوطی کے متعلق حمق اور ہوسی کے لفظ استعمال کرتے ہین؛ انکا ترجمہ ان الفاظ پر ختم کرتے ہین،

"فسبحان واھب العقول"

الضوء اللامع مین جہان جہان موقع ملا، انھون نے سیوطی پر تعریض کی! مثلاً ترجمہ عبد الجبار بن علی الاخطابی (شاگرد سیوطی) مین ہوس، عبد القادر بن حسین المعروف بابن المغربی

کے ترجمہ میں سو، عشرۃ کا الزام لگایا، علی بن محمد بن عیسیٰ الاشمونی کے ترجمہ میں حمق اور ابن النجا ابن خلف المصری کے ترجمہ میں حسد کی نسبت کی،

اسی طرح حافظ سیوطی نے سخاوی کے متعلق جو الفاظ استعمال کئے ہیں، وہ حد درجہ عبرتناک ہیں! نظم العقیان ص ۱۵۲ میں ملتے ہیں،

وَانتقیٰ وَخرّج لنفسہٖ وَلتلمیذہٖ مع کثرۃ لحنہٖ و عریہ من کل علم بحیث انہ لا یحسن من غیر الفن الحدیثی شیئاً اصلاً۔

الکاوی[1] علی السخاوی (نسخہ مخطوطہ بانکی پور) میں لکھتے ہیں:

مَاترکُون فی رجلٍ الف تاریخاً جمع فیہ اکابر واعیاناً لاکل لحومھم خزناً بذکر المساوی تلبساً للاعراض ..... ان سئل عَن مسئلۃ فی الاستنجا لم یحسن الجواب

رسالہ الویۃ النصر فی خصیصی بالقصر (نسخہ مخطوطہ بانکی پور) میں لکھتے ہیں:

وَلیسَ ذلکَ بمستنکر من عامی محض لا یعرف الصحیح من المقصور وَلا المرفوع من المجرور وَلا غیر المعرب من المبنی ..... فان قلبہ اقرب الی المسخ ..... الخ

صاحب النور السافر نے اس سلسلہ میں سیوطی کے دو شعر بھی نقل کئے ہیں،

قل للسخاوی ان تعوذ مشکلۃ علی کبجر من الامواج ملتطم

---

[1] شاعر ادیب ابن العلیف احمد بن حسین کی نے سخاوی کی طرف سے دفاع کی اور دو کتابیں لکھیں، (۱) الشہاب الہاوی علی منشی الکاوی (۲) المنتقد اللوذعی علی المجتہد المدعی،

والحافظ الدیمی[1] غیث الزمان فخذ غرفا من البحر او رشفا من الدیم

یہ اختلافات آخر وقت تک قائم رہے،

خلفاء امراء اور شاہانِ وقت سے تعلقات

حافظ سیوطی کا زمانہ ممالیک چرکسیہ کا زمانہ ہے، ان کا خاندان ہمیشہ دینی یا دنیاوی وجاہت کے لحاظ سے سربلند رہا، اسی لئے شاہانِ وقت سے برابر ربط وضبط رہا، اور یہ تعلق امیر شیخو کے وقت سے شروع ہوتا ہے،

خود حافظ سیوطی کے والد اور خلیفہ مستکفی باللہ ثانی نیز ملک ظاہر جقمق کے تعلقات کا حال شروع میں گذر چکا ہے،

حافظ سیوطی کی پرورش چونکہ شروع ہی سے شاہی ماحول میں ہوئی، اس لئے امراء واعیانِ مملکت سے ان کے تعلقات بھی تھے،

شہاب الدین بن طباخ کے سلسلہ سے امیر برکبیائے چرکسی سے خاصی راہ ورسم تھی، اینال الاشقر سے بھی خاص تعلق تھا، اینال الاشقر ملک خشقدم (۸۷۲ھ) کے زمانہ میں ملطیہ طرابلس اور حلب کا نائب رہا، پھر ملک اشرف قایتبائے (۹۰۱ھ) کے زمانہ میں راس نوبۃ النوب[2] کے مرتبہ کو پہونچا، علامہ سیوطی کو اینال الاشقر ہی نے شیخونیہ میں تدریس حدیث کے لئے مقرر کیا تھا،

خلفاء میں متوکل علی اللہ ثانی سے زائد تعلق تھا اسکی وجہ غالباً یہ ہے کہ متوکل علم دوست نیز سیوطی کے والد کا شاگرد تھا، جیسا کہ تاریخ الخلفاء میں مذکور ہے، متوکل ہی نے سیوطی کو

---

[1] دیمی الفخر عثمان المحدث اسماء الرجال کے ماہر تھے، ان کے اور سخاوی کے درمیان کسی قدر رنجش تھی،

[2] راس نوبہ تاتاریوں کا ایک عظیم الشان عہدہ تھا، مصریوں نے اس کو راس نوبۃ الامراء کہا اس کا

قاضی القضاۃ کا منصب عطا کیا تھا، سیوطی حسن المحاضرہ مین متوکل کا ذکر بہت محبت سے کرتے ہین اسکے حق مین دعا کرتے ہین، اور کہتے ہین، کہ مین نے ان کے لئے دو کتابین لکھی ہین،

(۱) الاساس فی فضل بنی العباس،

(۲) رفع الباس عن بنی العباس،

دوسرے امراے وقت خود زیارت کے لئے حاضر خدمت ہوتے، سلطان ملک اشرف قانصوہ غوری (سنہ ۹۲۲ھ) جو ایک متقی اور پرہیزگار بادشاہ تھا، سیوطی کا معتقد تھا ان کی خدمت مین تحفے بھیجتا تھا۔

ممالیک چرکسیہ اور خلفا رمین جو اندرونی کشمکش تھی اور اس زمانہ کے جو سیاسی انقلابات تھے، ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ علامہ سیوطی کو اُن سے کوئی تعلق نہ تھا،

گوشہ نشینی | ابن عماد حنبلی شذرات الذہب ج ۸ ص ۵۳ مین کہتے ہین، کہ حافظ سیوطی نے چالیس سال کی عمر سے گوشہ نشینی اختیار کر لی، درس و افتا ترک کر دیا اور ایک کتاب "التنفیس" لکھی جس مین اپنی معذوریون کو ظاہر کیا،

لیکن ہم کو چالیس سال کی عمر سے گوشہ نشینی کے تسلیم کرنے مین اس لئے تامل ہے کہ سیوطی تاریخ پیدایش کے لحاظ سے غالباً سنہ ۸۵۹ھ مین چالیس سال کے ہو جاتے ہین، اور سنہ ۸۹۱ھ مین ہیئت سیہ کی ایک ممتاز جگہ پاتے ہین، سنہ ۹۰۲ھ مین قاضی القضاۃ بنتے ہین، اور سنہ ۹۰۶ھ مین ہیئت سیہ سے الگ ہوتے ہین، اس لئے قرین قیاس یہ ہے، کہ ان کی عزلت و گوشہ نشینی کا زمانہ سنہ ۹۰۶ھ کے بعد سے شروع ہوتا ہے جس وقت ان کی عمر غالباً پچپن چھپن برس کی رہی ہوگی،

(بقیہ حاشیہ ص ۲۷۸) مفہوم یہ ہے کہ امرا مین سب سے بلند مرتبہ والا، (حسن المحاضرہ جلد ۲ ص ۸۵)

گوشہ نشینی سے وفات تک کا پورا زمانہ روضۃ المقیاس مین گذرا،

روضۃ المقیاس | مقریزی کا بیان ہے کہ جس کو آج کل روضہ کہتے ہین، وہ درحقیقت مصر اور جیزہ کے درمیان ایک جزیرہ کا نام ہے، شروع اسلام مین یہ جزیرہ مصر پھر جزیرہ حصن کے نام سے مشہور ہوا، افضل بن امیر الجیوش کے وقت سے روضہ نام پڑ گیا، جو اب تک مشہور ہے،

سیوطی حسن المحاضرہ مین کہتے ہین، کہ ولید کے عہد خلافت مین اسامہ بن زید التنوخی نے روضہ مین نیل کے لئے ایک مقیاس بنایا تھا،

غالبًا اسی وجہ سے اس کو روضۃ المقیاس کہتے ہین،

بہرحال اسی روضۃ المقیاس مین سیوطی دنیا سے رشتہ توڑ کر حق سے رشتہ جوڑنے مین مشغول ہوئے، مخلوق سے اس طرح منہ موڑا، کہ گویا کسی سے تعارف ہی نہین ہے شاہی دربار سے طلبی آتی، انکار کر دیتے، امرا نذرین پیش کرتے، وہ قبول نہ کرتے،

عزلت و گوشہ نشینی کی انتہا کا اندازہ ذیل کے واقعہ سے ہوگا،

صاحب نور السافر قسطلانی (جن کی حافظ سیوطی کے ساتھ شکر رنجی کا حال گذر چکا ہے) کے ترجمے مین لکھتے ہین، کہ جب قسطلانی اپنی صفائی کے لئے سیوطی کے پاس آئے، تو یہ روضۃ المقیاس مین گوشہ نشین تھے، قسطلانی نے گھر پہونچ کر دروازہ کھٹکھٹایا، سیوطی نے پوچھا کون ہے، انھون نے کہا کہ مین قسطلانی ہون، اس لئے حاضر ہوا ہون، کہ آپ کا دل مجھ سے صاف ہو جائے، سیوطی نے اندر ہی سے کہہ دیا کہ میرا قلب صاف ہے، نہ دروازہ کھولا اور نہ سامنے آئے،

گوشہ نشینی کے زمانہ مین تصنیفی کام البتہ جاری رہا،

وفات و تدفین | شب جمعہ ۱۹ جمادی الاول ۹۱۱ھ (۱۸ اکتوبر ۱۵۰۵ء) کو ایک ہفتہ کی علالت کے بعد انتقال ہوا، علالت کچھ زیادہ نہ تھی، بائین بازو مین سخت قسم کا ورم ہوگیا تھا، انتقال کے وقت ۶۱ سال دس ماہ اٹھارہ یوم کی عمر تھی،

باب قرافہ سے باہر حوش قوصون مین دفن ہوئے، حوش قوصون زاہر کوثری کی تحقیق مین قلعہ کے نیچے ہے، لیکن علامہ احمد تیمور پاشا جنھون نے "قبر الامام السیوطی" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، ان کے نزدیک حوش قوصون جامع کبیر کے پاس ہے،

ان کا بیان[1] ہے کہ بڑی تلاش و جستجو کے بعد امام سیوطی کی قبر کو مین نے پایا، یہ زمین سے اونچا عظیم الشان قبہ ہے جو زینہ کے ذریعہ سے اوپر جایا جاسکتا ہے، علامہ سیوطی کی قبر کے سوا اس قبہ کی تمام قبرین مٹ گئی ہین، اس جوار کے لوگ سیوطی کی قبر کی زیارت کیلئے آتے ہین، اس پر نذرین چڑھاتے ہین، اور "سیدی جلال" کے نام سے پکارتے ہین،

عام زندگی | علامہ سیوطی کی عام زندگی کے متعلق باوجود تلاش کے ہم کو کوئی خاص بات معلوم نہ ہوسکی! دوست احباب اور اہل و عیال تھے یا نہین؟ اگر تھے تو ان کے ساتھ کیا برتاؤ تھا؟ عادات اور معاملات مین کیا حال تھا؟ الغرض اس قسم کی تمام باتون سے ہمارے سوانح نگار خاموش ہین،

اتنا ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ مزاج مین کسی قدر ترفع تھا، ورنہ یہ جملہ زبان سے نہ نکلتا کہ ابن ظہیرہ میری نگاہون مین میرے والد کا وہی آدمی ہے، جو بچپن مین مجھکو اپنے کندھے پر بٹھائے گھومتا تھا"

اور اگر سیوطی کے بارے مین سخاوی کی روایت تسلیم کیجائے تو یہ امر بھی حیرت انگیز ہے

---

[1] کتوب احمد تیمور پاشا بنام [illegible] از مقدمہ نظم العقیان،

کہ ان کی والدہ کو ان کے ترفع کی شکایت تھی، اسی طرح محیوی بن مغیزل جو ان کے شاگرد اور بڑے مداح تھے ان کی بعض مزاجی کمزوریوں کی بنا پر بعد کو ان کے مخالف ہو گئے،

ان امور کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی پیش نظر رہے کہ سیوطی ایک صاحب کرامات بزرگ بھی تھے، شذرات الذہب میں ان کی بعض کرامتیں اور سچی پیشینگوئیاں بھی مذکور ہیں،

اور حق تو یہ ہے کہ علامہ سیوطی نے اپنی تصانیف کے ذریعہ سلف کا جو ذخیرہ ہم تک پہونچایا ہے، یہی ان کی سب سے بڑی کرامت ہے، اور یہ ان کا اس قدر عظیم الشان احسان ہے، کہ جس کے لئے ہم کو بہر حال ان کا ممنون رہنا پڑیگا غفر اللہ تعالیٰ۔

لہ اس مضمون کا ماخذ کتب ذیل ہیں، مضمون میں ہر جگہ حوالہ نہیں دیا گیا ہے،

(۱) حسن المحاضرہ سیوطی (۲) بغیۃ الوعاۃ سیوطی (۳) نظم العقیان سیوطی (۴) تاریخ الخلفاء سیوطی (۵) الضوء اللامع سخاوی (۶) البدر الطالع شوکانی (۷) شذرات الذہب ابن عماد حنبلی (۸) النور السافر عیدروسی (۹) ذیل طبقات الحفاظ ذہبی (۱۰) خطط مقریزی (۱۱) معجم البلدان (۱۲) انساب السمعانی (۱۳) کشف الظنون (۱۴) اتحاف النبلا (۱۵) معجم المطبوعات العربیہ والمعربہ (۱۶) الکاوی علی السخاوی سیوطی (نسخہ مخطوطہ بانکی پور) (۱۷) الدرۃ النضرۃ فی خصیصی بالعصر سیوطی (نسخہ مخطوطہ بانکی پور) (۱۸) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (۱۹) خلافت اور ہندوستان از مولانا سید سلیمان ندوی (۲۰) تفسیر کبیر (۲۱) مقالات شبلی (تعلیمی) (۲۲) مرقاۃ ملا علی قاری (۲۳) التعلیقات السنیۃ مولانا عبد الحی فرنگی محلی،

مقالاتِ شبلی جلد پنجم

یہ مولانا شبلی کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو اکابر اسلام کے سوانح و حالات سے متعلق ہیں، ان میں علامہ ابن تیمیہ، ابن رشد اور زیب النسا کی سوانحعمری وغیرہ جیسے اہم اور مفید مضامین ہیں، ضخامت ۱۴۰ صفحے، قیمت ۴ منیجر

محسن کاکوروی

اور

ان کی خصوصیات

جناب محمد ابواللیث صاحب صدیقی بدایونی ایم اے لکچرار اردو یونیورسٹی علیگڈھ

(۲)

جدت پسند اور مضمون آفرین شاعروں کو اپنے ذوق کی تکمیل کے لئے مبالغہ سے کام لینا پڑتا ہے، اکثر عام شاعر بھی اپنی دوکان سجاتے وقت اس سے فائدہ اٹھاتا ہے، مبالغہ کو شاعری میں اس درجہ دخل ہے، کہ ان دونوں کو ایک دوسرے کے مترادف سمجھا جانے لگا، شاعر تخیل کی بلند پروازی میں اکثر دنیا کی حقیقتوں سے بہت دور نکل جاتا ہے لیکن محسن ایسا نہیں کر سکتے تھے، جہاں تک تعریف و توصیف کا تعلق ہے، ان کے ممدوح یعنی رسول اللہ صلعم کی ذاتِ پاک اتنے اوصافِ حمیدہ کی جامع ہے، کہ ان کے بیان میں مبالغہ کی ضرورت ہی نہیں، دوسرے انھوں نے حدیث اور قرآن کی روشنی کو ہمیشہ اپنے لئے شمعِ ہدایت بنایا ہے، بعض نعت گو شاعر محبت کے جوش میں اکثر ایسی باتیں کہہ گئے ہیں، جو مذہبی نقطۂ نظر سے ناروا ہیں، ان کا عذر یہ ہے کہ جوشِ محبت اور والہانہ شیفتگی کے عالم میں یہ سب کچھ کہا ہے، اس لئے وہ لائقِ معافی ہیں، لیکن محسن کو اس عذر اور معافی کی ضرورت نہیں پڑتی، ہمارے یہاں میلاد النبیؐ کے سلسلہ میں جو مجالس منعقد ہوتی ہیں، ان میں نعت گو شعرا

کا کلام ہمیشہ پڑھا جاتا ہے اور ایسے ایسے اشعار پر لوگ وجد کرنے لگتے ہین :-

اللہ کے پتے ہیں وحدت کے سوا کیا ہے ۔ لینا ہی ہمین جو کچھ لے لین گے محمد سے

اس قسم کے اشعار مین شعراء نے حفظِ مراتب کو نظرانداز کر دیا ہے، اور بعض طبائع ایسی زیادتیون کو کسی عنوان گوارا نہ کرین گی، محسن کے یہان والہانہ عشق اور محبت کے باوجود ایسی لغزشین تلاش کرنے پر بھی نہین ملین گی، اپنے کلام مین انھون نے جابجا قرآن اور حدیث کے ان مقامات کی طرف اشارہ کیا ہے، جہان سے ان کا مضمون ماخوذ ہے ایک مثال سے یہ واضح ہو جائے گا،

مثنوی چراغِ کعبہ مین معراج کے سلسلہ سے حضرت جبریلؑ کی آمد کا ذکر کیا ہے، چونکہ کسی حدیث مین اس کی تصریح نہیں کہ حضرت جبریلؑ نے حاضر ہو کر کیا عرض کیا تھا، اسلئے فرماتے ہین :

آنا ہے طلب کا استعارہ ۔ بردن کا ہے آمدن اشارہ

اور حاشیہ مین اسکی صراحت کر دی گئی ہے،

براق کی صفت مین ایک مصرعہ ہے ع

چھوٹا سا فرس فرشتہ جبکل

حدیث شریف مین بھی مذکور ہے کہ براق چھوٹے فرس کے برابر تھا، فلکِ اول کی سیر کے سلسلہ مین ایک شعر ہے،

وہ روز ازل کا سعد اکبر ۔ وہ اول ماخلق کا مظہر

اسمین اشارہ ہے حدیث شریف کی طرف "اوّلُ مَاخلق اللہ نوری"،

فلک ششم کی سیر مین ایک شعر ہے،

تھا داغِ فراق لَنْ تَرَانِیْ مسرورِ وصال مَنْ رَأَنِی

اشارہ ہے اس حدیث شریف کی طرف مَنْ رَأَنِی فَقَدْ رَأَی الحق"۔

فلک ہفتم کے سلسلہ مین حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ایک شعر ہے،

کرتا تھا جو صرف میہمانی خوانِ یغمائے من عصانی

اس مین اشارہ ہے حضرت ابراہیمؑ کی دعا وَمَنْ عَصَانِی فَاِنَّکَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ کی طرف،

مقام اعلیٰ کے بیان مین ایک شعر ہے،

آنکھون کی تلاش جلوۂ رب کانون مین صدائے نحن اقرب

اس مین کلام مجید کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے نَحْنُ اَقْرَبُ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ مثنوی شفاعت و نجات مین بکثرت آیات کی طرف اشارے ہین،

ان چیزون سے محسن کی مذہبیت کا پتہ چلتا ہے، قرآن اور حدیث پر ان کی نظر تھی، اس لئے حالات و واقعات کے بیان مین ان کا مضمون کبھی ان کے حدود سے باہر نہین نکلتا تھا، لیکن اسی کے ساتھ فن شاعری کو ایسے کمالات کا اظہار کرتے تھے، کہ ان پابندیون کے باوجود کلام مین زور اور تاثیر پیدا کر لیتے تھے، شاعری اور وعظ مین یہی فرق ہے، وعظ کی خشکی سے سامعین گھبرا اٹھتے ہین، لیکن جب شعر کا ساز بجنے لگے، اور اس کے پردون سے وہی راگ نکلے، جو پہلے واعظ کی زبان سے ادا ہو رہا تھا، تو سننے والے مسحور ہو جاتے ہین، انھون نے اپنے کلام مین شاعری اور مذہب کے امتزاج کا ایسا مرقع پیش کیا ہے، کہ اس مادیت اور الحاد کے دور مین بھی جس کی جاذبیت اور کشش باقی ہے،

مضمون کے اعتبار سے محسن کے کلام کی ایک خاص خوبی کا ذکر کرنا باقی رہ گیا، یہ انکی تہذیب اور متانت ہے، لکھنو کی مخصوص انداز کی شاعری کی بدولت وہان کا پورا دبستانِ شعر

آج تک مطعون ہے، یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ اپنے نامور سخنورون کی فہرست مین پہلے ان شعرا کا نام رکھتا ہے، جن کا کلام اس دبستان کے دوسرے شعرا کے مقابلہ مین کہین زیادہ ستھرا اور پاکیزہ ہے، لیکن معلوم نہیں اس موقع پر محسن کا نام کیون نظر انداز کر دیا جاتا ہے، حالانکہ تہذیب و متانت کے اعتبار سے محسن کی شاعری اپنی آپ نظیر ہے، اور مضمون، زبان، تشبیہات اور استعارات ہر اعتبار سے اسکی ثقاہت اور تطہیر مسلّم ہے،

انیس اور دبیر نے مرثیہ گوئی کے فن مین مجدد کا درجہ حاصل کیا، اور مرثیہ گوئی کو بڑا فروغ بخشا، فصاحت اور بلاغت کے بڑے بڑے معرکے سر کئے، لیکن فن کاری کے اعتبار سے یہ بات دل مین کھٹکتی ہے کہ مرثیون مین جہان کہین عرب کے مردون عورتون اور ان کے حالات و واقعات کا ذکر کیا گیا ہے، وہان خالص لکھنوی تہذیب و معاشرت کا چربہ اتارا ہے، بہت سی وہ رسمین جو بیشتر ہندوستانی بلکہ بعض خالص ہندوانی ہین عربون کے کردار مین شامل کر دی گئی ہین، جس سے کردار نگاری مین جگہ جگہ جھول پیدا ہو گیا ہے، اور تاثیر کی فضا، کم ہو گئی ہے، لیکن محسن خالص ہندوستانی فضا کے شاعر ہین، اور اپنے ماحول کی ترجمانی کرتے ہین، ان کے خیالات، ان کی زبان، ان کی تشبیہات اور استعارات اسی ملک کی پیداوار ہین، اسی لئے ان مین اثر بھی زیادہ ہے،

مضمون کی بلندی اور فکر کی پرواز کے اعتبار سے بھی محسن کا کلام نادر ہے، قصیدہ مدیح خیر المرسلین، مثنوی تجلی کعبہ اور چراغ کعبہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ مضمون کی بلندی الفاظ کے شکوہ سے ہم پہلو و ہم آہنگ ہے، الفاظ کا حسن انتخاب قادر الکلامی کی دلیل ہے، مضمون کی مناسبت سے الفاظ کا صحیح استعمال اچھے شعر کے لئے ضروری شرط ہے، مثنوی چراغ کعبہ مین واقعۂ معراج کو نظم کیا ہے، یہ واقعہ چونکہ شب مین پیش آیا،

اس لئے تمہید میں مضمون اور الفاظ کی ہم آہنگی سے رات کے مناسب ماحول اور فضا کا پورا لحاظ رکھا ہے،

ہے نام خدا سوادِ تحریر — واللیل اذا یغشیٰ کی تفسیر

آغاز روایت میں لکھتے ہیں :-

بھیگی ہوئی رات آبرو سے — داخل ہوئی کعبہ میں وضو سے
اوڑھے ہوئے لیلیٰ گل اندام — شبنم کی ردا بقصدِ احرام
گویا کہ نہا کے آئی فی الحال — جھک جھک کے نچوڑتی ہوئی بال
کیا سعیِ صفا سے رنگ فق ہے — سر سے پا تک عرق عرق ہے
نامحرموں سے چھپائے چہرہ — پروین کو بنائے منہ کا سہرا
آنا کھلتا ہوا نہ جانا — اندازِ خرامِ صوفیانہ
سناٹے کا دم انیس و ہمدم — انفاسِ ہوا رفیق و محرم
خوشبو وہ کہ ہار یاسمن کے — لپٹے ہوئے بالوں میں ٹھن کے
یا تازہ بسی ہوئی ختن کی — کلیاں یوسف کے پیرہن کی
ناخن کی جگہ ہلال کی مد — دفتر سے طلوع کے ندارد
گرتے ہوئے ٹوٹ کر ستارے — ہیں رمیِ جمار کے اشارے

چونکہ یہ مثنوی ہے اسلئے زبان نہایت سادہ سلیس اور بامحاورہ استعمال کی ہے جس میں روزمرہ کا لطف آجاتا ہے،

محسن کے کلام میں فنی حیثیت | انیسویں صدی میں "صنعت" کو فطرت پر ترجیح دینے کا عام رواج تھا، یہی زمانہ محسن کاکوروی کو ملا، اس عہد کے لکھنؤ میں زندگی کے ہر شعبہ میں کمال صنعت

کی داد دی جا رہی تھی، نثر اور نظم دونوں کو تکلفات سے آراستہ کیا جا رہا تھا، یہی سبب ہے کہ لکھنؤ کی شاعری لفظی صناعی اور صنعت گری کا نمونہ بن گئی، اس سے تاثیر جو شعر کا مقصد اصلی ہے، کم ہو گئی، لیکن اس میں شبہہ نہیں کہ اس کا ظاہری لباس ایسا دیدہ زیب ہو گیا جو اس سے پہلے شاعری کو نصیب نہیں ہوا تھا،

محسن نے اپنی شاعری میں اپنے ماحول کی ترجمانی کرتے ہوئے لفظی صناعی پر بھی توجہ کی ہے، اور اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ ان کے کلام کی ظاہری خوبی اسی کوشش کی مرہون منت ہے، لیکن اس موقع پر بھی محسن نے اپنی انفرادیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے، اور ان کا قدم اعتدال کے راستہ سے نہیں ہٹا ہے،

اسی صنعت گری کے شوق میں شعرائے لکھنؤ نے رعایت لفظی کی طرف توجہ کی اس فن کے امام آغا حسن امانت ہوئے، اس دبستان کے دوسرے شعراء نے اس میں اس قدر مبالغہ کیا کہ بالعموم اسی کو شعر کا مقصد بنا لیا جس سے ان کا کلام بے مزہ ہو گیا، لیکن محسن نے صنعت گری میں بھی شاعرانہ لطافت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا چنانچہ ان کی رعایتیں بے ساختہ ان کی تشبیہات اور استعارات جاندار اور ان کا عام انداز شاعرانہ ہے، پورا کلام پڑھ جائیے ان تکلفات کی وجہ سے کوئی الجھن پیدا نہیں ہوتی، قصہ طلب تلمیحات بھی ہیں، اور بکثرت ہیں، لیکن بندش کی چستی اور نظم کی روانی ایسی ہے کہ طبیعت اس پر رک کر نہیں رہ جاتی اس اعتبار سے ان کا کلام اگر ایک طرف تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے جاذبیت رکھتا ہے، تو دوسری طرف عوام بھی اس کی خوبیوں پر سر دھنتے ہیں،

ان کے فن میں سب سے زیادہ نمایاں عنصر تلمیحات کا ہے، تلمیح یہ ہے کہ شعر میں تاثیر پیدا کرنے کے لئے نہایت مختصر الفاظ میں کسی مشہور و معروف واقعہ کی طرف اشارہ کر دیا جائے

چند مثالون سے اسکی وضاحت ہو جائیگی، سراپاے رسول اکرمؐ کا ایک شعر ہے،

شعلۂ طور کا کاغذ پہ کھینچی ہے نقشہ خاکہ انگارہ کف دست ید بیضا کا

اسمیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے، جب فرعون نے آپ کے بچپن مین آپ کے سامنے اشرفیان اور آگ رکھدی، حضرت موسیٰؑ نے انگارہ ہاتھ مین لے لیا، اور آپ کا ہاتھ جل گیا جو بعد مین ید بیضا ہو گیا،

اسی کا ایک اور شعر ہے،

خواب مین بھی جو وہ زہرہ جبیں پیش آئے مشتری طالع کنعان کی زحل ہو جائے

مثنوی صبح تجلی مین سے چند شعر یہ ہین:

آنکھین نظارے کی طلب گار نظارہ کا بخت خفتہ بیدار

منظور ہے حسن کا تماشہ، ہر دیدہ ہے دیدۂ زلیخا

ہے شرق سے غرب تک پریشان نور عینین پیر کنعان،

وہ سورۂ یوسف تجلی یہ مطلع مصر کی عزیزی،

اس مین حضرت یوسفؑ زلیخا اور حضرت یعقوبؑ کے واقعات کی طرف اشارہ ہے مثنوی چراغ کعبہ مین بکثرت تلمیحات ہین،

یونس سرحوت تک پہنچکر سکہ نہ بٹھائین ہر درم پر

مین ایک تلمیح اور ایک رعایت ہے، یونس علیہ السلام کو ایک مچھلی نگل گئی تھی اور حوت فلک کے بارہوین برج کا نام ہے، جس کی صورت مچھلی کی سی ہے، ایک اور شعر ہے،

آیا جو کرم پہ عشق بے باک سینہ کیا شق جگر کیا چاک

اسمیں واقعہ شق صدر کی طرف اشارہ ہے،

دو شعر اور ہین،

ازراہِ کمالِ مہربانی اس گھر سے ہوئی یہ میہمانی

رکھکر مے و شیر کو مقابل اس صاحبِ ذوق کا لیا دل

اس مین اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے، کہ حضرت جبریلؑ نے آنحضرت صلعم کے سامنے دو پیالے پیش کئے، ایک مین دودھ اور دوسرے مین شراب تھی، آپنے دودھ کے پیالے کو لیا اور شراب سے انکار کردیا،

فلکِ چہارم پر حضرت ادریسؑ سے ملاقات ہوئی کہا جاتا ہو کہ سب سے اول حضرت ادریسؑ نے قلم سے لکھنا ایجاد کیا تھا، اس کا اظہار فلکِ چہارم کی سیر کی تمہید مین اس طرح کیا ہے،

پھر وہ خطِ عفو و اہلِ عصیان فرزانہ شفیع پیشِ یزدان

فلکِ ہفتم کی سیر مین ایک شعر ہے،

کعبے کا سواد صفحۂ عین شنگرفی نسخۂ ذبیحین،

اس مین اشارہ ہے اس حدیث شریف کی طرف "انا ابن الذبیحین" یعنی مین بیٹا دو ذبیحون کا ہون، ایک ذبیح حضرت اسماعیل علیہ السلام اور دوسرے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے والد حضرت عبد اللہ، مثنوی شفاعت و نجات مین بھی ایسی بکثرت مثالین موجود ہین،

تلمیحات کے علاوہ ایک اور عنصر جو محسن کی خصوصیت مین شمار ہونے کے لائق ہے، انکی تشبیہات ہین، تشبیہ شعر کی جان ہے، جس طرح جسم بغیر روح کے مردہ ہے، اسی طرح شعر بغیر تشبیہ کے مکمل نہین، اس اعتبار سے محسن کی صرف ایک مثنوی صبحِ تجلی ان کو زندۂ جاوید کرنے

کے لئے کائی ہے، اتنی لطیف اور رقصان تشبیہات کہین اور مشکل سے ہی ملتی ہین،

سبزہ ہے کنارِ آب جو پر — یا خضر ہے مستعد وضو پر
نوبت ہو صداے قربان کی — تیاری ہو باغ مین اذان کی
محو تکبیر فاختہ ہے — قد قامتِ سرو دلربا ہے
اک شاخ رکوع مین رکی ہو — اور دوسری سجدہ مین جھکی ہو
سوسن کی زبان پر مناجات — جاری لبِ جو سے التحیات

تشبیہات کی یہ ندرت اور تسلسل محسن کا خاص حصہ ہے، چند مثالین اور ہدیۂ ناظرین ہین،

غنچے مین ہو خامشی کا عالم — یا صومِ سکوت مین ہے مریم

غنچۂ ناشگفتہ کو مریم کہنا اور اوسکی خاموشی سے مریم کے "صومِ سکوت" کا خیال پیدا کرنا تشبیہ کو بالکل مکمل کر دیتا ہے، جس سے پاکیزگی اور تقدس کی وہ فضا اور بڑھ جاتی ہے، جو جو صبح تجلی یعنی صبح ولادتِ رسول اللہ صلعم کے مناسب حال ہے، پھر اس سلسلہ کو یون جاری رکھا ہے،

کیاری ہر ایک اعتکاف مین ہو — اور آبِ روان طواف مین ہے

. . . . . .

سالک ہے چمن مین نہر موزون — مجذوب ہے شاخ بید مجنون
ہے صوفی صاف دل صنوبر — تحریک نسیم حالت آور

. . . . . .

ہے استغراق نیلوفر کو — یاس انفاس ہے سحر کو،

. . . . . .

خلوت گہہ حسن ہے زمانہ — اور جلوۂ صبح شاہدانہ
ڈوبی ہوئی رنگ میں چمن کے — نکھری ہوئی روپ میں دلھن کے
ہے چاندنی ایک ماہ پیکر — سورج کبھی آفتاب انور،

ہمارے خیال میں کسی دوسرے شاعر کی کسی ایک نظم میں اس قدر کثرت سے اور اتنی رقصاں تشبیہات مشکل سے نکل سکیں گی، قصیدہ مدیح خیر المرسلین میں بھی یہی شان جلوہ گر ہے،

جوگی بھیس کئے چرخ لگائی ہے بھبوت — یا کہ بیراگی ہے پربت پہ بچھائے کمل
لہرین لیتا ہے جو بجلی کے مقابل سبزہ — چرخ پر بادلا پھیلا ہے زمین پر مخمل
جس طرف دیکھئے بیلے کی کھلی ہیں کلیاں — لوگ کہتے ہیں کہ کرتے ہیں فرنگی کونسل
چرخ پر بجلی کی چل پھر سے نظر آتی ہے — سبزہ چمکائے ہلاتا ہوا برچھا بادل

یہ تشبیہیں شاعر کے اسلوب فکر، جدت اظہار اور مذاق شاعرانہ پر دلیل ہیں کیونکہ فطری اور سریع الفہم ہیں، اور ان میں جدت و تازگی کی وہ شان ہے جو محسن کی خصوصیت ہے، اسے بھی محسن کا مخصوص امتیاز سمجھنا چاہئے، کہ ان کی مثنویوں میں بھی قصیدے کا لطف آجاتا ہے، مثنوی صبح تجلی، چراغ کعبہ وغیرہ اس کی اچھی مثالیں ہیں، چراغ کعبہ کی تمہید میں بالکل تشبیب کی شان پیدا ہے،

ہے نام خدا سواد تحریر — واللیل اذا سجی کی تفسیر،
دریائے رواں ہے درنظم آج — یہ بحر خفیف بحر مواج،
جاتا ہے کلیم آسمان تک — معراج سخن ہے لامکان تک
خلوت گہہ دل ارم سرشتہ — پرواز طبیعت ایک فرشتہ
ہر گوہر قلزم تکلم — سیارۂ آسمان مفہم

بلند آہنگی کا یہ سلسلہ پوری نظم میں جاری و ساری ہے، یہ صحیح ہے کہ فارسی مثنویوں میں مثنوی کے مضمون کی قید نہیں، لیکن اس کا انداز بیان اور زبان مخصوص ہے، اردو میں مثنوی کو شعراء نے بالعموم عشقیہ اور بعض نے اخلاقی مثنویوں پر بھی طبع آزمائی کی ہے، لیکن محسن نے اسے اپنے فن سے نئی اور لازوال دولت بخشی، مضمون اور زبان دونوں کے اعتبار سے محسن کی مثنویاں ہماری شاعری میں بیش بہا اضافے ہیں،

قصیدے میں بھی محسن کسی باکمال سے پیچھے نہیں رہے، قصیدہ گوئی کا کمال تشبیب، گریز اور خاتمے سے پرکھا جاتا ہے، ان ہی تین چیزوں کے بل پر سودا نے قصیدہ گوئی کے فن میں امامت کا درجہ حاصل کیا، اس میں محسن کے کمال کے اظہار کے لئے چند مثالیں کافی ہیں، قصیدہ مدح خیر المرسلین کی تشبیب،

سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل — برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

محسن کی قادر الکلامی کی بین دلیل ہے،

گریز کے لئے بیساختہ ہونا ضروری ہے، دیکھئے محسن کس استادانہ کمال کے ساتھ مدح پر آئے ہیں،

ہاں یہ سچ ہے کہ طبیعت نے اڑایا جو غبار — ہوئی آئینہ مضمون کی دوچند ان صیقل

روئے معنی ہے بھکنے میں بھی اعلیٰ کی طرف — تاکتا ہے تو ثریا کی سنہری بوتل

اک ذرا دیکھئے کیفیتِ معراجِ سخن — ہاتھ میں جامِ زحل شیشۂ خورشید بغل

گرتے پڑتے ہوئے مستانہ کہاں رکھا پاؤں — کہ تصور بھی وہاں جا نہ سکے سر کے بھل

یعنی اس نور کے میداں میں پہنچا کہ جہاں — خرمنِ برق تجلی کا لقب ہے بادل

تار بادانِ مسلسل ہے ملائک کا ورود — پئے تسبیح خداوند جہان عز و جل

کہین طوبیٰ کہیں کوثر کہین فردوس بریں | کہین بہتی ہوئی نہرین نہرلبن و نہر عسل
باغ تزیہ مین سرسبز نہال تشبیہ | انبیا جسکی ہین شاخین عرفا کونپل
گل خوش رنگ رسول مدنی عربی | زیب دامان ابد طرۂ دستار ازل

خاتمہ میں کہتے ہین،

محسن اب کیجئے گلزار مناجات کی سیر | کہ اجابت کا چلا آتا ہے گھر تا بادل
سب سے اعلیٰ تری سرکار ہے سب سے افضل | میرا ایمان مفصل کا یہی ہے مجمل،

اسکے بعد مناجات کے نہایت پر تاثیر اشعار ہین،

محسن کا بقیہ کلام | نعتیہ کلام کے علاوہ محسن کے سرمایہ مین چند غزلین، ایک ناتمام عشقیہ مثنوی نگارستان الفت، ایک مثنوی خفتان محسن ایک قصیدہ واجد علی شاہ کی تعریف مین چترشہنشاہی کے نام سے اور چند قطعات تاریخ اور ہین لیکن شاعری کے لحاظ سے ان کا درجہ کچھ بہت اونچا نہین، یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان کا تخیل صرف نعت کی مقدس فضا مین بلند پروازی دکھاتا ہے، چنانچہ ان کی غزلین لکھنؤ کی عام شاعری کا نمونہ ہین، ان مین شاعر کی جدت، ذہانت اور طباعی کا کوئی غیر معمولی کمال نظر نہین آتا، اور بالعموم رعایت لفظی اور صنائع و بدائع کو دخل دیا گیا ہے، ایسا شاید اس وجہ سے ہو کہ یہ ابتدائی عمر کا کلام ہے، اور اس زمانہ مین چونکہ یہی روش عام تھی، اس لئے محسن نے بھی پہلا قدم اسی کی طرف اٹھایا، لیکن آخر مین تائید الٰہی اور طبیعت کی رسائی و تازگی سے اپنی راہ الگ نکال لی، غزلون کا اندازہ ذیل کے انتخاب سے ہوسکتا ہے، پہلی غزل ہے،

ہے عیان جلوہ بتون مین بھی خدا کے نور کا | زاہد آنکھون مین لگائے سرمہ خاک طور کا
سر جھکا ئے ہم ہین وہ تلوار کو کھینچے ہوئے | یہ نیاز عاجزانہ وہ ناز ہے مغرور کا

مغبچون کی کتنی خاطر کی خدا نے حشر میں
جرم ٹھہرا ٹوٹ جانا شیشۂ انگور کا

جب اٹھائیں اسقدر دورِ فلک کی سختیاں
حوصلہ پتھر ہو محسن دل سے چکنا چور کا

بعض اور اشعار ملاحظہ ہوں،

آنکھ پر ٹھہری نظر مائلِ ابرو ہو کر
ہم پھرے کعبہ سوائے قبلہ تو ہندو ہو کر

شب کا یہ جذبِ محبت کا تماشا دیکھا
شمع پروانے کے سا تھ اڑ گئی جگنو ہو کر

مبارک و کشوکس دھوم سی شورش ہی یاں تھی
خدا حافظ ہی توبہ کا صراحی بے طرح چھلکی

خدا نے تل کیا پیدا لبِ رنگین جاناں پر
تو گویا تیل چھڑکا آتشِ لعلِ بدخشاں پر

صاحب غیر دن سو جی خفا ہے
اور کیا مجھ سے آپ کو گلہ ہے،

فرہاد نہ پوچھ سختیِ ہجر
دن آج پہاڑ سا کٹا ہے

دامن سے وہ پونچھتا ہے آنسو
رونے کا کچھ آج ہی مزہ ہے

ان کو کبھی خیال ہو میرا یہ وہم ہے
جاگیں مرے نصیب یہ باتیں ہیں خواب کی

ہونے نہ پائی خشک بھی تر دامنی مری
محشر میں دھوپ ڈھلنے لگی آفتاب کی

رباعیات البتہ زوردار ہیں، بعض پر انیس کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے،

مولا کی نوازشِ نہاں کھلتی ہے
عزت مری پیش قدسیاں کھلتی ہے

کہدو کہ ملائک گوش برآواز رہیں
مداحِ پیمبر کی زباں کھلتی ہے،

اک شانِ خدا ہے سید عالی جاہ
ملکِ قدم و حدوث کا شاہنشاہ

جس دل پہ کھلی اس کی حقیقت محسن
بیساختہ بول اٹھا کہ اللہ اللہ

رہ جاؤ گے ہاتھ زندگی سے دھو کر
پچھتائیں گے اقرار تمہارے رو کر

محسن کیا پوچھتے ہو چھوڑو گھر بار
جنت کو چلے چلو مدینے ہو کر

مثنوی نگارستانِ الفت مین خالص لکھنؤ کی مثنویون کی تمام خصوصیات موجود ہین،

زردی چھائی ہوئی رخسارون پر — سرسون پھولی ہوئی انگاردن پر
مردنی چھائی ہے چہرہ دیکھو، — اپنی جاتی ہوئی دنیا دیکھو
کامدانی کا پہننا چھوڑا — لٹ گیا تیرا شہانا جوڑا
بند آنکھیں کئے روتے دیکھا، — رات ہم نے تجھے سوتے دیکھا
سو کہین ایک نہ مانی آخر — مٹ گئی تیری جوانی آخر
چاندنی پچھلے پہر کی کب تک — روشنی شمعِ سحر کی کب تک
دلِ ناشاد کو رکھ قابو مین — نہ سہی یار نہ ہو پہلو مین،

مثنوی فغانِ محسن مین (جو ایک دوست کے قید ہو جانے پر لکھی گئی ہے) البتہ خلوص کے ساتھ جذبات نگاری کے مرقعے ملتے ہین،

یہ بیٹھے بٹھائے مجھے کیا ہوا، — تڑپنے لگا دل اچھلنے لگا،
مری چشمِ تر کا یہ کیا حال ہے — کہ دامن سے تا آستیں لال ہے
مرا رنگ فق ہوتا جاتا ہے کیون — بدن خود بخود سنسناتا ہے کیون
مرے منہ پہ ہوائیان سی کیون اڑ گئین — چمن مین مرے کیون خزان آگئی
نہ کیا کیا ہوس زندگانی کی تھی — مگر موت آنی جوانی کی تھی،
کوئی دم مین دم ہی نکلتا ہے آج — کلیجا مرا کوئی ملتا ہے آج
چلی آتی ہین ہچکیان دمبدم — مجھے یاد کرتے ہین اہلِ عدم
اندھیرا مری آنکھون مین چھا گیا — جبین پر وہ دیکھو عرق آگیا

محسن کے تمام کلام کی نسبت صرف ایک بات کہنا اور باقی رہ گئی، یہ کلام کی شگفتگی ہے،

انیسویں صدی ہندوستان کی تاریخ کا ایک تاریک باب ہے، انقلاب اور خونریزی کی ظلمت میں سلاطین کی گداگری، شریفوں کی پریشان حالی، شاعروں اور ادیبوں کی ناقدری، امیروں کی بے سروسامانی اور غریبوں کی فاقہ کشی کے بھیانک خواب نظر آتے ہیں، اسی وجہ سے اس دور کے شاعروں کے کلام اور ادیبوں کی تصانیف پر قنوطیت کا گہرا رنگ چڑھ گیا ہے، جسے پڑھکر طبیعت افسردہ اور مضمحل ہوجاتی ہے، امید کا دامن چھوٹ جاتا ہے، آرزو کی آخری کرن ڈوب جاتی ہے، لیکن محسن کے یہاں افسردگی کی جگہ شگفتگی، ناامیدی کی جگہ یقین، تزلزل کی جگہ استحکام نظر آتا ہے، اور اس حیثیت سے وہ یقیناً اپنے معاصرین میں ممتاز ہیں،

الغرض محسن کا کلام اختراعی فن کاری کا ایک نادر نمونہ ہے، اور لکھنوی ہونیکے باوجود لکھنؤ کے عام رنگ سے جدا ہے جس میں شاعر کی شخصیت نے کمال خلوص و محبت کے خاکہ کو تصوف اور ہندیت کے رنگ سے آراستہ کرکے شاعرانہ صناعی سے مکمل کیا ہے، جس کی جدت جاذب اور جس کی مضمون آفرینی دلکش ہے، جہاں حدیث و قرآن کی صحت کے لحاظ کے ساتھ مذاق شاعرانہ اور مذہبیت کا معتدل امتزاج نظر آتا ہے، جہاں رکاکت اور ابتذال کی بجائے متانت تہذیب اور شائستگی کا جلوہ ہے، جہاں فنی حیثیت سے تلمیحات، تشبیہات اور استعارات کا کمال بے نظیر ہے، جہاں مثنویوں میں قصیدوں کا لطف ہے، جہاں ترجیع اور گریز کے مضامین نو شاعر کی قادرالکلامی پر دلیل ہیں، لکھنؤ کے دبستانِ شعر کا نادر ترین مرقع ہے،

تلخیص و تبصرہ

مغل یا مونگل

ذیل مین جناب شیخ عنایت اللہ صاحب دہلوی (مترجم جنگیز خان وتیمور) کی ایک تازہ تحریر درج کیجاتی ہے، جو گو مختصر ہے لیکن پر از معلومات ہے، مغلون کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والون کے لئے اس کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا،

براعظم ایشیا کا نقشہ سامنے رکھئے تو معلوم ہوگا کہ سلطنت چین کے شمال مین دشتِ گوبی اور دشتِ گوبی کے شمال مین کسی قدر مغرب کو جھکتی ہوئی بیکال کی جھیل ہے، اس بڑی جھیل کے ارد گرد جو علاقہ ہے، اوسے ترانس بیکالیہ نقشون مین لکھا جاتا ہے، ترانس بیکالیہ کے جنوب مشرق مین منچوریا کا ملک ہے، یہ ملک اور ترانس بیکالیہ کے علاقہ کا زیادہ تر حصہ یا یون سمجھئے کہ دشتِ گوبی کے شمال مشرقی گوشہ سے ملا ہوا ملک سرسبز و شاداب معلوم ہوتا ہے، کیونکہ وہان چھوٹے بڑے دریا، جھیلین، جنگل، پہاڑ، وادیان بکثرت ہین، اس سرزمین مین اور نیز دشتِ گوبی کے شمال مغربی حصون مین صدہا قبیلے یسون، ایماق، ایل والوس خانہ بدوش چارہ اور پانی کی تلاش مین آوارہ گرد رہتے تھے، بلکہ یہ سمجھنا چاہئے کہ ان چھوٹے بڑے قبیلون کے ایک عظیم الشان مجموعہ کی خانہ بدوشی کے لئے یہی صحرا، جنگل اور وادیان مخصوص تھین، یہین یہ قبیلے اپنے خیمے نصب کرکے کچھ دنون قیام کرتے تھے، پھر حسبِ ضرورت بدل

دیتے تھے، دریاے اونان اور کلوران کے قرب و جوار مین قبائل مغل کی آوارہ گردی کا حال بعض تاریخون مین مذکور ہے، نقشہ دیکھنے سے معلوم ہوگا، کہ دریاے اونان علاقہ ترانس بیکالیہ کے جنوب مین بہتا ہے، اور دریاے کلوران ترانس بیکالیہ سے بہتا ہوا کچھ دور تک دشت گوبی مین آیا ہے، ہنچو ریا ترانس بیکالیہ اور دشت گوبی کے اور بہت سے قبائل جو خانہ بدوشی کرتے تھے بعض کے نام یہ ہین، تاتار، نائمان، جلتان، قرایت، ایغور، دشت گوبی کے مغرب مین قراخطائیون کی حکومت شروع ہو جاتی تھی، چنگیز کو ایغور اور قراخطائیون کی پرانی ترکی قوم سے بتایا گیا ہے، غرض اس مجموعۂ قبائل مین وہ قبیلے تھے، جو اپنے کو مغل کہتے تھے، بعض محققون نے لفظ مغل یا مونگل کے متعلق لکھا ہے، کہ ابتدا مین یہ لفظ مونگ کو، منگ کو تھا جس زبان کا یہ لفظ تھا، اوس مین اس کے معنی "جوانمرد" یا "روپہلی قوم والے" کے تھے، اصل اس قوم کی تنگوس یا قدیم ترکی سے تھی، تنگوس قوم کی نسبت خیال ہے، کہ وہ اور بھی شمال مین ملک سائبیریا مین کسی برفستان کی رہنے والی تھی، اور غالباً اسی برف کی رعایت سے روپہلی قوم کہتے تھے، مونگ کو قوی ہیکل دراز قامت خانہ بدوش تھے، بھیڑ بکری اونٹ اور گھوڑون کے گلون پر گذر اوقات تھا، عمدہ چراگاہون اور چشمون کی تلاش مین صحرا گرد رہتے تھے، دشت گوبی اور اس کے شمال کی ہموار زمینین ان خانہ بدوشون کے رہنے کے مقامات تھے، مونگ کو وہی قوم تھی، جسے یونان کے پرانے مورخ ہیروڈوٹس نے ستھین لکھا ہے، اور یہ قرابت رکھتے تھے اقوام ہون اور آلان سے اور یہ ہون وہ تھے جنھون نے مغرب کی طرف یورش کر کے یورپ مین بڑی بڑی خونریزیان کی تھین۔

مدت ہوئی کہ چین کے لوگ انہی مونگ کو دون کو ہی انگ تو کہتے تھے، اور انہی قومون کی روک تھام کے لئے چینیون نے مشہور دیوار چین بنائی تھی، خلاصہ یہ کہ انہی مونگ کو دون کو

یونانیون نے سیتھین رومادالون نے ہون یا ہونی اور چین کے لوگون نے انھین ہی انگ تو لکھا ہے، ہی انگ تو بالعموم وہ خانہ بدوش قومین تھیں، جو آپس مین ہمیشہ لڑتی بھڑتی رہتی تھین، یہ نہین بتا سکتے کہ کئی جماعت یا قوم بجز قوم قرایت کے کوئی سیاسی حیثیت رکھتی تھی،

ایک سوال یہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ کسی قبیلہ کا نام مغل کیونکر ہوا ؟

دسوین صدی عیسوی سے قبل غیر ملکون مین مغل کا نام کسی نے نہ سنا تھا، یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ کوئی قوم یا قبیلہ شروع ہی سے اپنا نام مغل رکھتا تھا، یہ بات نہ تھی، بلکہ ان مختلف قبائل میں سے بعض رئیسون اور سردارون کا ذاتی نام مغل ہوتا تھا، جب کوئی ایسا سردار جس کا ذاتی نام مغل ہوتا، کسی قبیلہ کو اپنا مطیع و محکوم کر لیتا تھا، تو پھر اس قبیلہ کے کل آدمی بھی اپنے تئین مغل کہنے لگتے تھے، اور اس طرح ایک فرد واحد کا نام بہت سے افراد پر عائد ہونے لگتا تھا، اور ایسا پورا قبیلہ مغل کہلانے لگتا تھا، یہ خیال اسٹینلی لین پول کا ہے،

یہ خانہ بدوش قبیلے اور قومین بالکل آزاد نہ تھین، بلکہ اپنے ہمسایہ چینیون، خطائیون اور ترکون کی محکوم اور باجگذار تھین، صید و شکار کے علاوہ مویشی پال کر اسکی نسل بڑھاتے تھے، گوشت اور ترش دودھ جسے قیز کہتے تھے، ان کی غذا تھی، جانورون اور کھالون کا تبادلہ، خطائیون چینیون اور ترکون سے کرکے کچھ فائدہ کی صورت بھی پیدا کر لیتے تھے،

عملی طور پر مغلون کی تاریخ کی ابتدا چنگیز خان سے ہوتی ہے، انہی خانہ بدوش قبیلون مین ایک سردار یسوکای بہادر تھا، اوس نے اپنی قوت اور ذہانت سے بہت سے قبائل پر سرداری حاصل کر لی تھی، بہت سے قبیلون سے لڑکر اپنے قبیلے مین شریک کیا اور بہتیرون کو بصلح و آشتی اپنا بنایا، مگر باوجود ان تمام کوششون کے یسوکای بہادر کے ماتحت لوگون کی تعداد چالیس ہزار خیمون سے زیادہ نہ تھی، یسوکای بہادر نے جہان متعدد

چنگیزیون کو اپنا مطیع کیا تھا، وہان سب سے بڑا کام یہ کیا تھا، کہ اپنے ماتحت قبائل کو چین کی حکومت سے آزاد کرلیا تھا، ۱۱۶۷ء مین یسوکای بہادر کا انتقال ہوگیا، اپنے بعد منجملہ دیگر اولاد کے ایک لڑکا چھوڑا، جسکی عمر ۱۳ برس کی تھی، اور نام اوس کا تموجن تھا، تموجن آگے چل کر چنگیز خان کے معزز لقب سے مشہور ہوا،

باپ کے چھوڑے ہوے بیس ۴۰ ہزار خیمے تھے، جس کی بنیاد پر تموجن نے سلطنت کا وہ قصر عالیشان تعمیر کیا، جس کی مثال دنیا مین نہ تھی، باپ کی زندگی مین تموجن کو جو صرف ۱۳ برس کا کمسن لڑکا تھا، چنگیز خان کا لقب نہ ملا تھا، باپ کے مرنے پر دریائے اونان کے کنارے جو قبیلے خانہ بدوش رہتے تھے، اور زندگی مین باپ ان کا سردار تھا، اون پر تموجن حکومت کرنے لگا،

یہان ہمارا مقصد تموجن چنگیز خان کی فتوحات کا مفصل ذکر کرنے کا نہین ہے، صرف اتنا بتانا کافی ہوگا، کہ تیس برس تک گھر کے دشمنون سے کش مکش کے بعد جس مین اوسے کامیابی ہوئی وہ اپنے باپ کے قبائل اور ہمسایہ قبیلون پر باوجود سازشون کے جن مین دشمنون نے اوسے جان سے مار دینا چاہا آخر کار سب پر حاوی ہوگیا، اور موقع ملا کہ بیس برس زندگی کے جو باقی تھے ان مین ملک گیری اور کشورستانی کا شوق پورا کرے، اس شروع کے بیس برس کے زمانہ مین دشت گوبی کے شمال اقطاع مین خنگای کے پہاڑی سلسلہ سے لیکر جو منچوریا کے شمال مغربی گوشہ سے شروع ہوکر دشت گوبی مین دور تک آیا ہے، دریائے اونن تک جو مشرقی ترکستان کا دریا ہے، اور کوہ التای سے نکل کر سائبیریا مین بہتا ہوا دریائے اوبی مین شامل ہوکر قطب شمالی کے بحر منجمد مین گرتا ہے تمام قبیلون اور قومون کو اپنا مطیع و منقاد بنایا انہی قومون اور قبیلون مین مشہور قوم قرایت کی تھی، قوم قرایت کا بادشاہ جس کا نام طغرل اور سلطنت چین کا عطا کیا ہوا خطاب ونگ خان تھا، یسوکای بہادر کی زندگی مین یسوکای

سے بھائی چارہ رکھتا تھا، اور اسی تعلق سے توجن بھی ان کی عزت کرتا تھا، ونگ خان نے توجن کے دشمنوں کے کہنے میں آکر توجن کے ساتھ بڑی بڑی دغابازیاں کیں، اور اس کے خلاف سخت سازشیں کیں، بہرکیف جب قرایت کی قوم توجن کی محکوم ہوگئی، تو ۱۲۰۶ء میں توجن نے ایک توریلتای منعقد کی، اس توریلتای میں تمام قبیلوں اور ایل اولوسوں کے سردار جمع ہوئے اور مذہب شامان جو مغلوں کا مذہب تھا، اس کا ایک موبد بھی آیا، اس شامان نے حاضرین کے سامنے باواز بلند کہا، کہ آسمان (تنگری) توجن کو ایسا بڑا لقب دینا چاہتا ہے، جو کسی سردار اور رئیس کو حاصل نہیں، آج سے وہ بجائے توجن کے چنگیز خان کے لقب سے پکارا جائے چنگیز خان کے معنی "خصوصیت کے ساتھ زبردست بادشاہ" کے ہیں، غرض ۴۴ برس کی عمر میں قومون اور قبیلون ایل والوس پر وہ حکومت قائم کی، جس پر اب کوئی اعتراض کرنے والا یا مخالفت کرنے والا نہ تھا، تین برس کے بعد جب قوم ایغور بھی مطیع ہوگئی، تو چنگیز خان نے چین پر فوج کشی شروع کردی، گو چین پر کامل فتح بجائے چنگیز کے اوکے پوتے قوبلای یا قوبیلای کی قسمت میں لکھی تھی، قوبلای خان فرزند تھا اکتائی خان کا جو منجھلا بیٹا تھا چنگیز خان کا اور باپ کے مرنے پر خاقانی پر باپ کا جانشین ہوا تھا، چین کی سلطنت کو چھوڑ کر چین کے شمالی صوبجات میں مشرق کی سمت میں لیاونگ کی اور مغرب میں تنگوت کی ریاست بیا چنگیز خان کی زندگی ہی میں سلطنت مغلیہ کی ماتحت یا باجگذار ریاستون میں شمار ہونے لگی تھیں، اب دنیا پر حکمرانی کرنے میں جو چیز سدراہ تھی، وہ مغرب کی سمت میں قراخطائیون کی ترکی حکومت تھی، سلطنت قراخطای کی حدود ارضی آجکل کے مشرقی ترکستان سے مطابق ہوتی ہیں سلطنت قراخطای کے بادشاہون کو گورخان کہتے تھے، اور یہ سلطنت اپنی سرحد سے ملحق ریاستہائے ایران ماوراءالنہر سے باج وصول کرتی تھی، مگر چنگیز خان اور اس کے لشکر نے

قراخطائیون کی حکومت قیم کرنے کی جگہ ان پر حملہ کر دیا اور ثابت کر دیا کہ مغلون سے کسی کا مقابلہ کرنا قطعی بے کار ہے، اس کے کچھ زمانہ بعد چنگیز خان نے مشرقی ترکستان کے جنوبی شہرون کاشغر، یارقند اور ختن پر بھی اپنا قبضہ جمایا، اور پھر قراخطائیون کے باقی ملک پر بھی قابض ہو گیا اب مغلون کی حکومت کی سرحدین اس سلطنت سے جا ملین، جو خوارزم شاہ نے اپنی قوت بازو سے پیدا کی تھی، غرض اب خوارزم شاہ کی سلطنت مغلون کا نشانہ بنی، اور دنیا سمجھ گئی کہ مغلون کو اپنی سلطنت سے دور رکھنا قطعی ناممکن ہے،

مغلون کا لشکر اب کئی بڑے حصون مین تقسیم ہو گیا، ایک حصہ لشکر کا خوارزم خراسان اور افغانستان مین پھیل گیا، اور لشکر کا دوسرا حصہ آذربائیجان، گرجستان اور جنوبی روس پر چھا گیا، تیسرا حصہ لشکر کا چین کے فتح کرنے مین بدستور مصروف رہا،

اسی زمانہ مین کہ فتوحات کی موجین مختلف اطراف مین بڑھ رہی تھین، چنگیز خان کا انتقال ۶۲۴ھ ۱۲۲۷ء مین ہو گیا، (اس تاریخ مین اختلاف ہے)

اب تک چنگیز خان اور اس کے بیٹون نے جن ملکون کو فتح کر کے اپنی حکومت ان قائم کی تھی، وہ بحر اصفر (سی آف جاپان) سے لیکر بحر اسود تک پھیلے تھے، اور اس حکومت کی حدود ارضی مین وہ ملک اور قبیلے شامل تھے، جو مغلون نے چینیون، تنگوتون، افغانون ایرانیون یا ترکون سے چھینے تھے،

مغل سردارون مین دستور تھا کہ جب کوئی سردار مرتا تھا، تو اس کی اولاد ذکور مین وہ قبیلے اور قومین تقسیم کر دیجاتی تھین، جن پر سردار متوفی اپنی زندگی مین حکومت کرتا تھا، یہ تقسیم متروکہ بجائے ارضی تقسیم کے قبیلی تقسیم ہوتی تھی، اور وجہ ظاہر تھی، چونکہ قبیلے اور قومین خانہ بدوش صحراگرد تھین اس لئے کوئی خاص ملک یا مقام بطور وطن کے ان کیلئے

مخصوص نہین کیا جا سکتا تھا، پس یہی طریقہ ایل اُلوس قومون اور قبیلون کی تقسیم کا ان مین جاری تھا،

غرض چنگیز خان نے بھی جس قدر قبائل اور قومین اوس کے زیر نگین تھین، اپنی اولاد مین اس طرح تقسیم کین کہ خاص خاص قبائل اور قومین جو خانہ بدوش رہتی تھین، اور جن کے حدود ارضی کا جن مین وہ صحرا نورد رہتے ہون کوئی واضح تعین نہین ہو سکتا تھا، ان مین سے کچھ کچھ ہر ایک فرزند کو دین، اور صدر خانیت کا جس کا خود مالک تھا، اس کے لئے بھی اپنا ایک جانشین مقرر کیا، اس صدر خانیت کے خان کو خان کہتے تھے، اور وہ تمام خانون اور قوم کے چھوٹے بڑے سردارون کا حاکم اعلیٰ سمجھا جاتا تھا، اس صدر خانیت کے خانون کو ہم چنگیز خان کی اولاد کی حکمرانی کا سلسلہ شروع کرتے ہین،

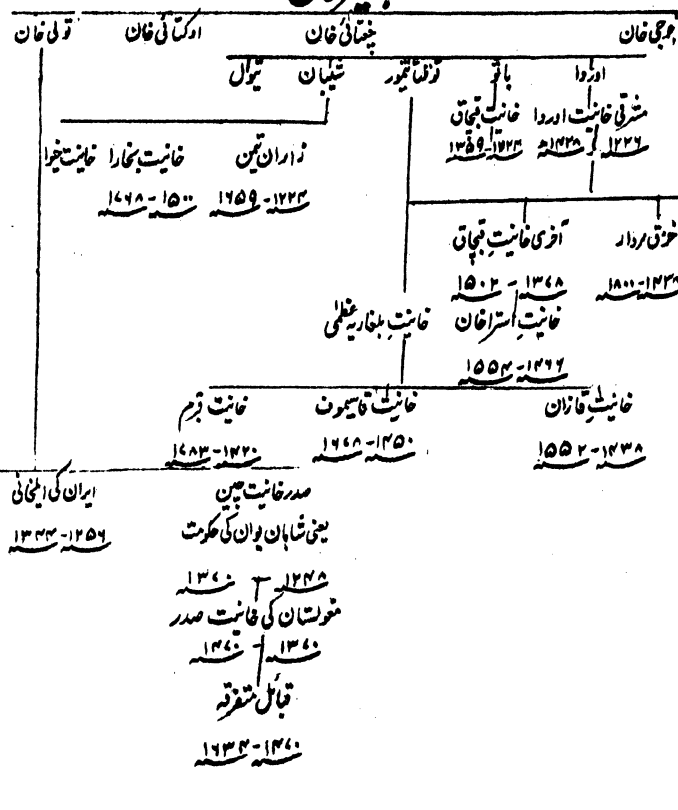
یہان یہ ذہن مین رکھنا ضروری ہے کہ چنگیز خان کے چار فرزند تھے، جن مین قومون اور قبائل کی تقسیم ہوتی تھی ان کے نام یہ ہین، (الف) جوجی خان سب سے بڑا بیٹا تھا. (ب) چغتائی خان منجھلا فرزند تھا (ج) اوکتائی خان سنجھلا بیٹا تھا، اور باپ کے مرنے پر بھی صدر خانیت کا خاقان ہوا (د) تولی خان، یہ سب سے چھوٹا بیٹا تھا،

چنگیز خان کی اولاد مین حکمرانی کے سلسلہ کو اس طرح بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے (۱) اوکتای خان کا سلسلہ جو ملک زنگاریہ کے قبائل پر حکومت رکھتا تھا، اوکتائی خان کی اولاد سے خاقان اس وقت تک ہوتے رہے، جب تک کہ اس کی اولاد کا سلسلہ قائم رہا اسکے بعد چنگیز خان کے سب سے چھوٹے فرزند تولی خان کی اولاد مین خاقانی منتقل ہو گئی (۲) تولی خان کا سلسلہ جو ملک یعنی مغولستان کے قبیلون پر حکمران تھا، اوکتای خان کی اولاد کے سقوط کے بعد تولی کی اولاد سے خاقان ہوتے رہے، یہانتک کہ چین مین منچوؤن کا راج ہو گیا، (۳) تولی خان کی اولاد

کی وہ شاخ جو ایران مین حکمران ہوئی، یعنی ہلاکو خان اور اوس کے بعد جو اوس کی اولاد جانشین ہوتی رہی، ان ہی کو ایل خان کہا گیا ہے، (جوجی خان کا سلسلہ جو خانیت قپچاق کے ترکی قبیلون پر حکمران ہوا، اسی جوجی کی اولاد مین خانان سیبر اور وا اور خانان آق اوردا ہے، اور انہی سے خانیت استراخان قائم ہوئی اور اسی استراخان کی خانیت سے یورپ مین قازان، قاسیموف اور قبرم کی خانیتین قائم ہوئین (۵) چغتای خان کا سلسلہ، چنگیز خان کا یہ فرزند ماوراء النہر مین حکومت کرتا تھا،

اب ہم یہان ایک شجرہ بطور گوشوارہ کے دیتے ہین جن سے معلوم ہوگا کہ وہ حکمران خاندان کون کون تھے جن کی اصل چنگیز خان سے تھی، اور انھون نے ایشیا اور یورپ مین کہان کہان کتنی مدت تک حکومت کی

چنگیز خان



اوپر کے شجرہ مین کل تفصیل آگئی ہے لیکن جن ناظرین کو شجرے کے دیکھنے مین زحمت معلوم ہوتی ہو، ان کے لئے ہم شجرہ کو معمولی عبارت مین لکھے دیتے ہین،

غرض ان چار فرزندون مین سے سب سے بڑے فرزند جوجی خان کے پانچ بیٹے تھے، اوردا باتو، توقا تیمور، شیبان اور تیول۔

اوردا کی حکومت شرقی خانیت کہلائی گئی یا اوسے آق اوردا کی حکومت کہتے تھے، اس کا زمانہ ۱۲۲۶ء سے ۱۴۳۸ء تک رہا، حکومت کا مقام دریاے دو لگا سے مشرق کی طرف تھا،

باتو کی اولاد مین خاقان قپچاق ہوئے، انھون نے اپنے دارالحکومت سرائے سے ۱۲۲۴ء سے ۱۴۵۹ء تک یورپین روس کے بڑے حصہ پر حکومت کی،

توقا تیمور اسکی اولاد نے بلغاریہ عظمیٰ مین ۱۴۶۶ء سے ۱۵۵۴ء تک حکومت کی، بلغاریہ عظمیٰ کی جانب سے جو یورپ مین واقع تھی، چار مختلف خانیتین پیدا ہوئین، ایک خانیت قازان جس کا زمانہ ۱۴۳۸ء سے ۱۵۵۲ء تک رہا، اور یوروپین روس کا مشہور شہر قازان اوس کا دارالحکومت رہا،

شیبان اسکی اولاد سے خانان تمین جنھین زاران تمین کہتے تھے، ان کا سلسلہ چلا، تمین کا شہر یورال کے پہاڑی سلسلے سے مشرق مین، مگر پہاڑی سلسلے سے قریب نقشون میں دکھایا جاتا ہے) زاران تمین کی حکومت کا زمانہ ۱۲۲۴ء سے ۱۶۵۹ء تک رہا، اسی شیبان کی اولاد سے توغائے خانان خیوہ اور خانان بخارا ہوئے، خانان خیوہ کا زمانہ حکومت ۱۵۱۵ء سے ۱۹۷۳ء تک، اور خانان بخارا کا دور حکومت ۱۵۰۰ء سے ۱۸۶۸ء تک رہا،

تیول جوجی خان کے اس فرزند سے سرداران توغائے اور خانان سائی بیریا

کا سلسلہ چلا،

اوکتای خان چنگیز خان کے مرنے پر منولستان مین خاقان ہوا اور مستقر حکومت قراقورم کا شہر تھا، اوس کی اولاد مین ۱۲۲۶ء سے ۱۲۴۶ء تک خاقان ہوتے رہے،

تولی خان چنگیز خان کے سب سے چھوٹے فرزند سے چین کی صدر خانیت کا سلسلہ چلا یہ منولستان کی صدر خانیت کے علاوہ صدر خانیت تھی جو تولی کی اولاد نے چین مین قائم کی جنھون نے مغلون کے ان خاقانون کو یوان خاندان کہا، زمانہ حکومت ۱۲۴۸ء سے ۱۳۶۰ء تک، اسی تولی کی اولاد سے منولستان مین ۱۳۶۰ء سے ۱۴۷۰ء تک خاقان ہوتے رہے، جب یہ خاقان نہ رہے تو حکومت مختلف قبائل مغل مین چلی گئی، اس تولی خان کی اولاد سے ایران کے ایل خانون کا سلسلہ چلا تو ۱۲۵۶ء سے ۱۳۴۴ء تک قائم رہا،

(باقی)

چنگیز خان

تاتاریون کے پہلے باقاعدہ فرمانروا چنگیز خان کے حالات اور کارنامون پر ہیرلڈ لیب کی دلچسپ محققانہ کتاب کا اردو ترجمہ مصنف نے اس مین تاتاری و فرنگی و عربی و فارسی ماخذون سے اس عجیب و غریب بادشاہ کے حالات مرتب کئے ہین، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیونکر اس وقت کی دنیا سے اسلام پر چھا جانے کا مستحق ہوا، ترجمہ کی صحت اور خوبی کے لئے مولوی عنایت اللہ صاحب بی اے سابق ناظم دارالترجمہ عثمانیہ کا نام نامی ضمانت ہے،

معارف پریس کی بہترین لکھائی چھپائی، کاغذ عمدہ ضخامت ۲۴۲ صفحے،

قیمت :- ۱۲ عہ

مینیجر

غیر مسلموں کی بعض اسلامی تصانیف

برنارڈ لیوس نے "فرقہ اسماعیلیہ کی ابتدا" The Origins of Ismailism کے نام سے ایک کتاب کیمبرج یونیورسٹی پریس سے شائع کی ہے، اس میں فاطمیوں کے تاریخی پس منظر کا مطالعہ کیا گیا ہے، اور اسلام کے ان متعدد فرقوں کے عروج کا تجزیہ کیا گیا ہے، جن کے رجحانات اسماعیلی تحریک میں مدغم ہو گئے، مصنف کا خیال ہے کہ اسماعیلی تحریک کی ابتدا ایک ایسے فرقہ کی کوشش سے ہوئی جس کے خیالات اسماعیل بن جعفر سے ملتے جلتے تھے، اسماعیل اور محمد بن اسمٰعیل نے اس تحریک کو ترقی دی اس کے دوسرے ممتاز اور اہم رہنما ابوالخطاب میمون القداح اور عبداللہ بن میمون تھے، مصنف کی یہ بھی رائے ہے کہ اسمٰعیل بن جعفر کے زمانہ سے خاندان فاطمیہ کے برسر اقتدار ہونے تک ائمہ کی دو شاخیں تھیں، امام مستقر اور امام مستودع یعنی مستقل اور عارضی امام، موخر الذکر میمون القداح کے خاندان سے تھے، مصنف نے یہ بھی دکھانے کی کوشش کی ہے کہ فاطمیوں میں قائم کے بعد جتنے خلفاء ہوئے، وہ علوی تھے لیکن خلافتِ فاطمیہ کا بانی سعید مہدی علوی کے بجائے القداحی تھا،

لہ خلافت فاطمیہ کا بانی تو عبید اللہ مہدی قداحی تھا ہی معلوم نہیں سعید سے کون مراد ہے پھر قداحی بھی علوی ہیں اسلئے کہ قداح عبداللہ بن میمون کا لقب ہے، "م"

ایک دوسری کتاب بیروت سے شائع ہوئی ہے، اس میں اسلام اور عیسائی مذہب کے نفسیاتی اور تاریخی تعلقات دکھائے گئے ہیں، یہ کتاب اسلام اور مسلمانوں کے متعلق عیسائیوں کی خوش فہمیوں اور اس روشن خیالی کی جو مجھ میں بھی ان کے متعصبانہ خیالات کا دلچسپ نمونہ ہے، اس کے مباحث کا خلاصہ یہ ہے، کہ عیسائی اب تک مسلمانوں کے مذہبی عقائد یا ان کے انفرادی اور معاشرتی کردار کا مطالعہ کرتے رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ عیسائی مبلغین مسلمانوں تک اپنا مذہبی پیام پہنچانے میں کامیاب نہیں ہوسکے ہیں لیکن اب ضرورت اس بات کی ہے کہ سامی قوموں کی نفسیاتی خصوصیات اور رجحانات کا مطالعہ کیا جائے اسلام اور عیسائی مذہب کے عقاید کی نفسیاتی تجلیح بہت وسیع ہے، سامی تخیلات مادی چیزیں ہوتی ہیں، اس لئے ان کے یہاں روحیت کی تجسیم ہوسکتی ہے، ایک راسخ العقیدہ مسلمان کا خیال ہے، کہ روح ایک جسمانی چیز ہے یعنی روحیت غیر روحی چیز ہے، ایک مسلمان کبھی یہ نہیں مان سکتا ہے، کہ خدا روح ہے، یہ اوس کے لئے ایک نفرت انگیز چیز ہے چنانچہ اسلام اور عیسائی مذہب میں اساسی اختلاف سیاست عقائد، اور اخلاق کا نہیں، بلکہ روحیت کے تخیل کا ہے، ایک مسلمان کے لئے عیسائیوں کے مذہبی اعتقاد اور اخلاقی معیار کو قبول کرنے میں کوئی مشکل نہیں ہوتی لیکن اس کے لئے یہ ناقابل فہم مسئلہ ہے کہ شخصیت یا وجود کا ظہور بھلائی، سچائی، خوبصورتی اور محبت میں کیسے ہوسکتا ہے، سامی ذہن میں وجود کا تخیل ہمیشہ جسمانی ہوتا ہے، اور اس خصوصیت کو نہ سمجھنے کی بنا پر عیسائیوں نے ہمیشہ اسلام کا سطحی مطالعہ کیا ہے، اس لئے عیسائی اگر مسیح کی تعلیم مسلمانوں تک پہونچانا چاہتے ہیں تو مسلمانوں کو روحیت کی حقیقت سے روشناس کرنا چاہئے، اسلام ایک مذہب ہے معتقدات کا، لیکن عیسائی مذہب نام ہے، عفو، مصالحت اور جدید زندگی کے روحانی تجربات کا، عیسائی عقائد ذہنی اذعان نہیں بلکہ ذاتی تجربات ہیں،

اس کتاب مین عیسائیون اور مسلمانون کے سیاسی اور مذہبی تعلقات پر بھی تبصرہ ہے اور مؤلف کو اس کا اعتراف ہے، کہ عیسائی حکمران اپنے مسلمان محکوم قوم کے ساتھ نسبتہً زیادہ غیر روادار رہے ہین، مسلمان بادشاہون نے عیسائیون پر ظلم وستم کئے ہین، لیکن ان کا یہ فعل مذہبی تعصب کی جانب منسوب نہین کیا جا سکتا ہے، مؤلف کا خیال ہے کہ عیسائیون کے لئے ایک مشکل زمانہ آگیا ہے، اور مسلمان اپنی ترقی اور عروج کے لئے نئی قوتین پیدا کر رہے ہین، اسلئے اب ضرورت اس بات کی ہے، کہ عیسائی مسلمانون کی نفسیاتی خصوصیات کو پیش نظر رکھکر انکی طرف متلفت ہون،

ایک فرانسیسی اہل قلم نے عربی کا ایک لغت لکھا ہے، جس کا نام "نشو اللغۃ العربیۃ و نموہا واختلاطہا" ہے، اس میں عربی الفاظ کے اشتقاق ماخذ اور تاریخ پر بحث کی گئی ہے، ایک عیسائی نومسلم علی بن ربان الطبری نے نوین صدی عیسوی کے وسط مین "کتاب الدولہ والدین" کے نام سے عیسائیون کے خلاف ایک کتاب لکھی تھی، یہ کتاب ۱۲۱۹ء کے لکھے ہوئے ایک قلمی نسخے کی مدد سے مرتب کرکے ۱۹۲۲ء مین مع انگریزی ترجمہ کے شائع کی گئی تھی، اس کی اشاعت پر عیسائی مبلغون کو بڑی ناگواری ہوئی، اور اب ایک عیسائی اہل قلم نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، کہ مطبوعہ نسخہ ایک غیر مستند مخطوطہ سے مرتب کیا گیا ہے،

موجودہ جنگ مین برطانیہ کے اخراجات

ریوٹر کے ایک بیان سے معلوم ہوا ہے، کہ اکتوبر کے پہلے ہفتہ تک موجودہ جنگ مین برطانیہ ایک کروڑ تیس لاکھ پونڈ روزانہ خرچ کرتی رہی ہے، اس سال اب تک برطانوی پارلیمنٹ جنگی مصارف کے لئے دو ارب پونڈ کی رقم خرچ کرنیکی اجازت دے چکی ہے، ستمبر کے مہینہ

سات کروڑ اسی لاکھ پونڈ ہفتہ وار، اور ایک کروڑ دس لاکھ پونڈ روزانہ خرچ ہوا، ان مین نوے لاکھ پونڈ تو خالصتہً لڑائی مین اور بیس لاکھ پونڈ متفرق کاموں مین خرچ کئے جارہے تھے، گذشتہ جون مین اخراجات کا اوسط ایک کروڑ دو لاکھ پچاس ہزار پونڈ تھا جس مین اسی لاکھ پونڈ کی رقم لڑائی مین خرچ ہو رہی تھی، گذشتہ جنگ عظیم مین برطانیہ کے زیادہ سے زیادہ اخراجات اسی لاکھ پونڈ روزانہ تھے،

امن پسندون کی کانفرنس

ابھی حال مین امریکہ کے کیکرز (Quakers) کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی، اس کے اراکین نے موجودہ جنگ کے اسباب پر غور کرکے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ دنیا مین امن کیسے قائم رہ سکتا ہے، ان کا خیال ہے کہ برسون کی خونریزی، ہلاکت اور بربادی کے بعد دنیا کو از سر نو تعمیر نہیں کیا جاسکتا ہے، امن کوئی ایسی شرط نہیں جو اس مین خلل ڈالنے والے کی شکست ہی سے پوری ہوسکتی ہے، بلکہ یہ ایک قوت آفرین طریقہ ہے، جس کے ذریعہ سے ناانصافی کو دور کرکے دنیا کی حالت بدل کر ساری برائیان دور کیجاسکتی ہین، اور امن کے اس نصب العین کی تکمیل کے لئے چھ چیزون کی ضرورت ہے، (۱) ثالثی فیصلہ (۲) تخفیف اسلحہ (۳) بین الاقوامی معاہدہ (۴) تمام قومون کو غیر ممالک کے بازار مین مساویانہ حقوق (۵) ہجرت کے قوانین تمام قومون کی بہبودی مین مساوات (۶) ان اقتصادی اور معاشرتی مسائل کا جن سے دوسری قومین متاثر ہون، بین الاقوامی مشورہ سے فیصلہ،

"ص ع"

خطبات شبلی یعنی مولینا شبلی کی مختلف علمی و مذہبی و قومی تقریرون کا مجموعہ حجم ۱۶۴ صفحے قیمت ۴ پتہ منیجر

ادبیات

وعظ جدید

از جناب اسد ملتانی

ہر مسلماں پر نمازِ پنجگانہ فرض ہے — تاکہ یہ باقاعدہ ورزش حیات انگیز ہو
غور سے دیکھیں تو روزہ کا بھی مقصد یہی — تندرستی کا سبب یہ عادتِ پرہیز ہو
تذکیہ ہے جو اہلِ زر پہ واجب زکوٰۃ — ہر ادارے کا خزانہ نقد سے لبریز ہو
اسلئے حج کے سفر کا ہے مسلمانوں کو حکم — تاکہ ان کا جذبۂ سیر و سیاحت تیز ہو
رسمِ قربانی کا بھی دراصل یہ مقصود ہے — مردِ مومن جنگ میں رنگین دلِ خونریز ہو
جنت و دوزخ سے ہو اک صورتِ امید و بیم — تاکہ یہ ذوقِ عمل کے واسطے مہمیز ہو
کوہکن ہیں ہم اُسی عبقی کی جوئے شیر کے — جس سے دنیا ہی میں حاصل شوکتِ پرویز ہو

یوں نئے واعظ بیان کرتے ہیں اسکی حکمتیں
دین جیسے اک دروغِ مصلحت آمیز ہو

ماتمِ فانی

از جناب یحییٰ اعظمی

رہروِ عالمِ باقی ہوئی جانِ فانی — آج ماتم کدہ ہے بزمِ جہانِ فانی
کام کر ہی گئیں اُف بادِ فنا کی موجیں — حیف خاموش ہوئی شمعِ زبانِ فانی

اٹھ گیا غم کدۂ دہر کا دہ مانیِ غم
کھینچ دیتا تھا جو تصویرِ جہانِ فانی

دے گا داد اس کی نوا ئکی جہان باقی
دارِ فانی مین کہان مرتبہ دانِ فانی

میر و غالب سے کوئی خلد مین جاکر پوچھے
احترام و ادب و عظمتِ شانِ فانی

ہو گئی بزمِ سخن کیفِ اثر سے محروم
اب غزل مین وہ کہان سحر نہانِ فانی

بزمِ امکان مین کہان سب کو وہ ہوتا ہے عطا
لذت اندوز تھی جس درد سے جانِ فانی

زہرِ غم اس کے لئے آبِ بقا سے بڑھکر
تھا یہی زندگی روح و روانِ فانی

ترجمانِ غمِ ہستی ہی رہی تا دمِ مرگ
شعلۂ غم سے بجھی تھی جو زبانِ فانی

اس کا ہر نقش ہے سرچشمۂ صد موجِ حیات
نہین مٹنے کا زمانہ سے نشانِ فانی

کارفرما ہین فضاؤن مین جو اس کے نغمے
آج تک وجد مین ہے کون و مکانِ فانی

شور نشور

از

از جناب نشور واحدی

قامتِ دلربا پر شباب آگیا
یا سوا نیزے پر آفتاب آگیا،

جب سے سمجھے کہ عہدِ شباب آگیا
آپ ہی آپ کچھ اجتناب آگیا،

دیکھتے دیکھتے انقلاب آگیا
قد مکمل ہوا اور شباب آگیا

جب لڑکپن گیا اور شباب آگیا
کچھ نگاہین جھکین کچھ حجاب آگیا

جاگی جاگی اُن آنکھون کا عالم نہ پوچھ
سامنے ایک جامِ شراب آگیا

اک نگاہِ محبت کی تخمیر مین
سب سمٹ کر جہانِ خراب آگیا

وہ چلے وہ بڑھے وہ جوان ہوگئے — چند لمحون مین یوم الحساب آگیا
جھوم اٹھی ایک ارماں بھری زندگی — جب ہوائین چلین جب سحاب آگیا
رات دلکش ہوئی حسن محشر ہوا — جب کسی بام پر ماہتاب آگیا

آیئے آیئے اس طرف وہ نشور!
شاعر یادگار شباب آگیا

حشر جذبات

از

ثاقب کانپوری

اب مجھ سے وجہ گریہ پیہم نہ پوچھئے — شرمندہ ہون گے آپ مرا غم نہ پوچھئے
جب التفات حسن سے تھی بارش کرم — سرمستی و خوشی کا وہ عالم نہ پوچھئے
مین خود بھی جانتا نہیں مین چاہتا ہون کیون — مجھ سے میرا تخیل مبہم نہ پوچھئے
اپنی تباہیون کا کہیں ذکر کر نہ دون — للہ وجہ گریۂ شبنم نہ پوچھئے
حاصل تھا جس مین مجھکو سرور مئے نشاط — وہ لطف وہ عنایت پیہم نہ پوچھئے
ہون آپ ہی کے عشق و محبت سے اشکبار — آنکھین ہین میری کس لئے پرنم نہ پوچھئے
کانون مین آرہی تھی انا الحق کی یہ صدا — سرشاری خودی کا وہ عالم نہ پوچھئے

ثاقب کے کچھ عقائد مذہب ہی اور ہین
اس نے پیا ہے کس طرح زمزم نہ پوچھئے

مطبوعات جدیدہ

پاکستان اور مسلمان مولفہ جناب انیس الرحمٰن صاحب تقطیع بڑی ضخامت ۸۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت معمولی قیمت مرقوم نہیں، پتہ:- غالباً سورج بھون الہ آباد سے ملے گی

یہ کتاب پاکستان کی مخالفت میں لکھی گئی ہے، مؤلف نے اس میں پاکستان کی مختلف اسکیموں پر جو اب تک سامنے آچکی ہیں، مختصر اور پنجابی اسکیم پر مفصل تنقید کرکے اسکی خامیاں اور عملی دشواریاں دکھائی ہیں، اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جغرافی اور تاریخی حیثیت سے ہندوستان ایک ناقابل تقسیم ملک ہے، اور یہاں کے مسلمان اور ہندو سیاسی نسلی اور کلچرل حیثیت سے ایک قوم ہیں اور پاکستان کی اسکیم نہ صرف اقتصادی اور انتظامی حیثیت سے ناممکن العمل، بلکہ سیاسی حیثیت سے غیر دانشمندانہ اور مسلمانوں کیلئے نہایت مہلک ہے، آخری بحث یعنی اقتصادی و انتظامی دشواریوں اور مسلمانوں کے حق میں اسکے برے نتائج کو واقعات اور دلائل و شواہد کی روشنی میں قابلیت کے ساتھ دکھایا گیا ہے البتہ کلچر کے اشتراک کی بحث نہ صرف اسلامی روح سے خالی ہے، بلکہ حقائق و واقعات کے اعتبار سے بھی غلط ہے، مؤلف نے موجودہ ہندوستانی کلچر کو بجنسہٖ اسلامی کلچر تصور کر لیا ہے، حالانکہ ہندوستانی مسلمان کا مذہب تک خالص اسلام سے بہت دور ہو گیا ہے، اس کلچر کو اسلامی کلچر قرار دینا اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت کا ثبوت ہے، اس پہلو سے قطع نظر اس میں جا بجا تاریخی غلطیاں اور غلط فہمیاں بھی ہیں، "مثلاً اکبر کی انتہائی رواداری اور ہندو تہذیب سے عشق حضرت سلیم چشتی جیسے باکمال صوفی کے زیر اثر تھا، ..... اسلامی تصوف اور ہندو فلسفے کے میل جول سے جو تصوف

پیدا ہوا، اسکی پیداوار میر خسرو گرونانک اکبر اور داراشکوہ کی شخصیتیں ہین... سنگیت پر یجات کو عملی جامہ اکبر کے زمانہ مین تان سین امیر خسرو اور سدارنگ نے پہنایا..... بیرونی نے سنسکرت کی بیس نادر الوجود کتابون کا ترجمہ کیا" اس قبیل کے اور بیانات مین، پیچ در پیچ غلطیان ہین، اولاً کسی مذہب و قوم کے میل جول سے مسلمانون مین جو چیز بھی ایسی پیدا ہو، جو اسلامی تعلیم کے خلاف ہو وہ قابل ترک ہے، اس کو کسی ثبوت مین نہیں پیش کیا جاتا، پھر مؤلف نے جو ثبوت پیش کئے ہین، اس مین بھی غلط بیانی ہے، اکبر کی انتہائی رواداری اور ہندو تہذیب سے عشق کو حضرت سلیم چشتی سے کوئی تعلق نہین، یہ اسکی بے دینی اور اسلام دشمنی کا نتیجہ تھا، اوس نے اسلام اور مسلمان دونون کو جو نقصان پہنچایا، اوس کی تلافی آج تک نہ ہو سکی، دارا شکوہ گو اکبر کی طرح دشمن اسلام تو نہ تھا، لیکن اس کی دینی گمراہی بھی اس سے کم نہ تھی، اگر اورنگ زیب نہ پیدا ہو گیا ہوتا، تو ان دونون نے اسلام کو مسخ کرنے مین کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی، حضرت امیر خسرو ہندوستانی موسیقی مین ضرور کمال رکھتے تھے لیکن اس کے علاوہ ان کو اور کسی نوع کی ہندویت سے کوئی علاقہ نہ تھا، وہ ایک سچے مسلمان اور پاک باطن صوفی تھے، گرونانک اسلامی تصوف اور ہندو فلسفہ کی پیداوار نہ تھے، بلکہ اسلامی توحید کی پیداوار تھے، اکبر کے زمانہ مین امیر خسرو کے سنگیت پر یجات کو عملی جامہ پہنانے کی تحقیق بھی خوب ہے، دونون کے درمیان صدیون کا فرق ہے، ۷۲۵ھ مین امیر خسرو کی وفات ہوئی اور ۹۴۹ھ مین اکبر پیدا ہوا، بیرونی نے سنسکرت کی چند کتابون کا ضرور ترجمہ کیا لیکن ان کی تعداد بیس بتانا غلط ہے، اس قبیل کی اور غلطیان بھی ہین بہرحال کلچر اور قومیت کی بحث کو چھوڑ کر اور حیثیتون سے کتاب بہت اچھی اور پر از معلومات ہے،

خطوط غالب (جلد اول) مرتبہ جناب پریش پرشاد صاحب تقطیع بڑی ضخامت ۴۰۸ صفحے کاغذ سپید، ٹائپ بہتر قیمت مرقوم نہین، پتہ ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد،

مرزا غالب کے خطوط اپنی جدت اور سادگی و پرکاری کے لحاظ سے اردو زبان میں سہل ممتنع کا درجہ رکھتے ہیں، اردو کے طرزِ انشا میں کتنے ہی تغیرات ہوں لیکن ان خطوط کی بہار بے خزاں ہے، ان کی دلآویزی اور تازگی میں کبھی فرق نہ آئے گا، مرزا کے خطوط کے کئی مجموعے عود ہندی اُردوئے معلّٰی اور مکاتیب غالب شائع ہو چکے ہیں، اول الذکر کے کئی کئی اڈیشن نکل چکے ہیں، لیکن ان میں کتابت وطباعت کی غلطیاں بکثرت ہیں بعض اڈیشن تو بالکل مسخ ہیں، پھر انکے خطوط میں تاریخی ترتیب کا التزام نہیں ہے، بہت سے خطوط میں سرے سے تاریخیں ہی نہیں ہیں، مکاتیب غالب مرتبہ مولوی امتیاز علی صاحب عرشی البتہ ان نقائص سے پاک ہے لیکن اس میں صرف والیان رامپور اور ان کے متوسلین کے نام کے خطوط ہیں، ان مجموعوں کے علاوہ غالب کے خطوط کی ایک معتدبہ تعداد ایسی ہے، جو ان میں سے کسی میں نہیں ہے، ان میں سے بعض خطوط کتابوں یا رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں، اور بعض اب تک لوگوں کے پاس قلمی موجود ہیں، جن کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی منشی نہیش پرشاد صاحب نے جن کو غالب کے خطوط کے لفافوں تک سے شغف ہے، بڑی تلاش و محنت سے ان تمام متفرق خطوط کو جہاں تک مل سکے، حاصل کرکے اور ان تینوں مجموعوں کے خطوط کو ملا کر تاریخی ترتیب کیساتھ ۴۵۲ خطوط کا یہ جامع اور صحیح مجموعہ مرتب کیا ہے، کتاب کی ترتیب و تصحیح کی نظر ثانی ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے جن کی اس باب میں دیدہ وری اور ژرف نگاہی مسلّم ہے، فرمائی ہے، جو کتاب کی صحت کی سب سے بڑی ضمانت ہے، موصوف کے قلم سے مکاتیب غالب کے مجموعوں اور ان کے مختلف اڈیشنوں کے حالات اور مرزا کے رسم الخط اور اس کے ضمن میں اردو کے مروجہ رسم الخط پر جو ڈاکٹر صاحب کا دلپسند موضوع ہے، مفید نقد و تبصرہ ہے، ان خطوط میں ان کی ادبی خوبیوں سے قطع نظر اردو فارسی نظم و نثر اور شعر و ادب اور اس عہد کے متفرق واقعات و حالات کے متعلق جن کی حیثیت اب تاریخ کی ہو گئی ہے، مفید معلومات ہیں، اس لئے یہ مجموعہ علمی اور تاریخی حیثیت سے بھی معلومات کا ایک قیمتی

ذخیرہ ہے، منشی محبش پرشاد نے اسے مرتب اور اکیڈمی نے اُسے شائع کرکے اردو زبان کی گرانقدر خدمت انجام دی ہے،

اسلام اور مسیحیت مولفہ مولینا ثناء اللہ صاحب امرتسری تقطیع اوسط ضخامت ۲۲۴ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت عمدہ پتہ:۔ دفتر اہلحدیث امرتسر،

مسلمانون اور عیسائیون کے درمیان بحث ومناظرہ اور ایک دوسرے کے مذہب پر تنقید کا پرانا طریقہ عرصہ ہوا بند ہو چکا لیکن پنجاب کے دیسی عیسائی پیٹ کی خاطر اب بھی اس دھندے کو قائم کئے ہوئے ہین، چنانچہ پادری برکت اللہ صاحب نے اسلام پر مذہب عیسوی کی برتری کے ثبوت مین تین کتابین توضیح البیان فی اصول القرآن مسیحیت کی عالمگیری اور دین فطرت اسلام ہے یا مسیحیت لکھی ہین، اس مین یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، کہ اسلام کے اصول فطرت کے خلاف ہین، ان مین عالمگیر ہونیکی صلاحیت نہین اصل دین فطرت مسیحی ہے، مولینا ثناء اللہ صاحب نے جن کا قلم پنجاب کے اکھاڑے مین شمشیر مجاہد کی حیثیت رکھتا ہے، ان تینون کتابون کے جواب مین اسلام ومسیحیت لکھی ہے، اور اپنے خاص انداز مین تینون دعوون کی پوری تردید کی ہے، اور بائبل سے موسوی اور عیسوی مذہب کی غیر فطری تعلیمات ان کی تنگی سختی اور درشتی اور اس کے مقابلہ مین اسلام کی فطری تعلیمات، ان کی سادگی سہولت اور وسعت کو دکھایا ہے، اور پادری صاحب نے اپنی کوتاہ نظری سے اسلام کی جن تعلیمات پر اعتراض کیا ہے، مولینا نے اوس سے زیادہ سخت تعلیمات بائبل سے پیش کردی ہین، جن لوگون کو مناظرہ کا ذوق اور اس قسم کے مسائل سے دلچسپی ہو، ان کے لئے اس کتاب مین کافی سامان ہے، ماشاء اللہ مولینا کا قلم اس بوڑھاپے مین بھی پر جوان ہے لیکن یہ تعجب ہے کہ مولینا جیسے کہنہ مشق کے قلم سے بعض عام پنجابی غلطیان اب تک سرزد ہوتی ہین، جیسے "مین نے بکر سے سو روپے لینا ہے"، صفحہ ۳۲، یا "اوس کے احکام کا بل عمل ہین"، صفحہ ۴۹،

ہم نے اس کا بل کو اپنی قابلیت سے پہلے کا بل پڑھا، غالبا یہ کاتب کی غلطیاں ہین بعض مسائل جیسے چھ مہینہ دن اور چھ مہینے رات والی سرزمین مین روزہ کے عدم وجوب کے مسئلہ مین ہمین مولف سے اختلاف ہے، حدیث دجال اقدر دھا جواب کی صحیح صورت تھی، قتل مرتد کے مسئلہ مین بھی اختلاف کی گنجایش ہے، نقل اعتراض کے سلسلہ مین پادری برکت اللہ کی ایک عبارت ہے کہ "ذات الوہیم مین باپ بیٹا اور روح القدس تین اقنوم ہین، اور اس کے لئے متی ۱۸ - ۱۹ کا حوالہ دیا گیا ہے لیکن افسوس کہ متی کے اس حوالہ مین یہ مضمون کہین نہین، پادری صاحب کو اس مضمون کا صحیح حوالہ اگر موجود ہو تو ضرور بتانا چاہئے،

ٹیپو سلطان مرتبہ محمد عبداللہ صاحب بٹ بی اے آنرز تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۳۹ صفحے کاغذ، کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد عہ، بے جلد عہ، قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور

گذشتہ سال آل پنجاب مسلم اسٹوڈنس فیڈریشن نے ہندوستان کے مجاہد اعظم سلطان ٹیپو شہید کی یادگار مین یوم ٹیپو منایا تھا، اس مین سلطان کے متعلق مختلف مضامین پڑھے گئے، فیڈریشن کے سکریٹری جناب عبداللہ بٹ نے ان مضامین کو کتابی صورت مین مرتب کر دیا ہے، اس میں سلطان کے حالات اوس کے اخلاق و سیرت سیاسی وانتظامی قابلیت طرز جہانبانی اور سیاسی مجاہدات وکارنامون پر بہت سے مفید مضامین ہین، اور بعض انگریز مصنفین نے سلطان کے خون بیگناہی سے اپنی قوم کا دامن بچانے کے لئے سلطان کے خلاف جو الزامات لگائے ہین، خود انگریزون ہی کی تحریرون سے اس کی پوری تردید کی گئی ہے، اس مجموعہ کا کوئی مضمون فائدہ سے خالی نہین مولینا محمد علی صاحب ایم اے کنٹب مدراس جناب ہروسالک عبداللہ بٹ صاحب اور پروفیسر سلیم چشتی کے مضامین خاص طور سے پڑھنے کے لائق ہین ان کے مطالعہ سے سلطان کی سطوت وعظمت جاہ وحریت اور اعلیٰ دماغی صلاحیتون کی پوری تصویر نگاہ کے سامنے آجاتی ہے،

صبح نشاط جناب اصغر حسین صاحب نظیر لدھیانوی تقطیع اوسط ضخامت ۴۰۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت غیر مجلد سے مجلد للعہ پتہ مزل حسین خاں ایڈیٹر اورنٹیل اشرف لدھیانہ

سر اقبال مرحوم کے اثر نے پنجاب میں جن شعراء کو پیدا کیا، ان میں ایک ممتاز نام جناب نظیر لدھیانوی کا ہے، وہ نئے دور کی پیداوار ہیں، ان کا کلام شاعری کے نئے رجحانات کا نہایت اچھا ترجمان، اس کے محاسن کا حامل اور اسکی خامیوں اور بے اعتدالیوں سے پاک ہے انھوں نے حال کو ماضی سے وابستہ اور ملک قوم اور وطن کو اپنے اپنے درجہ پر رکھا ہے، ان کی شاعری کا دائرہ نہایت وسیع ہے، چنانچہ صبح نشاط میں ہر رنگ و بو کے نہایت پاکیزہ اور ستھرے نمونے موجود ہیں، جذبات فطرت بھی ہیں معارف ملت بھی مناظر قدرت بھی ہیں، مذہب و سیاست بھی، پند و موعظت بھی ہے، اور اخلاق و حکمت بھی، حسن کی داستان بھی ہے اور عشق کی زبان بھی، غرض اس مجموعے میں شاعر کے ساز شاعری کا ہر نغمہ موجود ہے، قوم و ملت نظیر کی شاعری کا خاص مرکز ہے اسلئے اس مجموعہ میں یہی عنصر غالب ہے اور اس سے متعلق ہر قسم کی قومی مذہبی اور تاریخی نظمیں ہیں، پورا مجموعہ خیالات کے اعتبار سے بلند و پاکیزہ اور شعری و ادبی حیثیت سے اسقام شاعری سے پاک ہے چند فارسی نظمیں بھی ہیں

مسلمانوں کی دنیا مسلمانوں سید الطاف علی صاحب علوی تقطیع اوسط ضخامت ۴۵ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت معلوم نہیں، پتہ نظامی پریس بدایوں،

مولوی الطاف علی صاحب بریلوی ان اصحاب میں ہیں، جو مسلم ایجوکیشنل کے فرائض منصبی کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی خدمت بھی کرتے رہتے ہیں، ان کے قلم سے متعدد مفید کتابیں نکل چکی ہیں "مسلمانوں کی دنیا" انکا ایک اصلاحی افسانہ ہے اس میں مسلمانوں کے عیوب انکے لغو مشاغل اخلاقی کمزوریوں اور معاشرتی خرابیوں کو دکھایا گیا ہے جس سے انکی اخلاقی تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے اس افسانے سے یہ بھی سبق ملتا ہے کہ قومی کام کرنیوالوں کی کوششیں رخنہ اندازیوں کے باوجود بالآخر کامیاب ہوتی ہیں (م)

"جلد ۴۸" "ماہ شوال المکرم ۱۳۶۰ھ مطابق نومبر ۱۹۴۱ء" "عدد ۵"

مضامین

شذرات	سید سلیمان ندوی	۳۲۲-۳۲۴
عہد نبوی کا نظام تعلیم،	ڈاکٹر محمد حمید اللہ ایم اے، پی ایچ ڈی پروفیسر جامعہ عثمانیہ،	۳۲۵-۳۴۶
تیموری شاہ زادوں کا علمی ذوق،	جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ایم اے رفیق دارالمصنفین،	۳۴۷-۳۶۸
تاریخ ملک ارسلان سلجوقی،	جناب غلام مصطفیٰ خاں صاحب ایم اے اسسٹنٹ لکچرار کنگ اڈورڈ کالج امراوتی	۳۶۹-۳۸۰
خانان سیر اور دہ،	جناب مولوی عنایت اللہ صاحب بی اے دہلوی سابق ناظم دارالترجمہ حیدرآباد،	۳۸۱-۳۹۰
اخبار علمیہ،	"ص ع"	۳۹۱-۳۹۴
مطبوعات جدیدہ،	"م"	۳۹۶-۴۰۰



شذرات

مجلس نظامِ اسلامی کی خواہش کے مطابق اسلام کے سیاسی و اقتصادی نظامات پر جو کتاب لکھی جارہی تھی اس کا پہلا حصہ جو سیاسی نظام پر ہے تقریباً مکمل ہوگیا ہے، مولانا اسحاق صاحب ندوی سندیلوی سابق مدرس جامع العلوم کانپور اس کو مرتب کر رہے ہیں، موصوف انگریزی بھی جانتے ہیں اور انھوں نے ان مسائل کا کافی مطالعہ کیا ہے اور ان پر رسائل اور مضامین بھی لکھتے رہتے ہیں

ایران اس وقت جس سیاسی کشمکش میں ہے اس سے کون واقف نہیں لیکن یہ بات حیرت سے سُنی جائیگی کہ اس کشمکش اور پریشانی کے ساتھ ساتھ علم وفن کی خدمت کرنے والے اس حالت میں بھی اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں، اسی ہفتہ ایران سے ایک نئی کتاب درۃ التاج لغرۃ الدباج فارسی میں تصنیف علامہ قطب الدین شیرازی المتوفی ۷۱۰ھ چھپ کر آئی ہے، دباج اس زمانہ میں گیلان کا ایک امیر تھا جس کے نام پر یہ کتاب لکھی گئی ہے، کتاب قدیم فلسفہ وحکمت کی ساری شاخوں پر ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے، بالفعل اس کے پانچ حصے شائع ہوئے ہیں، سید محمد مشکوٰۃ نام ایک ایرانی فاضل نے متعدد قلمی نسخوں کی مدد سے اس کی تصحیح کی ہے، اور شروع میں تصنیف اور مصنف پر ایک فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے

ہر زمانہ میں پیروانِ مذہب کے اندر اہلِ عقل اور اہلِ نقل کے دو گروہ قائم رہے ہیں اور آج بھی موجود ہیں، اہلِ عقل یہ چاہتے رہے ہیں کہ ہر زمانہ میں جو علوم، خیالات اور افکار پیدا ہوتے رہتے ہیں، دین کو اس زمانہ کے

لوگوں میں قابلِ قبول بنانے کے لئے اس کی ترجمانی ہر زمانہ میں اس کے علوم و افکار کے مطابق کیجاتی رہے،

بات یہ ہے کہ ہر زمانہ میں ایک نہ ایک کوئی ایسا نظری خیال پیدا ہوجاتا ہے جو ہر طرح مشکوک، ناپائدار اور بے دلیل ہونے کے ساتھ اس درجہ یقینی، پائدار اور مدلل معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کا ہر انسان اس کو بے چون وچرا تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوجاتا ہے، متکلمین یہ چاہتے اور کرتے رہے ہیں کہ دین کی تعبیر اور اس کے مسائل کی ترجمانی اسی کے مطابق کردیں تاکہ اس زمانہ کے لوگ ان کو آسانی سے قبول کرلیں،

ابھی جدید علم کلام کی آفرینش کو نصف صدی بھی نہیں گذری کہ اس پر چار دور گذر گئے، سرسید نے جن کے زمانہ میں سائنس کا نیا نیا زور تھا، فطرت اور انکار خرقِ عادت کے اصول پر اس کو تول کر پیش کیا، ان کی اس ترازو پر جو مسئلہ پورا اترا اس کو مانا، اور جو نہیں آیا وہ کم و بیش کرکے اگر پورا آگیا تو اسی کمی بیشی کے ساتھ اس کو قبول کرلیا، اور اس پر بھی جو نہیں آیا اس کو رد کردیا، مولنا شبلیؒ کے عہد میں جدید تہذیب و تمدن کی گرم بازاری ہوئی تو انکی ساری عمر اسلام اور مسائلِ اسلام کو تہذیب و تمدن یا سویزیلیشن کے اصول پر سمجھنے اور سمجھانے میں گذر گئی، اور اسی لئے وہ ہمیشہ تاریخ اسلام اور تواریخ سلاطین اسلام سے تمدنی مسائل کی تحقیق کرکے اور ان کو موجودہ زمانہ کی تہذیب و تمدن کے نقطۂ نظر سے مستحسن کرکے دکھاتے رہے،

ان کے بعد تیسرا دور سیاسیات کا آیا جس میں عقائد و عبادات کے بجائے اسلامی مسائل میں سے سیاسیات کی بحث اہم ہوگئی اور ان کی تعبیر جمہوریت، دستوریت، نظامِ شوریٰ، خلافت، امارت و ملوکیت اور دین و ملت اور وطنیت میں تطبیق کی صورت میں نمایاں ہوئی، اس کے بعد ہی باشتوازم نے جنم لیا

توپیٹ اور روٹی اور مزدوری کے نظریے سامنے آگئے، متکلمین عصر نے ان کی تطبیق کی طرف توجہ فرمائی ہی تھی کہ یورپ کی یہ جنگ سامنے آگئی اور نازی ازم اور فسزم کی تحریکوں کی قوت ظاہر ہوئی، اب اس زمانہ کے متکلم اسلام ایک تحریک کا نام رکھ کر سارے مسائل کی گتھیوں کو حل کرنے میں مصروف ہیں، آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا ؟

لیکن دوسرا فریق جو اہل نقل کا ہے اس کے نزدیک اسلام کے حقائق و مسائل اپنی جگہ پر خود مستقل ہیں، ان کی تعبیر و ترجمانی کسی زمانہ میں بھی کسی عارضی مصالحت اور ہنگامی تطبیق کی خاطر ایسی نہیں کرنی چاہئے کہ دین اطفال عقلی کا بازیچہ بن جائے اور اس کی اپنی اصل مستقل حیثیت کے بجائے دوسروں کے ضمیمہ کی ہو جائے، جو دھوپ چھاؤں کی طرح ہر نئی حرکت آفتاب کے ساتھ نیا نیا رنگ بدلتا رہے،

اہل عقل کے نظریہ کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس میں دین پر براہ راست قلبی یقین کے بجائے عقلیات کے سہارے یقین ثانوی پیدا کرنے کی کوشش کیجاتی ہے، یہ سہارا جہاں ہٹا عقائد و اعمال کی ساری عمارت نیچے بیٹھ جاتی ہے، اس کی دوسری کمزوری یہ ہے کہ چونکہ اس میں دین کی کوئی مستقل حیثیت قائم نہیں رہتی، بلکہ ہر عصر اور زمانہ میں اس کے نئے نئے قالب بدلتے رہتے ہیں اور اس کی نئی نئی شکلیں نکلتی رہتی ہیں، اس لئے یہیں سے فرقہ آرائی کا سامان پیدا ہوتا ہے، اور نئے نئے فرقوں کا ظہور ہوتا ہے، اور پھر ہر طرف سے اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَکَانُوْا شِیَعًا کی لعنت برسنے لگتی ہے،

مقالات

عہدِ نبوی کا نظامِ تعلیم

از

ڈاکٹر محمد حمید اللہ پروفیسر جامعہ عثمانیہ

عرب اور بالخصوص مکہ معظمہ کی معاشرتی حالت کا جو قبل اسلام پائی جاتی تھی، اگر قریب سے مطالعہ کیا جائے، تو ناگزیر اس نتیجہ پر پہونچنا پڑتا ہے، کہ اس زمانہ کے عربوں میں غیر معمولی صلاحیتیں پائی جاتی تھیں جب اسلامی تعلیمات نے ان صلاحیتوں کو صیقل کیا، تو عربوں نے اپنی اپج اور کارکردگی کی قابلیت سے دنیا کو حیران کر دیا، اور جب "وحدت اور حرکت کے مذہب" یعنی اسلام نے ان کی توانائیوں کو ایک مرکز پر جمع کیا، اور ان میں مزید قوت پیدا کر دی تو یہی عرب اس قابل ہو گئے کہ پوری دنیا کو مبارزت دیں، اور وقتِ واحد میں اس وقت کی دونوں عالمگیر شہنشاہیتوں یعنی ایران اور روم (بیزنطینہ) سے جنگ کریں،

میں نے اپنے بعض مقالوں میں کسی قدر تفصیل سے بتایا ہے کہ زمانۂ جاہلیت کی عربی خانہ جنگیاں عربوں کے کردار کو بنانے اور ان میں حیرت انگیز قوتِ برداشت اور دیگر اعلیٰ صفات پسند قابلیتیں پیدا کرنے میں مدد و معاون رہیں، جن پر خود نپولین[1] کو رشک تھا، عرب میں معینہ اوقات

---

[1] سینٹ ہیلینا کی یادداشتیں (فرانسیسی) جلد (۳) صفحہ ۱۸۳،

پر لگنے والے بازارون اور کاروانون کی حفاظت کے لئے بدرقون یا خفارون کا انتظام کچھ اتنا مکمل اور وسیع ہوگیا تھا کہ اوس نے پورے جزیرہ نماے عرب مین ایک معاشی "وفاق" قائم کردیا تھا جس سے عربون مین وحدت کے خیالات پیدا ہونے لگ گئے تھے، اور اسلام کے تحت ان کی "سیاسی وحدت" کا راستہ صاف ہوگیا تھا، اسی طرح شہری مملکت مکہ کا دستور بھی خاصہ ترقی یافتہ تھا جس سے وہان کے باشندون کو اس بات کی تربیت مل چکی تھی، کہ ایک عالمگیر شہنشاہیت کے نظم ونسق کو چلاسکین[1]،

آج میرے پیش نظر ایک اور مسئلہ ہے، اور وہ یہ کہ زمانۂ جاہلیت کے عربون کی علمی صلاحیتین بھی اتنی خاصی تھین، کہ ہجرت کی ابتدائی صدیون مین عربون نے علوم وفنون کی حیرت انگیز فصلین کاٹین، انہی صلاحیتون کو اجاگر کرنا، ان کی خفتہ قابلیتون کو بیدار کرنا، اور اون کو مفید اغراض مین کام مین لانا، یہ البتہ اسلام کا کارنامہ ہے،

عہد نبوی کے نظام تعلیم کا اس سے بہتر پس منظر کیا ہوگا، کہ اسلام سے پہلے عرب مین علمی حالت جیسی کچھ تھی، اس کا خاکہ پیش کیا جائے،

عرب مین زمانۂ جاہلیت مین تعلیم بدقسمتی سے ہمارے پاس زمانۂ جاہلیت کے تعلیمی معاملات کے متعلق بہت کم معلومات محفوظ ہین، اسکی کچھ تو یہ وجہ ہے، کہ اس زمانے مین وہان لکھنے کا زیادہ رواج نہ تھا، اور کچھ یہ کہ لاکھون کروڑون کتابین ہلاکو خان وغیرہ نے بغداد قرطبہ اور دیگر مقامات پر ایسے زمانے مین تباہ کردین، جب کہ ابھی فن طباعت سے کتابین چھاپنے کا کام نہین لیا جانے لگا تھا، اس دشواری کے باوجود جو کچھ تھوڑا بہت مواد ہم تک پہونچ سکا ہے، اسکی مدد سے زمانۂ جاہلیت کی تعلیمی حالت کا پتہ چلتا ہے جس سے ہمین حیرت ہوتی ہے اور اس

[1] شہری مملکت مکہ جو رسالہ اسلامک کلچر جلد (۱۲) شمارہ ۳ مین شائع ہوا ملاحظہ ہو،

قوم کے متعلق رشک ہونے لگتا ہے، جو اَن پڑھ ہونے پر اتراتی تھی[1]

اولاً اون کی زبان کو لیجئے، یہ خیال کیا جاتا ہے، کہ کوئی زبان اپنے لغات، محاورات اور ادبی کمالات مین اس زمانے مین ترقی کرتی ہے، جب اوس کے بولنے والون کا تمدن عروج پر ہو، اور اس سے پہلے اوس زبان کی حالت اتنی پست ہوتی ہے، کہ اوس کو جانورون کی آواز سے کچھ ہی بلند قرار دیا جاسکتا ہے، کیونکہ اس وقت اس زبان مین نہ تو اونچے خیالات ادا کیے جاسکتے ہین، اور نہ معمولی روزمرہ کی ضرورتون کے سوا اس مین کوئی علوم و فنون ملتے ہین، اگر اس معیار پر اسلام سے پہلے کی عربی زبان کو جانچا جائے، تو ہم زبان کی نزاکت، لغات کی کثرت، قواعد صرف و نحو کے استحکام اور خاصے بلند معیار کے نظم کے ذخیرے کے باعث حیرت زدہ ہو جاتے ہین، یہ بات بھی یاد رکھنے کی قابل ہے، کہ مستند عربی زبان زمانۂ جاہلیت کی سمجھی جاتی ہے، اسلامی تمدن کے عہد زرین کی زبان کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہوئی اگر اگر ہم زمانۂ حال کی کوئی زبان مثلاً جرمن، روسی، فرانسیسی یا انگریزی کو لین، تو ان کے دو مؤلف جن مین مثلاً ڈیڑھ ہزار سال کا زمانہ حائل ہو تو ایک ہی زبان کے یہ مؤلف ایک دوسرے کو بالکل نہین سمجھ سکین گے، اس کے برخلاف امرء القیس کی زبان اور قواعد صرف و نحو بالکل وہی ہین جو مثلاً زمانۂ حال کے مصری شعراء شوقی اور حافظ کے ہین، قرآن اور حدیث اس "جاہلی زبان" مین ہین جس پر عربی شہنشاہیت کے تمدن نے کوئی اثر قائم کرنے کا موقع نہین پایا تھا، قرآن اور حدیث زمانۂ جاہلیت کے بدویوں کو بھی اسی سہولت سے سمجھ مین آتے تھے،

---

[1] خود ایک حدیث مین ہے "ہم ایک اُمّی قوم ہین، لکھنا اور حساب کرنا ہمین نہین آتا" مختصر جامع بیان العلم ص ۳۵
معارف، اصل حدیث صحیح بخاری وغیرہ مین بھی ہے مگر اس مین فخر کا شائبہ نہین، بلکہ قمری مہینون کے اختیار کی وجہ بتائی گئی ہے،

جتنا آج کسی جدید عربی کے متعلم کو، اسی زمانے مین عربی زبان لغات کی حد تک اتنی وسیع اور متمول ہوگئی تھی، کہ اس کا مقابلہ زمانہ حال کی انتہائی ترقی یافتہ مغربی زبانون سے بھی بآسانی کیا جاسکتا ہے، ان چیزون کی مجھے تفصیل بیان کرنی غیر ضروری ہی، کیونکہ ہر عربی دان اس سے واقف ہے، میرا منشا، صرف اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے، کہ اسلام سے پہلے عربون کی زبان جس پختگی اور وسعت سے بہرہ ور ہو چکی تھی، وہ یقیناً اس بات کے بغیر ممکن نہین، کہ اس سے پہلے اس زبان کے بولنے والون مین ادبیات کی بڑی صلاحیتین اور بڑے چرچے رہے ہون، بے شمار نظمین زمانہ جاہلیت کی طرف منسوب ہین، خود نثر مین بہت سے خطبون، تقریرون، ضرب المثلون، کہانیون، کاہنون، اور حکمون (پنچ) کے فیصلون وغیرہ کی صورت مین ہم تک ان کی یادگارین پہنچی ہین، ان کے دیکھنے سے ہر ناظر یہ اندازہ کرلے گا، کہ اس زمانہ کے عربون مین بلاغت، ظرافت، حسن ذوق، اور دقت نظر کا معیار کتنا بلند تھا،

خود لفظ "عرب" کے معنی ہین وہ شخص جو اپنا مطلب اچھی طور سے واضح کرسکتا ہو، تمام غیر عرب عجم کہلاتے ہین، جس کے معنی گونگے کے ہین،

یہانتک تو استنباطات اور قیاس آرائیان ہوتی رہین، خود تاریخی واقعات بھی مفقود نہین ہین، مدرسون کے سلسلے مین کسے یقین آئے گا کہ اس زمانے مین وہان نہ صرف تعلیم گاہین تھین بلکہ ایسی تعلیم گاہین جن مین لڑکے اور لڑکیان دونون تعلیم پاتی ہون،؟ بہرحال ابن قتیبہ نے عیون الاخبار (جلد ۴ صـ۱۳۱) مین بیان کیا ہے، کہ مکہ کے قریب رہنے والے قبیلہ ہذیل کی ضرب المثل فاحشہ عورت ظلمہ جب بچی تھی، تو ایک مدرسہ جاتی تھی، جہان اس کا سب سے دلچسپ مشغلہ یہ تھا کہ دواتون مین قلم ڈال اور نکال کر کھیلا کرے، اس دلچسپ واقعے سے اتنا تو معلوم ہوجاتا ہے کہ قبیلۂ قریش کے رشتہ دار قبیلۂ ہذیل مین ایسے مدرسے تھے، جو چاہے کتنے ہی ابتدائی نوعیت کے کیون نہ ہون،

ان مین لڑکے اور لڑکیان تعلیم پانے کے لئے جاتی تھین،

بازار عکاظ مین ہر سال جو ادبی چرچا ہوا کرتا تھا اس کے باعث اسے ایک "پان عرب لٹریری کانگریس" کہنا بے جا نہ ہوگا، عکاظ نے مورخین اور مؤلفین کو ہمیشہ سے ہی ابھار رکھا ہے، حال مین جامعہ مصریہ کے پروفیسر احمد امین نے مجلہ کلیۃ الادب مین اس موضوع پر ایک بہت اچھا مضمون لکھا ہے، مجھے یہان عکاظ کی علمی سرگرمیون کی تفصیل کی ضرورت نہین یہان اس قدر کافی ہے کہ اس ادارے کا صرف نام لے لیا جائے، جس نے عربی زبان کو معیاری بنانے کے لئے اتنا نمایان حصہ لیا ہے[1]

غیلان بن سلمہ ثقفی کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ہفتہ مین ایک دن علمی جلسہ منعقد کرتا جس مین نظمین پڑھی جاتین، اور ان پر تنقید ہوتی ہفتے کے باقی دنون مین وہ کسی دن عدل گستری کا کام انجام دیتا اور کسی دن دوسرے فرائض مین مشغول ہوتا، اس واقعہ سے معلوم ہوسکتا ہے کہ جاہلیت مین طائف والون کا علمی ذوق بھی کتنا بلند تھا،

اس زمانے مین مکہ کی علم دوستی اس سے بھی کچھ زیادہ ہی بلند تھی، سبع معلقات مکہ ہی کے معبد کعبہ مین لٹکائے جاتے رہے، اور اسی اعزاز و امتیاز نے ان سات نظمون کو عربی ادبیات مین ایک لافانی زندگی عطا کر دی ہے،

ورقہ بن نوفل مکہ کا ایک باشندہ تھا، اوس نے زمانہ جاہلیت مین توریت اور انجیل کو عربی مین منتقل کیا تھا،

غالبًا یہ مکہ والے ہی تھے جنھون عربی زبان کو سب سے پہلے ایک تحریری زبان کی

---

[1] الازمنہ والامکنہ، مؤلفہ مرزوقی جلد ۲ صفحہ ۹، تا صفحہ ۱۰ نیز معارف ابن قتیبہ،

حیثیت عطا کی تھی[۱] غالباً یہی وجہ تھی کہ یہان کے اجڈ سپاہی بھی لکھے پڑھے ہوا کرتے تھے، اس کی مزید تفصیل آگے آئیگی،

قصہ نویسی، ناول اور ڈرامہ زمانۂ حال میں ادبیات مین بہت بڑی اہمیت رکھتے ہین، مکہ والون کو بھی اس کا بڑا ذوق تھا، چنانچہ چاندنی راتون مین خاندانی اجتماع گاہون پر یا شہر کے مرکزی دارالندوہ مین یہ لوگ جمع ہوتے، اور پیشہ ور قصہ گو وغیرہ وہان برجستہ یا سنے ہوئے قصے بیان کرکے دلچسپی کا سامان مہیا کرتے، اس کے کچھ حوالے میرے مضمون شہری مملکتِ مکہ مین ملین گے،

ادبی ذوق جاہلیت مین صرف عربون ہی مین نہ تھا، بلکہ عرب مین رہنے والی دوسری قومون مین بھی اس کا پتہ چلتا ہے، چنانچہ یہودی سموأل بن عادیا اور دیگر یہودی اور نصرانی شعرا کے دیوان بھی پائے جاتے تھے، مدینہ منورہ کے یہودیون نے ایک بیت المدراس قائم کر رکھا تھا جو نیم عدالتی اور نیم تعلیمی ادارہ ہوا کرتا تھا، اور اسلام کے آغاز تک اس کا پتہ چلتا ہے، (دیکھئے سیرۃ ابن ہشام مین غزوۂ بنی قینقاع وغیرہ)

زمانۂ جاہلیت مین عربی زبان مین لکھنے پڑھنے کی چیزون کے لئے بڑی کثرت سے الفاظ ملتے ہین، چنانچہ صرف قرآن مجید مین ہی حسب ذیل الفاظ کا ذکر ہے :-

رق اور قرطاس (کاغذ) قلم، نون (دوات) نستنسخ، مرقوم، مسطور، مستطر، مکتوب، تخطہ، تملی، یملل (لکھنے کے معنی میں جو مختلف افعال پائے جاتے ہین، یہ ان کے صیغے ہین) کاتب، مداد (سیاہی) اسفار، زبر، کتب، صحف (کتابون اور تحریری چیزون کے معنون مین) وغیرہ،

---

[۱] فہرست ابن ندیم صفحہ نیز کتاب الخراج مؤلفہ قدامہ بن جعفر کا ٹکڑا جو آکسفورڈ مین ہے (مگر غلطی سے قلاتہ کی طرف منسوب ہے)

غرض ان اور اسی طرح کی مماثل بنیادوں پر علوم و فنون کی وہ بلند عمارتیں بعد میں زمانۂ اسلام کے عربوں نے کھڑی کیں جن پر پورے کرۂ ارض کی علمی دنیا فخر کر سکتی ہے،

قبل ہجرت اسلام

یہ چیز عام طور سے معلوم ہے کہ اسلام کا آغاز اس وقت سے ہوا، جب حضرت محمد صلعم پر چالیس سال کی عمر میں پہلی وحی اتری، اس بات کا کوئی پتہ نہیں چلتا، کہ نوعمری میں آپ نے لکھنے اور پڑھنے کے فن میں حصہ لیا ہو، یا آپ عمر بھر اُمی ہی رہے اس کے باوجود یہ کس قدر اثر انگیز واقعہ ہے، کہ خدا کے پاس سے آپ کو جو سب سے پہلی وحی آئی، اس میں آپ کو اور آپ کے متبعین کو "اقراء" یعنی پڑھنے کا حکم تھا، اور قلم کی ان الفاظ میں تعریف کی گئی تھی، کہ جملہ انسانی علم اسی سے ہے :-

"پڑھ اپنے رب کے نام سے جو خالق ہے جس نے انسان کو ایک جمے ہوئے قطرۂ خون سے پیدا کیا، پڑھ یہ تیرا بزرگ پروردگار ہی ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے تعلیم دی اور انسان کو وہ چیز بتائی، جسے وہ نہیں جانتا تھا"

(قرآن مجید سورۂ ۹۶ - آیۃ تمام)

ایک حدیث میں رسول کریم صلعم نے بیان فرمایا ہے کہ خدا نے سب سے پہلے قلم ہی کو پیدا کیا،[1]

سہولت کے لئے ہم بھی وہی مشہور تقسیم اختیار کر سکتے ہیں، جو قبل ہجرت و بعد ہجرت کے نام سے رسول کریم صلعم کی زندگی کے متعلق استعمال کی گئی ہے، اور اسی تقسیم سے وہ زمانے بھی

---

[1] ترمذی ۲۹۴۲ - ابو داؤد ۲۹۴۲ ، ابن حنبل جلد (۵) صفحہ ۳۱۵ طبع سی صفحہ ۵۷۰ ،

متعین ہو جاتے ہین، جب آپ کے ہاتھ مین دنیاوی اقتدار تھا یا نہ تھا،

یہ امر نمایان کئے جانے کے قابل ہے کہ قریب قریب وہ تمام آیتین جن مین لکھنے پڑھنے یا علم سیکھنے کا ذکر ہے، وہ مکی آیتین ہین، اس کے برخلاف مدنی آیتون مین کام کرنے اور تعمیل کرنے پر زیادہ زور دیا گیا ہے، چنانچہ

۱۔ کیا وہ لوگ جو جانتے ہین اور جو نہین جانتے، برابر ہو سکتے ہین،

(قرآن مجید ۳۹/۹)

۲۔ تم کو علم سے تھوڑی مقدار دیگئی ہے، (" ۱۷/۸۵)

۳۔ اللہ سے اس کے بندون مین صرف عالم ہی ڈرتے ہین، (" ۳۵/۲۸)

۴۔ اور کہہ میرے آقا مجھے علم مین زیادتی عطا کر، (" ۲۰/۱۱۴)

۵۔ تمھیں وہ چیز سکھائی گئی، جو نہ تم جانتے تھے، اور نہ تمھارے آباؤ اجداد،

(قرآن مجید ۶/۹۲)

۶۔ اگر زمین کے تمام درخت قلم بن جائین، اور سمندر سات دیگر سمندرون کیساتھ سیاہی بن جائے تو بھی خدا کے کلمات ختم نہ ہو سکین، (قرآن مجید ۳۱/۲۷)

۷۔ قسم ہے پہاڑ کی، اور قسم ہے ایک کتاب کی جو لکھی ہوئی ہے ایک جھلی پر جو پھیلائی گئی ہے،

(قرآن مجید ۵۲/۱تا۳)

۸۔ قسم ہے دوات کی اور قلم کی اور اس چیز کی جو تم لکھتے ہو، (" ۶۸/۱)

۹۔ اگر ہم نے تجھ پر ایک واقعی تحریری چیز کاغذ پر لکھی ہوئی بھی ہوتی (قرآن ۶/۷)

۱۰۔ اگر تمھین معلوم نہ ہو، تو یاد رکھنے والون سے پوچھ لو، (" ۱۶/۴۳)

یہ تمام مکی آیتین ہین،

کسی قوم مین کسی پیغمبر کا مبعوث ہونا تعلیم کے سوا کسی اور غرض کے لئے نہیں ہوتا، چنانچہ ہمین حیرت نہ ہو کہ ایک حدیث مین رسول کریم صلعم نے فرمایا ہے کہ مین ایک معلم بنا کر بھیجا گیا ہون[1]، اسکی تائید قرآنی آیتون سے بھی ہوتی ہے، چنانچہ فرمایا:

۱- (ابراہیم اور اسماعیل نے دعا کی): اے ہمارے آقا ان کے پاس انہی مین کا ایک رسول بھیج جو انھین تیری آیتیں سُنائے اور انھین کتاب وحکمت کی تعلیم دے، اور ان کا تزکیہ کرے، تو ہی طاقتور اور عقلمند ہے، (قرآن مجید ۲/۱۲۹)

۲- وہی ہے جس نے اُمیّون مین انہی مین کا ایک رسول بھیجا تاکہ انھین اسکی آیتیں سُنائے اُنکا تزکیہ کرے اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے، اگرچہ اس سے پہلے وہ خاص گمراہی مین مبتلا تھے، (ایضاً ۶۲/۲)

۳- بیشک خدا نے ایمان والوں پر مہربانی کی جب اوس نے ان کے پاس انہی میں کا ایک رسول بھیجا، جو اُنھیں اوس کی آیتین سناتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انھین کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے، اگرچہ اس سے پہلے وہ فاش گمراہی مین مبتلا تھے، (ایضاً ۳/۱۶۴)

حقیقت مین تبلیغ اور تعلیم ایک ہی چیز ہین، خاص کر ایسے شخص کے لئے جو مذہب و سیاست کو بالکل الگ اور ایک دوسرے سے آزاد چیزین نہ سمجھتا ہو، اور جس کا مطمح نظر یہ ہو کہ

"اے ہمارے پروردگار ہمین اس دنیا مین بھی بھلائی عطا کر اور آخرت مین بھی اور ہمین آگ کے عذاب سے بچا، (قرآن مجید ۲/۲۰۱)

بیعت عقبہ ثانیہ جیسے ابتدائی زمانہ مین جو ہجرت سے بھی دو سال پہلے منعقد ہوئی تھی کوئی ایک درجن مدینہ والون نے اسلام قبول کیا تھا، تو ان کی خواہش پر رسول کریم صلعم نے ان کے

---

[1] ابن عبد البر کی مختصر جامع بیان العلم ص۲۵ معارف ابن ماجہ باب فضل العلماء

ساتھ مکہ سے ایک تربیت یافتہ معلم[1] روانہ کر دیا تھا جو انھیں قرآن مجید کی تعلیم دیکے، اور دینیات اسلام سے واقف کرا سکے بے شبہہ اس ابتدائی زمانہ مین تعلیم سے مراد صرف مبادی دین اور عبادت کے طریقون کی تعلیم ہی ہو سکتی تھی،

زمانہ قبل ہجرت کی سب سے اہم چیز جو اس سلسلے مین بیان کیجا سکتی ہے، یہ تھی کہ آنحضرت صلعم نے کاتبوں کو مقرر کر رکھا تھا جن کا کام یہ تھا کہ جیسے جیسے وحی نازل ہوتی جائے، اس کو لکھ لین اور اسکی نقلین کرین، چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ جب حضرت عمرؓ اسلام لانے لگے، تو انھین قرآن مجید کی چند سورتین اپنی بہن کے گھر مین لکھی ہوئی ملی تھین، اور بظاہر ان کی بہن بھی پڑھنا جانتی تھین،

اس سلسلے مین سب سے آخر مین حضرت موسیٰؑ کے قصے کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہون جو قرآن شریف کی ایک مکی سورۃ (کہف) مین مذکور ہے، کہ کس طرح وہ طلب علم کے لیئے گھر سے نکلے، سفر کی صعوبتین برداشت کین، اور دل دہلانے والے تجربے حاصل کئے، اس قصے کا ماحصل یہ ہے کہ کوئی شخص کتنا ہی بڑا عالم ہو جائے، ہر چیز نہین جان سکتا، اور یہ کہ علم مین زیادتی کی خواہش ہو تو بیرونی ممالک کا سفر ناگزیر ہے[2]

بعد ہجرت

ہمارے پاس بعد ہجرت زمانے کے متعلق جو مواد ہے، اس کو سنہ وار ترتیب کی جگہ فن وار مرتب کرنا زیادہ سہولت بخش ہوگا، مثلاً مدرسون کا انتظام امتحانات، اقامت خانے ابتدائی تعلیم اور لکھنا پڑھنا سکھانے کا بندوبست، اجنبی زبانون کی تعلیم، نصاب تعلیم، عورتون کی تعلیم، صوبہ جات مین تعلیمی انتظام، صوبہ جات مین دورہ اور تفتیش کرنے والے افسر وغیرہ،

---

[1] سیرت ابن ہشام صفحہ ۲۸۹ [2] طلب علم کے لیے سفر کے سلسلے مین دیکھئے مقدمہ دارمی صفحہ ۴۶

ہم ابھی اوپر بیان کر چکے ہیں کہ رسول کریم صلعم نے ہجرت سے بھی پہلے ایک معلم کو مدینہ منورہ روانہ کیا تھا جس کے کارنامے تاریخ نے محفوظ رکھے ہیں، جب ہجرت کے بعد رسول کریم صلعم خود مدینہ منورہ پہنچے تو بیشمار اور بیحد اہم جنگی اور سیاسی مصروفیتوں کے باوجود آپ اس کے لئے وقت نکال لیا کرتے تھے، کہ مدینہ منورہ سے ناخواندگی کو دور کرنے کے کام کی شخصی طور سے نگرانی کر سکیں، چنانچہ اس سلسلے میں آپ نے سعید بن العاص رض کا تقرر کیا تھا، کہ لوگوں کو لکھنے اور پڑھنے کی تعلیم دیں، یہ بہت خوشنویس بھی تھے[۱]، رسول کریم صلعم کو خواندگی سے اتنی دلچسپی تھی، کہ ہجرت کے ڈیڑھ ہی سال بعد جب ساٹھ ستر مکہ والے جنگ بدر میں گرفتار ہو کر مدینہ لائے گئے تو آپ نے ان لوگوں کا جو مالدار نہ تھے، انکی رہائی کے لئے یہ فدیہ مقرر کیا تھا کہ مدینے کے دس دس بچوں کو لکھنا سکھائیں[۲]، حضرت عبادہ ابن الصامت رض کہتے ہیں، کہ رسول کریم صلعم نے مجھے صفہ میں اس غرض سے مامور کیا تھا کہ لوگوں کو لکھنے کی اور قرآن مجید کی تعلیم دوں[۳]،

صفہ سے مراد مکان کا مخصوص حصہ ہوتا ہے، یہ مسجد نبوی میں ایک احاطہ تھا جو اس غرض کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا، کہ باہر سے تعلیم کے لئے آنے والوں بلکہ خود مقامی بے گھرے طالب علموں کے لئے دارالاقامے کا بھی کام دے، اور مدرسہ کا بھی، اس اقامتی درس گاہ میں لکھنے پڑھنے کے علاوہ فقہ کی تعلیم دیجاتی تھی، قرآن مجید کی سورتیں زبانی یاد کرائی جاتی تھیں، فن تجوید سکھایا جاتا تھا اور دیگر اسلامی علوم کی تعلیم کا بندوبست تھا، جس کی نگرانی خود رسول کریم صلعم شخصی طور سے فرمایا کرتے تھے، اور وہاں رہنے والوں کی غذا وغیرہ کا بھی بندوبست کیا کرتے تھے، یہ طلبہ اپنی فرصت کے گھنٹوں میں طلب روزگار میں بھی مصروف ہوا کرتے تھے[۴]،

---

[۱] استیعاب ابن عبدالبر ص ۳۹۳، نیز نظام الحکومۃ النبویہ مؤلفہ کتانی ۲/۴۴ بحوالہ ابوداؤد و [۲] ابن سعد ۲/۱۴ صہیلی ۲/۹۲، مسند ابن حنبل ۱/۲۴۴ کتانی کتاب مذکور ۲/۴۴ [۳] کتانی ۲/۴۴ بحوالہ ابوداؤد وغیرہ (معارف: ابوداؤد، کتاب البیوع باب کسب المعلم) [۴] بخاری باب سریۃ بیر معونہ،

درس گاہ صفہ میں نہ صرف مقیم طلبہ کی تعلیم کا انتظام تھا، بلکہ ایسے بھی بہت سے لوگ آتے تھے جن کے مدینے میں گھر تھے، اور وہ صرف درس کے لئے وہاں حاضر ہوا کرتے تھے، وقتاً فوقتاً عارضی طور سے درس گاہ میں شریک ہونے والوں کی بھی کمی نہ تھی، مقیم طلبہ کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی اور ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک وقت ان کی تعداد ستر بھی تھی[۵۱]

مقامی طلبہ کے علاوہ دور دراز کے قبائل سے بھی طلبہ آتے، اور اپنا ضروری نصاب تکمیل کرکے اپنے وطنوں کو واپس ہوجاتے[۵۲]

رسول کریم صلعم اکثر اپنے کسی تربیت یافتہ صحابی کو قبائلی وفود کے ساتھ ان کے مسکنوں کو روانہ کردیتے تاکہ وہ اس علاقے میں دینیات کی تعلیم کا بندوبست کریں جس کے بعد وہ مدینہ واپس آجاتے[۵۳]

ہجرت کے ابتدائی سالوں میں معلوم ہوتا ہے، کہ رسول کریم صلعم کی یہ مستقل سیاست تھی کہ جب مدینہ کے باہر کے لوگ مسلمان ہوتے، تو ان کو حکم دیا جاتا کہ ترکِ وطن کرکے مرکز اسلام کے قریب آبسیں[۵۴] جہاں بعض وقت ان کو اپنی نوآبادی بسانے کے لئے سرکاری زمینیں بھی دیجاتیں[۵۵]

ترکِ وطن کے اس حکم میں دینی، سیاسی اور تمدنی جو اغراض پوشیدہ تھے، وہ ظاہر ہیں، ابن سعد نے بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلعم نے ایک قبیلے میں جو نیا نیا مسلمان ہوا تھا، ایک معلم روانہ

---

۵۱ مسند ابن حنبل جلد ۳ صفحہ ۱۳۷ ۵۲ بخاری باب رحمۃ البہائم نیز تفسیر طبری جلد (۱۱) صفحہ ۵ نیز تفسیر خازن میں سورہ (۹) آیۃ ۱۲۲ کی تفسیر جہاں قرآن مجید میں حکم ہے، کہ پوری قوم جہاد پر نہ جائے، بلکہ چند لوگ تعلیم حاصل کرکے رہنمائی کا فریضہ انجام دیں، نیز ابن عبدالبر کی کتاب العلم صفحہ ۲۱ تا ۲۵ ۵۳ کتانی کی نظام الحکومۃ النبویۃ جلد ۱ صفحہ ۳۳ و مابعد ۵۴ دیکھئے مفتاح کنوز السنۃ لفظ ہجرہ ۵۵ ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۳۲ وغیرہ ۵۶ طبقات ابن سعد باب الوفود۔

کیا، معلون کو ہجرت کے متعلق جو عام ہدایتیں تھیں، اسکی انھون نے لفظی تعمیل کی، اور کہنا شروع کیا کہ جو ہجرت نہ کرے وہ مسلمان ہی نہین سمجھا جائے گا، قبیلے والے پریشان ہوئے، مگر وہ سمجھدار تھے، انھون نے اپنا ایک وفد مدینہ روانہ کیا تاکہ براہ راست جناب رسول اکرم صلعم سے معلوم کرین، کہ ہجرت کے حکم کا کیا منشا ہے، اور یہ عرض کرین کہ انھیں اپنا وطن چھوڑنے مین کس قدر عظیم معاشی نقصان ہے، رسول کریم صلعم نے انکی مشکلات کو سُن کر انھیں اجازت دی کہ وہ اپنے وطن ہی مین رہین، اور ان کے ساتھ وہی سلوک ملحوظ رکھا جائے گا، جو اسلامی سرزمین مین ہجرت کرانے والون کے ساتھ رکھا جاتا تھا،

مدنی زندگی مین رسول کریم صلعم کی یہ مستقل سیاست تھی، کہ قبائل مین تعلیم و تربیت کے لئے معلم روانہ کرین، بیر معونہ کے مشہور واقعے مین ستر قاریان قرآن بھیجے گئے تھے، جس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انھین نجد کے ایک آباد علاقے مین اور کثیر قبائل مین کام کرنا تھا،

قبائلی نمائندون کا تعلیم کی غرض سے مدینہ آنا بھی کوئی شاذ و نادر واقعہ نہ تھا[1]، اور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، ایسے لوگون کے قیام و طعام اور تعلیم و تربیت کی رسول کریم صلعم خود شخصی طور سے نگرانی فرماتے تھے، اور یہ لوگ عموماً صفہ مین ٹھہرائے جاتے تھے،

مدینہ منورہ مین صفہ واحد درس گاہ نہ تھی، بلکہ یہان کم از کم تو مسجدین خود عہد نبوی مین تھیں[2]، اور اس مین کوئی شبہہ نہین ہے، کہ ہر مسجد اپنے آس پاس کے محلہ والون کے لئے درس گاہ کا بھی کام دیتی تھی، خاص کر بچے وہان پڑھنے آیا کرتے تھے، قبا مدینہ منورہ کے جنوب مین مسجد نبوی سے کوئی دو ڈھائی میل پر واقع ہے، بیان کیا جاتا ہے کہ وقتاً فوقتاً رسول کریم صلعم وہان تشریف لیجاتے اور وہان کی مسجد کے مدرسے کی شخصی طور سے نگرانی فرماتے تھے[3] بعض احادیث مین رسول کریم صلعم کے

---

[1] اسکی تفصیل اوپر آچکی ہے [2] ابو داؤد کتاب المراسیل نیز عینی شرح بخاری جلد ۲ صفحہ ۴۹۸

[3] ابن عبد البر کی کتاب العلم صفحہ ۹۷،

عام حکم ان لوگوں کے متعلق محفوظ ہیں، جو اپنے محلے کی مسجد کے مدرسے میں تعلیم پاتے تھے،[۵۱] آنحضرت صلعم نے یہ بھی احکام صادر کئے تھے، کہ لوگ اپنے ہمسایوں سے تعلیم حاصل کیا کریں،[۵۲]

ایک دلچسپ واقعہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رض نے بیان کیا ہے،[۵۳] کہ ایک دن جب رسول کریم صلعم مسجد نبوی میں داخل ہوئے، تو دیکھا کہ وہاں دو قسم کے لوگ موجود ہیں، کچھ لوگ نوافل اور خدا کی عبادت میں مشغول تھے، اور کچھ لوگ فقہ کی تعلیم و تعلم میں منہمک، آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا کہ دونوں ہی لوگ اچھا کام کر رہے ہیں، البتہ ایک کا کام زیادہ اچھا ہے، جو لوگ خدا سے کچھ مانگ رہے ہیں، ان کے متعلق خدا کی مرضی ہے، کہ چاہے تو دے چاہے تو نہ دے، البتہ دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو علم حاصل کر رہے ہیں، اور جہالت کو دور کر رہے ہیں، سچ تو یہ ہے کہ خود میں بھی معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہوں ——— یہ کہتے ہوئے آپ نے اس حلقے میں اپنے لئے جگہ بنائی جہاں درس ہو رہا تھا،

یہاں اس مشہور اور اکثر حوالہ دیجانے والی حدیث کا ذکر کیا جا سکتا ہے، کہ ایک عالم شیطان پر ایک ہزار عابدوں سے زیادہ سخت گذرتا ہے،[۵۴]

رسول کریم صلعم خود بھی شخصی طور سے اعلیٰ تعلیم دیا کرتے تھے، حضرت عمر رض وغیرہ بڑے صحابہ ان درسوں میں شریک رہا کرتے تھے، جہاں قرآن وغیرہ کی تعلیم دیجاتی تھی، آنحضرت صلعم مسجد نبوی کے حلقہائے درس کا اکثر معائنہ کیا کرتے تھے، اگر وہاں کوئی بے عنوانی نظر آتی، تو فوراً تدارک

---

۵۱ ابن عبدالبر کی کتاب العلم ص ۱۴ ۵۲ کتانی کی نظام الحکومۃ النبویہ جلد ۱ ص ۴۱ (معارف صحیح بخاری املا، نبوی بیان حضرت عمر رض)

۵۳ ابن عبدالبر کی کتاب العلم ص ۲۵ نیز دیگر کتب حدیث ۵۴ سیوطی کی جمع الجوامع تحت عنوان "عالم وفقیہ" بحوالہ بخاری و دیلمی، نیز ترمذی، باب العلم،

فرمادیا کرتے، چنانچہ ترمذی میں ہے[1] کہ ایک مرتبہ مسجد نبوی مین رسول کریم صلعم نے قضا وقدر کے متعلق کچھ مباحثہ ہوتے سنا، آپ اپنے حجرے سے باہر آئے، مارے غصے کے آپ کا چہرہ تمتما رہا تھا، اور راوی کے الفاظ مین ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ انار کا رس آپ کے رخسارون اور پیشانی پر نچوڑ دیا گیا ہو، آپ نے اس موضوع پر بحث مباحثے سے منع کر دیا اور ارشاد فرمایا کہ بہت سی گذشتہ اُمتین اسی مسئلہ مین الجھ کر گمراہ ہو گئی تھین،

یہ رسول کریم صلعم کی ایک طے شدہ سیاست تھی، کہ صرف وہی لوگ مسجدون مین امام بنین جو قرآن مجید اور سنت کے زیادہ سے زیادہ ماہر ہون، جیسا کہ صحیح مسلم مین بیان کیا گیا ہو، یہ کوشش بیکار نہ گئین، اور خواندگی مین اس قدر تیزی سے ترقی ہوئی، کہ ہجرت کو چند ہی دن گذرے تھے، کہ قرآن مجید نے حکم دیا کہ ہر وہ تجارتی معاملہ جس مین رقم ادھار ہو، صرف تحریری طور سے انجام پائے، اور ایسی دستاویز پر کم از کم دو اشخاص کی گواہی لیجایا کرے، اس کا منشا قرآن کے الفاظ مین یہ تھا کہ اس طرح کی تحریری گواہی "خدا کے نزدیک زیادہ منصفانہ ہے، اور شہادت کے اغراض کے لئے زیادہ مستحکم وسیلہ ہے، اور شبہات پیدا ہونے کی صورت مین رفع شک کا بہترین ذریعہ ہے[2]"

مدینہ مین خواندگی کی کثرت ہو جانے کے باعث اس حکم سے کوئی دشواری پیش نہین آئی، اور ظاہر ہے کہ ملک مین خواندگی کی وسعت کے بغیر ایسا حکم نہین دیا جا سکتا تھا، گو اس مین شک نہین کہ پیشہ ور کاتبون کا بھی اس زمانے مین پتہ چلتا ہی[3]

ہجرت کے بعد سے ہی سیاسی معاہدات، سرکاری خط و کتابت، ہر فوجی مہم مین جانے والے

---

[1] شمائل ترمذی برموقع [2] قرآن مجید ۲/۲۸۲،
[3] کتانی کی نظام الحکومۃ النبویہ، ۱/۲۷۵ تا ،،،

رضاکاروں کے ناموں کی فہرستیں[۱] مختلف مقامات مثلاً مکہ، نجد، خیبر وغیرہ میں خفیہ نامہ نگار جو عموماً[۲] تحریری طور سے آنحضرت صلعم کو اپنے مقام کے حالات سے اطلاع دیا کرتے تھے، نیز مردم شماری[۳] اور اسی طرح کی بہت سی چیزیں اس بات میں ممد و معاون ہوئیں، کہ خواندگی روز بروز بڑھتی ہی جائے، تاریخ نے رسول کریم صلعم کے کوئی ڈھائی تین سو خطوط محفوظ رکھے ہیں[۴]، صحیح تعداد اس سے بہت زیادہ ہونی چاہئے، کیونکہ آنحضرت صلعم کی حکومت دس لاکھ مربع میل کے علاقے پر چلتی تھی، اور دس سال تک حکمرانی کے فرائض آپ کو انجام دینے پڑے تھے،

عرب میں خطوط پر مہر کرنے کا رواج سب سے پہلے جناب رسالت صلعم ہی سے شروع ہوا[۵]، آپ کو خط کی صفائی اور وضاحت کا جس قدر خیال رہتا تھا، اس کا اندازہ ان چند احادیث سے ایک حد تک ہو سکتا ہے، جن میں آپ نے ارشاد فرمایا ہے، کہ کاغذ کو موڑنے سے پہلے اسکی سیاہی کو ریگ ڈالکر خشک کر لو[۶]، یا یہ کہ حرف "س" کے تینوں شوشے برابر دیا کرو اور اس کو بغیر شوشوں کے نہ لکھا کرو[۷]، غالباً یہ حکم اسلئے تھا کہ شوشے نہ دینا احتیاط پسندی کے فقدان اور سستی پر دلالت کرتا ہے، یا یہ کہ لکھتے ہوئے اگر کچھ رکنا پڑے تو کاتب کو چاہئے، کہ قلم اپنے کان پر رکھ لے، کیونکہ اس سے لکھوانے والے کی زیادہ آسانی سے یاد دہانی ہو جاتی ہے[۸]،

---

[۱] کتانی کتاب مذکور جلد ا صفحہ [illegible] بحوالہ صحیح مسلم [۲] کتانی [illegible] (معارف خفیہ نامہ نگار کی اصطلاح صحیح نہیں ہے ممکن ہے کسی نے اتفاقاً کوئی اطلاع بھیجدی ہو) [۳] صحیح بخاری [illegible] کتانی کے بیان کے مطابق ایک مرتبہ مسلم شماری کی فہرستوں سے پندرہ سو اندراجات شہر مدینہ میں ہونے معلوم ہوئے تھے، جو ظاہر ہے کہ ابتدائے ہجرت کا زمانہ ہوگا [۴] اس پر جدید ترین تالیف الوثائق السیاسیہ کے نام سے میں نے شائع کی ہے [۵] کتانی [illegible] فتوح البلدان مؤلفہ بلاذری باب [illegible] نخاتم، [۶] کتانی [illegible] [۷] ایضاً [illegible] وما بعدہ، [۸] ایضاً [illegible] وما بعدہ،
(معارف: اوپر کی تینوں باتیں صحیح حدیثوں میں نہیں)

عہد نبوی ہی میں یک فنی ذوق یا تخصص ترقی کر گیا تھا اور خود جناب رسالت مآب صلعم اوسکی حوصلہ افزائی فرمایا کرتے تھے، چنانچہ آپ فرمایا کرتے تھے، کہ جس کو قرآن سیکھنا ہو، وہ فلاں صحابی کے پاس جائے، جس کو تجوید یا تقسیم ترکہ کا حساب سیکھنا ہو، وہ فلان کے پاس جائے وغیرہ[۱]،

متعدد حدیثوں میں معلمون کو معاوضہ قبول کرنے کی ممانعت کی گئی ہے[۲]، عبادہ بن صامتؓ کی روایت ہے، کہ وہ درس گاہ صفہ میں قرآن اور فن تحریر کی تعلیم دیتے تھے، ایک مرتبہ ایک شاگرد نے انھیں ایک کمان نذر کی، مگر رسول کریم صلعم نے انھیں اوس کے قبول کرنے سے روک دیا[۳]،

ایک مملکت کے حاکم اعلیٰ کی حیثیت سے جناب رسالت مآب صلعم کو مترجمین کی بھی ضرورت ہوا کرتی تھی، جو غیر زبانیں جانتے ہوں، چنانچہ حضرت زید بن ثابتؓ دربار رسالت کے منشی کہے جاسکتے ہیں، فارسی، حبشی، عبرانی اور رومی (یونانی) جانتے تھے[۴]، آنحضرت صلعم نے ایک مرتبہ ان کو حکم دیا تھا کہ وہ عبرانی خط لکھنا اور پڑھنا بھی سیکھ لیں، اور چند ہفتوں میں وہ اس میں طاق ہو گئے تھے[۵]، چنانچہ یہودیوں کو اگر کوئی خط بھیجا جاتا یا ان کے پاس سے کوئی خط آتا، تو حضرت زید بن ثابتؓ اس کو لکھ یا پڑھ لیا کرتے تھے،

نصاب کا مسئلہ ایسا ہے کہ اس پر پوری صحت کے ساتھ بیان کرنا دشواری سے خالی نہیں، ہمارے پاس جو مختصر و محدود مواد ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہر جگہ ایک ہی نصاب جاری نہ تھا، معینہ کتب کو پڑھانے کی جگہ معینہ معلم کے پاس لوگ جاتے، اور وہ جو پڑھا سکتا، اس سے پڑھتے، بہر حال اتنا

---

[۱] طبقات ابن سعد بر موقع [۲] سیوطی کی جمع الجوامع تحت عنوان "علما" بحوالہ طبرانی نیز بخاری ۳۴/۱۱۴ ابوداؤد ۲۲/۲۰

[۳] ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۱۲۹، اس کا ذکر شبلی کی سیرۃ النبی طباعت دوم، جلد ۲ صفحہ ۵۸۵ میں بھی ہے،

[۴] کتانی ۱۰۲/۱ بحوالہ العقد الفرید مؤلفہ ابن عبد ربہ وغیرہ

[۵] ایضاً ۱۰۳/۱ بحوالہ بخاری وغیرہ،

معلوم ہوتا ہے، کہ قرآن وسنت کے ہمہ گیر نصاب کے علاوہ آنحضرت صلعم نے حکم دیا تھا کہ نشانہ بازی[۱]، تیراکی[۲] تقسیم ترکہ کی ریاضی[۳] مبادی طب[۴]، علم ہیئت[۵]، علم انساب[۶] اور علم تجوید[۷] قرآن کی تعلیم دیجایا کرے ایک حدیث میں یہ بھی حکم ہے کہ استاذ کی عزت کیجائے[۸]،

مکہ کے باشندوں کو زبان کی صفائی کا بیحد لحاظ رہتا تھا، اور وہ یہ بھی چاہتے تھے، کہ ان کے بچے صحرا کی آزاد زندگی میں پرورش پائیں، اور مکہ کی رنگا رنگ کی آبادی میں مل کر متاثر نہ ہوں، اسی لئے وہ اپنے نوزائیدہ بچوں کو مختلف قبائل میں بھیج دیتے تھے، جہاں وہ کئی سال رہ کر والدین کے پاس واپس آتے، خود رسول کریم صلعم کو بھی اس سے سابقہ رہا تھا، اور آئندہ زندگی میں آپ اُسے یاد کیا کرتے تھے، کہتے ہیں، کہ معززین مکہ میں اوس کا رواج آج بھی چلا آتا ہے،

تربیت دلانے کا ایک دوسرا طریقہ مکہ والوں نے یہ اختیار کیا تھا کہ تجارت کے لئے جو کاروان جایا کرتے تھے، اس میں کسی معمر کے ساتھ نوعمروں کو بھیجدیا کریں، چونکہ مکہ کی معاشی زندگی کا دارومدار بہت بڑی حد تک تجارت پر تھا، اس لئے اس طریقے کی اہمیت مکہ والوں کیلئے جیسی کچھ تھی ظاہر ہے، سفر کے تجارب کا فائدہ ماسوا تھا،

اس زمانے میں نوعمروں اور معمروں کی تعلیمی ضرورتوں کے فرق کو محسوس کر لیا گیا تھا، چنانچہ احادیث میں واضح الفاظ میں بتایا گیا ہے، کہ بچوں کو کن چیزوں کی تعلیم دینی چاہیئے، نشانہ اندازی

---

[۱] جمع الجوامع مؤلفہ سیوطی تحت عنوان "علموا" بحوالہ ابن مندہ، ابونعیم و دیلمی [۲] ایضاً تحت عنوان "علموا" بحوالہ ابونعیم و ابن مندہ [۳] ایضاً تحت عنوان "تعلموا" بحوالہ طبرانی و دارقطنی وغیرہ نیز ابن عبد البر کی کتاب العلم ص۸، ابوداؤد ۱۵، ابن ماجہ ۲۳ [۴] سیوطی کی جمع الجوامع تحت عنوان تعلمن بحوالہ مالک [۵] ایضاً تحت عنوان تعلموا بحوالہ ابن سنی [۶] ایضاً تحت عنوان تعلموا من انسابکم بحوالہ مالک و ترمذی وبیہقی و طبری [۷] ایضاً تحت عنوان تعلموا من امر الجمعہ بحوالہ دیلمی [۸] جمع الجوامع سیوطی تحت عنوان "تعلموا" بحوالہ طبرانی،

اور پیرا کی خاص طور سے بچپن ہی سے سکھائی جاتی تھی، اسی طرح نماز پڑھنے کا طریقہ بھی بچپن ہی سے بچوں کو سکھایا جاتا تھا، اور سات برس کی عمر کے بعد بچے نماز نہ پڑھیں تو انھیں سزا دینے کا حکم تھا[۵۱]،

عورتوں کے ساتھ علحدہ سلوک کیا جاتا تھا، چنانچہ آنحضرت صلعم نے ہفتہ میں ایک دن مقرر کر لیا تھا، جب آپ عورتوں کے خصوصی مجمع میں تشریف لیجاتے ان کو تعلیم دیتے، اور ان کے سوالات کا جواب دیتے[۵۲]، آنحضرت صلعم نے عورتوں کے لئے چرخہ کاتنا سب سے اچھا مشغلہ قرار دیا تھا[۵۳]، ایک حدیث میں یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ آنحضرت صلعم نے ایک خاتون سے خواہش کی کہ وہ آپ کی ایک بیوی کو لکھنے پڑھنے کی تعلیم دیں[۵۴]، آنحضرت صلعم کی زوجہ مطہرہ بی بی عائشہؓ کو فقہ اور دیگر اسلامی علوم، نیز ادب، شاعری اور طب میں بڑا دخل تھا[۵۵]، یہاں تک کہ ایک مرتبہ رسول کریم صلعم نے فرمایا، کہ آدھا علم عائشہؓ سے حاصل کرو[۵۶]، قرآن نے بھی رسول کریم صلعم کی بیویوں پر ایک خصوصی فریضہ عائد کیا ہے، کہ وہ دوسروں کو تعلیم دیا کریں[۵۷]، ایک حدیث میں بیان ہوا ہے، کہ جس کسی کے پاس کوئی لونڈی ہو اور وہ اُسے تعلیم دے اور اچھی تعلیم دے، اور اس کی تربیت کرے، اور اچھی تربیت کرے، پھر اوس کو آزاد کر کے باضابطہ نکاح کرلے، تو اوسے دوگنا ثواب ملے گا[۵۸]،

رفتہ رفتہ مملکت اسلامیہ جو ابتداءً ایک شہر مدینہ کے کچھ حصہ پر مشتمل تھی پھیلتی گئی، اور نہ صرف خانہ بدوش بدوی، بلکہ شہروں میں مستقل طور سے سکونت کرنے والے عربوں نے بھی بڑی تعداد میں

---

۵۱ جمع الجوامع سیوطی تحت عنوان علموا الصبی بحوالہ ابن حنبل و ترمذی و نسوی ۵۲ صحیح بخاری کتاب العلم
۵۳ جمع الجوامع سیوطی تحت عنوان علموا (نعم لھو المومنۃ فی بیتھا الغزل) بحوالہ ابونعیم و ابن مندہ،
۵۴ کتانی ۴۹ تا ۵۵ بحوالہ قاضی عیاض و ابوداؤد ۵۵ سیرۃ النبی مؤلفہ شبلی طبع دوم ۲/۴۰۷ ۵۶ احادیث فضل عائشہ کسی کتاب حدیث میں دیکھی جاسکتی ہیں ۵۷ قرآن مجید ۳۳/۳۴ ۵۸ ابن عبدالبر کی کتاب العلم ص ۲۶

اسلام قبول کرنا شروع کیا، ایک نئے دین کے قبول کرنے کا ناگزیر نتیجہ تھا، کہ ایک وسیع تعلیماتی نظام قائم ہو، جو دس لاکھ مربع میل کے رقبے کی ضرورتون کو پورا کرسکے، عہد نبوی کے اختتام پر حکومت اسلامی باوجود اس قدر وسیع رقبے پر مشتمل ہونے کے دینیات کی تعلیم کی ضرورتون سے اچھی طرح عہدہ برآ ہونے لگی تھی، کچھ تو مرکز مدینہ سے بڑے بڑے مقامات پر تربیت یافتہ معلم بھیجدیئے جاتے تھے، اور کچھ صوبہ دار گورنرون کے فرائض منصبی مین یہ امر صراحت کے ساتھ شامل کر دیا جاتا تھا، کہ وہ اپنے ماتحت علاقے کی تعلیمی ضرورتون کا مناسب انتظام کرین[۵۱] مین کے گورنر عمرو ابن حزم کے نام جو طویل تقرر نامہ یا ہدایت نامہ جناب رسالت مآب صلعم نے لکھا تھا، اسے تاریخ نے محفوظ رکھا ہے[۵۲]، اس مین بھی گورنر کو ہدایت ہے، کہ لوگون کے لئے قرآن، حدیث، فقہ اور علوم اسلامیہ کی تعلیم کا بندوبست کرین، اسی دستاویز مین ایک دلچسپ جملہ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ مذہبی اور دنیاوی تعلیم مین کسطرح فرق کرنا چاہئے اور وہ جملہ یہ ہے کہ "لوگون کو اس بات کی بڑی ترغیب دو[۵۳] کہ وہ دینیات کی تعلیم حاصل کرین" گورنرون کو جس تعلیم کے رائج کرنے کا حکم تھا، اسمین دنیاوی ضرورتون مین سے وضو، غسل جنابہ، نماز باجماعت، روزہ اور حج کعبہ کے احکام شامل تھے،

صوبہ دار درس گاہون کا معیار بلند کرنے کے لئے رسول کریم صلعم نے صوبہ مین مین ایک صدر ناظر تعلیمات مقرر کیا تھا جس کا کام یہ تھا، کہ مختلف اضلاع و تعلقات مین ہمیشہ دورہ کرتا رہے، اور وہان کی تعلیم اور تعلیم گاہون کی نگرانی کرے[۵۴]، کوئی تعجب نہیں جو اور صوبہ جات مین

---

۵۱ کتانی ۱/۲۴۳ و ما بعد ۵۲ سیرۃ ابن ہشام ص ۹۶۱ تا ص ۹۶۲، تاریخ طبری ص ۱۴۲۶، ص ۱۴۲۹ کتانی ۱/۲۴۸ تا ۲۴۹ وغیرہ،

۵۳ جمع الجوامع سیوطی تحت عنوان "علموا ولا تعنفوا فان المعلم خیر من المعنف — علموا ویسروا ولا تعسروا) بحوالہ ابن سعد و بیہقی و ابن عبل،

۵۴ تاریخ طبری ص ۱۸۵۲ تا ۵۳ و ۱۹۰۳، (اعوال سنہ ۱۱ ھ)

بھی اس طرح کے افسر مامور کئے گئے ہون،

آخر میں تعلیم کی نظری حیثیت کے متعلق قرآن وحدیث کے بعض احکام کی جانب اشارہ کرنا بے محل نہ ہوگا، چنانچہ قرآن مجید میں ہم دیکھتے ہین، کہ شروع سے آخر تک بار بار اور صاف وصریح الفاظ میں اندھی تقلید کو برا ٹھہرایا گیا ہے[۵۱]، اور اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ ہر شخص خود اپنے طور پر غور وفکر کرے، اور کسی رسم ورواج کی پیروی محض آبائی وموروثی ہونے کی بنا پر نہ کرے[۵۲]، کسی اور مذہبی کتاب میں فطرت کے مطالعہ پر اتنا زور نہین دیا گیا ہوگا، جتنا قرآن مجید میں ہے، کہ سورج، چاند سمندر کی موجین، دن اور رات، چمکتے ستارے، دمکتی فجر، پودے اور حیوانات ——— تمام ہی قوانین فطرت کے تابع بتائے گئے ہین، جن سے ان کے خالق کی قدرت کا مظاہرہ ہوتا ہے، قرآن مجید کے مطابق علم لامتناہی ہے[۵۳]، اور بڑے سے بڑے عالم کا علم بھی تھوڑا ہی ہوتا ہے، یہ کہ سارا عالم انسان کی خدمت کے لئے پیدا کیا گیا ہے، اور انسان جو زمین مین خدا کا نائب ہے، اپنے برتاؤ اور کردار کے مطابق جانچا جائے گا، اسی طرح قرآن مجید مین اس کا بھی بار بار ذکر ہے، کہ حق وصداقت کی پیروی کیجانی چاہئے، اور موروثی عقائد ورواجات سے متاثر نہین ہونا چاہئے،

احادیث مین بھی علماء کی بڑی تعریف کی گئی ہے، اور ان کو سب سے بہتر انسان

---

۵۱ ابن عبد البر کی کتاب العلم ص۱۶۷ باب ذم التقلید بحوالہ آیت "اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ" ۵۲ طلب علم کی فضیلت کے لئے دیکھو ابو داؤد، ۲۲/۳۱۷ مقدمہ ابن ماجہ ص۱۷، مقدمہ دارمی ص۳۱ وغیرہ، ترمذی ۳۹/۱۹۲،

۵۳ قرآن مجید ۱۸/۵۹ قرآن مجید مین قصہ موسیٰؑ وخضرؑ کا مقصد بھی طلب علم کی فضیلت اور علم انسانی کی قلت کو نمایان کرنا ہے،

قرار دیا گیا ہو،[۵۱] حتی کہ ان کو انبیاء کا وارث قرار دیا گیا ہو،[۵۲] آخر میں ایک حدیث کا ذکر کیا جاسکتا ہے جس کا اکثر حوالہ آتا ہے، اگرچہ ماہرین اس کو اس کے موجودہ الفاظ میں صحیح حدیث نہیں سمجھتے لیکن اسکا مفہوم قرآن و حدیث کی عام تعلیمی پالیسی سے بالکل متفق ہو، یعنی علم حاصل کرو اگرچہ چین ہی میں کیوں نہ ہو، کیونکہ علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت کا فریضہ ہے۔[۵۳]

ایک حدیث میں یہ دعا ماثور ہو، کہ "اے خدا! میں تجھ سے علم نافع اور رزق طیب اور عمل مقبول کی استدعا کرتا ہوں"[۵۴] اور اسی پر یہ تبصرہ ختم کیا جاتا ہو،

اللّٰھُمَّ انی اسئلک علماً نافعاً ورزقاً طیباً وعملاً متقبلاً، آمین!

معارف: جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب جو عالم بھی ہیں، اور یورپ کی متعدد زبانوں سے واقف بھی ہیں، اور خاص طور سے عہد نبوی کے مختلف نظامات کے معلومات جن کا خاص فن ہو، وہ انگریزی میں مسلسل عنوانات پر اسلامک کلچر میں مضامین لکھ رہے ہیں، اب انھوں نے اپنے اس سلسلہ کے چند مضامین کو حذف و اضافہ کے ساتھ دوبارہ اردو میں مرتب کر کے ہمارے پاس بھیجا ہو، ان مضامین میں یہ بات خاص لحاظ کے قابل ہو کہ یہ یورپی طرز خیال و ذہنیت کو سامنے رکھکر لکھے گئے ہیں، جو اردو کے قالب میں آنیکے بعد بھی اپنے فرنگی طرز تخیل کی غمازی کر رہے ہیں، "س"

---

۵۱ من یرد اللہ بہ خیراً یفقہہ فی الدین (بخاری ۳/۱۳۱، ۹۶/۱۰۰ ترمذی ۳۹/۱ مقدمہ ابن ماجہ ف ۱۷ مقدمہ دارمی ف ۲۳ ابن عبد البر کی کتاب العلم صـ ۱۶ تا ۱۸، حدیث خیر الناس العلماء والمتعلمون (مقدمہ دارمی ف ۲۵ و ف ۳۱) ابو داؤد ۲۴/۳

۵۲ العلماء ورثۃ الانبیاء (بخاری ۳۰، ترمذی ۳۹/۹، ابن عبد البر کی کتاب العلم صـ ۲۱)

۵۳ اطلبوا العلم ولو بالصین فان طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ (ابن عبد البر کی کتاب العلم بیہقی کی شعب الایمان ابن عدی کی الکامل اور سیوطی کی جمع الجوامع میں یہ حدیث ہو)

۵۴ حدیث نبوی بحوالہ کتاب العلم مؤلفہ ابن عبد البر صـ ۵۲،

تیموری شاہزادون کا علمی ذوق

از

سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب ایم اے رفیق دارالمصنفین

(۲)

داراشکوہ علمی حیثیت سے تیموری شہزادون کا گل سرسبد داراشکوہ تھا، وہ ایک باکمال مصنف، شاعر اور خطاط تھا، اس کو شروع مین تصوف اور بعد مین ہندو مذہب سے گہرا شغف پیدا ہوگیا تھا، نثر مین اسکی تصانیف ان ہی دو موضوعون پر ہین، ان تصانیف سے داراشکوہ کے جن مذہبی اعتقادات اور صوفیانہ خیالات کا اظہار ہوتا ہے، ان پر بحث کرکے ہم ناظرین کو اس کی جانب سے بدظن کرنا نہین چاہتے بلکہ صرف اسکے علمی کمالات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے[1] مگر اس کی تصانیف کی تاریخ وار ترتیب سے ناظرین کو خود اندازہ ہوجائے گا، کہ وہ کس طرح رفتہ رفتہ صحیح و خالص اسلام سے ہٹ کر عامیانہ تصوف کی طرف مائل ہوگیا،

۱۔ سفینۃ الاولیاء داراکی یہ پہلی تصنیف ہے کہ جو اوس نے اپنی عمر کے پچیسوین سال ۱۰۴۹ھ

---

[1] داراشکوہ کی ایک تصنیف مجمع البحرین کو پروفیسر محفوظ الحق (پریزیڈنسی کالج کلکتہ) نے اڈٹ کیا ہے اور اوس کے دیباچہ مین دارا کی تصنیفات اور تراجم پر بڑی محنت و کاوش سے ایک انگریزی مقالہ لکھا ہے، جناب سید نجیب اشرف صاحب ندوی سابق رفیق دارالمصنفین نے بھی مقدمۂ عالمگیر مین دارا کی تصانیف پر بحث کی ہے،

مین لکھی، اس کتاب کے شروع مین رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک ہے، اور پھر خلفاے راشدین حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد کے ائمہ کے مناقب ہین، اس کے بعد اولیاء اللہ کے احوال ہین جن مین قادریہ نقشبندیہ، چشتیہ، کبرویہ، سہروردیہ کے سلاسل کا ذکر خاص طور پر ہے، ایک باب مین متفرق سلسلوں کے صوفیاے کرام کے بھی کچھ حالات ہین، آخر مین ازواج مطہرات رض اور بنات رض طاہرات آنحضرت صلعم کے بعد ان خواتین کا ذکر ہے جنھون نے راہ سلوک مین کمال حاصل کیا، یہ کتاب مختلف مطبعون مین چھپ گئی ہے، ۱۸۵۳ء مطبع مدرسہ آگرہ سے ایک انگریز مسٹر بیل کے اہتمام مین جو نسخہ شائع ہوا تھا، اوس کے صفحات ۳۷۴ ہین،

داراشکوہ نفحات الانس، کشف المحجوب، تذکرۃ الاولیا، اور طبقات سلطانی وغیرہ جیسے تذکرون سے مطمئن نہ تھا، کیونکہ اس کے خیال مین ان کتابون مین صوفیاے کرام کے حالات سلسلہ بسلسلہ علٰحدہ علٰحدہ منقول نہ تھے، اور ان کی پیدایش اور وفات کے سال کی تفصیل بھی ان مین اطمینان بخش نہ تھی اسی لئے ان خامیون کو سفینۃ الاولیا لکھ کر پورا کیا[1]، تمام تذکرہ نویسون نے اس کو ایک مستند تذکرہ قرار دیا ہے، حتی کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنی کتاب اخبار الاخیار مین اسکا حوالہ جابجا دیا ہے، سفینۃ الاولیا، کی تحریر کے وقت داراشکوہ حنفی المشرب تھا، اور تصوف مین سلسلۂ قادریہ سے متوسل تھا، مگر آگے چل کے اس کے عقائد مین اسلامی تصوف کی شان بالکل مفقود ہوگئی،

اس کتاب کے ادب و انشاء کے متعلق داراخود لکھتا ہے:

"واگرچہ عبارت این کتاب راست براست است و در عبارت آرائی مقید نشدہ

---

[1] سفینۃ الاولیا، مطبع مدرسہ آگرہ ۱۸۵۳ء، دیباچہ

و فارسی سادہ عام فہم نوشتہ لیکن بعضے جا اقتدار بعبارت نفحات الانس قطب الاولیاء قدوۃ الاتقیاء نیز آسمان عرفان خورشید فلک ایقان حضرت مولانا نور الملۃ والدین عبد الرحمٰن جامی قدس سرہٗ انشاء کہ کمال فصاحت و متانت دارد و اینجا نزد استاد خودی داند کردہ و زبان رونہ مرہ خود را نیز ترک ساختہ[1]"

۲۔ **سکینۃ الاولیاء**: دارا نے یہ کتاب اپنی عمر کے اٹھائیسویں سال ۱۰۵۲ھ میں لکھی، اس میں اوس نے اپنے پیر لسان اللہ ملا شاہ محمد یا محمد شاہ بدخشانی اور پیر کے مرشد میاں میر (یا ملا جیو) کے حالات، ملفوظات، کرامات اور ان کے خاندان اور خلفاء کے احوال کی تفصیلات لکھی ہیں، اس کتاب کی وجہ تصنیف یہ بتائی ہے:-

سکینۃ الاولیاء..... اور کتابوں کی طرح اولیاء حق کے معتقدوں اور مخلصوں کے لئے بطور یادگار رہے، اور معلوم ہو جائے کہ کوئی زمانہ اس عالی گروہ سے خالی نہیں رہا، اور نیز یہ کہ اس زمانے میں بھی جب کہ ۱۰۵۲ھ ہجری ہے، اس قسم کے لوگ ہیں، اور تھے[2]"

دارا نے راہ سلوک کی منزلیں جس طرح طے کیں، اوس کا حال اس طرح لکھتا ہے:

"جمعرات کے روز چوبیس سال کی عمر میں خواب میں فرشتہ نے مجھے آواز دی اور چار مرتبہ کہا "تجھے اللہ تعالیٰ ایسی چیز عنایت کرے گا، جو روے زمین کے کسی بادشاہ کو نصیب نہیں ہوئی"۔ نیند سے بیدار ہو کر میں نے اپنے دل میں سوچا کہ اس قسم کی سعادت البتہ عرفان ہو گی، اور بے شک اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل و کرم سے مجھے یہ دولت بخش دے گا،

---

[1] سفینۃ الاولیاء، ص ۴، [2] مجھکو سکینۃ الاولیاء کا فارسی نسخہ نہیں مل سکا، اس کا اردو ترجمہ جو فضل الدین ملک چنن الدین تاج الدین گگے زئی تاجران کتب قومی منزل نقشبند یہ کشمیری بازار لاہور نے شائع کیا ہے، میرے پیش نظر ہے،

ان اللہ غفور رحیم، میں ہمیشہ اس دولت عظمیٰ کا طالب رہا، یہاں تک کہ ۲۹ برس کی عمر ۱۰۴۹ھ کو ایک دوست خدا کی صحبت میں پہنچا، وہ مجھ پر نہایت مہربان ہوا، جو بات دوسرے لوگوں کو ایک مہینہ میں حاصل ہوتی تھی، وہ مجھے پہلی رات میں مل گئی، اور جو کچھ دوسرے ایک سال میں حاصل کرتے تھے، مجھے ایک مہینہ میں حاصل ہوگئی، جہاں اور کوئی طالب سالہا سال کے مجاہدوں اور ریاضتوں سے پہونچتا، میں محض اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے بغیر ریاضت یک بارگی پہنچ گیا، دونوں جہان کی محبت میرے دل سے اٹھ گئی، اور فضل ورحمت کے دروازے میرے دل پر کھل گئے، اور جو میں چاہتا تھا، وہ مجھے مل گیا" (ص۵)

گو ہم دارا کے صوفیانہ عقائد سے بحث کرنا نہیں چاہتے لیکن یہ کہنا نامناسب معلوم نہیں ہوتا، کہ دارا نے جس عجلت اور تیزی سے راہ سلوک کی منزلیں طے کیں، وہ ہندوستان کے صوفیوں کے کرام میں کسی اور نے نہیں کیں، حضرت خواجہ معین الدین چشتی رح نے بیس سال تک اپنے مرشد کے پاس رہکر ریاضت کی، اور برسوں سمرقند، بغداد، ہمدان، تبریز، استراباد، سبزوار، حصار، بلخ اور ہندوستان وغیرہ کی بادیہ پیمائی کرنے کے بعد راہ سلوک کی منزلیں طے کر سکے، حضرت بختیار کاکی رح بیس برس تک رات کو مطلق نہ سوئے، حضرت فرید الدین گنج شکر رح نے اتنے مجاہدے کئے، کہ ایک بار حضرت معین الدین چشتی رح ان کے حجرے میں تشریف لائے، تو ضعف سے ان کی تعظیم کے لئے کھڑے نہ ہو سکے، حضرت شرف الدین یحییٰ منیری رح نے ۳۰ سال تک جنگلوں میں عبادت کی، اس لئے دارا کا یہ لکھنا کہ اوس نے یکبارگی "سب کچھ" حاصل کر لیا مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے،

دارا کو اپنے مرشد ملا جیو سے والہانہ عقیدت تھی، اور وہ ایک قصبہ "باری"

مین عزلت نشین تھے، اسلئے دارا ان کو باری تعالیٰ کہتا تھا، (حسنات العارفین صفحہ ۳۰) ملاجیو نے خواب مین اسکو مشاہدہ اور مراقبہ کرنا سکھایا، اور خواب ہی مین اپنے سینہ کی امانت اس کے سینے مین منتقل کی، جس کے بعد داراشکوہ کو سلوک میں فتح پر فتح حاصل ہوئی، (صفحہ ۴۳)

ملاجیو کو بھی اپنے مرید کے مرید سے غیر معمولی شیفتگی تھی، وہ اپنے "یارون" اور "مریدون" سے کہا کرتے تھے، کہ جس طرح میں دارا کے حال کی طرف متوجہ رہتا ہون، تم بھی رہا کرو، اگر تم اس کی طرف متوجہ نہ ہوگے، تو خدا سے پھر جاؤ گے" (صفحہ ۴۲) (العیاذ باللہ) وہ اپنے مریدون کو داراشکوہ ہی کی صورت کا مراقبہ کرنے کی تلقین کیا کرتے تھے، (صفحہ ۴۲)

لسان اللہ شاہ محمد یعنی دارا کے اصلی مرشد کو بھی دارا سے بڑی محبت تھی، انھون نے اسکی شان مین ایک غزل بھی کہی تھی، لیکن یہ اس قدر غلط اور بے معنی یا اتنی مسخ چھپی ہے، کہ بالکل مہمل ہوگئی ہے، ایک شعر جس کے کچھ معنی سمجھ میں آتے ہیں، یہ ہے:

اے بے خبر نہ عالم راز نہان دل روزے شود کہ تو بشنوی ہزبان دل

ملا شاہ محمد کو داراشکوہ سے یہ امید تھی، کہ وہ ہندوستان مین طریقۂ قادری کو رواج دیگا، لیکن یہ امید بر نہ آئی، (صفحہ ۱۳۸)

داراشکوہ نے اپنے مرشد کے خوارق و کرامات کی بہت سی تفصیلات لکھی ہین، اور انہی کے ذریعہ سے ان کی روحانی عظمت کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے، آخر مین اس کے مرشد کی ہمشیرہ بی بی جمال خاتون کے احوال و کرامات بھی درج ہین، اور اس کے بعد ملاجیو کے خلفا کا ذکر ہے، دارا نے ان خلفا کے اشعار کے انتخاب بھی اس کتاب میں دیدیے ہین کتاب ہذا کے کشف المحجوب، نفحات الانس، غنیۃ الطالبین، تفسیر عرائس، تفسیر قشیری، فصل الخطاب، بحر الحقائق، تفسیر حسینی، صحیح مسلم، مشکوٰۃ، معجم البلدان وغیرہ کے حوالے ہین جن سے اندازہ ہوتا

کہ یہ کتابیں دارا کے زیر مطالعہ رہیں،

۳- رسالہ حق نما:- میری نظر سے نہیں گذرا،

۴- حسنات العارفین یا شطحیات:- دارا اس کتاب کی تمہید میں لکھتا ہے، کہ "وجد و ذوق" کی حالت میں اس کے منہ سے ایسے کلمات بلند حقائق" نکل جاتے تھے، جن کو سن کر "پست فطرت" "دون ہمت" اور "زاہد خشک" لوگوں نے اپنی کوتاہ بینی سے اس پر تکفیر کے فتاوی صادر کئے، اس تکفیر سے بچنے کے لئے اس نے مذکورۂ بالا کتاب تالیف کی جس میں نہ صرف صوفیائے کرام اور علمائے عظام بلکہ رسول اللہ صلعم اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے ایسے کلمات اور اقوال نقل کئے ہیں جو اس کے خیال میں شطحیات ہیں، ان اقوال سے وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے، کہ توحید و معرفت کے منازل و مدارج میں ایک ایسا مقام آتا ہے، جب ایک سالک شریعت و طریقت، کفر و ایمان، خیر و شر اور عبد و معبود سے بالکل بے نیاز ہو جاتا ہے، اور بے خودی میں اسکی زبان سے ایسے کلمات نکلتے ہیں، جو بظاہر مذہب و ایمان کے منافی ہوتے ہیں لیکن وہ قابل مواخذہ نہیں ہوتے، چنانچہ دارا یہ بتانے کی کوشش کرتا ہے، کہ راہ سلوک میں ایسے ہی مقام پر پہنچ کر اس کی زبان سے شطحیات صادر ہوئیں، اور اسی مقام کے وجد و ذوق میں وہ صوم و صلوٰۃ سے مستغنی ہو گیا،

دارا نے جتنے کلمات و اقوال نقل کئے ہیں، ان پر مفصل بحث کر کے یہ دکھایا جا سکتا ہے کہ ان کلمات کی نسبت غیر معتبر، مشکوک اور مجہول الروایت ہے، اور بعض اقوال کی تشریح و توضیح صحت سے دور ہے، مگر اس مضمون میں ہم اس قسم کی بحث سے قصداً پرہیز کرنا چاہتے ہیں، اس میں شک نہیں کہ بعض شطحیات ایسی ضرور ہیں جو بعض صوفیائے کرام کی زبانوں سے غیر اختیاری طور پر نکلیں لیکن وہ خود کسی حال میں بھی دارا کی طرح ان کے جواز کے قائل نہ تھے، کیونکہ اسلامی تصوف شریعت کے دائرہ سے الگ نہیں ہے، اور شطحیات علماء و صوفیہ میں سے کسی نے بھی روا نہیں رکھا ہے، چنانچہ

ہندوستان کے اکابر مشائخ اور صوفیہ کا عمل اسی پر رہا ہے، ان کے افعال و اقوال اس کے شاہد ہیں

۵۔ مجمع البحرین :- یہ کتاب دارا نے اپنی عمر کے ۴۲ ویں سال میں لکھی، اس میں اسلام اور ہندو مذہب کو ایک ہی سمندر کے دو دھارے بتایا ہے، اور ان دونوں کو ملانے کی کوشش کی ہے، اور یہ بھی بتایا ہے کہ اسلامی تصوف اور فلسفۂ ویدانت میں لفظی اختلاف کے سوا کوئی اور فرق نہیں، توحید کے شیدائی ان دونوں میں سے جس کی بھی تقلید کریں حقانیت کی منزل تک پہونچ سکتے ہیں، اس کتاب کی اشاعت پر دارا کو مرتد اور ملحد قرار دیا گیا، اور آگے چل کر اس کے یہی عقائد اورنگ زیب کے زوال اور موت کا سبب بنے، یہ کتاب اپنی نوعیت کے لحاظ سے پہلی اور آخری تصنیف ہے[1]

دارا کی تصانیف یہی پانچ ہیں، اس کے بعد اس نے زیادہ تر ہندو مذہب کی کتابوں کے ترجمے کئے یا کرائے، ان ترجموں کی تمہید میں دارا نے اپنے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ان سے پتہ چلتا ہے، کہ وہ حنفی المشرب اور سلسلۂ قادریہ کا پیرو ہونے کے بجائے رفتہ رفتہ ہندو ہونے کی کوشش کر رہا تھا، یا کم از کم وہ اپنے عقائد کو ایسے سانچے میں ڈھال رہا تھا، کہ ہندو اس کی طرف مائل ہو کر تخت و تاج کے حصول میں اس کے معاون اور مددگار ہوں،

۶۔ سر اکبر :- یہ اوپنشد کے پچاس ابواب کا فارسی ترجمہ ہے، جو داراشکوہ نے ۱۰۶۹ھ میں بنارس کے پنڈتوں کی مدد سے کیا، اس کتاب میں بسم اللہ کے بجائے گنیش جی کی تصویر دی ہے، اور دیباچہ میں لکھا ہے، کہ اصل قرآن مجید یہی کتاب ہے، (نعوذ باللہ) اسکی وجہ تصنیف کے متعلق وہ خود رقمطراز ہے، (نقل کفر کفر نہ باشد)

جب یہ فقیر بے اندوہ محمد داراشکوہ ۱۰۵۷ھ ہجری میں کشمیر جنت نظیر گیا تھا، تو میں نے

---

[1] پروفیسر محفوظ الحق کلکتہ نے مجمع البحرین کو بہت ہی دقت نظر کے ساتھ اڈٹ کر کے اس کے انگریزی ترجمہ کے ساتھ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سے شائع کیا ہے،

عنایتِ الٰہی اور اوس کے فضلِ نامتناہی سے کاملون کے کامل، عارفون کے خلاصہ، استادون کے استاد، پیشواؤن کے پیشوا، اور حقائق آگاہ کے معتقد یعنی حضرت ملاشاہ سلمہ اللہ سے سیادت اور ارادت حاصل کی، مجھکو ہر گروہ کے عارف کو دیکھنے اور توحید کے متعلق اعلیٰ باتین سننے کا ذوق تھا، اور تصوف کی بہت سی کتابین نظر سے گذر چکی تھین، اور کچھ رسالے بھی تصنیف کئے تھے، لیکن طلبِ توحید مین جو ایک بحرِ بیکران ہے، اور بھی تشنگی ہر وقت بڑھتی گئی، دقیق مسائل ذہن مین آتے تھے جن کا حل بجز کلام الٰہی اور استاذ ذات نامتناہی کے ممکن نہ تھا، چونکہ قرآن مجید و عظیم اور فرقانِ کریم کی اکثر باتین رمز کی ہین، اور آج کل اُن کے جاننے والے کم ہین، اس لئے مین نے چاہا کہ تمام آسمانی کتابون کو پڑھون، کیونکہ کلام الٰہی اپنی تفسیر آپ ہے یعنی جو بات مجمل ہوگی دوسری کتابون مین مفصل پائی جائیگی اس تفصیل سے اجمال معلوم ہو جائیگا، مین نے توریت انجیل زبور اور دوسری کتابیں پڑھیں لیکن انمین توحید کا بیان مجمل اور اشارات مین تھا، اور ان آسان ترجمون سے جن کو اہلِ غرض نے کیا تھا مطلب معلوم نہیں ہوتا تھا، اس بات کی فکر مین ہوا کہ ہندوستان وحدت عیان مین توحید کی گفتگو کیون بہت زیادہ ہے، اور قدیم ہند کے ظاہری اور باطنی علماء کو وحدت سے انکار اور موحدون پر کوئی اعتراض نہیں، بلکہ ان پر اعتبار ہے، برخلاف اسکے جملاے وقت خداشناسون اور موحدون کے قتل، کفر اور انکار مین مشغول ہین، اور توحید کی تمام باتون کو جو کلام پاک اور صحیح احادیث نبوی سے ظاہر ہین، رد کرتے ہین، وہ خدا کے راستے کے راہزن ہین، ان باتون کی تحقیق کے بعد معلوم ہوا، کہ اس قوم قدیم (یعنی ہندوؤن) کے درمیان تمام آسمانی کتابون سے پہلے چار آسمانی کتابین تھین، رگ بید، سام بید، اتھربن بید..... اور اس وقت کے سب سے بڑے نبی برہما

یعنی آدم صفی اللہ پر یہ تمام احکام نازل ہوئے، اور یہ باتین ان کتابون سے ظاہر ہین ..... اور محض توحید کے اشغال اس مین درج ہین جس کا نام اپنکھت ہے، اس زمانہ کے انبیا نے ان کو علحدہ کرکے ان پر شرح و بسط کے ساتھ تفسیرین لکھی ہین، اور ہمیشہ ان کو بہترین عبادت سمجھکر پڑھتے ہین، اس خاکسار کی نظر چونکہ وحدت ذات کی اصل پر تھی، اور نہ کہ عربی، سریانی، عراقی اور سنسکرت زبان پر تھی، اس لئے چاہا کہ ان اپنکھت کو جو کہ توحید کا خزانہ ہے، اور جس کے جاننے والے اس قوم مین بھی کم رہ گئے ہین فارسی زبان مین بغیر کسی کمی اور بیشی اور نفسانی غرض کے لفظ بلفظ بالمقابل ترجمہ کرکے سمجھون کہ یہ جماعت اوس کو اہل اسلام سے پوشیدہ اور پنہان رکھتی ہے، اس کا کیا بھید ہے؟ شہر بنارس جو اس قوم کا دار العلم ہے، اور جہان پنڈت اور سنیاسی جو کہ سرآمد وقت اور بید اور اپنکھت کے جاننے والے تھے، ..... اس خاکسار سے تعلق رکھتا تھا، ..... ۱۰۶۷ھ ہجری مین بے غرضی کے ساتھ اس کا ترجمہ کیا، اور توحید کے متعلق ہر قسم کی مشکل اور اعلیٰ باتین جن کا مین طلب گار تھا، لیکن حل نہین پاتا تھا، اس قدیم کتاب کے ذریعہ سے معلوم ہوئین، جو بلاشک وشبہہ پہلی آسمانی کتاب ہے، اور بحر توحید کا سرچشمہ ہے اور قدیم ہے، اور قرآن مجید کی آیت بلکہ تفسیر ہے، اور صراحۃً ظاہر ہوتا ہے، کہ یہ آیت بعینہٖ اس کتاب آسمانی سرچشمۂ بحر توحید اور قدیم کے حق مین ہے، انہ لقرآن کریم فی کتب مکنون لا یمسہ الا المطہرون تنزیل من رب العالمین" یعنی قرآن کریم ایسی کتاب مین ہے، جو پوشیدہ ہے، اور اس کو نہین چھوتے ہین، مگر وہ جو کہ پاک ہین، وہ نازل ہوئی ہے، خداوند عالم کی طرف سے متین طور سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت توریت اور انجیل کے حق مین نہین، لفظ تنزیل

سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوح محفوظ کے حق مین ہے، چونکہ اسکمت کہ وہ ایک مخفی راز ہے، اصل کتاب کی ہے، اور قرآن مجید کی آیتین بعینہ اس مین پائی جاتی ہین پس تحقیق کہ چھپی ہوئی کتاب یہی کتاب قدیم ہے، اس فقیر کو جس نے بے جانی ہوئی چیز کو جان لیا اور بے سمجھی ہوئی چیز کو سمجھ لیا، اس ترجمہ کے کرنے مین اس کے سوائے کوئی مطلب اور مقصد نہ تھا، کہ وہ اور اوس کی اولاد اوس کے دوست اور حق کے طلب گار فائدہ اٹھائین"

مولانا شبلی مرحوم نے سترا کبر کے نسخون کو ۱۹۰۶ء مین ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس منعقدہ بنارس کی علمی نمایش گاہ مین دیکھا تھا، اس کتاب کے دیباچہ کو پڑھکر ان پر جو اثرات طاری ہوئے ان کا اظہار اس طرح کرتے ہین، کہ "عالمگیر نے داراشکوہ کے مقابلہ کا جب قصد کیا تو اس کا یہ سبب ظاہر کیا کہ داراشکوہ بدعقیدہ اور بددین ہے، اس لئے اگر وہ ہندوستان کا فرمانروا ہوا، تو ملک مین بددینی پھیل جائے گی، عام مورخون کا خیال ہے، کہ یہ محض ایک فریب تھا، نہ داراشکوہ بے دین تھا اور نہ عالمگیر کی مخالفت کا یہ سبب تھا، دونون کا حال خدا کو معلوم، لیکن اس کتاب کے دیباچہ سے صاف ظاہر ہے کہ داراشکوہ بالکل ہندو بن گیا تھا، اور کچھ شبہہ نہین کہ اگر وہ تخت شاہی پر متمکن ہوتا تو اسلامی شعار اور خصوصیات بالکل مٹ جاتے"

(مقالات شبلی جلد ہفتم صفحہ ۱۱۰)

علمی حیثیت سے اس ترجمہ سے یہ فائدہ ہوا کہ برہمنون کا علمی بخل جاتا رہا، اور اب تک ان کے جو علوم محض رازہاے سربستہ تھے، وہ بالکل فاش ہوگئے، اور اس فارسی ترجمہ کے ترجمے یورپ کی مختلف زبانون مین ہوئے، اور کہا جاتا ہے کہ جرمنون کو اپ نشد کے راز سترا کبر ہی کے ذریعہ سے معلوم ہوے،

سترا کبر کا ایک خوش خط قلمی نسخہ دارالمصنفین کے کتب خانہ مین ہے، گمان یہ ہے کہ اس

نسخہ کا خط داراشکوہ یا اوس کے کسی منشی کے ہاتھ کا ہے، آخری عبارت یہ ہے :-

"این ترجمۂ اپنکتھا سے ہر چہار ویدکہ موسوم بستر اکبر است و تمام معرفت نورالانوار از نفیر بے اندوہ محمد داراشکوہ خود بعبارت راست براست در مدت شش ماہ آخر و شنبہ بست و ششم ماہ رمضان سنہ یکہزار و شصت و ہفت در شہر دہلی، در منزل تکبود و بتمام رسانید ازین گنج معرفت بہرہ ور از ہستی موہوم خلاص گشتہ بہستی حق رسید رستگار جاوید گردید تمام شد کتاب ترجمہ اپنکتہار موافق چہار بید"[1]

۷۔ **بھگوت گیتا**:- اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں ہے جس کے شروع میں یہ عبارت ہے

"گیتا بزبان فارسی تصنیف شیخ ابوالفضل علامی از کتاب ہا بھارت از فن ششم کہ آنرا بھکم پرب گویند سری کرشن جیو ارجن سنایا"

اس تحریر سے یہ ظاہر ہوتا ہے، کہ بھگوت گیتا کا یہ فارسی ترجمہ شیخ ابوالفضل کا کیا ہوا ہے لیکن برٹش میوزیم کے فہرست نگار نے اس کی بقیہ عبارت مین ابوالفضل کے اس ترجمہ کی عبارت مین تطبیق نہین پائی، جو اکبر کے عہد مین ترجمہ کیا گیا تھا[2]، اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری مین ہے، اس کے فہرست نگار نے اس نسخہ کے ترجمہ کو داراشکوہ کی طرف منسوب کیا ہے، اور یہ بھی واضح طور سے بتایا ہے، کہ برٹش میوزیم کے نسخہ کو ابوالفضل کی طرف منسوب کرنا درست نہیں[3]

انڈیا آفس کے فہرست نگار نے ایک اور کتاب **نادرالنکات** داراشکوہ کی طرف منسوب کی ہے،

---

[1] معارف نمبر ۶ جلد ۱۴ میں اکبر کے موضوع پر ایک بہت ہی مفصل تبصرہ شائع ہوا ہے جس کا مطالعہ ناظرین کے لئے مفید ثابت ہوگا [2] برٹش میوزیم کیٹلاگ جلد اول ص ۵۹ [3] انڈیا آفس کیٹلاگ جلد اول کالم ۱۰۸۹ [4] ایضاً کالم ۲۰۵۔

مگر اس کا نام صرف سفینۃ الاولیاء کے سلسلہ میں آگیا ہے، فہرست نگار نے اس کی کوئی تفصیل نہیں لکھی ہے، پروفیسر محفوظ الحق کا خیال ہے کہ یہ کتاب شاید رسالہ حق نما یا مکالمہ بابا لال و داراشکوہ کا دوسرا نام ہو، کیونکہ خدا بخش خان لائبریری پٹنہ میں جو آخر الذکر نسخہ ہے اسکا دوسرا نام مخزن نکات بھی ہے،

خزینۃ الاصفیاء کے مصنف داراشکوہ کے تذکرہ میں لکھتے ہیں :-

"از تصانیف مشہورہ وے کتاب سفینۃ الاولیاء و سکینۃ الاولیاء و سہ اکبر و دیوان اکسیر اعظم و رسالہ حق نما و رسالہ معارف وغیرہ است"

رسالہ معارف میری نظر سے نہیں گذرا، دیوان اکسیر اعظم کا ذکر آگے آئیگا،

مخزن الغرائب کے مولف نے اپنے دیباچہ میں ان کتابوں کی فہرست دی ہے جن سے انھوں نے استفادہ کیا ہے، اس فہرست میں داراشکوہ کی بیاض کا حوالہ ان الفاظ میں دیا ہے،

بیاض محمد داراشکوہ ولی عہد شاہجہان بادشاہ قادری تخلص صاحب مجمع البحرین کہ باصطلاحات صوفیہ ہند نوشتہ"

مگر اس بیاض کا ذکر کسی کتب خانہ کے کیٹلاگ میں نہیں، ورنہ اس سے داراکے شاعرانہ ذوق کا اندازہ ہو سکتا تھا، لیکن مخزن الغرائب کے جیسے دقیق النظر تذکرہ نگار کا اس بیاض سے استفادہ کرنا داراشکوہ کے کمال شاعری کی سند ہے،

پروفیسر محفوظ الحق صاحب نے مجمع البحرین کے دیباچہ میں مختلف ماخذوں سے داراکی تین اور تالیفات کا ذکر کیا ہے، پیرس کے قومی کتب خانہ میں ایک مخطوطہ نگارستان منیر ہے جس کے آخر میں ایک مرقع کا دیباچہ ہے، کتب خانہ ہذا کے فہرست نگار کا بیان ہے کہ اس دیباچہ کی تحریر داراشکوہ کی ہے، پروفیسر صاحب کا خیال ہے کہ شاید یہ دیباچہ اس مرقع کا ہو جو دارا نے

اپنی محبوب بیوی نادرہ بیگم کو ۱۰۵۱ھ مین بطور تحفہ دیا تھا، مخزن ستمبر ۱۹۰۶ء مین دارا کی ایک فارسی مثنوی اور پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی جرنل (جلد دوم نمبر ۱) مین دارا کی ایک تزک کا ذکر ہوا ہے، مگر ان کتابون کے نام کسی تذکرہ اور تاریخ مین نہیں پائے جاتے،

ان تالیفات کے علاوہ حسب ذیل کتابین دارا کے حکم سے لکھی گئین،

۱- مکالمۂ دارا شکوہ و بابا لال بابا لال بیراگی ذات کا کھتری اور قصور کا باشندہ تھا، لیکن اس کا استھان دھیان پور (بٹالہ) مین تھا، میان جیو کا دوست تھا، اس لئے دارا شکوہ کو بھی اس سے عقیدت تھی، اپنی کتاب شطحیات مین بابا لال کے متعلق لکھتا ہے:

بابا لال مندیہ کہ از کمال عرفاست و در ہنود بفرمان دمقانت وے کسے دیدہ نشد، مرا گفت، در ہر قومے عارف و کامل می باشد کہ حق سبحانہ تعالیٰ بہ برکت او آن قوم را نجات می دہد، و تو منکر ہیچ قومے مباش" (صفحہ ۳۳ مطبع مجتبائی)

مجمع البحرین میں بابا لال بیراگی کا نام مسلمان صوفیۂ کرام کے ساتھ آیا ہے، (صفحہ ۲۶)

دارا شکوہ ۱۰۶۲ھ میں قندھار کی مہم سے واپس آیا، تو لاہور مین بابا لال سے ملا، اور دونون کی گفتگو سات مجلسون میں ختم ہوئی، ان مکالمون کو دارا شکوہ کے حکم سے اس کے میر منشی چندر بھان برہمن نے قلمبند کر لیا تھا، مکالمے دلچسپ ہین، جن مین یہ دکھلایا گیا ہے، کہ حق و صداقت کسی ایک مذہب کی ملکیت نہین، اب سے بہت پہلے یہ رسالہ مع اردو ترجمہ کے مطبع مجیب ہند دریا گنج دہلی سے چھپ گیا ہے، اس کا اردو ترجمہ ایک ہندو لالہ چرنجی لال نے کیا ہے،

۲- جگ بشست: یہ سنسکرت کی مشہور کتاب "یوگ واسی شست" کا فارسی ترجمہ ہے، جو دارا شکوہ کے حکم سے اوس کے ایک درباری نے ۱۰۶۶ھ مین کیا، ترجمہ کی وجہ دارا نے یہ بتائی ہے:

"اس کتاب کے انتخاب کا ترجمہ جو شیخ صوفی کے ساتھ منسوب ہے، ہم نے مطالعہ کیا تو رات کو خواب میں دیکھا کہ دو بزرگ قبول صورت ایک اونچے پر اور دوسرے کسی قدر ان سے نیچے کھڑے معلوم ہوئے جو اونچے پر کھڑے تھے، بشسٹ تھے، اور دوسرے ذاتجند ..... میں بے اختیار بشسٹ کی خدمت میں حاضر ہوا، بشسٹ نے نہایت مہربانی سے ہاتھ میری پیٹھ پر رکھا، اور فرمایا کہ اے رام چندر یہ سچا طالب ہے، اور سچی طلب میں تیرا بھائی ہے، اس سے بغلگیر ہو، رامچندر کمال محبت کے ساتھ مجھ سے ملے، اس کے بعد بشسٹ نے رام چندر کے ہاتھ میں مٹھائی دی، تاکہ مجھے ملا دے، میں نے وہ شیرینی کھائی، اس خواب کے دیکھنے پر ترجمہ کی خواہش از سر نو زیادہ ہوئی، اور دربار عالی کے حاضرین میں سے ایک شخص مقرر اس خدمت پر ہوا، اور ہندوستان کے پنڈتوں سے ..... اس کتاب کے لکھنے میں اہتمام و انصرام کیا"[1]

اس ترجمہ کا ایک نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی میں ہے، اس کا اردو ترجمہ منہاج السالکین کے نام سے مولوی ابوالحسن صاحب نے کیا ہے، جو نولکشور پریس لکھنؤ میں طبع ہوا ہے، اوپر کی عبارت سے معلوم ہوگا، کہ دارا ہندوؤں پر یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا، کہ وہ بھی رام چندر کی طرح ایک اوتار ہے،

۳۔ **تاریخ شمشیر خانی**: یہ شاہ نامہ کی گویا تلخیص ہے، جو دارا کے حکم سے کی گئی، دارا کے وسیلہ سے جو کتابیں لکھی گئیں ان میں جناب پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی نے قصص الانبیا کا نام بھی گنایا ہے،

دارا کی علم پرستی کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ بعض اہل قلم اپنی کتابیں لکھ کر اس کے

---

[1] بحوالہ مقدمہ رقعات عالمگیر مرتبہ نجیب اشرف ندوی رفیق دار المصنفین،

نام سے منسوب اور معنون کرتے تھے، نورالدین محمد بن عبداللہ بن عین الملک نے ۱۰۵۶ھ مین طب پر ایک ضخیم کتاب لکھی، اور اسکا نام طب دارا شکوہی رکھا، پیرس کے قومی کتب خانہ کے فارسی مخطوطات کی فہرست مین اس کا نام علاجات دارا شکوہی ہے، ابراہیم مسکین نے اپنی کتاب ترجمۂ اقوال وسطی مین ابوبکر بن محمد بن موسیٰ الواسطی کے اقوال کا فارسی ترجمہ کیا، اور اس کو دارا شکوہ کے نام سے معنون کیا۔

دارا نثر نگار ہونے کے علاوہ ایک ممتاز شاعر بھی تھا، اسکی شاعری کی داد اس کے مرشد نے "بے نظیر" اور "دلپذیر" کہکر دی تھی[1]، کلمات الشعراء کے مصنف سرخوش نے لکھا ہے:

"طبع بلند و ذہنے رسا داشت، مطالب صوفیہ در رباعی و غزل منظوم می کرد و بحسب اعتقادی کہ بسلسلۂ عالیہ قادریہ داشت، قادری تخلص می کرد..... دیوان مختصر از و جمع شدہ"

خزینۃ الاصفیا، کے مصنف کا بیان ہے کہ دارا شکوہ کے دیوان کا نام اکسیر اعظم تھا اور وہ اسکی شاعری کی تعریف ان الفاظ مین کرتے ہین:

"سخنش دریاے توحید است کہ از زبان گوہر افشان او روان گشتہ و یا خورشید وحدانیت است کہ از افق بیان مطلع انوارش طلوع شدہ، مغزی باید کہ سخنش را بفہمد و دری باید کہ معانی آن در وی امکان پزیرد" (خزینۃ الاصفیا ص۱۷۵ جلد اول)

دارا کا دیوان نایاب تھا، مگر ابھی حال ہی مین خان بہادر ظفر الحسن صاحب (محکمۂ آثار قدیمہ) کو اوس کے ایک دیوان کا نسخہ ملا ہے، موصوف نے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے ایک ماہانہ جلسہ (جولائی ۱۹۳۹ء) کے مضمون مین یہ بتایا ہے، کہ اس دیوان میں دارا کی ۴۳ غزلین اور ۲۸ رباعیات ہین، اور یہ نسخہ دارا کی زندگی ہی مین لکھا گیا تھا، اب تک اس دیوان کی طباعت نہ ہو سکی ہے، لیکن شاید علی گڈھ کی مجلس تاریخ کی طرف سے بہت جلد شائع ہونے والا ہے، مختلف تذکرون میں ہم کو

---

[1] سکینۃ الاولیاء صفحہ ۱۴۳۔

دارا کے جو جستہ جستہ اشعار ملے ہیں، ان کو ناظرین کی دلچسپی کے لئے ذیل میں درج کرتے ہیں، اس سے دارا کے ذوقِ شعری کا اندازہ ہوگا،

تذکرۂ سرخوش :-

ہر خم و پیچی کہ شد از تاب زلفِ یار شد — دام شد زنجیر شد تسبیح شد زنار شد

خاطر نقاش در تصویر حسنش جمع بود — چون بزلف اور سید آخر پریشانی کشید

بشکست دلِ ابله از گردش پایم — در کار من انیم گرہی بود کہ وا شد

بقدر مال باشد سرگرانی، — زوزن زر فزاید بار دستار

بخیہ بر فرقۂ فاکیشان — موجِ آبِ حیات را ماند،

ہمہ چیز تو خوب لیک این بد — کہ تو بسیار دیر می آئی

تا دوست رسیدیم چو از خویش گذشتیم — از خویش گذشتن چہ مبارک سفری بود

مخزن الغرائب : رباعی

معروف شدم تا کہ بعرفان گشتم — عارف شدم و ز خویش عریان گشتم

پیدا کردی مرا ولیکن من ہم — پیدا کردم ترا و قربان گشتم

دیگر

عارف دل و جانِ تو مزین سازد — خار یکہ بود پاش گلشن سازد

کامل ہمہ راز نقص بیرون آرد — یک شمع ہزار شمع روشن سازد

حسنات العارفین میں دارا شکوہ نے شطحیات کی تائید و حمایت میں بکثرت اشعار نظمین اور رباعیاں لکھی ہیں، ان میں جو اشعار اور رباعیاں اوس نے اپنی طرف منسوب کی ہیں، ان کو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں، مثلاً وہ اس مضمون کو کہ ذاکر مذکور سے غافل ہوسکتا ہے، مگر اوس کا غافل ہونا عوام کے

غافل ہونے سے مختلف ہے، یوں ادا کرتا ہے،

خوش گرچہ بیاد خود نشستن ہمہ وقت — این قید چہ لازم ست بر من ہمہ وقت
غافل شدن خلق ز حق از حق ست — خود را تعب است یاد کردن ہمہ وقت

یا توحید کی حقیقت خود توحید کو فراموش کرنا ہے،

توحید خموشی ست و فکر است مدام — بحث آمد و شد ز دست توحید تمام
یک گفتن تو بہ بین قوی ثابت کرد — توحید رود ز نقطہ چون گیری نام

ابو عبداللہ خفیفؒ سے پوچھا گیا، کہ تصوف کیا ہے، تو فرمایا "غفلت راہم وجود اللہ دانستن" دارا نے اس نکتہ کو اس طرح ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے،

ہر چند کہ خلق را گرفتہ کولی، — غفلت شدہ است بر ہمہ مستولی
مشغول بحق ست بفہمد، — یا نہ ہر کس کہ بہر چیز کند مشغولی

جو شخص خدا کے ساتھ مشغول ہے، اوس کے لئے ایمان کا سوال باقی نہیں رہتا،

کافر گفتی تو از پے آزارم، — این حرف ترا راست ہمی پندارم
پستی و بلندی ہمہ شد ہموارم، — من مذہب ہفتاد و دو ملت دارم

منصور نے صرف اپنے میں خدا کو دیکھا لیکن عارف ہر چیز میں خدا دیکھتا ہے،

عارف بخود اطلاق خدائی نکند — از ذات لطیف خود جدائی نکند
گر بندہ کسے بود خدا او باشد — چون جملہ خداست خود نمائی نکند

توحید علم سے حاصل نہیں ہوتی ہے، کہنا اور ہے، اور ہونا کچھ اور ہے،

خواہی کہ شوی داخل ارباب نظر — از قال بحال باید ت کرد گذار
از گفتن توحید موحد نشوی، — شیرین نشود دہان ز نام شکر

عارف کسی کی پیروی نہیں کرتے ہیں،

ہر دم بر سد بعارفان ذوق جدید — خود مجتہد اند نے ز اہل تقلید
شیران نخورند جز شکار خود را — روباہ خورد فتادہ بحسم قدید

دنیا کی تمام چیزوں کو معرفت حاصل ہے۔ لیکن یہ راز صرف عارف کو معلوم ہوتا ہے،

توحید شناخت ہر کرا حالی نیست — در راہ طلب ہمت او عالی نیست
خوش آنکہ میان خویش حق را بشناخت — او در ہمہ جاست ہیچ جا خالی نیست

عرفان اپنے کو پہچاننے کا نام ہے،

کے کار تو در شمار حق می آید، — قلبے تو در اعتبار حق می آید،
باید کہ تو عین خویش دانی حق را — فانی شدنت چہ کار حق می آید،

بر عارف اطلاق مردن جایز بود چہ جان بجانان پیوست آب آب شد و خاک خاک و ہوا ہوا و آتش آتش،

بیرون و درون کوزہ پر بود ہوا — پیچید درون کوزہ آواز و صدا
کوزہ بشکست و گشت آواز آواز — بشکست حباب و گشت عین دریا

خدا کا نام لیکر ذکر کرنا غفلت کا باعث ہے،

ہستی وجود خویشتن کردم رد — گردید مساویم ہمہ نیک و بد
اکنون نتوان نام خود و نامش برد — گر نام بگیرم ز من اومی رنجد

فقیر اور عارف کا کوئی نام نہیں ہوتا،

یک ذرہ ندیدیم ز خورشید سوا، — ہر قطرہ آب ہست عین دریا،
حق را بچہ نام کس نتواند خواندن — ہر نام کہ ہست ہست از اسماء خدا

داراشکوہ دلربا کو ایک رقعہ میں لکھتا ہے کہ اس کے دل سے اسلام مجازی محو ہو گیا، اور اب کفر حقیقی کا جلوہ نظر آتا ہے، اور اس کفر حقیقی کی قدر معلوم کرنے کے بعد وہ زنار پوش، بت پرست، بلکہ خود پرست اور دیرنشین ہو گیا ہے، اور اس کے لئے کسی چیز کے اقرار و انکار کا سوال باقی نہیں رہا ہے،

مسلمان گر بداند کہ بت چیست — بداند کہ دین در بت پرستی است
اگر کافر ز اسلام مجازی گشت بیزار — کہ کفر حقیقی شد پدیدار،
درونِ ہر بتے جانیست پنہان — بزیر کفر ایمانیست پنہان،
بتر سازادہ دادم دل بیک بار — مجرد گشتم از اقرار و انکار[1]

داراشکوہ نہ صرف شاعر تھا، بلکہ شاعروں کا سرپرست اور مربی بھی تھا، میر رضی دانش مشہد سے ہندوستان آیا تو داراہی کے دامن دولت سے وابستہ ہو کر درجۂ عروج پر پہنچا، مرأۃ الخیال کا مؤلف میر رضی دانش کے ذکر میں لکھتا ہے :

"از تربیت کردہائے شاہ بلند اقبال سلطان داراشکوہ است و بدست یاری استعداد و پایہ دری طالع بمحفل ہمایونش راہ دانست"

رضی دانش کے متعلق مخزن الغرائب میں ہے :-

"شاہزادہ داراشکوہ ..... ویرا تربیت کلی فرمودہ از باعث قدر دانی شہزادہ نہایت عزت و شہرت بہند یافت"

مرأۃ الخیال کے مؤلف کا بیان ہے، کہ رضی دانش کی مندرجۂ ذیل غزل پر دارا نے ایک لاکھ روپئے بطور انعام دیئے[2]

---

[1] رقعات عالمگیر مرتبہ سید نجیب اشرف ندوی ص ۳۲۳،
[2] مرأۃ الخیال، کلکتہ اڈیشن ص ۲۵۸

موسم آن شد کہ ابر ترچمن پر ور شود — نکہتِ گل مایۂ شورِ جنون در سر شود
تاک را سیراب سازد ابر نیسان در بہار — قطرہ تا مے میتواند شد چرا گوہر شود
نالۂ بلبل نہان در پردۂ برگِ گل است — بید ما غم کاش ازین یک دو نازک تر شود
مانیز قِ گریۂ مستی درین بزم آمدیم — مے بدہ ساقی بقدرِ آنکہ چشمم تر شود
راز پوشیدن نیاید دانش از بے تابِ عشق — در میانِ انجمن پروانہ خاکستر شود،

مرآۃ الخیال مین ہے، کہ دارا کو مطلع بہت پسند آیا، لیکن سرخوش رقمطراز ہے کہ اس کو دوسرا شعر مرغوب ہوا، چنانچہ اس شعر کو مصرعِ طرح بنا کر شعراء کو غزلین لکھنے کی فرمایش کی، اوس نے بھی اس پر ایک غزل کہی جس کا ایک شعر یہ ہے،

سلطنت سہل است خود را آشنائی فقر کن — قطرہ تا دریا تواند شد چرا گوہر شود[1]

داراشکوہ اپنے میر منشی چندر بھان برہمن کی نثر و نظم کی سادگی کا بھی دلدادہ تھا، اور مرآۃ الخیال کے مؤلف کیلئے باعثِ تعجب ہے، چنانچہ وہ لکھتا ہے:

"عجب کہ شاہزادہ بآن ہمہ مستعد ان کہ در عرصۂ روزگار بہ رنگ آمیزی الفاظ آبدار صفحہ خاطر ارباب دانش را چون شقہائے موسم بہار بہزار رنگ متلون می ساختند خاطر مبارک بسخن سادہ اش فرود آوردہ بود، این معنی خالی از دو چیز نبودہ باشد، یا مذاق شاہزادہ بہمان طرز آشنائی داشت، یا او بزور طالع بدین پایہ رسید[2]"

داراشکوہ کو برہمن کا یہ شعر بہت پسند تھا،

مرا دلیست بکفر آشنا کہ چندین بار — بکعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

داراشکوہ نے برہمن سے شاہجہان کے سامنے بھی یہ شعر پڑھایا، شاہجہان شکر برافروختہ ہوا،

---

[1] سرخوش مخطوطہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی،

لیکن افضل خان نے اس کا غصہ سعدی کا یہ شعر پڑھکر ٹھنڈا کیا،

خر عیسیٰ گرش بمکہ برند چون بیاید ہنوز خر باشد[۵۱]

داراشکوہ فن خطاطی میں بھی ید طولیٰ رکھتا تھا، یہ فن اوس نے شاہجہانی عہد کے مشہور استاد آقا عبدالرشید دیلمی سے سیکھا، اور وہ اس کا بہت ہی محنتی اور لائق شاگرد تھا، تذکرۂ خوشنویسان مین ہے:

"داراشکوہ پسر شاہجہان بادشاہ شاگرد عبدالرشید آقاست باوجود اشغال امور شاہزادگی، و دیگر علوم بروئے آقا عبدالرشید شاید کسے مثل او نوشتہ باشد"[۵۲]

داراکو نستعلیق اور نسخ دونون مین کامل مہارت تھی، پروفیسر محفوظ الحق نے اس کی خطاطی کے بہت سے نمونون کا ذکر مجمع البحرین کے دیباچہ مین کیا ہے، مثلاً اوس کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک کلام پاک عزیز باغ لائبریری حیدرآباد دکن مین ہے، اس کے حروف شروع سے آخر تک سُنہرے ہین، ایک مطلا پنجسورہ کا نسخہ بخط نسخ اور ایک "دہ پند ارسطو" کا نسخہ بخط نستعلیق وکٹوریہ میموریل ہال مین محفوظ ہے، آصفیہ لائبریری حیدرآباد مین داراکے خط کی دو کتابین ہین، رسالہ حکمت ارسطو اور شرح دیوان حافظ (فہرست کتب خانہ آصفیہ جلد اول ص۴۳۹) ان کے علاوہ اسکی لکھی ہوئی وصلیان مختلف جگہون مین پائی جاتی ہین، بعض کتابون پر اس کے دستخط اور مختصر تحریرین بھی ہین، جو خطاطی کے نادر نمونے کہی جاسکتی ہین،

سپہر شکوہ | خزینۃ الاصفیا کے مصنف کا بیان ہے کہ داراشکوہ کے قتل کے بعد جب اسکا نوسالہ لڑکا اورنگزیب عالمگیر کے سامنے پیش کیا گیا تو عالمگیر نے اس بچہ کا حال پوچھا، بچے نے

---

۵۱ مرأۃ الخیال صفحہ ۱۵ ص ۲۱۴،

۵۲ تذکرہ خوشنویسان ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ص ۵۴

فی البدیہہ یہ شعر پڑھا،

ہجر وا ابر دلِ من کمتر از یعقوب نیست او پسر گم کردہ بود و من پدر گم کردم

عالمگیر یہ جواب پاکر رنجیدہ ہوا اور بولا بھیڑیے کو مارنا اور اس کے بچہ کی پرورش کرنا عقلمندون کا کام نہین، چنانچہ اس بچہ کو مروا ڈالا[۱] خزینۃ الاصفیار کے مصنف نے نو سالہ بچے کا نام نہین لکھا ہے، مصنف موصوف کی مراد شاید سپہر شکوہ سے ہو، مگر یہ روایت صحیح نہین، کیونکہ عالمگیر نے اپنے سولھوین سال جلوس ۱۰۸۳ھ مین اپنی لڑکی نواب زبدۃ النسار بیگم کو شہزادہ سپہر شکوہ کے حبالۂ عقد مین دیا[۲]، (باقی)

---

[۱] خزینۃ الاصفیار ص ۵، ۱ جلد اول [۲] مآثر عالمگیری اردو ترجمہ صفحہ ۸۳ دارالترجمہ حیدرآباد دکن،

مقدمہ رقعات عالمگیر

اس مین رقعات پر مختلف حیثیتون سے تبصرہ کیا گیا ہے، جس سے اسلامی فن انشا اور شاہانہ مراسلات کی تاریخ، ہندوستان کے صیغۂ انشار کے اصول نہایت تفصیل سے معلوم ہوتے ہین، بالخصوص خود عالمگیر کے انشا، اور اس کی تاریخ کے مآخذ اور عالمگیر کی ولادت سے برادرانہ جنگ تک کے تمام واقعات وسوانح پر خود ان خطوط ورقعات کی روشنی مین تنقیدی بحث کی گئی ہے، مرتبہ پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی ایم اے،

قیمت :- للہ ر

ضخامت، ۳۹۰ صفحے

منیجر دارالمصنفین

تاریخ ملک ارسلان غزنوی

از

جناب غلام مصطفےٰ خانصاحب ایم اے ایل بی (علیگ) اسسٹنٹ لکچرر کنگ ایڈورڈ کالج امراوتی (برار)

برٹش میوزیم کے مخطوطہ نمبر ۱۰۶۹ کے ورق ۱ اب اور ۱۸ اب سے معلوم ہوتا ہے، کہ سر ہنری ایلیٹ نے غالب کے شاگرد نواب ضیاء الدین (نیر رخشان) سے فرمایش کی تھی، کہ مسعود سعد سلمان[1] (م ۵۱۵ھ/۱۱۲۱ء) اور سید حسن غزنوی (م ۵۵۵ھ/۱۱۶۰ء) کے کلام سے تاریخی اشارات جمع کئے جائیں لیکن افسوس ہے کہ وہ اس طرف زیادہ توجہ نہ کر سکے، ورنہ یہ زمانہ جس کو بارتھولڈ نے اپنی کتاب "ترکستان" مین "تاریک زمانہ" کہا ہے کسی قدر نمایان ہو جاتا، بہرحال ہم کوشش کرتے ہین، کہ ان شاعرون اور ان کے معاصرین کے کلام سے غزنوی عہد کے اختتام کی تاریخ مرتب ہو سکے، چنانچہ ملک ارسلان کی تاریخ کو اس سلسلہ کی ایک کڑی سمجھنا چاہیئے،

ملک ارسلان کے والد یہ بادشاہ اس معاملہ مین ضرور خوش قسمت ہے کہ تاریخ نے اوس کو مسعود سوم غزنوی (شوال ۵۰۸ھ/فروری ۱۱۱۵ء) ہی کا بیٹا سمجھا، ورنہ اس کے بھائی بہرام شاہ غزنوی (م ۵۵۲ھ/۱۱۵۷ء)

---

[1] یہ عجیب بات ہے، کہ جب نیر رخشان نے ورق ۱۸ اب مین لکھا کہ مسعود سعد سلمان کی وفات ۵۱۰ھ ہجری مین ہوئی، تو وہ بہرام شاہ غزنوی کے متعلق جو بعد کو تخت نشین ہوا کیونکر لکھ سکتا ہے، تو ہنری ایلیٹ نے اوس ورق کے حاشیہ پر انگریزی مین لکھ دیا ہے، کہ میرا مقصد مسعود سعد سلمان سے نہ تھا، بلکہ صرف سید حسن غزنوی سے تھا،

کو صاحب طبقات ناصری[1] تک نے اوس کا چچا کہا ہے، تاریخ کے قول کی تصدیق عثمان مختاری (م ۵۵۴ھ/۱۱۵۹ء) کے اس شعر سے بھی ہو جاتی ہے:

ابو الملوک ملک ارسلان بن مسعود طراز ملک جہان پادشاہ ملک طراز[2]

ملک ارسلان کی والدہ | اسکی والدہ کے متعلق تاریخ کو ضرور دھوکا ہوا ہے، ہم یہاں کوشش کرتے ہیں کہ اس کے متعلق شبہات دور ہو جائیں، عموماً تمام تاریخوں میں ہے کہ سلطان سنجر سلجوقی (م ۵۵۲ھ/۱۱۵۷ء) کی بہن "محمد عراق" بہرام شاہ (برادر ملک ارسلان) کی ماں تھی، ابھی اس بات کو پر کھنا ہی تھا، کہ اسی سلسلے میں ایران کے جدید مورخ عباس پرویز کا دعوی یاد آیا، جو بغیر ثبوت کے فرماتے ہیں، کہ

---

[1] نسخہ بانکی پور ورق ۱۲۳ (الف)، یا کلکتہ اڈیشن صفحہ ۲۲، ذیل کے اشعار سے بھی معلوم ہو سکتا ہے، کہ (ارسلان کی طرح) بہرام شاہ بھی مسعود سوم کا لڑکا تھا:

شاہ بہرام شاہ بن مسعود کہ بناز د بعدل او محمود (حدیقہ سنائی لکھنؤ ایڈیشن ص ۶۲۵)

شاہ بہرام شاہ بن مسعود کہ سزد چرخ صفعۂ بارش (دیوان سید حسن غزنوی انڈیا آفس نمبر ۳۱۲۹ ورق ۱۴۶ ب)

[2] ڈاکٹر ایتھے نے عثمان مختاری کی تاریخ وفات (فہرست انڈیا آفس صفحہ ۶۳۰) ۵۴۴ھ/۱۱۴۹ء یا ۵۵۴ھ/۱۱۵۹ء بتائی ہے، لیکن یہ تاریخ غلط ہوگی، اگر ہم تاریخ صحیح صادق (جلد سوم ورق ۱۰۲۲ الف بانکی پور) کا یہ قول صحیح سمجھیں کہ ذیل کے شعر والا قصیدہ خسرو ملک نبیرۂ بہرام شاہ (نہ کہ فرزند ملک ارسلان) کی مدح میں ہے جو ۵۵۹ھ/۱۱۶۳ء میں تخت نشین ہوا:

ابو الملوک خداوند خسروان زمین جمال ملکت خسرو ملک پناہ سپاہ

[3] دیوان مختاری ورق، ب بانکی پور، عثمان مختاری کا مکمل دیوان بانکی پور میں ہے، انتخاب جامعۂ عثمانیہ میں ہے، اور اسی کی صحیح نقل، لیکن قدیم نسخہ پروفیسر مسعود حسن رضوی لکھنوی کے پاس ہے [4] روضۃ الصفا، ۱۷۸ء جلد چہارم صفحہ ۹۹، راحت الصدور میں سنجر کی وفات ۵۵۱ھ/۱۱۵۶ء میں بتائی ہے، مجالس العشاق (لکھنؤ اڈیشن صفحہ ۲۳۲) بھی ملاحظہ ہو،

وہ سنجر کی بیٹی تھی، گویا شبہہ در شبہہ پیدا کر دیا ہے، بہرحال ان کا یہ قول کہ وہ سنجر کی بیٹی تھی قطعی غلط ہے، کیونکہ سنجر کی ولادت راحت الصدور مین ۴۷۹ھ ہے، اور بندارری کے بیان جمعہ ۲۵ رجب ۴۷۶ھ (یکم فروری ۱۰۷۹ء) ہے اگر بندارری کا قول اصح مانا جائے، اور تھوڑی دیر کے لئے یہ فرض کر لیا جائے کہ سنجر نے اپنے دادا الپ ارسلان کی طرح تیرہ سال کی عمر میں شادی کی، یعنی ۴۸۲ھ مین تو اسکی بیٹی "مہد عراق" اگر سب سے پہلی اولاد ہو تو وہ ۴۸۵ھ سے پہلے پیدا نہ ہوئی ہوگی، اس تاریخ کو ذہن مین رکھتے ہوئے یہ دیکھنا ہے، کہ اس لڑکی کی شادی کب ہوئی اور کب ہو سکتی تھی ؟

تاریخ فرشتہ (جلد اول صفحہ ۴۸) سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سلطان ابراہیم غزنوی (م ۴۹۱ھ) اپنے بیٹے کی شادی "مہد عراق" کے ساتھ کر چکا اور اُسے سلجوقیون کی طرف سے یک گونہ اطمینان ہو گیا، تو وہ ہندوستان آیا اور قلعۂ اجودھن (پاک پٹن) کو ۴۷۲ھ مین فتح کیا، ابن الاثیر (جلد دہم صفحہ ۴۶) نے اس فتح کی تاریخ ۲۰ صفر ۴۷۶ھ (یک شنبہ ۷ جولائی ۱۰۸۳ء) لکھی ہے، بہرحال اس سے یہ معلوم ہوا کہ اس فتح کی تاریخ کے پہلے وہ شادی ہو چکی تھی، اب اگر معتبر بُنداری کا قول اصح سمجھا جائے، کہ سنجر کی ولادت ۴۷۱ھ مین ہوئی تو عباس پرویز کے بے بنیاد قول کو کون مان سکتا ہے، کہ وہ شادی (جو ۴۷۲ھ یا ۴۷۶ھ سے پہلے ہوئی) سنجر کی بیٹی سے ہوئی تھی، جب کہ اوس کی بیٹی ۴۸۵ھ سے پہلے پیدا

---

[1] از ظاہر یان تا مغول" جلد اول صفحہ ۵۰۹ [2] مصری اڈیشن ۱۳۱۸ھ صفحہ ۲۳۴ [3] سنجر کے والد ملک شاہ کی پیدائش ۴۴۵ھ مین ہوئی اور ملک شاہ کے والد الپ ارسلان کی پیدائش ۴۳۱ھ مین ہوئی تھی، یعنی ملک شاہ اپنے والد کی ۱۴ سال کی عمر میں پیدا ہوا، ملاحظہ ہو راحت الصدور یا اس کا خلاصہ (رائل ایشیاٹک جرنل مورخہ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۵۹۴ و ۵۹۵)

نہیں ہو سکتی تھی، چنانچہ اب واضح ہوا کہ یہ قول صحیح ہے، کہ "عہد عراق" سنجر کی بیٹی نہ تھی،

اب طبقاتِ ناصری[1] کے اس قول کو پرکھئے کہ "عہد عراق" ارسلان کی سوتیلی ماں اور بہرام شاہ کی حقیقی ماں تھی، صرف فخرالدین مبارک شاہ (م ۶۰۰ھ - ۱۲۱۰ء - ۶۳۳ھ - ۱۲۳۵ء) کو اس سے اختلاف ہے، اور اس نے اس شادی کے متعلق اپنی کتاب آداب الحرب[2] میں تفصیل دی ہے، خلاصہ اس کا یہ ہے کہ جب ملک شاہ سلجوقی (م ۴۸۵ھ - ۱۰۹۳ء) نے غزنین کی طرف بڑھنے کے لئے خوارزم خراسان اور عراق سے ایک بہت بڑی فوج جمع کی، تو سلطان ابراہیم غزنوی نے اپنے ایلچی مہتر رشید (ابوالرشد رشید) کو صلح کی غرض سے بھیجا، وہ ایلچی ایک عرصے تک ملک شاہ کے دربار میں رہا، اور آخر کار اوس نے کوشش کرکے مسعود سوم غزنوی کی شادی چغری بیگ ابوسلیمان[3] داؤد ابن میکائیل بن سلجوق کی لڑکی یعنی ملک شاہ کی بھوپھی سے طے کرائی، آداب الحرب کے اصل الفاظ یہ ہیں:

"ملک شاہ، مہتر رشید را گفت" من دختر ندارم، اما خواہرے ہست مرا بعراق، و دختر خواہر بیگ داؤد نام زد کردم، کس بفرست تا بیارند و بدان حضرت برند" دبیر فرمود تا بعراق نامہ نوشتند کہ عمت خویش را بامیر علاء الدولہ مسعود بزنی دادم، زود تر برگ او بسازند کہ کسان می آیند تا ہر چہ زود تر تحویل کنند، و آن دختر، مادر ملک ارسلان بود....."

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ ملک ارسلان کی ماں، چغر بیگ ابوسلیمان داؤد[4] کی لڑکی

---

[1] کلکتہ ایڈیشن صفحہ ۲۳ [2] شائع کردہ اورینٹل کالج لاہور ص ۱۶-۲۷ [3] اس کے پورے نام کے لئے ملاحظہ ہو رائل ایشیاٹک جرنل مورخہ جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۵۸۸ [4] مسٹر اقبال شفیع کو شک ہے کہ یہ شادی کیونکر ہو سکتی تھی، جب کہ چغر بیگ کی وفات ۴۵۱ھ - ۱۰۵۹ء میں ہوئی، اور مسعود سوم تین سال بعد پیدا ہوا (اسلامک کلچر مورخہ اپریل ۱۹۳۸ء صفحہ ۱۹۶) لیکن بڑی عمر کی لڑکی سے شادی کرنا مسلمانوں میں رائج ہے،

تھی جو غالباً عراق مین رہنے کی وجہ سے "ملک عراق" کے لقب سے مشہور ہوئی، ملک ارسلان کے اس رشتہ کے متعلق ذیل کے تیسرے شعر مین مسعود سلمان نے اشارہ کیا ہے: (از زبان ملک ارسلان گوید)

من مایۂ عدل و مایۂ جودم، سلطان ملک ارسلان مسعودم
محمود خصالم درسم و دراعم زیر اشرف نژاد محمودم
باقوت و قدرت سلیمانم، زیرا ز اصل و نسل داؤدم[1]

اسی شاعر نے ایک اور جگہ اشارہ کیا ہے:

توئی ز گوہر محمود و گوہر داؤد کدام شاہ نسب دارد از چنین والا[2]

اس شعر کے دوسرے مصرع مین اگر شاعرانہ مبالغہ نہ ہو بلکہ حقیقت ہو تو بھی یہی خیال ہوتا ہے کہ صرف ملک ارسلان ہی ان دو خاندانون سے تعلق رکھتا تھا، اور اس کا بھائی بہرام شاہ اس مان سے نہ تھا[3]،

ملک ارسلان کی ولادت اس بادشاہ کی ولادت کے متعلق بھی تاریخون مین اختلاف ہے، اس لئے اسے بھی پرکھنے کی ضرورت ہے،

ابن الاثیر (جلد دہم صفحہ ۱۷۹) اور ابو الفداء (جلد دوم ص ۲۳۹) وغیرہ عربی مورخون نے لکھا ہے کہ ملک ارسلان ۲۰ سال کی عمر مین جمادی الآخر ۵۱۲ھ (ستمبر ۱۱۱۸ء) مین قتل ہوا یعنی اس حساب سے اوس کی تاریخ ولادت ۴۹۲ھ/۱۰۹۹ء سمجھنا چاہئے لیکن صاحب طبقات ناصری (کلکتہ اڈیشن ص ۲۳)

---

[1] دیوان مسعود سعد سلمان، طہران ایڈیشن ص ۶۱۱ [2] ایضاً ص ۱۱۳ [3] اسی طرح مسعود سعد سلمان فی (دیوان ص ۶۰) جب بہرام شاہ کی نسل کی تعریف کی ہے، تو صرف یہ کہا ہے:

گویند ہفت کشور زیر نگین کند شاہے ز اصل و نسل مینی دین توئی

اس کے علاوہ اگر "ملک عراق" ارسلان کی مان نہ ہوتی تو وہ سنجر کے پاس اسے تحائف کے ساتھ بہرام شاہ کے خلاف کیون بھیجتا، نیز ارسلان نے جب سنجر کی فوج کشی کا حال سنا تو سنجر کے حقیقی بھائی محمد سنجوتی سے سفارش چاہی کہ سنجر بہرام شاہ کی مدد نہ کرے،

نے لکھا ہو کہ اس نے ۳۵ سال کی عمر مین ۴۵۱ھ مین وفات پائی یعنی اس دوسرے حساب سے اسکی پیدایش ۴۱۶ھ مین ہوئی،

اس کے پہلے ہم دیکھ چکے ہین کہ ملک ارسلان کے والد مسعود سوم غزنوی کی شادی قلعۂ اجودھن (پاک پٹن) کی فتح کے پہلے ہو چکی تھی، اور فرشتہ نے اس فتح کی تاریخ ۴۶۲ھ بتائی ہے، اس کے معنی یہ ہوے کہ وہ شادی اس کے پہلے یعنی غالباً ۴۶۱ھ مین ہوئی لیکن ذیل کے واقعات کے تطابق سے معلوم ہوتا ہے، کہ یہ تاریخ صحیح نہیں ہے :

(الف) راحت الصدور سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس سال یعنی ۴۶۱ھ مین ملک شاہ سلجوقی سمرقند وغیرہ[1] کی فتح مین مشغول تھا، اور آداب الحرب سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ سلطان ابراہیم غزنوی کے ایلچی مہتر رشید نے ملک شاہ کے دربار مین ایک عرصہ تک گفت وشنید کی، اور مختلف چالون سے ملک شاہ کو اس شادی کے لئے آخر کار مجبور کر ہی دیا، اس سے یہ واضح ہوتا ہے، کہ اس طویل گفتگو کے لئے ملک شاہ کو پورا سکون چاہیے تھا، جو اُسے ۴۶۱ھ مین سمرقند کی مہم کی وجہ سے حاصل نہ ہو سکتا تھا،

(ب) نظامی عروضی نے چہار مقالہ (مقالہ دوم حکایت ششم) مین لکھا ہے کہ جب مسعود سعد سلمان ۴۶۲ھ مین محبوس ہوا تو اوس نے یہ رباعی سلطان ابراہیم کے پاس بھیجی :

در بند تو اے شاہ ملک شہ باید	تا بند تو پاے تاجداری ساید
آن کس کہ ز پشت سعد سلمان آید	گر زہر شود ملک ترا نگزاید

اگر نظامی عروضی[2] کی یہ تاریخ (۴۶۲ھ) صحیح مان لیجاے، تو پھر یہ خیال پیدا ہوتا ہو

---

[1] راحت الصدور دیا اس کا خلاصۂ رائل ایشیاٹک جرنل جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۵۹ [2] میرزا قزوینی نے مسعود سعد سلمان کی پہلی قید اور نظامی عروضی کی اس تاریخ کے متعلق کوئی پختہ راے نہیں دی، ان کا

کہ وہ شادی اس تاریخ تک نہ ہوئی ہوگی، کیونکہ اس رباعی کے پہلے شعر سے یہی واضح ہوتا ہے کہ اس وقت تک سلطان ابراہیم اور ملک شاہ کے درمیان تعلقات اچھے نہ تھے، کیونکہ وہ شادی جس کے لئے سلطان ابراہیم نے لاکھ جتن[۵۱] کئے تھے، ضرور بہت زیادہ قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی ہوگی، اور ایسی حالت میں ایک "مجوس" شاعر کا ایسا لکھنا کوئی آسان کام نہ تھا،

(ج) ہم ابھی آداب الحرب سے بتا چکے ہیں، کہ سلطان ابراہیم غزنوی کا ایلچی مہتر رشید عرصے تک ملک شاہ کے دربار میں رہا، اور جب اوس نے مسعود سوم غزنوی کی شادی کے لئے درخواست کی، تو ملک شاہ نے جواب دیا کہ "من دختر ندارم، اما عمۂ ہست مرا بعراق ....."

اس گفتگو کا زمانہ یقیناً ۴۸۲ھ/۱۰۸۹-۹۰ء کے بعد ہوگا، کیونکہ ابن خلدون سے[۵۲] معلوم ہوتا ہے، کہ اسی سال ملک شاہ نے اپنی ایک لڑکی خلیفۃ المقتدی (م ۴۸۷ھ/۱۰۹۴ء) کے عقد میں دی تھی، چنانچہ ثابت ہوا کہ وہ شادی ۴۸۲ھ/۱۰۸۹-۹۰ء کے بعد اور فتح اجودھن کے پہلے ہوئی ہوگی کیونکہ فرشتہ نے اس فتح کا زمانہ اس شادی کے بعد ہی بتایا ہے، لیکن چونکہ اوس نے اس فتح کا زمانہ ۴۷۲ھ/۱۰۷۹ء بتایا ہے، اس لئے ابن الاثیر کا قول زیادہ معتبر ہے، یعنی ۲۰ صفر ۴۷۶ھ (یک شنبہ ۹ جولائی ۱۰۸۳ء) اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ وہ شادی ۲۰ صفر ۴۷۶ھ کے پہلے اور ۴۷۲ھ کے بعد ہوئی، یعنی ۴۷۵ھ/۱۰۸۲-۸۳ء میں سلجوقی اور غزنوی خاندان پھر وابستہ ہوئے،

اس تفصیل سے نتیجہ یہ نکلا کہ طبقات ناصری کا قول اصح ہے، کہ ارسلان ۴۷۶ھ میں پیدا ہوا

(بقیہ حاشیہ ص ۳۷۴) خیال ہے، کہ اس شاعر کی قید ۴۸۰ھ سے لیکر ۴۹۲ھ کے کچھ پہلے تک رہی (ملاحظہ ہو، انگریزی ترجمہ "تنقید مسعود سلمان" از پروفیسر براؤن صفحہ ۴۱۰-۴۳۰) لیکن اس شاعر کے دیوان میں رشیدیا کا عقدہ بہتر معلوم ہوتا ہے،

۵۱ فرشتہ (ص ۴۰ جلد اول) نے اس باہمی تعلق کے لئے دوسری تفصیل دی ہے ۵۲ تاریخ ابن خلدون (ترجمہ چہارم ۱۲ صہ)

جب کہ وہ شادی ۴۷۵ھ ۱۰۸۲ء مین ہو چکی تھی،[۵۱]

تخت نشینی اور خانہ جنگیان مسعود سوم غزنوی کی وفات[۵۲] شوال ۵۰۸ھ (مارچ ۱۱۱۵ء) مین ہوئی، اور اسکی وصیت[۵۳] کے مطابق اس کا بڑا لڑکا شیرزاد تخت نشین ہوا، لیکن تاریخ اوس کے حال سے خاموش ہے، شعرائے معاصرین مثلاً ابوالفرج رونی اور مسعود سعد سلمان کے بعض قصائد سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے، کہ وہ اپنے والد کی زندگی مین سپہ سالار رہ چکا تھا، ورنہ اس کی یک سالہ بادشاہی تاریخی اعتبار سے بالکل پوشیدہ ہے، اس کی اصل وجہ یہ معلوم ہوتی ہے، کہ اس کو مطلق طمانیت حاصل نہین ہوئی، کیونکہ اس کی تخت نشینی کے ساتھ ہی خانہ جنگیان شروع ہو گئین، آخرکار ملک ارسلان نے اپنے اس بھائی کو قتل کیا،[۵۴] اور دوسرے بھائیون کو یا تو قتل کر دیا، یا قید کر دیا، لیکن اوس کا بھائی بہرام شاہ[۵۵] جو تکین آباد (علاقۂ گرم سیر) مین اپنے باپ کے ساتھ باپ کی وفات کے

---

۵۱ مسعود سعد سلمان کے ذیل کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہ شادی زمستان مین ہوئی یعنی شعبان شوال ۴۷۵ھ ۱۰۸۲ء جب کہ وہ شاعر قید تھا:

آلت رامش بخواہ گوہر شادی بیار	رعد مثال آن بزن ابر نہاد این بیار
روے چو دوزخ زمین گشت ز سبزۂ بہشت	نقش گرفتہ جہان شد بزمستان بہار
عدۂ پاینده ملک خاصہ خسرو رشید	آمد باز از عراق شاد دل و شادخوار
داد بشہزادگان شاہی چنو	در ہنر ملکت دید و نشد روزگار
وایم پوشیدہ نیست بر دل بیدار تو	کہ من چو بینم ہمی در فرع این حصار
چو بوم خیم زدہم در شکم این مضیق	چون زاغ خیزم ز ترس بر سر این کوہسار

(دیوان مسعود سعد سلمان صفحہ ۲۰۹، ۲۱۲)

۵۲ جنات الفردوس ورق ۶۲ الف (بانکی پور) مجمل فصیحی ورق ۱۶۰ الف (بانکی پور) تاریخ ابن الاثیر جلد دہم ص ۱۷۶ (مطبوعہ مصر) زبدۃ

۵۳ تاریخ گزیدہ (حبیب گنج) مراۃ العالم ورق ۱۰۹ الف وغیرہ ۵۴ ایضاً ص ۵۵ طبقات ناصری اور فی ص ۱۴۵

پہلے سے تھا، بھاگ نکلا جس کی تفصیل ہم آیندہ لکھیں گے،

ملک ارسلان نے جب میدان صاف پایا، تو غزنین مین "السلطان الاعظم سلطان الدولہ"[۵۱] کے لقب سے چہارشنبہ ۲۰ شوال ۵۰۹ھ (۲۲ فروری ۱۱۱۶ء) مین تخت نشین ہوا مسعود سعد سلمان نے ایک قصیدہ مین اس تخت نشینی کی تاریخ بتائی ہے جس کے بعض اشعار یہ ہین :

بون ایزدشش روز رفتہ از شوال — برآمد از فلک دولت آفتاب کمال
گذشتہ پانصد و نہ سال تازی از ہجرت — زہے مبارک ماہ و زہے مبارک سال
ابوالملوک ملک ارسلان بن مسعود — کہ بحر کوہ وقارست و کوہ بحر نوال
چہ روز بود کہ پیش از زوال چشمہ مہر — مخالفان را شد عمر و جان و جاہ زوال
چہارشنبہ بود و چہار گوشہ تخت — گرفت نصرت و تائید و دولت و اقبال[۵۲]

مسعود سعد سلمان کے ذیل کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ بہرام شاہ اور ارسلان کے درمیان تکین آباد مین کچھ جنگ ضرور ہوئی :-

ز شاہ مینم دلہای اہل حضرت شاد — ہزار رحمت بر شاہ و اہل حضرت باد
سپہ کشیدہ و آراستہ بداد جہان — بدست حشمت برکندہ دیدہ بیداد
ابوالملوک ملک ارسلان بن مسعود — خدایگان جہاندار شاہ شاہ نژاد

---

[۵۱] ملک ارسلان کے سکون مین یہ القاب کندہ ہین، (تاریخ الیٹ جلد دوم صفحہ ۴۸۳) لیکن روجرس کی کتاب (حصہ چہارم صفحہ ۱۹۰) سے معلوم ہوتا ہے، کہ سکون کے ایک رُخ مین "السلطان الاعظم ملک ارسلان" کندہ ہے، اور دوسرے رُخ مین بیل کا سر بنا ہوا ہے، اور سنسکرت مین "شری سمنت دیو" لکھا ہوا ہے مین نے تانبے کے یہ سکے پروفیسر محمود شیرانی کے یہان دیکھے ہین،

[۵۲] دیوان مسعود سعد سلمان مطبوعہ طہران صفحہ ۳۱۷ - ۳۱۸،

بکامگاری بر دید روزگار نشست — قدم زدر تبت بر تارکِ سپهر نهاد
چه روز بود که در پرتوِ سیاستِ او — عیار ملک بپاو و خنجر پولاد
چهارشنبه روزے که از چهارم چرخ — سعود رایت ہی قہر برتکین آباد
زمین تو گوئی مرخصِ ملک را بگرفت — بدان زمان که برآمد ز طاغیان فریاد
گہے عزیمت کردو گہے ہزیمت شد — چنان که باشد در پیش باز گرسنه خاد
چه منفعت ز عزیمت که آن نبود قوی — چه فائده ز ہزیمت که آن نیافت نهاد[1]

ان اشعار میں بہرام شاہی شکست کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ تکین آباد میں وہی تھا، ایک دوسرے قصیدہ میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے :-

چو ابر نصرت بارید چرخ فصل خزان — بہار گشت ز ملک تو در تکین آباد
ز تیغ تیز تو فریاد کرد دشمنِ تو — ولیک آنجا سودے نداشت آن فریاد[2]

عثمان مختاری کے ذیل کے منتخب اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک ارسلان اپنی تخت نشینی پر اپنی حکمرانی کے لوہے[3] بھی گیا تھا :

---

[1] دیوان مسعود سعد سلمان ص ۱۲۷، ۱۲۸، ان اشعار کے چھٹے شعر میں "چہارم چرخ" اور "تہر" اس رعایت سے ہیں کہ وہ "برج اسد" میں ہیں، اور ارسلان کے معنی بھی ترکی میں اسد کے ہیں [2] ایضاً ص ۱۱۱، ۱۱۲ [3] روضۃ الصفا، (جلد چہارم ص۱۰۰) سے معلوم ہوتا ہے کہ مودود (م ۴۴۰ھ) کے زمانے سے غزنوی حکومت ہندوستان کے علاوہ غزنین اور کابل اور اطراف تک ہی محدود رہی، تاریخ بیہقی (ص ۱۰) سے معلوم ہوتا ہے، کہ غزنوی حکومت ۴۲۲ھ سے صرف غزنین تک محدود رہی، لیکن عثمان مختاری کے مذکورۂ بالا اشعار سے صاف واضح ہوکہ رے (طہران کے جنوب میں) بھی غزنوی سلطنت میں تھا، حالانکہ سمرقند وغیرہ سب بنجر کو خراج دیتے تھے، ورنہ گوشمالی کیجاتی تھی، (ملاحظہ ہو تاریخ ماوراء النہر بی ص۱۷)

بہمنجہ ست خیز و آرای چراغ رے — تا برچینیم گوہر شادی ز گنج رے
در خدمت رکاب خداوند شرق و غرب — ذکرے دگر کنیم و جہانے کنیم رے
بنگر کہ تا دو مہ بچہ عدت بود سپاہ — سلطان ابوالملوک ملک ارسلان بہ رے
شاہے کہ در غنیت ہندوستان مدام — رایان سند بخشش غلمان او زنے
شاہے کہ پیش افسر چون آفتاب او — تخت ملوک بوسہ دہد خاک راچو نے
روزے جلوس شاہ بگردون ندارسد — کاے چرخ حق شاہ بحرمت گزار رے
ہر تاجور کہ جز بمراد تو دم زند — با تیغ تو برو نکند عقل حکم رے
شکر تو در دہان جہان باد چون شکر — اقبال پیش تخت تو بستہ میان چو نے
اے خورد نت موافق و شافی و طبع ساز — بہمنجہ ات مبارک و مسعود و نیک پے

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے، کہ ملک ارسلان نے شہر رے مین بہمنجہ کے دن تخت نشینی کی یعنی ماہ بہمن کی دوسری تاریخ کو جب کہ ایران مین ایک عید ہوتی ہے، اور جو مطابق ہوتی ہے ماہ فروری ۱۱۲۶ء یعنی شوال ۵۱۹ھ سے جب کہ وہ غزنین مین تخت نشین ہو چکا تھا، ہم اب بھی دیکھ چکے ہین، کہ بہرام شاہ اپنے والد مسعود سوم کی وفات کے وقت تکین آباد مین تھا، وہان سے وہ سیستان گیا، اس کے ساتھ بقول محمد عوفی[۲] ایک ہی خادم تھا، انھون نے اپنے گھوڑون کے نعل الٹے لگوائے تھے، تاکہ دشمن ان کی روانگی کو نہ سمجھ سکے، سیستان ہوتا ہوا بہرام شاہ کرمان پہنچا جہان ارسلان شاہ بن کرمان شاہ بن قاورد (م ۵۳۳ھ / ۱۱۴۲ء)[۵۳] نے

---

۵۱ مرتن لاہور، قلمی ص ۶۹ حبیب گنج ۵۲ تاریخ الیٹ جلد ۲ ص ۱۹۹ اس وقت سیستان مین سنجر کا بہنوئی تاج الدین (شہر صفیہ) حکمران تھا، لیکن تاریخ نہیں بتاتی، کہ اوس نے اس وقت بہرام کی مدد کی تھی ۵۳ مجمل فصیحی (ورق ۱۶۴ الف) نے اس کی تاریخ وفات ۵۳۶ھ / ۱۱۴۱ء لکھی ہے، لیکن تواریخ آل سلجوق

بقول محمد بن ابراہیم "اورا (بہرام شاہ را) بخزداریا زرداد و چندان عطا کرد کہ در حوصلۂ انسانی گنجائی نداشت و گفت چون سلطان اعظم سنجر بر مسند سلطنت است ترک ادب است مرا لشکر دادن والا بدانچہ مقدور بود تقصیر نمی کردم و یکے از امرای حضرت در خدمت بہرام شاہ بپایۂ سریر سنجری فرستادہ استدعاے اعانت بہرام شاہ کرد....."[۱]

حضرت سنائی ۵۴۵ھ / ۱۱۵۰ء نے بھی کرمان کے اسی واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے، اور بہرام شاہ کی ابتدائی حالت کو اس طرح بیان کیا ہے:-

مثل ابتداے دولتِ شاہ — ہست چون یوسفؑ و برادر چاہ
گرچہ زاخوان ہوان رسید اورا — کارِ محنت بجان رسید اورا
آخر الامر عالم و شہ شد — بر سپہرِ شرف خور و مہ شد
نہ چو رہ رفتنش نیاز آمد — منزم رفت و شاہ باز آمد
بے زیان باز گشت سوے مکان — خود زسیر آفتاب را چہ زیان
روے بخشش ازان بکرمان کرد — تا عدو را غذاے کرمان کرد[۲]

چنانچہ کرمان سے بہرام شاہ، سنجر کی خدمت میں پہنچا، اور آخر کار اسکی اعانت سے بہرہ ور ہوا، اوسکی تفصیل آداب الحرب (ص ۳۲-۳۴) میں ہے، اسکے علاوہ کچھ اور مواد ہے جسکو انشاء اللہ تاریخ بہرام شاہ میں مہیا کریں گے، (باقی)

(بقیہ حاشیہ ص ۳۷۹) کرمان (از محمد بن ابراہیم برلن ۱۸۸۶ء ص ۲۵) میں ۵۳۷ھ / ۱۱۴۲ء ہے، یہ بادشاہ بھی عثمان مختاری کا ممدوح تھا، جسکی مدح میں ایک بہت اچھا قصیدہ اس شاعر نے اس مطلع سے شروع کیا ہے:-

رفتم براہ غزنین برتاب آہنیں . خفتم بہ حد کرمان بر آتشیں سراب (ملاحظہ ہو مجموعہ قصائد فارسی ص ۴۵ ضمن حبیب گنج)

[۱] ذیل تاریخ آل سلجوق کرمان ص ۲۶ [۲] حدیقہ طبع لکھنؤ ص ۶۳۰ و ص ۶۴۲، سنائی کے متعلق ڈاکٹر ایتھے نے بوڈلین لائبریری کی فہرست صفحہ ۶۲۰ میں بحث کی تھی، پھر علامہ سید سلیمان ندوی نے نہایت تفصیل سے معارف مارچ ۱۹۳۳ء میں بحث کی ہے، مجھے بھی ایک نہایت اہم ماخذ اسکے متعلق ملا ہے جو انشاء اللہ آیندہ کبھی پیش کیا جائیگا،

تلخیص تبصرہ

خانان سیراوردہ

(۶۲۲ھ سے ۹۰۷ھ تک)

(۲)

جوجی خان چنگیز خان کے سب سے بڑے فرزند کودہ قبائل باپ سے ورثہ میں ملے تھے جو حال کی مفتوحہ سلطنت قراخطای کی حدود مین خانہ بدوشی کرتے تھے، سلطنت قراخطای کا موقع دریائے سیحون (سر) کے شمال مین تھا، اور یہین جوجی باپ سے کچھ دنون پہلے فوت ہوا، جوجی کے مرنے پر اس کا سب سے بڑا فرزند اوردہ باپ کا جانشین ہوا، لیکن اوردہ سے ایک چھوٹے بیٹے باتو نے یورپ پر فوج کشی کرکے اپنے محکوم قبیلون کی تعداد مین مغرب میں دور تک کے قبیلون کو شامل کرکے بڑا اضافہ کرلیا، اور خود ملک قپچاق کا جہان سے ترکون کا عمل دخل تھا، بادشاہ ہوگیا،

باتو کی اس سلطنت کے شمال مین بلغاریہ عظمیٰ کا ملک واقع تھا، جو باتو کے ایک دوسرے بھائی توقا تیمور کے حصہ مین آیا تھا، بلغاریہ عظمیٰ کے علاقہ مین دریائے وولگا کی بالائی گذرگاہ سے ملحق زینین واقع تھین، جوجی خان کا ایک اور بیٹا شیبان اُن کا ہستانون پر حکومت کرتا تھا، جو آجکل کا ہستان قرغز قزق کہلایا جاتا ہے، یہ کا ہستان شیبان کے بڑے بھائی اوردہ کے محکوم قبائل کے شمال میں تھے،

جوجی خان کا پانچواں بیٹا تیول قبائل یحینیک (پی چی نیک) پر حکومت کرتا تھا، یحینیک کا

نام بعد کو توغای ہوگیا، یہ قبیلے دریاے یایق (یورال) اور دریاے وہبہ کی درمیانی زمینوں مین خانہ بدوش رہتے تھے، مگر یہ جس قدر قبائل اوپر بیان ہوئے، اور اس کے سردار سب کم وبیش خاندان باتو کے محکوم تھے، باتو کو جوجی خان کا سب سے بڑا بیٹا نہ تھا، مگر قوت واقتدار مین وہ سب سے بڑھا ہوا تھا چنانچہ اوس نے دریاے وولگہ (اتیل) کے کنارے یورپ کی حدود مین ایک عالیشان شہر تعمیر کیا، جس کا نام سرائے تھا، اور اوسے مملکت جوجی کا پایہ تخت قرار دیا، اور جس قدر قبیلے اوس کے زیر نگیں تھے وہ سب قبائل سراوردہ کہلائے جانے لگے، یہ نام اس وجہ سے پڑا تھا، کہ باتو خان کا شاہی خیمہ جو زرنی وزرنیفت کا تھا، اوسے مغلی زبان مین سراوردہ کہتے تھے، (سیر سونا، اور وہ۔ خیمہ)

یہان یہ بیان کرنا ضروری ہے، کہ صرف شاہی خاندان اور فوج کے اعلیٰ افسر اور سردار تو مغل نسل کے لوگ ہوتے تھے، لیکن اکثر قبیلے جو جوجی خان کے بیٹون کے حصہ مین آئے تھے، وہ منقوح ترک و ترکمان تھے، جوجی خان کے گھرانے کو حسب ذیل شقون میں بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے

(الف) باتو خان کا سلسلہ اس سلسلہ مین وہ خانان سیراوردہ ہین جو مغربی قپچاق کے قبائل کوک اوردہ پر حکومت کرتے تھے، یہ حکومت ان کی ۱۲۲۴ء سے ۱۳۵۰ء عیسوی تک قائم رہی، (ب) اوردہ کا سلسلہ، اس سلسلہ کے سردار خاندان مین نام کے رئیس تھے، ان کی حکومت مشرقی قپچاق مین قبائل آق اوردہ پر ۱۴۲۲ء سے ۱۴۲۸ء تک رہی اور مغربی قپچاق مین جب کہ باتو کی اولاد باقی نہ رہی، ۱۳۶۸ء سے ۱۵۰۰ء تک وہ خان ہوتے رہے، اور آخر کار وہ قوت مین گھٹتے گھٹتے وہ خانان استراخان رہ گئے جنکی حکومت ۱۴۶۶ء سے ۱۵۵۴ء تک رہی، (ج) توقاتیمور کا سلسلہ، توقاتیمور جوجی خان کا بیٹا تھا، اس سلسلے مین خانان بلغاریہ عظمیٰ ہوئے، بلغاریہ عظمیٰ کا ملک قپچاق کے شمال مین واقع تھا، اسی توقاتیمور کے سلسلے سے مغربی قپچاق کے خانان بھی ہوے ہین، آخر کار اس توقاتیمور سے خانان قازان بھی ہوئے، جن کی حکومت ۱۴۲۸ء سے ۱۵۵۲ء تک رہی اور اسی سلسلہ

تو قا تیمور سے خانانِ قایموف تھے، جو ۱۴۵۰ء سے ۱۷۶۸ء تک صاحبِ حکومت رہے، اور اسی سلسلۂ تو قا تیمور سے خانانِ قرم (کریمیا) مین ہوے جو ۱۴۲۰ء سے ۱۷۸۳ء تک حکومت کرتے رہے؛ (د) شیبان پسر جوجی کا سلسلہ، شیبانی خانون کی حکومت از بکون یا جن کا دوسرا نام قزغز قزاق تھا، ان کے کا ہستانون مین رہی (۱۲۲۴ء سے ۱۶۵۹ء تک) بعد کو شیبان کے محکوم قبیلون نے نقلِ مکان کیا، اور پھر خیوہ اور بخارا کے خانان بھی اسی شیبانی سلسلہ سے ہوے، (ان کا زمانہ ۱۵۰۰ء سے ۱۸۷۶ء تک رہا) اب ہم الف ج د کی تفصیل حسب ذیل کرتے ہیں:

(الف) باتو پسر جوجی کا سلسلہ:- اس سلسلہ سے سیر اور دہ کے خانان ہوئے، ان خانون کے زیر نگیں مغربی قپچاق کے قبائل کوک اوردہ تھے، جن کا زمانہ حکومت ۱۲۲۴ء سے ۱۳۵۹ء تک رہا، یہ بات باتو کے سلسلۂ خانان کو نصیب ہوئی، کہ وہ مغرب کی اس خانیت پر حکومت کرے، جسے ہم وثوق کے ساتھ مغرب کی خانیت بزرگ کہہ سکتے ہین، (یورپین نظر سے دیکھا جائے) تو اس خانیت کی اس وجہ سے اہمیت حاصل ہے، کہ انہی خانون کے باہمی نفاق سے اوس کو اپنی سلطنت کے وسیع کرنے کا موقع مل گیا، شروع مین باتو خان کی اولاد مختلف ریاستہاے روس کی حاکم و مختار تھی، ان روسی ریاستون سے

لہ مغربی قپچاق کہان تھا؟ مغربی قپچاق سے مراد وہ ملک ہے جو (یورپ مین) دریاے ڈون (Don) سے دریاے (Volga) یعنی آبِ اتیل سے سیراب ہوتا ہے، شرقاً غرباً وہ دریاے (Ural) یا یق سے دریاے نیپر (Dnieper) تک اور شمالاً جنوباً بحر اسود سے اور بحر خزر سے لیکر یوگ کے مقام تک ہے، یوگ (Vyatka) شہر سا ماٹوف (واقع یورپین روس) سے نو میل کے فاصلہ پر ہے (غرض مغربی قپچاق کا زیادہ تر حصہ یورپ مین پڑتا ہے، اور کچھ حصہ مغربی ایشیا مین) دیکھو ہوورتھ کی تاریخ منغول دوسری جلد صفحہ ۳۶ سے صفحہ ۱۹۴ تک، نقشہ دیکھنے سے قپچاق مغربی کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے،

سیر اور وہ کے خانان خراج وصول کرتے تھے، ان کی بیٹیوں سے شادیاں کرتے تھے، پھر تقدیر نے وہ پلٹا کھایا، کہ یہی خانون کی اولاد روسیوں کی محکوم و باجگذار بن گئی، غرض جو کبھی حاکم تھی، وہ محکوم ہو گئے، لیکن مغرب کی خانیت بزرگ کی یہ حالت اوس وقت ہوئی جب کہ باتو خان کی اولاد ختم ہو چکی تھی اور باتو خان کے بھائیون کی اولاد مغرب کی خانیت پر بیٹھنے لگی تھی، جب تک باتو کی اولاد مین خانیت رہی، تو قپچاق مین مغلون کی قوت کو پورا عروج رہا، باتو کی اولاد مین جانی بیگ خان تک جو دس خان گذرے، اسکی تاریخ بمقابلہ دیگر شاخون کے بالکل صاف ہے، لیکن جانی بیگ خان کی موت پر جو ۱۳۳۰ء مین واقع ہوئی، حکومت مین ابتری پڑی جانی بیگ کے فرزند بردی بیگ نے صرف ۲ برس حکومت کی، جانی بیگ کے دو بیٹے جو جانی بیگ کو اپنا باپ کہتے تھے، ایک ہی سال تخت نشین ہوئے، اس کے بعد بیس برس کا زمانہ بڑی پیچیدگیون کا آتا ہے، جس مین ایسے خانان تخت پر بیٹھے، جن کے حریف مسند خانی کے لئے موجود تھے،

جوجی خان کے پانچ بیٹے تھے جب باتو خان کی اولاد باقی نہ رہی، تو باقی بھائیون کی اولاد مین خانیت قپچاق مغربی کے لئے دعویدار پیدا ہوتے رہے، شمال مین بلغار یہ عظمی کے خانون کا سلسلہ اور جنوب مین خانان قرم (کریمیا) سلطنت کرتے تھے، اور یہ سب قرابوتا پسر جوجی کی اولاد سے تھے، جنوب مین قفقاز کا ملک تھا، یہان تیرک اور کومہ کے دریاؤنکے کنارے برکہ خان کے قبائل اپنے ڈیرے ڈالتے تھے، برکہ خان باتو خان کا چھوٹا بھائی تھا، اور باتو کے بعد وہی باتو کا جانشین ہوتا، اور اس برکہ خان کی صولت وجلالت کی وجہ سے سیر اور وہ کو وہ اقبال و اختیار نصیب ہوا تھا، جس سے روس کی ریاستون مین ہر وقت خوف اور دہشت طاری رہتی تھی، خانیت سیر اور وہ کے مشرق مین اق اور وہ کے قبائل تھے، ان قبیلون کو خان اور وہ پسر جوجی کی اولاد سے ہوتے تھے، اور مشرق ہی مین شمال کی طرف ازبکون کے قبیلے تھے، جن کے خان شیبان پسر جوجی کی اولاد سے ہوتے تھے، اور مشرق میں شمال کی طرف ازبکون

کے قبیلے تھے، جن کے خان شیبان پسر جوجی کی اولاد سے ہوا کرتے تھے، بحر خزر کے شمال ساحل پر توغای کے قبیلے اپنے مویشی چراتے تھے، اس زمانے کے پندرہ خانون کی فہرست جو ہم آگے درج کرینگے وہ کسی قدر قیاس پر مبنی ہے، لیکن ہم نے ان کے زمانہ ہائے حکومت کی تصدیق سکون سے کرلی ہے، ۱۳۷۸ء مین خانیت سیراوردہ کی حکومت جوجی کے سب سے بڑے فرزند اوردہ کی اولاد سے توقتمش کے قبضے مین چلی گئی،

(ب) اوردہ پسر جوجی کا سلسلہ اس سلسلہ کے محکوم قبائل مشرقی[1] قپچاق کے قبائل آق اوردہ تھے، (زمانہ ۱۲۲۶ء تا ۱۴۳۸ء) اوردہ کی اولاد سے کبھی کبھی مغربی قپچاق کے خان ہوئے (زمانہ ۱۳۷۸ء تا ۱۵۰۲ء) انھی سے خانان استراخان ہوئے، جن کا زمانہ حکومت ۱۴۱۶ء سے ۱۵۵۴ء رہا، گو جوجی کی اولاد مین باتو سے زیادہ صاحب قوت و اقتدار تھا مگر جوجی کے بڑے فرزند اوردہ کو وہ قبائل ملے تھے، جو جوجی کو چنگیز خان نے دئے تھے یعنی وہ قبیلے جو دریاے سیحون کے علاقون مین خانہ بدوش رہتے تھے، یہ قبیلے اوردہ پسر جوجی کو اپنا موروثی حاکم سمجھ کر خاص طور پر اس کے اطاعت گذار تھے، سیراوردہ کا دایان بازو کوک (نیلا) اور داہنا اور بایان بازو اق اور دایین سپید رنگ والا اوردا کہلایا جاتا تھا، کوک (نیلے) کو آق سفید پر ترجیح ہوتی تھی، یا یون سمجھئے کہ باتو کے قبیلے جو کوک اوردا کہلائے جاتے تھے، وہ بڑے بھائی کے قبائل پر مرجح سمجھے جاتے تھے، یہ کوک کا لفظ اس کے نام کے ساتھ اس لئے تھا، کہ

---

[1] مشرقی قپچاق سے مراد وہ علاقہ ہے، جو دریاے سیحون کی بالائی گذرگاہ یعنی دریا کے سرچشمون سے لیکر ایرتش تاغ اور کوچک تاغ کے پہاڑون تک چلا گیا ہے، مغرب مین اسکی سرحد باتو کے کوک اوردہ قبائل سے شمال مین شیبان کے قبائل ازبک سے اور مشرق مین چغتای خان کی خانیت سے ملتی تھی، اور جنوب مین دشت قزل قم اور اسکندر دف کا پہاڑی سلسلہ تھا،

(ہوورتھ جلد ثانی صفحات ۲۱۶-۳۵۲)

وہ ایک طور پر آق اوردا کے زیر دست تھے، آق اوردہ چونکہ دور بحر خزر سے بھی پرے کے کا ہستانوں میں خانہ بدوش رہتا تھا، اس وجہ سے آق اوردا نے کوک اوردا کے سامنے سر جھکا دیا، جو دریاے دون اور وولگا (اتیل) والی زمینوں میں رہتے تھے، لیکن آق اوردا چونکہ برفستانی ملک میں خانہ بدوش رہتے تھے، اسلئے وہ زیادہ سختیاں جھیلنے کے خوگر ہوگئے تھے، آخر کار انھوں نے اپنے سرداروں کو باتو کی زیادہ مہذب مگر کمزور اولاد پر خان بنا دیا، آق اوردہ کے پہلے حکمرانوں کا حال بہت کم معلوم ہے، صرف اتنا علم ہے کہ اوش خان کے بعد ان کا بیٹا ہمیشہ خان ہوتا رہا، اور جس بڑے واقعہ کا حقیقت میں علم ہے وہ کوچی سیر اوردہ کے دور حکومت میں غزنا و بامیان دو بڑے مقام جو چغتای خان کی یا ایل خانانِ ایران کی بادشاہی میں تھے، اون پر کوچی قابض تھا، اور دس خان اوردہ پسر جوجی کی اولاد میں پہلا خان ہے، جسے اوردہ کے سلسلۂ خانان میں کسی قدر خصوصیت حاصل ہے، اوزبک خان نے امیر تیمور گورگان کی فوجوں کو ایک مرتبہ سے زیادہ شکست دی، تیمور گورگان نے زعم جہانداری میں جوجی کے محکوم قبیلوں پر اوردہ کے خاندان سے ایک شخص توقتیش کو سردار بنا دیا، توقتیش کا باپ ایک معرکہ میں مارا گیا تھا، اور خود توقتیش کو اوردس خان نے جلا وطن کر دیا تھا، امیر تیمور نے توقتیش کی کچھ فوج سے مدد کی تاکہ اوزبک خان سے مقابلہ کرکے جس سرداری پر تیمور نے اوسے نامزد کیا ہے، اوسے حاصل کرے، توقتامیش[1] نے کئی مرتبہ اوردس خان سے ہتھیار اٹھائیں، اور جب تک اوردس خان مر نہ گیا اوس کے فرزند توقتیہ نے کچھ دنوں بعد باپ کے بعد حکومت نہ کر لی، اوس وقت تک توقتامیش اوردس خان کے دوسرے بیٹے کے ہاتھ سے آق اوردہ کی حکومت نہ چھین سکا،

حقیقت یہ ہو کہ سیر اوردہ کی تاریخ میں توقتامیش آخری باعظمت سردار ہے، جب

---

[1] فارسی تاریخوں میں توقتیش آتا ہے، مگر یورپین تاریخیں اس نام کو توقتامیش لکھتی ہیں،

آق اوردہ کے تختِ حکومت پر وہ بیٹھ گیا، تو پھر اوس نے مغربی قپچاق پر فوج کشی کی، اور دارالحکومت سرائے میں حاجی کو شکست دی، جو وہان شاہ ساز بنا ہوا تھا، تو قتامیش کو یہ فتح ۱۳۷۸ء میں حاصل ہوئی تھی، اس فتح نے آق اوردہ اور کوک اوردہ میں جو نزاع مدت سے چلا آتا تھا، اس کا خاتمہ کر دیا، اب مشرقی اور مغربی قپچاق ایک ہی شخص کے تحت ہو گیا، اور اس وقت سے اوردا پسر جوجی کی اولاد نے کوک اوردا پر حکومت کرنی شروع کر دی، اور اپنے ہمراہ مشرقی قپچاق کے بہترین لوگوں کو مغربی قپچاق میں لے آیا، جب آق اوردہ کی زمینیں اس طرح خالی ہوئیں، تو شیبان پسر جوجی کی اولاد ان زمینوں میں اپنے خیمے نصب کرنے لگی، تو قتامیش کے دورِ حکومت میں سیراوردہ نے بہت کچھ اپنی گئی گذری شان پھر حاصل کر لی اور پھر اس کا اقبال قائم ہونے لگا، تو قتامیش نے روس پر فوجکشی کی، موسکو کا محاصرہ کر لیا، اور وہاں آگ لگا دی (۱۳۸۲ء) اور موسکو کے صاحبِ اقتدار علاقے کو لوٹا اور غارت کیا، پہلے زمانے کے مغلوں کی تاخت و تاراج کا نمونہ پھر شروع کر دیا، اور خانانِ سیراوردہ کی پہلی سی شان و عظمت پھر پیدا کر لی، لیکن اس وقت پرانی شان و شوکت پھر زندہ کرنا، ایک عارضی فعل تھا، تو قتامیش کی یہ بدقسمتی سمجھئے یا محسن کشی تصور کیجئے کہ وہ امیر تیمور گورگان سے لڑ پڑا، جس نے سابق میں اسکی مدد کی تھی، امیر تیمور ہی کی مدد اور استعانت سے تو قتامیش کو کامیابی نصیب ہوئی تھی، اور اپنے ہی محسن سے وہ لڑ پڑا، اور گستاخانہ طریقہ سے اسکے ساتھ پیش آیا، کہ کسی کی ہمت تیمور کے ساتھ ایسی گستاخی کرنے کی نہ ہوئی تھی، چنانچہ تیمور نے دو موقعوں پر ایک ۱۸ جون ۱۳۹۱ء میں مقام ارتوبہ پر اور دوسری دریائے تیرک کے کنارے جب کہ ۱۳۹۵ء میں تو قتامیش جلاوطنی سے واپس ہو رہا تھا، ایسی سخت شکست دی جس نے خانانِ قپچاق کی قوت کو بالکل ہی توڑ دیا،

یہ سچ ہے کہ امیر تیمور کے واپس چلے جانے پر تو قتامیش ۱۳۹۸ء میں پھر دارالحکومت

سرائے میں واپس آگیا، مگر تیمور قتلغ نے جو اوس کے پرانے دشمن اردوس خان کا بیٹا تھا، جلد توقامیش کو وہان سے نکال دیا، اب توقامیش مجبور ہوکر لتھوانیا کے بادشاہ وی توت کے پاس چلا گیا یہان آکر توقامیش نے وی توت بادشاہ لتھوانیا کو تاتاریون سے لڑوا دیا، یہانتک کہ ۱۴۰۶ء مین توقامیش کا انتقال ہوگیا،

توقامیش کے زوال پر جو زمانہ آیا، وہ سیرا ادر دہ کی تاریخ مین بہت ہی پیچیدہ اور تاریک ہے، تخت سرائے کے مختلف مدعیون کی باہمی کشمکش ہوتی رہی، معلوم ہوتا ہے کہ کم سے کم تین گھرانے ایسے تھے جن سے لوگ سیرا ادر دا کی خانیت حاصل کرنا چاہتے تھے، ان مین ایک گھرانا اردس خان کا تھا، جس کی مدد پر توغای کا سردار ایدکو ہمیشہ کمربستہ رہتا تھا، یہ توغای سردار ایدکو گویا ممای کے بعد دوسرا شاہ سازِ سرائے مین پیدا ہوا تھا، دوسرا گھرانا توقامیش کا تھا، جسکے فرزند خانی کے متمنی تھے، تیسرا گھرانا شیبان کے خاندان کے نوجوان ارکان تھے، آگے جو فہرست خانون کی ہم نے دی ہے، اس سے اس پریشان زمانی کا اندازہ ہوسکتا ہے، بعض موقعے ایسے آئے کہ دو دو آدمی ایک ہی وقت مین سرائے پر خانی نہ کرتے تھے، بلکہ بعض شہرون کے ایک ہی وقت مین دو دو مالک ہوتے تھے، شہر سرائے اور اور بڑے شہرون کی کیفیت آئے دن کے محاصرون اور قبضون کے سوا کچھ نہ تھی، اور یہی اختتام ہوگیا سیرا اوردہ کی باعظمت تاریخ کا، آخر کار روس کی سلطنت نے ۹۰۷ھ مطابق ۱۵۰۳ء مین سیرا ادر دا کے علاقون پر اپنا قبضہ کرلیا، اب سیرا ادر دا کی تاریخ کے چند ٹوٹے ہوئے ٹکڑون کے حالات لکھنے باقی رہ گئے ہین، ان ہی ٹکڑون مین ایک خانیت استراخان کی تھی جس پر اردہ پسر جوجی کی اولاد نے حکومت کی، اس خانیت کا بانی ایک شخص قاسم نامی تھا، اوس نے ۱۴۶۶ء مین اس مختصر سی خانیت کی بنا ڈالی، اور اسی قاسم کے خاندان مین ۱۵۵۲ء تک خانیت رہی، پھر موسکو کے رئیس اعظم نے اس خاندان کو معزول کر دیا،

خانان سیرا اور وہ یعنی مغربی قپچاق کا کوک اور وہ یعنی باتو کا خاندان، باتو (۶۴۱ھ/۱۲۲۴ء) مرتاق (۶۵۴ھ/۱۲۵۶ء) منگو تیمور (۶۶۴ھ/۱۲۶۶ء) تودا منگو (۶۷۹ھ/۱۲۸۰ء) تولا بوغا (۶۸۶ھ/۱۲۸۷ء) توقتو (۶۸۹ھ/۱۲۹۰ء) اترنگ (۷۱۲ھ/۱۳۱۲ء) تینی بیگ (۷۴۱ھ/۱۳۴۰ء) جانی بیگ محمود (۷۴۱ھ/۱۳۴۰ء) بردی بیگ محمد (۷۵۸ھ/۱۳۵۷ء) قولنا (۷۶۰ھ/۱۳۵۹ء) نوروز بیگ (۷۶۰ھ/۱۳۵۹ء) باتو خان کے بھائیون کی حسب ذیل اولاد سیرا اور وا کی خان ہوئی شیبان کی اولاد سے خضر (۷۶۰ھ) مرداد (۷۶۲ھ) پولاد خواجہ (۷۶۲ھ سے ۷۶۸ھ تک) تولون بیگ (۷۷۲ھ) البان (۷۷۵ھ) خانان (۷۷۷ھ) عرب شاہ (۷۷۹ھ) اور وا کی اولاد سے تیمور خواجہ، مرید خواجہ قتلغ خواجہ، عبداللہ (۷۶۴ھ) محمد بولاق (۷۷۱ھ) یوقا تیمور کی اولاد سے کلدی بیگ (۷۶۲ھ) عزیز شیخ (۷۶۴ھ) حسن (۷۶۸ھ) ۷۶۲ھ میں مغربی قپچاق کی حکومت آق اور دا کے قبضہ مین چلی گئی، مشرقی قپچاق کے خانان آق اور دا یعنی اور دا پسر جوجی کے گھرانے مین جو خان ہوئے وہ یہ ہین، اور دا (۶۳۳ھ/۱۲۳۶ء) کوچی (۶۷۹ھ/۱۲۸۰ء) بایان (۷۰۱ھ/۱۳۰۱ء) ساسی بوقا (۷۰۹ھ/۱۳۰۹ء)، ایبی سان (۷۱۵ھ/۱۳۱۵ء) مبارک خواجہ (۷۲۰ھ/۱۳۲۰ء) چغتائی (۷۴۵ھ/۱۳۴۴ء) اور دس (۷۶۲ھ/۱۳۶۱ء) توق تکیا (۷۷۵ھ/۱۳۷۵ء) توقتامیش غیاث الدین (۷۷۸ھ/۱۳۷۶ء) اس آخری خاندان نے کوک اور دا اور آق اور دا کو شامل کرکے ایک کر دیا،

خاندانہاے حریف یعنی آق اور دا کی خانی کے لئے خاندان اور دا اور خاندان شیبان کے لوگ جو دعویدار ہوے، ان کی تفصیل یہ ہے، خاندان اور دا سے تین خاندان قائم ہوئے یعنی (۱) توقتامیش کا خاندان جس مین خانی کے دعویدارون کے نام یہ ہین، بیگ پولاد (۷۹۳ھ) جلال الدین (۸۱۴ھ) کریم بردی (۸۱۵ھ) کبیک (۸۱۷ھ) جبار بردی (۸۱۸ھ) (۲) دوسرا خاندان اور دس کا تھا جس سے حسب ذیل دعویدار پیدا ہوئے، تیمور قتلغ ۷۹۷ھ شادی بیگ ۸۰۲ھ پولاد ۸۱۰-۱۵ھ تیمور (۸۰۹ھ تا ۸۱۸ھ)، جکپا ۸۱۵ھ،

کوچک محمد ۸۱۶ھ ..... ۸۶۴ھ، محمود ۸۶۴ھ، احمد ۸۶۴ھ، سید احمد، مرتضیٰ، شیخ احمد ۸۸۶ھ (۳) تیسرا مشرقی قپچاق کا سلسلہ جو قوری چاک سے چلا، بوراق ۸۲۳ھ (اس نے مغربی قپچاق کے ایک حصہ پر قبضہ کر لیا ۸۲۷ھ خاندان تو قا تیمور، دولت بردی (بوراق کی عدم موجودگی میں) خاندان شیبان سے صرف دو دعویدار پیدا ہوئے، درویش اور سید احمد،

سائنس

(انجمن ترقی اردو (ہند) کا ماہانہ رسالہ)

اگست ۱۹۴۱ء کے چند مضامین

(۱) سائنس (۲) حیوانوں کی گرمائی اور سرمائی نیند (۳) ہمارے دانت (۴) دوران خون (۵) اوزان اور پیمانوں کی معیار بندی

ستمبر ۱۹۴۱ء کے چند مضامین

(۱) حیدرآباد میں سلفیورک ترشہ اور دوسری اہم کیمیائی اشیاء کی صنعتی تیاری کے امکانات (۲) ہنسی (حیاتیات کی روشنی میں) (۳) ہماری آنکھیں، (۴) جابر ابن حیان (۵) ہوائی حملہ اور ہم

یہ رسالہ ملکی زبان میں سائنس کا واحد رسالہ ہے جس میں مختلف مضامین کے علاوہ ہر ماہ دو تین معلومات سائنس سے متعلق سوال و جواب سائنس اور صنعت سے متعلق تازہ ترین خبریں اور نئی کتابوں پر تبصرے شائع ہوتے ہیں، رسالہ میں متعدد بلاک بھی شائع ہوتے ہیں، امید ہے کہ علم کے شائقین اور اردو زبان کے بہی خواہ سرپرستی فرمائیں گے،

اشتہارات کے نرخ طلب کئے جا سکتے ہیں،

چندہ سالانہ، پانچ روپیہ سکہ انگریزی، نمونہ کا پرچہ آٹھ آنہ،

المشتہر معتمد مجلس ادارت رسالہ سائنس جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

اخبار علمیہ

ہوور لائبریری

اسٹینفورڈ یونیورسٹی (ریاستہاے متحدہ امریکہ) مین مندرجۂ بالا نام سے گذشتہ جون مین ایک کتب خانہ قائم ہوا ہے، جس مین جنگ، صلح، بغاوت اور انقلاب کے متعلق لٹریچر کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع کیا گیا ہے، کہ دنیا کے کسی کتب خانہ مین نہیں پایا جاتا، اس مین موجودہ دنیا کی معاشرت اور سیاست پر بھی کافی ذخیرہ ہے، کتب خانہ کے بانی ہربرٹ ہوور سابق صدر ریاستہاے متحدہ امریکہ نے پچیس سال کی مسلسل اور شدید محنت کے بعد یہ ذخیرہ جمع کیا ہے، اس مین مختلف سلطنتون، حکومتون، وزارتون، سیاسی محکمون اور اداروں انقلابی مجلسون، جاسوسون، سیاسی سازش کرنے والون، قاتلون اور غداروں کے بہت سے ایسے پوشیدہ اور رازدارانہ کاغذات ہین، جو بیسویں صدی کی معاشرتی اور سیاسی تاریخ کے مطالعہ کے لئے بیحد معاون ہین، کہا جاتا ہے کہ اس قسم کے کاغذات فرانس انگلستان اور جرمنی کے کسی کتب خانہ مین نہیں مل سکتے، ہوور کو اس قسم کے کتب خانہ کو قائم کرنے کا خیال ۱۹۱۴ء مین اس طرح پیدا ہوا، کہ اس نے ایک کتاب مین پڑھا تھا کہ انقلاب فرانس کے زمانہ کا لٹریچر زیادہ تر برباد ہو گیا، یہ پڑھکر وہ متاثر ہوا، کیونکہ اس کا خیال ہے کہ کسی زمانہ کی حقیقت جنگی تاریخون کے بجاے معاشرتی اور سیاسی کاغذات سے زیادہ منکشف ہوتی ہے، اس کا یہ بھی خیال ہے

کہ موجودہ دور کی کشاکش کے مقابلہ مین انقلاب فرانس کی اہمیت کچھ زیادہ نہیں ہے، اسی لئے موجودہ دور کے متعلق ہر قسم کا لٹریچر جمع کرنا شروع کیا، اور اس کے لئے اس نے پندرہ اساتذہ اور طلبہ کو مختلف ملکون مین بھیجا، جہان ان کو اتنے کاغذات ملے، کہ ہوور نے ان کو کئی جہاز پر لاد کر اپنے یہان منگوایا، جرمنی سے کاغذات پندرہ چھکڑون پر آئے، ان کاغذات مین جرمنی کی جنگی مجالس کے بہت سے راز ہین، مگر ہوور نے انھیں بھی اس وعدہ پر حاصل کر لیا، کہ یہ کاغذات تیس سال تک سربمہر رہین گے، روس سے پچیس چھکڑے کاغذات آئے، ان مین سوویٹ روس کے ضلعون، شہرون اور قصبون کی پوری جزوی تفصیلات ہین، ہنگرین سوویٹ مین جب انقلاب ہوا، اور یہان سوویٹ حکومت ختم ہو گئی، تو اس انقلاب مین حکومت کے سارے کاغذات ہوور کے ایک نمایندہ کو مل گئے، جس نے ان کو امریکہ کے سفارتخانہ مین محفوظ کر دیا، ہنگری کی دوسری حکومت نے ان کاغذات کو واپس لینا چاہا، تو ہوور نے اس شرط پر ان کو واپس کئے، کہ ان کی عکسی تصویر لینے کی اجازت دیدیجائے،

اس کتب خانہ مین ساٹھ حکومتون کے سکاری کاغذات کی پچیس ہزار جلدین ہین، تینتیس ملکون کی اسی ہزار کتابین اور رسالے ہین، چھبیس زبانون کے ایکہزار سات سو چوبیس اخبارات ہین، پہلی جنگ عظیم کے دو ہزار ساٹھ سکاری نقشے ہین، تصویرون، سکون، اشتہارون، پوسٹرون، تمغون کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے، تین سو سربمہر ذخیرے ایسے ہین، جو ابھی کئی سال تک اسی طرح بند رہین گے، ایک بڑے ٹرنک مین دنیا کی ایک بہت مشہور جاسوس عورت کے سارے کاغذات محفوظ ہین، گمان ہے کہ یہ کاغذات ماتاہری کے ہون گے، جو لیس سیزر کے بھی بہت سے کاغذات مل گئے ہین، امن اور صلح کی کانفرنسین جو مختلف اوقات مین منعقد ہوئین، ان کی بہت سے خفیہ دستاویزین بھی اس ذخیرہ مین موجود ہین، موجودہ جنگ عظیم کے سلسلہ مین

ہوور نے نازی ازم اور فاشزم سے متعلق بہت سے کاغذات حاصل کرلئے ہین، اور وہ جہازون پر لاد دیئے گئے ہین تاکہ جنگ ختم ہوتے ہی حفاظت سے کتب خانہ مذکور مین پہنچا دیئے جائین کتب خانہ میں ایک شعبہ پروپاگنڈا لٹریچر کا ہے، ہوور کا خود بیان ہے کہ یہ سارا لٹریچر بالکل جھوٹ، کذب اور افترا پر مشتمل ہے، اور اس کو اس بات پر تعجب ہے کہ صریح جھوٹ اور افترا سے عوام کے ذہن جس طریقہ سے پراگندہ مسموم اور بدظن کئے جاتے ہین، ان سے یہ بالکل بے خبر رہتے ہین، اس کتب خانہ کے لئے پچاس لاکھ ڈالر وقف ہین، اور اسٹینفورڈ یونیورسٹی سے بھی امداد ملتی رہتی ہے، اس کی عمارت کے اخراجات کا تخمینہ ساٹھ لاکھ ڈالر ہے پوری عمارت ایک برج کی شکل کی ہے جس مین سات منزلین ہین، اور عمارت کے کسی حصہ مین آفتاب کی روشنی نہیں پہونچتی ہے، بلکہ خوبصورت قندیلون کے ذریعہ سے ساری منزلین روشن رہتی ہین،

آفتاب پر پڑنے والی روشنی

سویڈن کے ایک ماہر طبیعیات نے آفتاب کی روشنی پر بعض دلچسپ تحقیقات کی ہین، فضاے بسیط مین آفتاب کی لہرین پانچ لاکھ میل تک بڑھکر پیچھے ہٹتی ہین، اور پیچھے ہٹ کر پھر آگے بڑھتی ہین بعض اوقات ایک نامعلوم جگہ سے گیسون کے بادل نمودار ہوکر آفتاب کے اوپر چھاجاتے ہین، اور ان کے چھاجانے کے بعد روشنی کے جلتے ہوے شرارے آفتاب کی سطح کی طرف عقب سے پھر رجوع ہوتے ہین، ماہرین ہیئت کے لئے یہ چیز معما ہے، کہ یہ شرارے کہان سے نمودار ہوتے ہین بعض ماہرین طبیعیات کا خیال ہے، کہ یہ شرارے آفتاب کے ہالے سے پیدا ہوتے ہین کیونکہ تحقیقات سے معلوم ہوا ہے، کہ ہالہ مین تقریبًا دو درجن غیر مشخص شعاعی لہرین موجود ہین، بعض ماہرین ہیئت کی رائے ہے، کہ وہ ایک نئے عنصر کرونیم" کا پتہ دیتے ہین بعض علماے سائنس کا

گمان ہے کہ وہ آکسیجن کی طرح روشنی کے عناصر ہین جو طبیعی طور سے متلاطم اور مضطرب ہوتے ہین، مگر سویڈن کے مذکورۂ بالا ماہر طبیعیات بنگٹ ایڈلن (Bengt Edlen.) نے اپنی جدید تحقیقات سے ان مشکوک خیالات مین بہت سی نئی باتین پیدا کی ہین، اس کی تحقیق مین ہالہ وزنی عناصر مثلاً لوہا، چونا اور نکل پر مشتمل ہے، ماہرین طبیعیات کو یہ ایک حیرت انگیز بات معلوم ہوئی ہے، ایڈلن کا خیال ہے کہ ہالہ کے ان وزنی کیمیائی مادون مین جو روشنی کی لہرین پیدا ہوتی ہین اس کے لحاظ سے ہالہ کی حرارت بیس لاکھ ڈگری ہوگی، حالانکہ اس سے پہلے کی تحقیق تھی، کہ یہ حرارت دس ہزار ڈگری سے زیادہ نہیں، ایڈلن کو اپنی تحقیقات پر شبہہ تھا، اس لئے دو سال اسکو پوشیدہ رکھا، لیکن اب اس کے سارے شبہات دور ہوگئے ہین، ۱۹۳۶ء کے سورج گرہن سے اس کے نظریہ کی تصدیق مختلف رصدگاہون سے ہوئی، گذشتہ جون مین ہارورڈ کی رصدگاہ مین بھی اس کی تصدیق کی گئی، اور اب یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے، کہ آفتاب کے اندر بعض ایسے متلاطم اور مرتعش ذرات ہین، جو بالکل نہین دکھائی دیتے، انہی ذرات سے آفتاب کی گردش سے گیس نکلتے ہین، اور ان گیسون کی برقی لہرین آفتاب کے اندرونی حصہ سے نکلتی ہین، اس وجہ سے وہ جلد ٹھنڈی نہین ہوتی ہین، اور اس کی گرمی بہت دور تک باقی رہتی ہے، مگر جیسے جیسے یہ لہرین ٹھنڈی ہوتی جاتی ہین، اپنے مرکز کی طرف مائل ہوتی جاتی ہین، (ص ع)

افکار عصریہ

سائنس نے جنگ عظیم کے بعد جو ترقیان کی ہین، یہ کتاب ان تمام ترقیون کا خلاصہ ہے کتاب ۲۶ بابون میں تمام ہوئی ہے، اور ہر باب میں سائنس کے مختلف اہم مسائل کی تحقیق کی گئی ہے ضخامت ۲۰۰ صفحے قیمت ۱۲ عہ

"منیجر"

مطبوعات جدیدہ

فہم قرآن از مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی ایم اے تقطیع بڑی ضخامت ۱۹۴ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد ۷ غیر مجلد ۴ پتہ ندوۃ المصنفین قرول باغ دہلی

آج کل فہم قرآن اور اسکی تفسیر و تاویل کے بلند بانگ دعووں اور حدیث وسنت کے حجت شرعی نہ ماننے کا فتنہ اتنا عام ہوتا جاتا ہے، کہ فہم قرآن کے لئے عربی کی ابجد سے واقفیت بلکہ اردو ترجمہ کی مدد کو کافی سمجھا جاتا ہے، اور نعوذ باللہ حدیث نبوی کو دفتر بے معنی قرار دیکر اسے ناقابل اعتبار ٹھہرایا جاتا ہے، معارف میں ان مباحث پر مبسوط اور مدلل مضامین نکل چکے ہیں، مولینا سعید احمد صاحب اڈیٹر البرہان دہلی نے اس موضوع پر یہ مستقل کتاب تالیف فرمائی ہے، اس میں آیت قرآنی لَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْآنَ سے پیدا شدہ غلط فہمیوں کو دور کرکے اوس کا اصلی مقصد ومنشا واضح کیا گیا ہے اور کلام اللہ کی تفسیر کے اصول وشرائط بتائے گئے ہیں، پھر کلام اللہ اور احادیث نبوی کے تعلق سے اوکو حجت شرعی ہونے اور اوس کے وثوق واعتماد کے علمی وتاریخی دلائل دیئے گئے ہیں، ان مباحث میں تدوین حدیث کی تاریخ وضع حدیث کا انسداد، حفاظ صحابہ میں حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابن عباسؓ اور حفاظ تابعین میں امام زہری اور اصحاب صحاح میں امام بخاری ومسلم کی علمی واخلاقی جلالت ان کی صحیحین کے درجہ اور اسناد وروایت وغیرہ کی بحثیں ہیں، احادیث وسنت کی صحت، اوس کے وثوق اور اس کے حجت شرعی ہونے کے دلائل اور اس سے متعلقہ مباحث اتنے کثیر ہیں، کہ کسی مختصر کتاب میں ان کا احاطہ دشوار ہے، تاہم اس کتاب میں اس کے اکثر اہم پہلو آگئے ہیں، اور فی الجملہ

ایک طالب حق کی تشفی کے لئے کافی ہین، موضوع کے اشتراک کی وجہ سے اس کتاب کے بعض مباحث اور دار المصنفین کی سیر الصحابہ اور معارف کے مضامین کے درمیان کہین کہین توارد ہوگیا ہو اسکی ایک دلچسپ مثال عدالت صحابہ کی بحث (ص ۱۳۵) مین "بَعدَ البَتِہّٗ" کا ترجمہ ہے، اس کا ترجمہ غلطی سے ان کی (صحابہ) عدالت کے بجائے "تہمتون کے بُعد" ہوگیا ہے، بعینہٖ یہی غلطی اسوۂ صحابہ کے پہلے ایڈیشن مین ہوئی تھی، عہد صحابہ مین تدوین حدیث اور احادیث کے مجموعون کی بحث تشنہ ہے، اس مین صرف دو تین صحابہ کی کتابت حدیث کا تذکرہ ہے، حالانکہ ان کی تعداد اس سے کہین زیادہ ہے، اور خطبات مدراس مین پوری تفصیل مذکور ہے، یہ چیز اس لئے تفصیل کے ساتھ دکھانے کی تھی، کہ منکرین حدیث کا سب سے بڑا اعتراض یہی ہے، کہ حدیثین عہد رسالت کے مدتون بعد مدون ہوئین، اسی طرح یہ بیان صحیح نہین ہے، کہ "روایت سے حضرت عمرؓ بن عبد العزیز کا جمع حدیث کی طرف متوجہ ہونا، اور ابوبکر بن حزم کو اس کے لئے حکم دینا ثابت ہوتا ہے، یہ نہین معلوم ہوتا، کہ اس حکم کی تعمیل مین احادیث جمع بھی کی گئین، (ص ۹۲)" حالانکہ فتح الباری اور جامع بیان العلم ابن عبد البر مین اس کی تصریح موجود ہے، کہ حضرت عمرؓ بن عبد العزیز نے نہ صرف ابوبکر بن حزم کو بلکہ صوبون کے تمام والیون کو احادیث کی تلاش اور اوس کے جمع کرنے کا حکم دیا تھا، اس حکم پر محدثین نے احادیث کے مجموعے مرتب کئے، اور حضرت عمرؓ بن عبد العزیز نے اس کی نقلین مختلف ملکون مین بھجوائین،

ممالک اسلامیہ کی سیاست مؤلفہ جناب عشرت حسین صاحب صدیقی بی اے تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۵۳ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر

قیمت مجلد عہ، پتہ مکتبہ جامعہ نئی دہلی، لاہور، لکھنؤ، بمبئی، نمبر ۳،

یورپ کے سیاسی اور تجارتی مفاد کا اسلامی دنیا سے نہایت گہرا تعلق ہے، اسی مفاد کی

بنا پر وہ مدتوں سے یورپ کی حکومتوں کا شکار بنے ہوئے ہیں، لائق مؤلف نے اس کتاب میں مصر، ٹرکی، عرب، فلسطین، شام، عراق، ایران، افغانستان اور افریقہ کے اسلامی خطوں کے مختصر سیاسی حالات ان کی اور یورپین حکومتوں کے تعلق اور ان میں ان کی سیاست اور موجودہ صورتِ حال کی سرگذشت بیان کی ہے، موضوع کی اہمیت کے لحاظ سے یہ حالات بہت مختصر ہیں، تاہم فی الجملہ اسلامی ممالک کی موجودہ حالت اور ان کے ساتھ یورپ کی سیاست کو سمجھنے کے لئے کافی ہیں،

بحرالکاہل کی سیاست : مؤلفہ جناب امین خالدی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۹۲ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد ۱؎ روپیہ، پتہ: جامعہ نئی دہلی، لاہور، لکھنؤ، بمبئی نمبر ۳،

ایک زمانہ تک بحرالکاہل کی سیاسی اہمیت صرف چین، جاپان اور مشرقِ بعید کے ملکوں تک محدود تھی لیکن اب بحرالکاہل کے راستہ سے تجارت کی روز افزوں ترقی، برطانیہ کی نوآبادیات اور چین میں روس، برطانیہ اور امریکہ کے اقتصادی مفاد اور تجارتی اور سیاسی مسائل کی اشتراک کی بنا پر ان حکومتوں کے لئے بھی بحرالکاہل کی اہمیت روز بروز بڑھتی جاتی ہے، اس کتاب میں بحرالکاہل کے ساحلی ملکوں اور اوس کے جزائر کے جغرافیہ تاریخ اور اقتصادی اور سیاسی مسائل کی روشنی میں اس اہمیت کو دکھایا گیا ہے، ہر ملک کی پیداوار، رقبہ آبادی اور تجارت کے اعداد و شمار کے نقشے بھی دیدیئے ہیں، جن سے ان مسائل کے سمجھنے میں سہولت ہوتی ہے جن لوگوں کو عالمگیر سیاسی مسائل سے دلچسپی ہو، یہ کتاب ان کے مطالعہ کے لائق ہے،

صدر المدرسین : مؤلفہ مولینا شہید انصاری فرنگی محلی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۰۰ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت: ۸ر پتہ:- مصنف فرنگی محل لکھنؤ سے ملے گی،

مولانا عنایت اللہ صاحب مرحوم فرنگی محلی خاندانِ فرنگی محل کے علم و عمل کی آخری یادگار تھے، افسوس کہ گذشتہ جولائی مین یہ یادگار بھی مٹ گئی، مرحوم علم و عمل تعلیم و تدریس تالیف و تصنیف کے اعتبار سے اپنے اسلافِ کرام کے سچے جانشین تھے، ان کی ساری عمر تعلیم و تدریس کے شغل مین گذری، ان کے لائق بھتیجے مولانا صبغۃ اللہ صاحب شہید انصاری نے صدر المدرسین کے نام سے مرحوم کے حالات لکھے ہین، اس مین انکی سیرت و سوانح کے ساتھ انکی علمی تعلیمی سیاسی اور تصنیفی خدمات پر بھی مختصر روشنی ڈالی ہے،

ہمارے عہد ور، مؤلفہ جناب محمد عبد القادر صاحب لکچرار معاشیات جامعۂ عثمانیہ، تقطیع اوسط ضخامت ۵، صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مرقوم نہین، پتہ: انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی،

صنعت و حرفت کے فروغ کے ساتھ صنعتی کارخانون اور مزدورون کا مسئلہ روز بروز اہم اور عالمگیر ہوتا جاتا ہے، لائق مؤلف نے اس رسالہ مین مزدورون کی حالت ان کی زندگی انکے حقوق و فرائض، اصلاح و تنظیم، مراعات سہولتون اور ان کے اور کارخانہ دارون کے درمیان اختلاف کی صورت مین مفاہمت کے طریقون اور اس مسئلہ کے متعلق اور دوسرے پہلوون پر روشنی ڈالی ہے،

تازیانے، مرتبہ جناب الطاف مشہدی، تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۴۰ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد ۱؎، پتہ: - لاجپت رائے اینڈ سنز، تاجران کتب لاہور،

آج کل ترقی پسند ادب یعنی ان افسانونکی جانب رجحان زیادہ بڑھتا جاتا ہے، جن مین ہماری زندگی کی زبون حالی اور ہمارے اخلاقی اور معاشرتی نقائص کی مصوری کی گئی ہو، جناب الطاف مشہدی نے تازیانے کے نام سے مشہور افسانہ نگارون کے اس قسم کے چودہ افسانون کا یہ مجموعہ مرتب کیا ہے

افسانون کا انتخاب اچھا ہے، سب افسانے کسی نہ کسی اصلاحی پہلو سے تعلق رکھتے ہین؛

کلیاتِ میر، مرتبہ جناب مولوی عبدالباری صاحب آسی تقطیع بڑی ضخامت ۹۷۶ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مرقوم نہین، پتہ مطبع نولکشور لکھنؤ،

کلیاتِ میر کے کئی اڈیشن نکل چکے ہین لیکن ان مین سے کوئی بھی اغلاط سے خالی نہیں ہے، بعض تو بالکل مسخ ہین، ان کا کاغذ بھی نہایت خراب ہے، میر کے کلام کی اہمیت کے لحاظ سے ضرورت تھی کہ صحت اور حسن طباعت کے اہتمام کے ساتھ ایک نیا اڈیشن شائع کیا جاتا، اس فرض کو جناب مولوی عبدالباری صاحب آسی نے ادا کیا، اور متعدد قلمی اور مطبوعہ نسخون سے تصحیح و مقابلہ کے بعد یہ نسخہ مرتب کیا ہے، کلیات کے شروع مین ان کے قلم سے ایک مبسوط مقدمہ ہے، اس مین میر کے حالات اور ان کے کلام پر تبصرہ ہے، حالات خاصی تفصیل سے ہین، میر کی زندگی کے مختلف فیہ واقعات مین لائق مؤلف نے عموماً اپنی تحقیق کے بجائے دوسرے ارباب قلم کے بیانات نقل کرکے اون کا فیصلہ ناظرین پر چھوڑ دیا ہے، کہین کہین خود بھی کوئی نئی بات کہی ہے، میر کے زمانہ کے بہت سے الفاظ و مصطلحات اب متروک و فراموش ہو چکے ہین، آخر مین ان کا ایک فرہنگ دیدیا گیا ہے، امید ہے کہ اصحاب ذوق مین یہ نیا اڈیشن مقبول ہوگا،

گلبانگِ حیات، مصنفہ خواجہ محمد مسیح پال امین حزین تقطیع بڑی ضخامت ۲۱۲ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد عہ، پتہ مصنف سیالکوٹ سے ملیگی،

سیالکوٹ کی سرزمین نے جسے اقبال کے مولد ہونے کا فخر حاصل ہے، انہی کا ہمنوا ایک اور شاعر پیدا کیا، جو دنیاے شاعری مین امین حزین کے نام سے مشہور رہے، یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ دونون نے ایک ہی استاذ شمس العلماء میر حسن سے فارسی مین فیض حاصل کیا، اس سے زیادہ مشابہت اور یکرنگی دونون کے فکر وخیال، تصورِ زندگی اور موضوعِ شاعری مین ہے، بلکہ اس اعتبار سے حزین کی شاعری

کو اقبال کی شاعری کا عکس کہنا چاہیے، ان کا مرکزی تصور بھی اثباتِ خودی، ایمان و ایقان، جوشِ عمل ولولۂ آرزو اور زندگی کی تڑپ ہے، اور گلبانگ حیات حزیں کی زبان سے نویدِ زندگی ہے، اس مجموعہ میں گو مختلف رنگ کے نمونے ہیں لیکن مرکزی خیال تقریباً سب میں ایک ہے، حتیٰ کہ غزلوں میں بھی رنگین نوائی کے بجائے رجزِ زندگی ہے، قطعات خاص طور سے بہت حکیمانہ اور روحِ حیات کی تفسیر ہیں،

الہاماتِ سلیمانی، مرتبہ جناب منظور الحق صاحب کلیم تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۵۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت اوسط، قیمت معلوم نہیں، پتہ:۔ منظور الحسن صاحب کلیم پرنسپل ٹیچرز گورنمنٹ ہائی اسکول شاہجہان پور،

مولانا شاہ سلیمان صاحب مرحوم پھلواروی اپنے گوناگون کمالات کے ساتھ شعر و سخن کا بھی ذوق رکھتے تھے اور تفنن کو طور پر کبھی کبھی فکرِ سخن بھی فرمالیا کرتے تھے، عربی فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں ان کے کلام کے نمونے موجود ہیں، ان کے خلیفۂ مجاز منظور الحق صاحب کلیم نے ان کو الہاماتِ سلیمانی کے نام سے شائع کر دیا ہے، اس میں منظوم شجرے قصیدے نعتیں منقبت منظوم مکتوبات غزلیں تاریخیں وغیرہ مختلف اصناف کے نمونے موجود ہیں، شاہ صاحب کے متوسلین کے لئے یہ مجموعہ تبرک کی حیثیت رکھتا ہے،

رباعیاتِ حیدر، از جناب حیدر دہلوی تقطیع جیبی ضخامت ۱۲۴ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عہ پتہ عالی پبلشنگ ہاوس اردو بازار جامع مسجد دہلی،

جناب حیدر دہلوی دہلی کے خوشگو شعراء میں ہیں، رباعیات حیدر ان کی رباعیوں کا مجموعہ ہے اس میں شرابِ شباب، حقائقِ تلخ، حقائق و معارف، برکاتِ وطن، اردو پیری، انسان، شاعر، شہداء اور آثارِ وطن سے متعلق سو سے اوپر رباعیاں ہیں، یہ رباعیاں تخیل اور زبان دونوں کے اعتبار سے پر لطف ہیں، "م"

جلد ۴۸ "ماہ ذی قعدہ ۱۳۶۱ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۴۱ء "عدد ۶"

مضامین

نذرات،	سید سلیمان ندوی،	۴۰۲-۴۰۴
آنی تصور مملکت،	ڈاکٹر حمید اللہ صاحب استاد قانون بین الممالک جامعہ عثمانیہ،	۴۰۵-۴۳۱
دری شاہزادوں کا علمی ذوق،	جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب ایم اے رفیق دارالمصنفین،	۴۳۲-۴۴۹
تاریخ ملک ارسلان غزنوی،	جناب غلام مصطفےٰ خانصاحب ایم اے علیگ اسسٹنٹ لکچرر کنگ ایڈورڈ کالج امراوتی (برار)	۴۵۰-۴۵۹
نانِ قرم (کریمیہ)	جناب مولوی عنایت اللہ صاحب بی اے دہلوی سابق ناظم دارالترجمہ حیدرآباد دکن	۴۶۰-۴۶۵
لوسلاویہ کے مسلمان	سید ابوعاصم صاحب بی اے، دسنوی،	۴۶۵-۴۷۰
اخبار علمیہ،	"ص ع"	۴۷۱-۴۷۳
کس لئے،	پروفیسر آل احمد سرور،	۴۷۴-۴۷۵
عورت نشاط،	جناب اصغر حسین خانصاحب نظیر لودھیانوی،	۴۷۵
مطبوعات جدیدہ،	"م"	۴۷۶-۴۸۰

شذرات

رحمتِ عالم کے ہندی ترجمہ کے لئے تین صاحبوں نے چندے بھیجے ہیں اور تینوں علماء میں سے ہیں، جن میں سے ایک نے ۵۰ر دکن سے بھیجے ہیں، اور دوسرے نے ۵۰ر علی گڈھ کے نواح سے، اور تیسرے نے ۵ر رسی پی کے ایک گوشہ سے، اب اس کام کے لئے کسی چندہ کی ضرورت نہیں، احباب زحمت نہ فرمائیں،

ایک زمانہ تھا جب کہ قرآنِ پاک کا کوئی انگریزی ترجمہ کسی مسلمان کے قلم سے موجود نہ تھا، لیکن پچھلے بیس برس کے عرصہ میں بحمداللہ متعدد ترجمے چھپ کر شائع ہوئے اور مسلمانوں میں پھیلے لیکن ابھی تک کوئی ترجمہ ایسا نہیں ہوا تھا جس پر اہلِ علم اور علماے دین کو پورا اعتبار ہو، اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی (بی اے) نے کی ہے، موصوف مسلسل کئی سال سے پورے انہماک کے ساتھ اس میں مصروف تھے، اب بحمداللہ ان کا یہ کام اتمام کو پہنچ گیا،

اس ترجمہ کی خصوصیت یہ ہے کہ ترجمہ حاصلِ مراد اور مطلب کا نہیں کیا گیا ہے، جس میں بیسیوں لفظی و معنوی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں، بلکہ پوری لفظی پابندی کے ساتھ کیا گیا ہے، اور اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ ہر قرآنی لفظ کا ٹھیک ترجمہ صحیح انگریزی لفظ میں ادا ہو جائے،

مطلب و معنی میں خالص متبعینِ سنت کے اصول کی پیروی کی گئی ہے، یعنی ہر قسم کی تاویلاتِ فاسدہ سے احتراز برتا گیا ہے، آیت کے حل اور معنی کے تعین میں تفسیر کی معتبر کتابوں کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے، شرح طلب آیتوں پر حاشیے لکھے گئے ہیں جن میں تاریخی، جغرافی، کلامی، فقہی، تمدنی مسائل متعلقہ کی تفصیل کی گئی ہے، اور جہاں ضرورت ہوئی ہے توراۃ و انجیل، اور یہود و نصاریٰ کی مستند کتابوں سے حوالے دے کر قرآنِ پاک کی تصدیق کی گئی ہے، انگریزی زبان کی صحت میں متعدد زبان دانوں سے مشورے لئے گئے ہیں،

ہمارے ملک میں مصنف و مترجم کی اصلی دقت اپنے کام کے ختم کرنے کے بعد شروع ہوتی ہے، جب وہ اپنے کام کو ختم کرکے یہ آواز لگاتا ہے،

من قاش فروشِ دلِ صد پارۂ خویشم

پھر اس کے جواب میں کہیں سے کوئی آواز نہیں اٹھتی، چاہیئے تو یہ تھا کہ کوئی فیاض دل اٹھتا اور اس کی طبع و اشاعت کا کام دین کی خدمت سمجھ کر انجام دیتا، لیکن بہر حال اب جو صورت اس کی قرار پائی ہے وہ بھی اچھی ہے، یعنی تاج کمپنی نے تجارتی حیثیت سے اس کام کو اپنے ذمہ لیا ہے، اور اب امید ہے کہ موجودہ زمانہ کی ناگزیر دشواریوں کے باوجود کچھ دنوں میں مسلمانوں کے ہاتھوں میں ان کے کلامِ الٰہی کا ایک مستند ترجمہ آجائے، انشاء اللہ اس ترجمہ سے نوجوان مسلمانوں، اور اُن ملکوں کے مسلمانوں کو جہاں انگریزی زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے، بیحد فائدہ پہنچے گا،

ادارۂ **معارفِ اسلامیہ** لاہور کا سالانہ اجلاس جیسا کہ پہلے سے معلوم ہے امسال **لکھنؤ** میں ہوگا، ادارہ کی مجلس عاملہ نے اسکے لئے ۱۶-۱۷-۱۸ مارچ ۱۹۴۳ء کی تاریخیں مقرر کی ہیں، ۱۰ ماہ دسمبر کو اس کے لئے لکھنؤ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ایوانِ عباسیہ میں شہر کے اکثر اہلِ علم و قلم اور

علم دوست حضرات کا جلسہ ہوا جس میں مجلس استقبالیہ کی ابتدائی کارروائیاں طے ہوئیں، جناب مولنا حافظ محمد عمران خاں صاحب ندوی ازہری مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء اور جناب مولانا حکیم خواجہ شمس الدین صاحب جنرل سکریٹری اور جناب پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی ناظم نمایش کتب علمی، جناب مستفراللہ صاحب خازن اور چھ سات اصحاب انتظامی مجلس کے ممبر قرار پائے، جن کے نام علاوہ مذکورۂ بالا عہدہ داروں کے یہ ہیں، نواب زادہ شمس الحسن خاں صاحب شمس بی اے، ال ال بی (بھوپال ہوس) مولنا محمد شفیع صاحب مدرس اعلیٰ مدرسۂ نظامیہ فرنگی محل، مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی اور یہ ہیچ مدان، شاید ایک دو نام یاد نہ رہے ہوں صدارت استقبالیہ کے لئے چند نام زیر غور ہیں، یونیورسٹیوں کے تعاون کی بھی امیدیں ہیں،

یہ تو اجلاس کی ظاہری شکل ہے، لیکن اس کی حقیقی کامیابی اہل علم و اہل قلم و ارباب تحقیق اور شائقین علم کی شرکت اور مقالات کی اہمیت ہے، ہم کو امید ہے کہ پنجاب، یوپی اور بعض دوسرے صوبوں کے شائقین علم و تحقیق اس میں اپنے محققانہ مقالے پڑھیں گے، اور سعی بلیغ فرمائیں گے کہ یہ اجلاس اپنی معنوی خصوصیات کے لحاظ سے کامیاب ہو،

اس اجلاس کے متعلق ہر قسم کی اطلاع، خط و کتابت، اور استفسار براہ راست جنرل سکریٹری صاحب اجلاس ادارۂ معارف اسلامیہ، دارالعلوم ندوہ لکھنؤ سے کریں یا سکریٹری صاحب دفتر ادارۂ معارف اسلامیہ اورنٹیل کالج لاہور سے،

مقالات

قرآنی تصورِ مملکت

از

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب پی ایچ ڈی استاذ جامعہ عثمانیہ

"لائق مضمون نگار جامعہ عثمانیہ میں قانون بین الممالک کے استاذ ہیں، اور دنیا کی مختلف قوموں کے تصورِ مملکت اور دستورِ حکومت پر ان کی نگاہ ہے، اس مضمون میں اسی نقطۂ نظر سے اسلامی تصورِ مملکت کو انھوں نے پیش کیا ہے، موجودہ زمانہ میں اسلامی تعلیمات اور اس کے نظام کو جدید طرز میں اس طرح پیش کرنا جو دوسری قوموں اور جدید طبقہ کے لئے بھی قابلِ توجہ ہو، ایک مفید خدمت ہے، یہ مضمون چونکہ اسی نقطۂ نظر سے اور ایک خاص طبقہ کو پیشِ نظر رکھکر انگریزی میں لکھا گیا تھا، اس لئے زبان اور طریقۂ تعبیر میں اس کے ذوق کا لحاظ رکھا گیا تھا، جس کی کچھ جھلک اس اردو مضمون میں بھی موجود ہے،

جزیرہ نمائے عرب اسلام سے پہلے کبھی ایک اقتدار کے تحت متحد نہیں ہو سکا تھا، اور یہ ایک انوکھا اور عجیب و غریب واقعہ تھا کہ پورے ملک نے حضرت محمد صلعم کو متحدہ طور سے اپنا روحانی اور سیاسی سردار تسلیم کر لیا، جس ملک میں نراج کا دور دورہ ہو، وہاں دس ہی

سال کی کوشش مین ایک مرکزیت اور نظام قائم کر دینا رسول کریم صلعم کا عظیم الشان کارنامہ تھا، آنحضرت صلعم اپنے آپ کو آسمانی وحی کا تابع قرار دیتے تھے، جو وقتاً فوقتاً آتی تھی، اور جس کا مجموعہ اب قرآن کے نام سے دنیا مین موجود و مشہور ہے، اگر کوئی شخص سیرۃ نبویہ کا قریب سے مطالعہ کرے، تو اسے ام المومنین حضرت عائشہؓ کے اس قول کی صحت کو باور کرنے مین ذرا بھی دشواری نہ ہوگی، کہ قرآن رسول کریم صلعم کی زندگی کا آئینہ ہے، (کَانَ خُلُقُہُ الْقُرآنَ) اسی لئے یہ معلوم کرنا کہ آنحضرت صلعم کی شریعت مین مملکت کا تصور کیا ہے، بڑی آسانی کے ساتھ قرآن کو دیکھنے سے ممکن ہے،

یہ چیز قابلِ ذکر ہے کہ قرآن مجید مین نہ صرف ازمنۂ سابقہ کے پیغمبرون کے حالات بیان ہوئے ہین، بلکہ ان کی سیرتون کو جو قرآن مین ہین اب بھی ماخذ تسلیم کیا گیا ہے، بجز اس کے کہ صراحت سے قرآن اُسے یا اس کے کسی جزء کو منسوخ قرار دے، دوسرے الفاظ مین انبیائے سابقہ کی سنت مسلمانون پر اب بھی واجب التعمیل ہے، بجز اس کے کہ اس کے کسی معین جزء کے نسخ کا کوئی حکم قرآن مجید مین یا رسول کریم صلعم کے افعال و اقوال مین صراحت سے ملتا ہو، ایک آیت ملاحظہ ہو :-

"اولئک الذین اٰتینٰھم الکتب والحکم والنبوۃ، یہی وہ لوگ ہین جنکو ہم نے کتاب اور حکمت اور نبوت عطا کی، اگر کوئی لوگ اس کو نہ مانین تو ہم یہ امانت ایسے لوگون کے سپرد کرین گے، جو اس سے انکار نہ کرین، یہی وہ لوگ[۱] ہین جن کی خدا نے ہدایت کی ہے، اس لئے تو ان کی رہنمائی کی پیروی کر" (قرآن ۶/۸۹ تا ۹۰ نیز دیکھئے ۴۲/۱۳)

---

[۱] اس سے اوپر کی آیتون مین (۸۶) پیغمبرون کے نام لئے گئے ہین جن مین نوح، ابراہیم، اسمٰعیل، ہارون، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام شامل ہین، اور انہی کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے،

امام بخاری اور ترمذی نے ایک حدیث روایت کی ہے کہ جب کبھی کسی معاملہ میں براہ راست آسمانی وحی نہیں آتی، تو رسول کریم صلعم بجائے عام عربی رواجات کے اہل کتاب کے طریقوں کی پیروی فرمایا کرتے تھے،

یہ چیز سیاسی معاملات کی حد تک بھی اسی طرح صادق آسکتی ہے، جس حد تک معاشی و معاشرتی معاملات میں،

معاشرۂ انسانی کی تاریخ پر نظر ڈالیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ مملکت کا قیام بڑے عرصہ کے بعد ہوسکا، قرآن مجید میں واقعات کی جو ترتیب ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے حضرت آدمؑ پیدا ہوئے، جن کو خدا نے زمین پر نائب یا خلیفہ مقرر کیا، وہ نسل انسانی کے باپ تھے، اور بزرگ خاندان ہونے میں ان کا کوئی حریف نہیں ہوسکتا تھا، ان کی وفات کے بعد کئی نسلوں تک انکی اولاد میں مختلف قسم کے اختلافات اور برائیاں کم یا زیادہ مقدار میں ساری رہیں، اسی لئے قرآن مجید کے مطابق پیغمبر بھیجے گئے، جو خدا اور عام انسانوں کے مابین واسطے کا کام دیتے تھے، اور انسانوں کو یہ بتاتے تھے، کہ ان کے خالق کی حیثیت اور اسکا حکم کیا ہے، اور نیکی کی ترغیب دیتے اور برائی سے روکتے تھے، ان پیغمبروں نے خلوص کے ساتھ جو بے غرضانہ نصیحتیں کیں، اور ان کی باتوں کو کچھ لوگوں نے مانا بھی تو اس جماعت کی حیثیت کسی مملکت کی قرار دینی مشکل ہے، بظاہر قدیم ترین زمانہ میں انبیاء علیہم السلام کی آمد کے باوجود سیاسی نظام اور اقتدار کی ضرورت نہیں پائی جاتی تھی، قرآن مجید میں بھی بارہا ذکر ہے، کہ ایک قوم کی جگہ دوسری قوم کو سرفرازی عطا ہوئی، مگر ایک مملکت کو دوسری مملکت کی جگہ قائم کرنے کا کوئی ذکر نہیں ہے، قرآن مجید میں ان قومی وحدتوں کے غیر سیاسی وجود کے باوجود ان لوگوں کی معاشی اور سماجی سرگرمیوں کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے، لیکن ان چیزوں کا ذکر صرف اس طور سے ہوا ہے، کہ لوگ ان کو خدا کی نعمتیں سمجھکر

یاد رکھیں، اور خدا کی اطاعت کا فریضہ بجا لائیں،

بادشاہی کے ذکر کا آغاز قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ سے ملنے لگتا ہے جب کہ ایک شخص اپنے ملک کے تمام لوگوں کی جان و مال پر اپنا اقتدار چلاتا ہوا نظر آتا ہے (دیکھئے قرآن مجید ۲/۲۵۸ نمرود کا قصہ) حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ سے ادارۂ مملکت میں زیادہ استحکام و ترقی نظر آتی ہے، چنانچہ ان کے زمانہ کے حالات میں (دیکھئے قرآن مجید ۱۲/۴۳) بادشاہوں اور وزیروں اور سرکاری قید خانوں کا بھی ذکر ملتا ہے، (سورۂ یوسف)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جو حالات قرآن مجید میں ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے ان مقدس رہنما کی تمنا اور کوشش یہ تھی، کہ ارضِ موعود میں ایک مملکت قائم کریں، مگر قوم نے نااہلی کے مظاہرے (عدمِ اطاعتِ احکامِ الٰہی) سے مایوسی کا سامان کر دیا، آخر ان کی قوم کو چالیس سال تک انتظار کرنے کی ضرورت پیش آئی، کہ ایک بالکل نئی نسل پیدا ہو، جس کی بچپن ہی سے ان کی نگرانی میں تعلیم و تربیت ہو، اور پھر اس نئی نسل کی مدد سے وہ ارضِ موعود کو فتح کریں، گو اسی اثنا میں حضرت موسیٰؑ نے وفات پائی، اور ان کی چہل سالہ تربیتی اسکیم ان کے بعض فیض یافتوں نے مکمل کی، حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں جو فرعون مصر تھا، وہ قرآنی تذکرے کے مطابق ایک خاصا باقاعدہ حکمران تھا جس کا ایک وزیر تھا، اور جس کے مشورے کے لئے معزز اور اہل الرائے لوگوں کی ایک مجلس بھی پائی جاتی تھی، اس مجلس کے اجلاسوں کی جو روداد قرآن مجید میں ہے اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہ بے سوچے سمجھے اور عاجلانہ فیصلے نہیں کیا کرتی تھی، بلکہ اوس کی مشورے مناسب اور قابلِ عمل ہی ہوتے تھے، مثال کے طور پر حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ سے ان کی عداوت طرازیوں کے باعث کیا برتاؤ کرنا چاہئے؟ جب فرعون نے یہ سوال پیش کیا، تو مجلس شوریٰ نے نرمی اور اعتدال کا مشورہ دیا تھا، اس زمانہ میں عوام الناس تک ایک حد تک سیاسی شعور

رکھتے نظر آتے ہیں، چنانچہ (قرآن مجید ۲۰/۲۱) جب ایک شخص نے حضرت موسیٰ کو ان کی سخت گیری کے باعث ملامت کرنی چاہی تو اوس نے یہ الفاظ کہے تھے، کہ

"ان تریدالا ان تکون جبارا فی الارض الخ تو تو زمین میں ایک جبار بنجانا چاہتا ہے، اور صلاح و فلاح کا کام کرنے والوں میں سے نہیں ہونا چاہتا"

حضرت موسیٰ کے زمانہ میں مجلس و وگانہ یا مرکب بادشاہت کا بھی پتہ چلتا ہے[۵۱]

طالوت یعنی بادشاہ ساؤل کا قصہ قرآن مجید میں ایک خصوصی دلچسپی کا حامل ہے، بنی اسرائیل کو ان کے دشمن نے شکست دیکر ان کے گھروں سے جلاوطن کر دیا تھا، انتقام کی خواہش نے انھیں اس بات پر آمادہ کیا، کہ اپنے پیغمبر سے یہ خواہش کریں کہ ان پر ایک بادشاہ نامزد کیا جائے جو اُن کو ساتھ لیکر دشمنوں سے لڑسکے:

"اذ قالوا لنبی لھم ابعث لنا ملکا نقاتل فی سبیل اللہ الخ یاد کرو جب موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل نے اپنے نبی سے کہا کہ ہم پر ایک بادشاہ کو مامور کرتا کہ ہم اللہ کی راہ میں لڑسکیں، اُس (نبی) نے کہا اگر تم لڑنا فرض ہونے کے بعد لڑنے سے انکار کرو تو انھوں نے کہا یہ کیسے ہوسکتا ہے، کہ ہم اللہ کی راہ میں نہ لڑیں، جب کہ ہمیں ہمارے گھروں اور ہمارے بچوں سے نکال باہر کر دیا گیا ہے، اس کے باوجود جب لڑنا ان پر فرض کیا گیا تو انھوں نے روگردانی کی، بجز چند لوگوں کے، اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے، ان کے پیغمبر نے ان سے کہا: دیکھو اللہ نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے، انھوں نے کہا یہ کیسے ہوسکتا ہے، کہ وہ ہمارا بادشاہ بنے؟ ہم اس سے زیادہ بادشاہت

---

[۵۱] قرآن مجید ۲۰/۳۲ چنانچہ خود حضرت موسیٰ نے اپنے بھائی کے متعلق خدا سے دعا کی تھی کہ وَاَشْرِکْہُ فِیْ اَمْرِیْ (اس کو میرے کام میں شریک بنا)

بکے مستحق ہین، کیونکہ وہ مالدار نہیں ہے، اس (نبی) نے کہا اللہ نے اسی کو تم پر فوقیت دی ہے اور علم اور جسم مین اس کو وافر حصہ دیا ہے، اللہ اپنا ملک جس کو چاہتا ہے، دیتا ہے، اللہ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے، اور ہر چیز کو جانتا ہے"۔

(قرآن مجید ۲ ۲۴۶ تا ۲۴۷)

علاوہ اور اہمیتون کے اس اقتباس مین یہ بتایا گیا ہے، کہ مال و دولت یا حسب و نسب نہین بلکہ علم و جسم یعنی سیاست[1] دانی اور بہادری بادشاہت کی اولین ضرورتین ہین، اس اقتباس سے یہ اہم چیز بھی معلوم ہوتی ہے، کہ اس زمانہ مین یہودیون نے مذہب اور سیاست کو الگ چیزین ہونا تسلیم کر لیا تھا، اور نبی کے علاوہ بادشاہ کی ضرورت سمجھی گئی تھی، بادشاہ فرائض نبوت بجا نہیں لا سکتا تھا، اور نہ نبی فرائض بادشاہت، البتہ یہ چیز قابل ذکر ہے، کہ طالوت یعنی بادشاہ ساؤل کے فوری جانشین حضرت داؤدؑ اور ان کے بعد ان کے بیٹے حضرت سلیمانؑ دونون بادشاہت اور نبوت ہر دو حیثیتون کے حامل بنے، ان کا کچھ تذکرہ ذیل مین کیا جاتا ہے:-

حضرت داؤدؑ کا قرآنی تذکرہ بیحد اہم ہے، کیونکہ اس مین فرائض بادشاہت کا (جن مین عدل گستری سب سے اہم ہے) ذکر کیا گیا ہے:-

(ا) وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ الخ اور داؤد نے جالوت کو قتل کیا، پھر خدا نے اوس کو بادشاہت اور حکمت عطا کی" (قرآن مجید ۲ ۲۵۱)

(ب) وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ الخ "ہم نے اسکی حکومت کو مضبوط بنا دیا، اور اس کو حکمت اور فیصلہ کرنے والی زبان عطا کی" (ایضاً ۳۸ ۲۰)

(ج) "یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ الخ اے داؤد!

---

[1] معارف: قرآنی اصطلاح مین علم کا مفہوم معرفت حق ہے،

بیشک ہم نے تجھکو زمین پر ایک نائب مقرر کیا ہے، اس لئے لوگون مین حق کے ساتھ فیصلے کیا کر اور خواہشات کی پیروی نہ کر ورنہ وہ تجھے خدا کی راہ سے بھٹکا دین گے اور جو کوئی خدا کی راہ سے بھٹکے، تو اس کا انجام بُرا ہوتا ہے، کیونکہ وہ قیامت کے حساب و کتاب کو بھول جاتا ہے؛ (قرآن مجید ۳۸/۲۶)

حضرت سلیمانؑ کے سلسلے مین یہ بیان کیا گیا ہے، کہ "اور سلیمان کو داؤد کا وارث بنا"[۵] اگرچہ بیٹا اپنے باپ کا جانشین ہوا تھا، لیکن اس قرآنی تذکرے کا منشا، یہ بالکل نہین ہے، کہ بیٹا بطور حق کے بادشاہ بنا ہو، بلکہ یہ محض خدا کی عنایت تھی، کہ باپ کی جگہ بیٹے کو بھی حکومت ملی، اور اقتدار کا اصلی سرچشمہ خدا ہی کی مشیت ہے،

حکمرانی کے کل پرزون کی حرکت کا سب سے دلچسپ منظر قرآن مجید مین ملکۂ سبا کے تذکرہ مین ملتا ہے، چنانچہ:-

"قالت یا ایھا الملؤا افتونی فی امری ما کنت قاطعۃ امرا حتی تشھدون الخ

"اُس (ملکہ) نے کہا اے سردارو مجھے میرے اس معاملہ میں مشورہ دو، مین تمھاری موجودگی کے بغیر کوئی قطعی فیصلہ نہین کرتی، انھون نے کہا ہم بڑے طاقتور اور بہادر لوگ ہین، حکم دینا تیرا کام ہے، اس لئے تو سوچ کر فیصلہ کر، اُس (ملکہ) نے کہا جب کبھی بادشاہ کسی شہر مین داخل ہوتے ہین، تو اُسے تباہ کر دیتے ہین، اور وہان کے معززین کو ذلیل بنا دیتے ہین، اور وہ ایسا ہی کرین گے، البتہ مین اُن (حضرت سلیمان کے ملک والون) کو ایک تحفہ بھیجون گی، اور دیکھون گی کہ سفیر کیا واپس لاتے ہین، چنانچہ جب سفیر سلیمان کے پاس پہونچے، تو انھون نے فرمایا کیا تم مجھے مال کے ذریعہ سے کچھ مدد دینی

---

[۵] قرآن مجید ۲۷/۱۶

چاہتے ہو، جب کہ وہ چیز جو خدا نے تمھے دے رکھی ہے، وہ اس سے کہین بہتر ہے، جو
اس نے تمھین دی ہے، ؟ تمھین تو اپنے تخت ہی پر ناز ہے، ان کے پاس واپس جاؤ،
ہم بیشک ان کے پاس ایسی فوجین لیکر آئین گے، جن کا وہ مقابلہ نہیں کرسکین گے،
اور ہم ان کو وہان سے ذلیل کرکے نکال دین گے، اور وہ پست ہو جائین گے"

(قرآن مجید ۲۷ تا ۳۷)

ہر زمانہ مین اس امر کی ضرورت تسلیم کیجاتی رہی ہے، کہ ملت کی رہنمائی کے لئے ایک قوانین کا مجموعہ بھی موجود ہو، قرآن مجید مین اکثر اس کا ذکر آیا ہے، کہ پیغمبرون کو کتابین یا صحیفے دیے گئے، کتاب کے لفظی معنی حکم دینے کے بھی آتے ہین، اور صحیفہ سے مراد دستور العمل ہوتا ہے، حضرت موسیٰؑ کے سلسلہ مین خاص طور سے اس کا ذکر ہوا ہے، کہ جونہی وہ فرعون کی سرزمین سے نکل کر باہر آگئے، تو خدا نے حضرت موسیٰؑ کو احکام لکھی ہوئی تختیان (الواح) عطا کین، جن کی تعمیل بنی اسرائیل پر فرض قرار دیگئی،

ظالم بادشاہون کے ظالمانہ اور نامناسب افعال کی قرآن مجید مین بارہا برائی کی گئی ہے، (دیکھئے قرآن مجید ۱۰۱، ۲۸ وغیرہ) ایک چیز جو قرآنی تذکرون مین خاص طور سے قابلِ ذکر معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ مملکت سے زیادہ حکمرانِ مملکت کو نمایان کیا گیا ہے، بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مملکت کا ذکر محض ضمناً آیا ہے، اور سیاسی وحدت مین بادشاہ کا ذکر ہی سب سے نمایان ہے، کیونکہ قدیم زمانون مین یہی صورتِ حال تھی،

اسلامی مملکت | اب تک ہم نے اپنی تحقیقات کو زمانۂ قدیم کی مملکت تک محدود رکھا تھا، اس کے معنی یہ نہین، کہ آنحضرت صلعم نے جو اسلامی مملکت قائم کی تھی، اس کے لئے کوئی خصوصی احکام قرآن مجید مین نہین دیئے گئے، ہمارے تذکرہ کا منشا یہ تھا کہ چونکہ انبیاءِ سلف کی سنت بھی مسلمانون کے لئے

واجب التعمیل قرار دی گئی ہے، اس لئے ان کے زمانہ کے احکام کا تذکرہ نہ صرف اسلامی مملکتی تصور کے لئے ایک پس منظر کا کام دیتا ہے بلکہ واقعتہ وہ اسلامی قانون سیاسی و انتظامی کا جز بنجاتے ہیں، وہ احکام جو قرآن مجید میں نبی کریم صلعم کو خاص طور پر دیئے گئے ہیں، ان کا موضوع و اتذکرہ کیا جاتا ہے،

سب سے پہلی چیز یہ کہ اقتدار اعلیٰ کے ربانی ماخذ کو کہیں بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے، اور قیامت کے حساب کتاب پر بار بار زور دیا گیا ہے تاکہ بادشاہ میں کسی دنیاوی ذمہ داری کے نہ ہونے کے باعث استبداد نہ پیدا ہو جائے، اگرچہ قرآن مجید میں علاقے یا زمین کا ذکر بعض وقت حکمرانی کے ساتھ آیا ہے لیکن وہ بڑی حد تک ضمنی ہے، بنیادی نہیں مثلاً:

(ا) قُلِ اللّٰھُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ الخ

کہہ اے خدا ملک کے مالک! تو ہی جس کو چاہتا ہے، ملک دیتا ہے، اور جس سے چاہتا ہے ملک واپس لے لیتا ہے، جس کو چاہتا ہے تو عزت دیتا ہے، اور جس کو چاہتا ہے تو ہی ذلیل کرتا ہے، بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے، تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے،

(قرآن مجید ۳/۲۶)

(ب) هُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ الخ وہی ہے جس نے تم کو زمین میں نائب مقرر کیا، اور تم میں سے چند کو دوسروں پر رتبے میں فوقیت دی تاکہ تمھیں اس چیز کے ذریعہ سے آزمائے، جو اس نے تمھیں دی ہے،

(ایضاً ۶/۱۶۵)

(ج) وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ الآیہ

ہم نے تم کو زمین میں اقتدار عطا کیا اور تمھارے لئے وہاں روزی مہیا کی (ایضاً ۷/۱۰)

جامعۂ روما کے پروفیسر نالینو کو یہ تسلیم کرنے مین کوئی ہچکچاہٹ نہین معلوم ہوتی کہ اسلامی حکمران کی تخت نشینی کے وقت جو بیعت لیجاتی ہے، وہ ایک طرح سے معاہدۂ معاشری کہلا سکتا ہے، چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ

"کسی شخص کو خلافت کا رتبہ عطا کرنا فقہا کے نزدیک ایک معاہدہ ہوتا ہے، جس کا ایک فریق وہ شخص ہوتا ہے، جو اس عہدے کو قبول کرے، اور دوسرا فریق جماعتِ اسلامی ہوتی ہے، یہ معاہدہ اس وقت تک مکمل نہین ہوتا، جب تک کہ بیعت یعنی اظہارِ وفاداری امت کے اصحابِ حل وعقد کی طرف سے نہ عمل مین آجائے"[1]

لفظ بیعت کے معنی خود ایک معاہدہ کے ہوتے ہیں، اور اصطلاحًا اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وفاداری اور اطاعت کی ایک طرف سے پیشکش کی جائے اور دوسرے فریق کی طرف سے اُسے قبول کیا جائے، (دیکھئے قرآن مجید ۴۸/۱۰، ۶۰/۱۲) دوسرے الفاظ مین حکمران کا اقتدار چاہے مشیتِ عامہ سے پیدا نہ ہوتا ہو لیکن اسی پر مبنی ہوتا اور اسی کا محتاج ضرور رہتا ہے،

اگرچہ رسولِ کریم صلعم کے متعلق مسلمانون مین یہ چیز جزوِ عقیدہ ہے، کہ پیغمبر معصوم ہوتے ہین، اور اگرچہ خلفا پیغمبرون کے سیاسی جانشین سمجھے گئے لیکن معصومیت کا یہ اعزاز ان کے لئے کبھی تسلیم نہین کیا گیا، یہی وجہ ہے کہ بعض دیگر قومون مین بادشاہ کو "غلطی نہین کرسکتا" کا جو سیاسی نظریہ پایا جاتا ہے، وہ مسلمانون مین کبھی جگہ نہ پاسکا، اس کے برخلاف مسلمانون کو اسی پر ناز ہے، کہ نہ صرف عام حکمران بلکہ خود پیغمبر صلعم بھی حقوق العباد کے معاملے میں انہی عام قوانین کے پابند ہین جن کے عام مسلمان، اور یہ کہ رسول اللہ صلعم نے کبھی کبھی خود اپنی ذات کے خلاف مقدمات سنے، اور منصفانہ

---

[1] فرانسیسی رسالہ موسومہ خلافت کی عام نوعیت، اور سلاطین عثمانیہ کے دعوائے خلافت پر تبصرہ مطبوعہ روما ص ۱۱،

فیصلہ کیا[۵۱] پیغمبروں کی معصومیت کا منشا، اسلامی علم کلام مین صرف یہ لیا جاتا ہے کہ وحی کی تبلیغ اور خدا کے احکام پہنچانے مین ان سے کوئی غلطی یا سہو سرزد نہین ہو سکتا، اس کے علاوہ دیگر معاملات مین پیغمبر کی حیثیت بھی ایک انسان ہی کی ہوتی ہے، اور احادیث مین متعدد مرتبہ بیان ہوا ہے، کہ رسول کریم صلعم نے فرمایا کہ "دنیاوی معاملات مین مین بھی تمھاری ہی طرح ایک انسان ہون، سیاسی حیثیت سے رسول کریم صلعم جماعت اسلامی کے ایک فرد تھے، اور ان قوانین کے جن کو آپ نافذ کرتے تھے، خود بھی پوری طرح پابند تھے،

غرض جملہ مخلوقات کی طرح کرۂ ارض اور انسانی بستی کا بھی اصل مالک اور بادشاہ خدا ہی کی ذات ہے، اور وہی صلاحیتون کو دیکھکر کسی انسان کو اپنی نیابت سے سرفراز کرتا ہے اور پھر دیکھتا ہے، کہ وہ عمل کیسا کرتا ہے، (انّ الارض یرثھا عبادی الصالحون، إنی جاعلٌ فی الارض خلیفۃ، لینظر کیف تعملون، إنّ الارض للہ یورثھا من یشاء من عبادہٖ وغیرہ) خدا کا خلیفہ برحق تو نبی ہوتا ہے جس کا براہ راست وحی سے تقرر ہوتا ہے، اور وحی ہی سے اسکی رہنمائی ہوتی ہے، اس کے باوجود بھی سرور کائنات صلعم اپنی اطاعت اور پیروی کی بیعت لیتے رہے، نبیؐ کے دنیاوی پردہ فرمانے پر احکام شریعت سے ناواقفون کو واقف کرانے کی حد تک حدیث شریف مین ہے کہ العلماء ورثۃ الانبیاء[۵۲] لیکن سلطنت رانی اور سیاست مدن کے لئے ماوردی، ابن خلدون وغیرہ کے الفاظ مین "اصحاب حل وعقد" کسی کا انتخاب کرتے ہین، اور یہ انتخاب بمصداق حدیث شریف یدُ اللہ علی الجماعۃ منشا ربانی کا اظہار اور باعث خیر و برکت ہوتا ہے، اور یہی اصحاب حل وعقد، انتخاب اور بیعت کے بعد بھی حکمران کی حکمرانی مین مرجع کا کام دیتے ہین، اور ضرورت

---

۵۱ سیرۃ ابن ہشام ص ۴۴۴، کامل ابن الاثیر ج ۲ ص ۱۴۱ نیز سیرۃ شامی مین آٹھ دس ایسے واقعے درج ہین ۵۲ معارف :- سند آیہ حدیث ثابت نہین،

تو اُسے معزول بھی کر سکتے ہیں،[۵] حکمران کے حقِ اجتہاد کے حدود، مصالح ملکی اور نظم و نسق میں شوریٰ کا موقف، اصحابِ حل و عقد کی دستوری حیثیت، وغیرہ پر تفصیل سے بحث یہاں ممکن نہ ہوگی البتہ اس سوال کا جواب شاید ضروری ہے، کہ اصل دنیاوی اقتدار کے استعمال کا حق کس کو حاصل ہوتا ہے، اس کا جواب حضرت امام اعظمؒ کے الفاظ میں:-

انّ نواحیَ دارالاسلام تحتَ	اسلامی سرزمین کے جملہ حصے اسلامی
یدِ امامِ المسلمین ویدکاید	بادشاہ کے اقتدار میں ہوتے ہیں، اور
جماعۃ المسلمین۔	اس کا اقتدار مسلمانوں کی جماعت ہی
(مبسوط سرخسی ج ۱۰ ص ۹۳)	کا اقتدار ہوتا ہے،

امام ابوحنیفہؒ کے دونوں شاگردوں امام ابو یوسف اور امام محمد شیبانی نے مزید وضاحت سے کہا ہے، کہ کسی ملک کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا امتیاز یہ ہے کہ وہاں غلبہ اور محافظ قوت کس قوم کو حاصل ہے، تعداد سے بحث نہیں "لِصفۃ الدار انّما تُنسب إلی اھلھا لثبوتِ یدِ ھؤلاء علیھا وقیامہ ولا یعتبر الحافظۃ فیھا" (محیط رضی الدین سرخسی مخطوطہ استانبول ورق نمبر ۵۰ ب) اور حنفی علماء متفق ہیں، کہ اسلامی مملکت کا انتظام امام پوری امت مسلمہ کے نائب کے طور پر کرتا ہے، چنانچہ شارح شیبانیؒ کے الفاظ میں "الامام بمنزلۃ جماعۃ من المسلمین فی استیفاء ھذا الحق" (مبسوط سرخسی ج ۹ ص ۲۰۴) یعنی اس حق کے نفاذ میں امام کی حیثیت امت مسلمہ کے قائمقام کی ہوتی ہے،

بہرحال یہ اسلامی تصورِ اقتدارِ اعلیٰ ہے، کہ مقتدرِ اعلیٰ خداوند خلاق کی ذاتِ کبریائی ہے اور حکمرانی شریعت کو حاصل ہوتی ہے، اور خلیفۃ اللہ فی الارض" یا شریعت کے نفاذ کے افسر کا انتخاب

---

[۵] بدائع الصنائع للکاسانی ج ۷، صفحہ ۱۶۔

بھی خدا ہی کرتا ہے، اور اس بارے میں خدا کی مشیت کا اظہار "یَدُ اللّٰہِ علی الجماعۃ" اور "لا یجتمع امتی علی الضلالۃ" وغیرہ احادیث شریفہ کے بمصداق اور عہد خلافت راشدہ کے نظائر کے مطابق اصحاب حل وعقد کی بیعت کے ذریعہ سے ہوتا ہے،

دین و دنیا کا ملاپ قدیم زمانوں میں جب انسانی تمدن نے زیادہ ترقی نہ کی تھی، اور تقسیم کار کی اتنی زیادہ ضرورت پیش نہ آئی تھی، کسی ملک میں مرکزی حکومت کے اختیارات یا تو عدل گستری کے متعلق ہوتے تھے، (جس میں دشمن سے جنگ بھی شامل ہے، اور فقہ کی کتابوں میں باب الجہاد کا ذکر "حدود" یعنی سزاؤں کے سلسلہ ہی میں ملتا ہے) یا قومی معبود کی پرستش و عبادت کے متعلق دیگر سلطنتی نظم و نسق کے مسائل اٹھتے ہی نہ تھے، بلکہ وہ عوام کے انفرادی معاملات سمجھے جاتے تھے، اور عبادت ہی نہیں عدل گستری اور جنگ بھی مذہبی مراسم کی تابع تھی، تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ کشوری اور مذہبی فرائض میں دوری پیدا ہوتی جاتی تھی، چنانچہ رومیوں نے ius (دنیاوی قانون) کو ہمہ گیر fas (مذہبی قانون) سے ایک الگ چیز کے طور پر ایجاد کیا، یہودیوں نے "قالوا لنبی لھم ابعث لنا ملکا نقاتل فی سبیل اللّٰہ" (قرآن ۲/۲۴۶) اپنے نبی سے کہا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر جس کے ساتھ ہم خدا کی راہ میں جنگ کر سکیں،

اور نبوت و بادشاہت یا مذہب و سیاست کو جدا کر دیا، حضرت عیسیٰؑ کی طرف بھی یہ قول انجیل میں منسوب ملتا ہے، کہ قیصر کی چیزیں قیصر کو دیدو، اور کلیسا کی کلیسا کو" بدھ متیوں اور ہندوؤں کے ہاں بھی ترک دنیا ہی انسانیت کا کمال قرار پایا،

غرض قدیم اہل مذہب نے دنیائے ناپائدار کو دل لگانے کے قابل چیز نہ سمجھا، لیکن اس میں دو دنیاوی مسائل نظر انداز ہو کر خامی پیدا ہو گئی، ایک تو گنتی کے چند فرشتہ صفت انسانوں کے سوا باقی جو لاکھوں کروروں عامۃ الناس تھے، ان کے معاملات مادیت پسندانہ ہو گئے، اور دوسرے

سیاست کی اخلاقی بنیاد نہ رہی، اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ سابقہ تمام مذاہب اکائیون یا دہائیون مین ختم ہوجانے والے فرشتہ صفت انسانون کے لئے ہوتے تھے، اور اسلام نازکر سکتا ہے، کہ وہ اعلیون اور اوسط درجہ کے انسانون کے لئے ایک قابل عمل دستور لایا، یہ ظاہر ہے، کہ دنیا مین ایسون ہی کی بہت بڑی اکثریت ہوتی ہے، انسان نما فرشتے اور انسان نما شیطان دونون کی تعداد ہمیشہ بہت محدود ہی ہوتی ہے،

مذہب اور سیاست دو بالکل الگ چیزین ہین، مذہب خدا اور بندے کے تعلقات کا نام ہے، اور سیاست بندے اور بندے کے معاملات کا، ان دونون کو ایک کہنے والا گویا ہاتھ اور پاؤن کو ایک کہتا ہے، لیکن جس طرح ایک زندہ اور تندرست انسان مین ہاتھ اور پاؤن دونون ہی ایک مشترکہ اور مرکزی قوت مثلاً عقل یا ارادے کے تابع ہوتے ہین، بالکل اسی طرح دین اسلام نے مذہب اور سیاست کو ایک مشترکہ دستور العمل کے تابع کر دیا، جو قرآن یا ربانی کلام تھا، اور دونون ہی کی رہنمائی کے لئے احکام کا ماخذ ایک ہی قرار دیکر سیاست مین اخلاقی اساس اور اخلاق مین حقیقت پسندی باقی رکھی، کوئی شخص ہاتھون کے بل تھوڑی دور ضرور چل سکتا ہے، اور پاؤن سے بُرا بھلا کچھ لکھ بھی ضرور سکتا ہے، اسی طرح عبادت کو سیاست اور سیاست کو عبادت بنا کر انسان چند روز گذارا ضرور کر سکتا ہے لیکن یہ غیر فطری عمل نہ تو سہولت بخش ہوگا اور نہ مفید،

یہی وجہ ہے کہ ہمارے ایک بزرگ سیرت نگار نبوت کے الفاظ مین "محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا مین دین اور دنیا دونون کی برکتین لیکر آئے، آپ نے صرف آسمانی بادشاہت کی خوشخبری نہیں سُنائی، بلکہ آسمانی بادشاہی کے ساتھ دنیا کی بادشاہی کی بھی بشارت دی تاکہ دنیا مین خدا کی بندگی بے خوف و خطر کیجا سکے، اور خدا کی بادشاہی دنیا مین قائم ہو"۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ الخ

"خدا نے ان سے جو ایمان لائے اور اچھے عمل کئے، یہ وعدہ کیا، کہ وہ ان کو زمین مین حاکم بنائیگا، (جیسا کہ ان کو حاکم بنایا تھا، جو ان سے پہلے تھے) اور اُن کے لئے ان کے اوس دین کو جو اُس نے اُن کے واسطے پسند کیا ہے، جمادیگا" (قرآن ۲۴/۵۵)

قرآن نے سب سے اچھی دعا انسانون کے لئے یہ بتائی ہے :-

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا مین بھلائی دے، اور آخرت مین بھلائی دے، اور ہم کو آگ کے عذاب سے (دوزخ) سے بچا" (قرآن ۲/۲۰۱)

اور ایک جگہ فرمایا :

"لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةٌ وَّلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَیْرٌ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِیْنَ اور جنھون نے نیک کام کئے ان کے لئے اس دنیا مین بھلائی ہے، اور آخرت کا گھر سب سے اچھا ہے، اور پرہیزگارون کا گھر کیا اچھا ہے!" (قرآن ۱۶/۳۰)

.... جن لوگون نے خدا کی راہ مین اپنی جانون کی بازی لگائی ان کو بشارت ہے :-

فَاٰتٰهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْیَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ تو اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب اور آخرت کا بھلا ثواب عنایت کیا، اور اللہ نیکی کرنیوالون کو چاہتا ہے، (قرآن ۳/۱۴۸)

دنیا کا ثواب فتح و نصرت، ناموری و عزت، مال و دولت اور حکومت و سلطنت ہے، جنھون نے خدا کی راہ مین اپنا گھر بار چھوڑا، اور خوشی خوشی ہر طرح کی تکلیف جھیلی، ان کو دونون جہان کی نعمتین بخشین :-

وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا فِی اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا الخ اور جنھون نے ہمارے لئے ستائے

جانے کے بعد گھر چھوڑا، ہم ان کو دنیا مین اچھا ٹھکانا دین گے، اور بیشک آخرت کا اجر سب سے بڑا ہے، (قرآن ۱۶/۴۱)

.... (اور اولیا، و اتقیا یعنی فرشتہ صفت مسلمانون کو ترکِ دنیا کی ہدایت نہ کی، بلکہ دنیا داری اور دین داری دونون کے ملاپ کا حکم دیا):-

الذین ان مکنّاھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ ۲۲/۴۱ وہ ایسے لوگ ہین، کہ اگر ہم ان کو زمین مین جما دین تو وہ نماز کھڑی کرین، اور زکوٰۃ دین، اور اچھے کامون کو کہیں اور بُرے کامون سے روکین، اور ہر کام کا انجام خدا کے ہاتھ مین ہے،

(قرآن ۲۲/۴۱)

.... ان آیتون سے یہ اشارہ بھی نکلا، کہ مسلمانون کے ہاتھون مین خدا کے قانون کے اجراء کی طاقت ہونی چاہیئے، اور یہ اشارہ بھی کہ دین و دنیا کا امتزاج یا ملاپ ہی انسان کو انسان بناتا ہے اور "احسن تقویم" کا مظاہرہ ہوسکتا ہے، ورنہ وہ یا تو فرشتہ ہو جائے گا، یا شیطان اور ان دونون اصناف سے جدا ایک خاص مخلوق یعنی انسان کی تخلیق کا مقصد فوت ہو جائیگا،

ایسی آیتین قرآن مجید مین بکثرت ملتی ہین جن میں یہ بتایا گیا ہے، کہ خدا نے اپنی ہر مخلوق انسان کی خدمت یا استفادے کے لئے پیدا کی ہے، اور انسان اپنی خالق کی عبادت کے لئے پیدا کیا گیا ہے مگر اس کی تفصیل یہان طول بحث سمجھی جائیگی،

بیعت حکمران کی اطاعت کو جیسی کچھ اہمیت حاصل ہے، ظاہر ہے، قرآن مجید مین بھی اس پر کچھ کم زور نہین دیا گیا ہے، مثلاً:-

(۱) یا ایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واُولی الامر منکم ۵۹/۴ اے ایمان والو اطاعت کرو اللہ کی اور رسول کی، اور ان لوگون کی جو تم مین سے افسران حکومت ہون،

اگر تم مین کسی معاملہ مین آپس مین جھگڑا ہو تو اُسے اللہ اور رسول سے رجوع کرو، اگر تمھین خدا اور یوم آخرت پر سچا ایمان ہو، یہی بہتر اور مآل کار اچھا طریقہ ہے، (قرآن مجید ۵۹/۴)

(ب) اَذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ وَالْخَوْفِ اَذَاعُوا بِهٖ الخ اگر امن یا خوف کی ان کو کوئی خبر ملتی ہے، تو اسے مشہور کر دیتے ہین، بہتر ہوتا کہ وہ اسکی اطلاع رسول کو اور اپنے افسرون کو دیتے تو سمجھدار لوگ اوس کو سمجھ جاتے، (قرآن مجید ۴/۸۳)

یہ تو افسرون کی اطاعت کا ذکر تھا، جناب رسالت مآب صلعم کی شخصی اطاعت پر تو اس سے بھی زیادہ مواقع پر زور دیا گیا ہے کہیں صرف حکم ہے، تو کہیں اوس کے فوائد بتا کر ترغیب دی گئی ہے، رسول کی اطاعت اور پیروی کے ان احکام کا یہ ناگزیر نتیجہ تھا، کہ بعد کے زمانہ مین آپ کے ہر قول اور فعل کا تذکرہ محفوظ کرنے کی اتنی عظیم الشان کوشش اہل علم کی جانب سے عمل مین لائی گئی، ایسی بعض آیات حسب ذیل ہین :-

(ا) مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا . . . . . .

. . . . . ، جو کچھ رسول تمھیں دے اُسے لے لو، اور جس سے منع کرے اوس سے رُک جاؤ، (قرآن مجید ۵۹/۷)

(ب) لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ بیشک اللہ کے رسول مین تمھارے لئے ایک اُسوۂ حسنہ پایا جاتا ہے، (ایضاً ۳۳/۲۱)

(ج) یاایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ ورسولہ ولا تولوا عنہ وانتم تسمعون الخ اے ایمان والو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اور جب وہ کچھ کہے تو سنکر روگردانی نہ کرو . . . . . اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اور آپس مین جھگڑو نہین، تاکہ تم کمزور نہ پڑ جاؤ، اور تمھاری ہوا نہ

اکھڑ جائے[1]، اس کے برخلاف صبر سے کام لو، اللہ صبر سے کام لینے والوں کیساتھ ہوتا ہے

(قرآن مجید ۲، ۲۵۰، ۴۶)

(د) وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ان هوالا وحی یوحی، وہ (یعنی رسول خدا) اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتا، بلکہ وہ وحی ہی ہوتی ہے، (قرآن مجید ۵۳/۳)

آرنلڈ نے اپنی کتاب خلافت میں بالکل ٹھیک رائے ظاہر کی ہے، کہ اس طرح رعیت کے فریضۂ اطاعت پر زور دیا گیا، مگر اس کے ساتھ ہی حکمران کے لازمی فرائض کا اتنا ذکر نہیں ہوا، اس سے اسلامی حکمران جابر اور استبداد پسند نہیں بن گیا، کیونکہ حشر و نشر اور حساب و کتاب کا عقیدہ نیز حکمران کا بھی قانون اسلامی کے ماتحت ہونا اس پر گرفت رکھنے کیلئے کافی ثابت ہوئے، اس کے یہ معنی نہیں، کہ حکمران کے فرائض پر قرآن مجید نے زور نہ دیا ہو

(ا) فلذلك فادع واستقم كما امرت ولا تتبع اهوآءهم (اس کیلئے) بلا اور (اے محمد) استقامت سے رہ جیسا کہ تجھے حکم دیا گیا ہے، اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کر، بلکہ کہہ: میں ایمان لاتا ہوں ہر اس کتاب پر جو اللہ نے اتاری ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے، کہ تم میں انصاف کرتا رہوں، اللہ ہمارا اور تمہارا آقا ہے ہم کو ہمارے کام اور تم کو تمہارے کام، ہم میں اور تم میں کوئی حجت نہیں، اللہ ہمیں یکجا کرے گا، اور ہمیں اسی کی طرف جانا ہے، (قرآن مجید ۴۲/۱۵)

(ب) فلنسئلن الذين ارسل اليهم ولنسئلن المرسلين تب ہم یقیناً ان لوگوں سے دریافت کریں گے، جن کے پاس ہمارا پیغمبر بھیجا گیا تھا، اور ہم پیغمبروں

---

[1] ایک بحری محاورہ ہے، بادبانوں سے ہوا نکل جائے تو ملاح بے بس ہو جاتا ہے، اس محاورہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ قدیم عربوں کو سمندر سے کتنا لگاؤ تھا،

سے بھی پوچھین گے، (قرآن مجید ۹/۲۴)

متعدد آیتون مین اس پر زور دیا گیا ہے، کہ اجتماعی اور حکومتی مفاد کو انفرادی مفاد پر ترجیح دیجائے، مثلاً قرآن مجید (۹/۲۴ و ۹/۲۸)

یا ایّھا الّذین آمنوا لا تخونوا اللہ والرّسول الخ اے ایمان والو اللہ اور اس کے رسول سے خیانت نہ کرو، اور نہ جان بوجھ کر اپنی باہمی امانتون مین خیانت کرو،

واعلموا انّما اموالکم واولادکم فتنۃ الخ اور یہ جان لو کہ تمھارے مال اور تمھاری اولاد ایک آزمایش ہے، اور خدا ہی کے پاس اجر عظیم پایا جاتا ہے،

مذکورۂ بالا آیتون سے یہ واضح ہوتا ہے، کہ ذاتی مفاد کے لئے یا بیوی بچون کی خاطر بھی ہمین کوئی ایسا کام نہین کرنا چاہئے، جو نامناسب ہو، اور عالم آخرت کے حساب و کتاب کیلئے ہمین اپنے ہر فعل مین اس کا لحاظ رکھنا چاہئے،

ضمناً اس چیز کی طرف بھی اشارہ کیا جا سکتا ہے، کہ "حب ملی" اسلام مین ایک نیم مذہبی، نیم سیاسی وحدت کے تصور پر مبنی ہے، جغرافی یا لسانی یا نسلی وحدت سے اُسے کوئی سروکار نہین، چنانچہ :-

(ا) یا ایّھا النّاس انّا خلقناکم من ذکر وانثی وجعلناکم شعوبًا وقبائل لتعارفوا الخ اے انسانو ہم نے تم کو مرد اور عورتین بنایا، اور تمھین قومون اور قبیلون مین تقسیم کیا، تاکہ تم پہچانے جا سکو، لیکن اصل مین تم مین سے سب سے زیادہ بزرگ خدا کے پاس وہی ہوتا ہے، جو تم مین سب سے زیادہ متقی ہو، علم اور خبر خدا ہی کو حاصل ہوتی ہے، (قرآن مجید ۴۹/۱۳)

(ب) کلّ مؤمن اخوۃ ایمان والے سب آپس مین بھائی بھائی ہین (ایضاً ۴۹/۱۰)

(ج) واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا واذکروا نعمت اللہ علیکم اذ کنتم اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا (اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو اور تفرقہ نہ کرو، اور اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو کہ تم آپس مین دشمن تھے، اور (ایمان لانے کے باعث) اس نے تمھارے دلون مین الفت ڈالدی، اور اس کی عنایت سے تم بھائی بھائی بن گئے، تم تو آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے، اور اسی نے تم کو بچایا) اس طرح اللہ اپنی آیتین تم کو بیان کرتا ہے، تاکہ تم ہدایت پاسکو، اور تم مین سو ایک ایسی قوم پیدا ہو جو بھلائی کی طرف بلائے، اچھی بات کا حکم دے، اور بری بات سے روکے، ایسے ہی لوگ کامیاب ہونگے۔ (ایضاً ۳/۱۰۲)

یہ بیان کرنے کی شاید ہی کچھ ضرورت ہو کہ ایمان اور عمل صالح کی فوقیت کے سوا اسلام حسب و نسب کی کسی برتری کو قطعاً تسلیم نہین کرتا، انبیاء کی اولاد تک "عمل غیر صالح" کے باعث عذاب مین گرفتار ہوئی،

عدل گستری | یہ حکمران کا اولین فریضہ ہے کہ اُسے نا طرفدار ہونا چاہئے، اور انصاف کے ساتھ حسب موقع و ضرورت رحم بھی کرنا چاہئے، (دیکھیے قرآن مجید ۵/۹، ۸، ۵/۴۲، ۱۳۵، ۵/۸، ۶۰/۸) غیر مسلم ذمی رعایا کو عدالتی خود مختاری دینے کا قرآن مجید مین حکم ہے، جہان ان کے اپنے شخصی قوانین کے مطابق فیصلے انجام پائین گے، اگر غیر مسلم رعایا اسلامی عدالت مین اپنی مرضی سے مقدمہ یا مرافعہ پیش کرے، تو اس کے ساتھ بھی انصاف کیا جانا چاہئے (دیکھئے قرآن مجید ۵/۴۲ تا ۵۰) اس بارے میں مزید تفصیل ایک علحدہ مضمون کی متقاضی ہے[۱] البتہ اتنا اور اشارہ

---

[۱] قرآن مجید ۴/۱۱۱ [۲] "عدل گستری ابتدائے اسلام مین" کے عنوان سے ایک مضمون مجلہ عثمانیہ حیدرآباد مارچ ۱۹۳۶ء مین چھپا ہے جس کے حوالے فرانسیسی مولفین سے بھی دئے ہین

کیا جاسکتا ہے، کہ قیامت کی جزاے اعمال، حساب، کتاب، چشم دید گواہ، تحریری شہادت، کراماً کاتبین کی ڈائری وغیرہ کی جو تفصیل قرآن میں آئی ہے، وہ عہدِ نبوی کے مروّجہ امور ہوں گے جن کے ذریعہ سے عالمِ آخرت کا خاکہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے،

مشورائیت | قرآن مجید میں حکم ہے کہ حکمران اپنے فیصلے مشورہ لیکر کیا کرے، چنانچہ :-

(ا) وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ اور اُن سے معاملات میں مشورہ کر پھر جب تو عزم کرے تو خدا پر توکل کر، بیشک خدا توکل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے،

(قرآن مجید ۳/۱۵۹)

(ب) فَمَا أُوتِيتُم مِّن شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَا عِندَ اللَّهِ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ جو کچھ تمھیں دیا گیا وہ دنیا وی زندگی کا ایک حق تمتع ہے، اور بس، ورنہ خدا کے پاس جو چیز ہے، وہ بہتر اور زیادہ پائدار ہے، یہ ان لوگوں کو ملے گی، جو اپنے رب پر ایمان لاتے اور اس پر توکل کرتے ہیں، اور جن کے معاملات باہمی مشورہ سے طے ہوتے ہیں، اور جو اس چیز کو خرچ (خیرات) کرتے ہیں، جو ہم نے اُن کو عطا کی،

(ایضاً ۴۲/۳۶ تا ۳۸)

(ج) طَاعَةٌ وَقَوْلٌ مَّعْرُوفٌ فَإِذَا عَزَمَ الْأَمْرُ فَلَوْ صَدَقُوا اللَّهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ

(مشیروں وغیرہ کے لئے فیصلے کے بعد اطاعت اور فیصلے کے وقت قول معروف ہونا چاہئے اور پھر جب کسی کام کا عزم کر لیا جائے، تو اگر وہ لوگ خدا سے اپنے کئے ہوئے وعدے کو پورا کریں تو انہی کے لئے اچھا ہے،

(ایضاً ۴۷/۲۱)

غرض اگر مشورہ لینے کی ایک طرف پابندی عائد کی گئی ہے، تو دوسری طرف مشورہ کے بعد جو بھی چیز قرار پا جائے اسکی تعمیل کرنا بلا لحاظ اس کے کہ وہ اپنی رائے اور مشورے کے مطابق تھی

یا مخالف ضروری قرار دیا گیا ہے، ساتھ ہی اس کا بھی ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، کہ آخری ذمہ داری چونکہ حکمران پر ہوتی ہے، اس لئے اس کو مشورے کے متعلق حق تنسیخ دیا گیا ہے، جیسا کہ قرآن مجید ۳/۱۵۹ میں بیان کیا گیا ہے،

قانون سازی | قرآن مجید نے نبی کریم صلعم کے ہر قول و فعل کو اُسوۂ حسنہ اور قانون کی حیثیت دی ہے، (دیکھئے قرآن مجید ۳۳/۲۱ تا ۵۳/۴ و ۵۹/۷ وغیرہ) اس حکم کے باعث اسلامی فقہاء یا قانون سازوں کا کام آسان تر ہو گیا، کیونکہ ایک طرف تو جن چیزوں کا ذکر قرآن مجید میں نہ تھا، ان کے لئے حدیث نبوی میں کافی مواد مل گیا، اور دوسری طرف یہ بھی دیکھا گیا، کہ خود رسول کریم صلعم نے نہ صرف یہ کہ قیاس اور استنباط سے کام لیا، بلکہ اسکی صراحت کے ساتھ اجازت بھی دی تھی، جیسا کہ معاذ بن جبلؓ گورنر یمن کے تقرر نامے وغیرہ میں مذکور ہے، اگرچہ قرآن اور حدیث کی قیاس کے ذریعہ سے تنسیخ نہیں ہو سکتی، لیکن قیاس اور تعبیر کی اجازت سے علماء و فقہاء کو انفرادی رائے سے کام لینے کی خاصی گنجایش مل گئی، حتیٰ کہ یہاں تک تسلیم کیا گیا، کہ مجتہد سے غلطی ہونے کے امکان کے باوجود اسکو اس کام سے نہیں روکا جا سکتا، چنانچہ ایک حدیث میں مذکور ہے، کہ "اجتہاد کرنے والا خطا بھی کر سکتا ہے، صواب کو بھی پہنچ سکتا ہے، اور صحیح فیصلہ کی صورت میں اسے دو ثواب ملیں گے اور خطا کی صورت میں ایک ثواب" اس طرح اس کا بھی موقع نکل آیا، کہ ایک مجتہد کے بعد دوسرا مجتہد بھی اجتہاد کرے، اور کسی بہتر نتیجہ پر پہنچنے کے باعث سابقہ مجتہد کا فیصلہ منسوخ قرار پائے، اور خود اجماع کے متعلق بھی فقہاء نے ایسی ہی سہولت تسلیم کی ہے، جب تک ان اجازتوں سے فائدہ اٹھایا جاتا رہا، اسلامی قانون میں زمانہ کا ساتھ دینے کی گنجایش رہی، اور وہ ترقی کرتا رہا، اور جب سے قدیم فقہاء کے فیصلوں کے خلاف اجتہاد کا دروازہ چند لوگوں نے بند کر دیا، تو اس سے قانون اسلامی کو بیحد نقصان پہنچا، لیکن یہ مسئلہ یہاں دائرۂ بحث سے خارج ہے،

جہان بانی کے قواعد قرآن مجید میں اندرونی اور بیرونی سیاست کے قواعد خاصی تفصیل سے ملتے ہیں جن سے حالتِ امن و صلح و غیر جانبداری میں حکمران کی رہنمائی مقصود تھی، رسول کریم صلعم نے خود ایک مملکت قائم کی، اور اس ملک میں جہان ہمیشہ سے رواج سا چلا آرہا تھا، ایک مرکزیت اور ایک مملکت قائم کی، اور عربوں کو خانہ جنگیوں کے ذریعہ اپنی توانائیوں کو ضائع کرنے سے روک کر انھیں اپنے زمانہ میں دنیا کی سب سے بڑی فاتح اور نوآبادکار قوم بنا دیا، اور ان کے ذہنوں سے احساسِ کمتری کو کلی طور پر دور کرکے ان میں وہ صحت و رجذیہ بھر دیا، جسے احساسِ برتری یا احساسِ خودشناسی کہا جا سکتا ہے، اور جو کسی ترقی پذیر قوم کے لئے اس قدر ضروری ہوتا ہے، چنانچہ:-

(ا) کنتم خیر اُمّۃ اُخرجتْ للناس تامرونَ بالمعروف وتنھونَ عنِ المُنکرْ تم وہ بہترین قوم ہو، جو انسانوں کے لئے پیدا کی گئی، تم اچھی بات کا حکم دیتے ہو، اور بُری بات سے روکتے ہو، (قرآن مجید ۳/۱۱۰ نیز ۱۹/۳ و ۸۵/۳)

(ب) اُذِنَ للذینَ یُقاتلونَ وانّھُمْ ظُلِمُوا الخ ان لوگوں کو جن سے لڑا جا رہا تھا (برابر کا جواب دینے کی) اجازت دیدی گئی، کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا تھا،..... یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار عطا کریں، تو وہ خدا کی عبادت کو قائم کردیں، اور زکوٰۃ دیں، اچھی بات کا حکم دیں، اور بُری بات سے روک دیں،

(ایضاً ۲۲/۳۹ تا ۴۱)

(ج) قاتلوھُمْ حتیٰ لاتکونُ فتنۃٌ ویکونَ الدّینُ کلُّہٗ للّٰہ، ان سے اس وقت تک لڑتے رہو، تاآنکہ فتنہ باقی نہ رہے، اور خدا ہی کا دین چھا جائے،

(ایضاً ۸/۳۹)

(د) وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا الخ اے محمد ہم نے تجھے صرف اس لئے بھیجا ہے، کہ تمام لوگون کے لئے بشیر و نذیر بنے، گو اکثر لوگ اسے نہین جانتے، (قرآن مجید ۳۴/۲۸)

غالبًا یہی وہ ایقان یا احساس فرض تھا، جس نے انھیں دنیا مین حکومت الٰہیہ قائم کرنے کے لئے اپنی ہر چیز کو قربان کر دینے کے لئے آمادہ کر دیا، جہاد کا حکم مذکورۂ بالا اور دیگر آیات قرآنی مین ملتا ہے، اس کا منشا، یہ بالکل نہ تھا، کہ دوسرون کی جائداد لوٹی جائے، بلکہ اس کا مقصد صرف یہ تھا، کہ وہ ایک مقدس ترین اور بڑا ایثار طلب فریضہ تھا، کہ اپنی جان جوکھون مین ڈالکر دوسرون کی رہنمائی کرین، اورانکو سیدھا راستہ دکھائین، یہ بار جو محض خدا کی راہ مین تھا اسے اُنھون نے ہنسی خوشی برداشت کیا،

قانون بین الممالک کے خاصے تفصیلی احکام ہمین قرآن مجید مین ملتے ہین، جن پر مختلف مقالے بھی لکھے جاتے رہے ہین[1]، یہان ان کی تفصیل کی گنجایش نہین، صرف اس قدر اشارہ کافی ہوگا کہ قرآن مجید مین انتقامی جنگ (۲/۱۹۰ تا ۹۵) معاہدات کی تعمیل (۹/۴) مدافعت (۲۲/۳۹، ۴۲/۴۱ تا ۴۵) ہمدردانہ جنگ (۴/۹۰) فریق ثانی کی طرف سے معاہدہ شکنی کا خوف (۸/۵۸) مذہبی رواداری (۲/۲۵۶، ۱۰۹/۶، ۱۰۰/۱۰۰) غیر مسلم رعایا سے برتاؤ (۹/۲۹) قیدیون سے برتاو (۴۷/۴ و ۷۶/۸ تا ۹) پناہ جویون کو امن دینا (۹/۶) مفتوحہ اراضی کا انتظام (۵۹/۷) صلح کرنا (۸/۶۱) غیر جانبداری (۴/۸۸ تا ۹۰، ۱۱/۱۲۱ تا ۱۲۳، ۶۰/۸ تا ۹) وغیرہ وغیرہ امور کا اصولی ذکر ملتا ہے،

قومی دولت | کی لایکون دولۃ بین الاغنیاء تاکہ وہ تم مین سے صرف مالدارون

---

[1] چنانچہ اسلامک کلچر حیدرآباد مین جنوری ۱۹۳۴ء و مابعد کے پرچون مین کئی سو صفحون کا ایک طویل مقالہ چھپا ہے، اسکی کتابیات مین سابقہ اہل علم کی کوششون کی بھی تفصیل ہے،

مین گردش نہ کرتی رہے" (قرآن مجید ۵۹/۷)

یہ اسلامی اصولِ دولت عامّہ کا خلاصہ ہے جو قرآن مجید نے پیش کیا ہے، اسلامی معاشیات کے پیشِ نظر یہ چیز رہی ہے، کہ دولت کی ملک کے ہر طبقہ مین تقسیم عمل مین آئے، اور وہ یکجا اکٹھی نہ ہو بلکہ گردش کرتی رہے، معیار سے زائد دولت پر لازمی محصول (یعنی زکوٰۃ) وصیت کرنے کے اختیارات کی تحدید اور کسی شخص کی جائداد سے اسکی وفات پر اس کے قریبی رشتہ دارون کو لازمی طور سے حصہ ملنا، نیز غربا اور محتاجون کے لئے حکومت کی آمدنی مین لازمی طور سے حصہ مقرر کیا جانا۔ یہ اور اس کے مماثل قاعدے قرآن مجید نے مقرر کئے ہین جن سے تقسیم و گردشِ دولت کا مقصد پورا ہوتا ہے اور ساتھ ہی انفرادی ملکیت پر کوئی قید عائد نہ ہونے سے ہر شخص کو اپنے قوائے فطری سے زیادہ سے زیادہ کام لینے کی ترغیب ہوتی رہتی ہے، اور سود کی ممانعت اور قرضہ ہائے حسنہ کا انتظام جو قرآن مجید نے کیا ہے، وہ اسلامی قواعدِ معاشیات کو ایک مکمل نظام کی حیثیت دیدیتے ہین، جو نہ تو سرمایہ داری ہے اور نہ اشتراکیت، بلکہ اس مین ان دونون کی خوبیان ہین، اور ساتھ ہی دونون کی برائیون سے اس نظام کو محفوظ رکھنے کا انتظام کر دیا گیا ہے،

اخلاقِ عامّہ میرے نزدیک مذہب اور سیاست دونون ایک دوسرے سے ممتاز عمل ہین، ان کو ایک سمجھنا غلطی ہے، مذہب انسان اور خالق کے تعلق کا نام ہے، اور سیاست بندون کے باہمی تعلقات کے لئے برسرِ کار ہوتی ہے، لیکن اگر ان دونون مین کوئی رابطہ اور حلقۂ اتصال نہ پیدا کیا جائے تو انسانیت کو لامحدود نقصان پہنچ جاتا ہے، اسلام نے اس کا ایک حل تلاش کر لیا، اور اس کو کامیابی سے عمل میں لاکر بھی دکھایا، اور وہ یہ تھا کہ اگرچہ مذہب اور سیاست دونون کے دائرہ ہائے عمل بالکل جدا جدا ہین، لیکن دونون کے قواعد کا ماخذ ایک ہی چیز کو قرار دیا گیا، چنانچہ مسلمانون کا مذہب اور مسلمانون کی سیاست دونون کی رہنمائی قرآن و حدیث، اصولِ انصاف و استحسان

اور ہم آہنگیٔ ضمیر سے ہوتی ہے،

سیاسی اصطلاحات اسلامی اداراہائے سیاست نے اپنی بہت سی اصطلاحین قرآن مجید ہی سے لی ہین، چنانچہ امت اور ملت سے سیاسی جماعت مراد ہوتی ہے، خلیفہ اور امام اس جماعت کے سردار کا نام ہوتا ہی، (دیکھئے قرآن مجید ۲/۲۲ نیز سیرۃ ابن ہشام ص ۳۴۱ میں رسول کریم صلعم نے شہر مدینہ کے لئے ہجرت کے بعد جو دستورِ مملکت نافذ فرمایا تھا، اور جس کا پورا متن خوش قسمتی سے ہم تک پہنچ چکا ہے، اس کی دفعہ (۲) مین بھی انہی اصطلاحات کو استعمال کیا گیا ہے، لفظ خلیفہ کے لئے دیکھئے قرآن مجید ۲/۳۰ اور لفظ امام کے لئے ۲/۱۲۴،

جانشینی لفظ خلیفہ کے ساتھ ہم جانشینی کے خار دار مسئلہ سے دوچار ہو جاتے ہین، یہی وہ مسئلہ ہے جس نے تیرہ سو سال سے مسلمانون کو دو بڑی متخاصم جماعتون مین تقسیم کر دیا ہے، جو اسلام رسول کریم صلعم اپنی امت کے لئے لائے تھے، اور جس کی آپ عمر بھر تبلیغ کرتے رہے، اس کے بنیادی اصولون مین کہین بھی اس کا ذکر نہین ہے، کہ آپ کی جانشینی کے لئے کیا اصول ہو، اور اس اصول کا ماننا اس سے بھی کم ایک جزء عقیدہ امر بن سکتا ہے، لیکن بدقسمتی سے اس کے بالکل برعکس صورت حال پیدا ہو گئی، اور ہر دو فریقون کے ہان غلو رکھنے والے خیالات بھی پھیلتے رہے، حالیہ زمانہ مین ایک حل جو اس کے لئے سوچا گیا ہے وہ سنجیدہ غور کا مستحق ہے، وہ یہ کہ سُنّی اور شیعہ دونون اس امر پر متفق ہین کہ تاریخی واقعہ کی حیثیت سے جناب رسالت مآب صلعم کے بعد حضرت علیؓ پہلے خلیفہ نہین ہوئے، اسی طرح شیعہ اور سُنّی دونون ہی اس پر متفق ہین کہ روحانی امور مین حضرت علیؓ جناب رسالت مآب صلعم کے خلیفہ بلافصل[1] ہین، چنانچہ چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ وغیرہ قریب قریب

---

[1] معارف: خلیفہ بلافصل کے معنی گویا یہ ہوئے کہ جس نے براہ راست مشکوٰۃ نبوت سے فیض پایا ہو، اس معنی کے لحاظ سے تمام اکابر صحابہ خلفاء بلافصل تھے، اور عالم روحانی مین تعدد خلفاء بلافصل ممنوع نہین،

تمام صوفی سلسلے اسی کو مانتے ہیں[1] اب رہا یہ امر کہ حضرت علیؓ کو سیاسی جانشینی کا بھی استحقاق تھا یا نہیں، یہ ایک خالص علمی مسئلہ رہ جاتا ہے، جس کو آئے دن کی روزمرہ سیاسی زندگی پر اب تیرہ سال بعد اثر انداز کرنے کی کوئی ضرورت نہیں رہتی،

جس طرح ایک نبی کے بعد دوسرے نبی کے آنے تک اوّل الذکر ہی کی شریعت باقی رہتی ہے، اسی پر قیاس کرکے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک حکمران کی وفات کے باوجود اس کے جانشین کے انتخاب تک اوّل الذکر ہی کا اقتدار جاری رہتا ہے، اور اسی کے مقرر کردہ افسر اپنے فرائض منصبی انجام دیتے رہنے کے پابند ہیں، چنانچہ :-

کَانَ اَبُوْحنیفۃ یقول اذا مات	امام ابوحنیفہ فرماتے تھے، اگر خلیفہ
الخلیفۃ فالقاضی علیٰ قضائہ	کا انتقال ہو جائے، تو قاضی اپنی
والوالی علیٰ ولایتہ حتی یغیرہ	قضاءت پر اور والی اپنی حکومت
القائم بعدہ، (مناقب ابی حنیفہ	پر باقی رہتا ہے، جب تک خلیفہ کا
للموفق ج ۱ صفحہ ۸۸)	جانشین اسے بدل نہ دے،

اسی مسئلہ کو قاتل حضرت عمرؓ کے بعض بے گناہ ہم وطنوں کی شہادت اور ان شہداء کی عدم دادرسی کے افسوسناک تاریخی واقعہ کے باعث تھوڑی سی اہمیت تھی، اس لئے اس کا بھی ذکر کر دیا گیا،

یہ سرسری خاکہ زیادہ قابل اہل علم کے لئے دعوت ہے، کہ اس اہم موضوع پر توجہ کرکے ملک و ملت کی رہنمائی کریں، وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین،

---

[1] اور یوں بھی عالم مادی میں "دو شاہان در اقلیمے نہ گنجند" صحیح ہو تو ہو عالم روحانی میں ایک سے زیادہ خلیفہ بلا فصل ہونے میں کوئی مانع نہیں،

تیموری شاہزادون کا علمی ذوق

از

جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب ایم اے رفیق دار المصنفین

(۳)

شجاع و مراد شاہجہان کے لڑکون مین تخت و تاج کے لئے جو خونریز جنگ ہوئی، اس مین مورخین شجاع اور مراد کا عبرتناک انجام دکھانے مین اس قدر محو ہوگئے، کہ ان دونون کے علمی فضل و کمال کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے، حالانکہ شاہجہان کے دو لڑکے دارا اور اورنگزیب جس تعلیم و تربیت کی بدولت آسمانِ علم پر مہر و ماہ بن کر چمکے، ظاہر ہے کہ اس سے شجاع اور مراد بھی ضرور فیضیاب ہوئے ہون گے، مگر جس طرح وہ صفحۂ ہستی سے مٹا دئے گئے، اسی طرح ان کے علمی اوصاف بھی صفحۂ تاریخ سے گم کر دیئے گئے، لیکن ان دونون کی علمی قابلیت ان کے رقعات سے اُن کی علم نوازی کا حال ان کے درباری شعراء اور متوسلین سے معلوم ہو سکتا ہے، شجاع اور مراد کے رقعات مختلف کتابون مین جستہ جستہ ملتے ہین، ان کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے، کہ وہ اورنگزیب اور دارا کی طرح گو بلند پایہ ادیب اور انشاء پرداز تو نہ تھے، پھر بھی انکی تحریرون مین اس زمانہ کے ذوقِ ادب کی پوری چاشنی ضرور ہے،

شجاع اور مراد دونون شعراء اور اربابِ کمال کے قدردان اور سرپرست تھے، ملا محمود جونپوری شاہجہانی عہد کے بہت ہی ممتاز عالم تھے، فلسفہ مین ان کی تصنیف شمس بازغہ اور معانی

دبیان میں فوائد فی شرح الفوائد اب تک بلند پایہ سمجھی جاتی ہے ۱۰۶۲ھ میں جب ان کا انتقال ہوا، تو ان کے استاذ مولانا محمد افضل جونپوری پر اتنا اثر ہوا کہ شاگرد کی وفات کے بعد ان کے لبوں پر کسی نے مسکراہٹ نہیں دیکھی، اور کل چالیس روز کے بعد وہ بھی شاگرد سے جاملے[1]، شجاع ملا محمود جونپوری کے فضل و کمال سے فیضیاب ہونا چاہتا تھا، اسلئے ان کو اپنے دربار آنے کی ان الفاظ میں دعوت دی جس سے اس کے دل میں ان کی عزت و احترام کا اندازہ ہوتا ہے:

"افادت و افاضت پناہ فضائل و کمالات دستگاہ ملا محمود بعنایت بے غایت خسروانی ممتاز گشتہ بداند کہ چون بمیامن برکاتِ الٰہی خاطرِ فیض مآثر ما ہموارہ متوجہ آن ست کہ ارباب علم و حکمت و اصحاب دین و ملت از ملتزمان محفل فیض منزل بودہ، دقائق علمی و حکمی را بوقتِ عرض می رسانیدہ باشند و آنچہ بر ضمیر الہام پذیر ما کہ آئینہ صور غیبی و گنجینہ اسرار لاریبی است پرتو انداختہ باشد، بآن جماعت می فرمودہ باشیم تا کار ہا بر وفق احکام الٰہی و سنت نبوی بعمل می آمدہ باشد بنابران از روے مہربانی یاد آن دانش آگاہ حقائق انتباہ نمودہ طلب فرمودہ ایم کہ بدرقۂ الطاف سلطانی طریق سعادت پیمودہ خود را بشرف حضور تمام فیض سراسر سعادت معزز گرداند بعد ازان کہ بشرف اندوز ملازمت گردد و چندے فیض ظاہر و باطن از حضور معلّی بر گیرد اگر خواہد بوطن معاودت نماید، او را مشمول عنایات و مورد توجہات فرمودہ رخصت انصراف ارزانی خواہیم داد، و اگر خواہش بودن درین آستانِ سلطنت آشیان داشتہ باشد، بنوعے کہ باطمینان دل وذوقِ خاطر گذراند، در بابِ او توجہ مبذول خواہیم داشت، باید کہ بمجرد وصول این منشورِ کرامت و افضال بے توقف و دغدغہ روانہ عتبہ بوس گردد و در عہد شناسد[2]"

---

[1] تذکرۃ العلماء، ص ۲۲۱، [2] رقعاتِ عالمگیر مرتبہ سید نجیب اشرف ندوی ص ۳۳۲،

فارسی سخنگویوں میں شیخ منعم لاہوری[۵۱] اور ہندی شعراء میں چنتامن ساکن کوڑہ جہان آباد شجاع کے مقربین خاص میں تھے، چنتامن اپنے عہد کا بہت ہی مشہور سنسکرت کا عالم تھا، اسکی ہندی شاعری کا مجموعہ "کبت بچار" کے نام سے موسوم ہے، اس میں سلطان زین الدین محمد بن شاہ شجاع کی مدح میں بھی بہت سی کبتائیں ہیں[۵۲]

شاہزادہ مراد کا سب سے محبوب شاعر سعید قریشی تھا، جو ملتان کا باشندہ تھا جب مراد کو گجرات کی نظامت تفویض ہوئی، تو سعید قریشی بھی اس کے ساتھ گیا، اور اپنی بذلہ سنجی، شیریں بیانی اور شعر گوئی کی بدولت مراد کی نگاہوں میں اتنا چڑھا کہ دربار کے تمام امراء اس پر فریفتہ ہوگئے، مرآۃ الخیال کا مصنف اسکی تعریف میں یوں رطب اللسان ہے،

"بیان بزرگی صوری و شرح حالت معنوی و ذکر وسعت مشرب و اظہار محاسن شیم و ابراز مکارم اخلاق و ادائے کشادگی پیشانی و تقریر بے تعینی وقت و تحریر استعداد سخنش زبان قلم و قلم زبان برنتابد"

"اوائل ملازمت میں ایک روز سعید قزینی مراد کے دربار میں پہونچا، تو داروغہ غسلخانہ نے جو یکے از چیلہ بابو" اندر آنے کی اجازت نہ دی، سعید قریشی نے فوراً یہ رباعی لکھکر مراد کے پاس بھیجی :

اے شاہ جنابت چو جناب اللہ است ہر حکم تو چون حکم کتاب اللہ است
این چیلہ دیو فعل مانع درت ابلیس صفت مانع باب اللہ است

مراد رباعی پڑھکر بہت محظوظ ہوا، اور سعید قریشی کو زنانخانے کے علاوہ ہر جگہ آنے جانے کی اجازت دیدی

---

۵۱ ان کی شاعری کے نمونے کے لئے دیکھو مخزن الغرائب قلمی نسخہ ص ۴۰۸ دار المصنفین اعظم گڈھ

۵۲ مآثر الکرام جلد دوم ص ۳۲۶

ایک بار عید اضحیٰ کے موقع پر مراد اپنے ہاتھوں سے بکرا ذبح کر رہا تھا، بکرے کی آنکھوں پر پٹی بندھی تھی، مراد نے بکرے کی آنکھ دیکھی، پھر اس کی نظر سعید قریشی کی طرف اٹھی، سعید قریشی نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا،

عید قربانست دمی خواہم کہ قربانت شوم ہمچو چشم گوسپند کشتہ حیرانت شوم

ایک مرتبہ عید الفطر کے موقع پر مراد کی سواری عیدگاہ جا رہی تھی، سعید قریشی مجرا کے لئے حاضر ہوا مراد نے اس سے دریافت کیا، کہ عید الفطر کی تہنیت میں اس نے کچھ کہا ہے، یا نہیں اتفاق سے سعید قریشی نے کچھ نہ کہا تھا، یہ پوچھنے کے بعد مراد نماز میں مشغول ہو گیا، سعید قریشی کو موقع مل گیا، اس درمیان میں اس نے ایک غزل تیار کر لی، مراد نماز پڑھ چکا تو سعید نے غزل پیش کی، مراد شراب کا بڑا دلدادہ تھا، اس غزل میں اسکی خاص رعایت رکھی ہے،

روز عیدست لب خشک مے آلودہ کنید چارۂ کار خود ای تشنہ لبان زود کنید
دیر گاہیست کہ از دیر مغان دوریم زود باشید کہ جام زر اندود کنید
شربت حب نبات لب جان بخش ایاز نوش دارو دی دل خستہ محمود کنید
حرف بے صرفہ و اعظ نتوان کرد بگوش گوش بر زمزمۂ چنگ و نے و عود کنید
ہست بہبود شما بندگی شاہ مراد بہتر آنست کہ اندیشۂ بہبود کنید
شیوۂ صدق چو سرمایہ ہر سود بود ہست امید کہ این شیوہ بسے سود کنید

پدرش یافت رہ از طالع مسعود سعید
سعی در یافتن طالع مسعود کنید[1]

شاہزادہ مراد نہ صرف غزل سے محظوظ ہوا بلکہ سعید قریشی کی اس بدیہہ گوئی پر بھی

[1] مراۃ الخیال ص۲۶۳

حیرت کا اظہار کیا،

مراد کی رندی اور اس کے دربار کی رنگینیون کی خبر شاہجہان کو پہونچی تو اوس نے اپنے ایک ہوشمند اور زیرک امیر علی نقی کو مراد کی نگرانی کے لئے بھیجا، علی نقی سعید قریشی کو ناپسند کرتا تھا، اس لئے دونون مین اتنا عناد بڑھا کہ سعید قریشی کی جان کے لالے پڑگئے، چنانچہ ایک رات مراد کو اطلاع کئے بغیر گجرات سے نکل بھاگا، مراد کو خبر ہوئی تو اسکی جدائی گوارا نہ کرسکا، اور اسکو واپس بلانے کے لئے قاصد دوڑائے، لیکن سعید قریشی نے واپس آنے کے بجائے یہ غزل معذرت مین لکھ بھیجی،[1]

مشکل بود بکوی تو دیگر نشست ما — پیچیدہ است زلف تو بہر شکست ما
چون سبزہ در رہ تو بجز پافتادگی — اے سرو من بگو کہ چہ آید زدست ما
در دم کہ بار قیب تو خاطر نشان کند — جز تیر بے خطا کہ برآمد زشست ما
دل بستہ در خیال میان جان بہ بند زلف — سد سکندری شد ازین بند و بست ما

فارغ زدین و کفر شدہ بعد ازین سعید
ما و سر نیاز و بت خود پرست ما

سلطان محمد یہ اورنگزیب عالمگیر کا سب سے بڑا لڑکا اور نواب بائی کے بطن سے تھا، اورنگزیب ایک شفیق اور دور اندیش باپ کی طرح اپنے لڑکون کی اعلیٰ تعلیم و تربیت کے لئے ہمیشہ کوشان رہا تاکہ اس کے بعد اس کی وسیع اور عظیم الشان سلطنت کا جانشین لائق اور ہوشمند شخص ہو، مگر اسکی یہ کوشش بارآور نہیں ہوئی، سلطان محمد کو مختلف رقعات مین سفر و حضر کی حالت مین سونے جاگنے نہانے دھونے کھانے اور پینے، نماز اور وظائف مین مشغول ہونے، لکھنے پڑھنے اور شکار کھیلنے، دربار منعقد کرنے یہانتک کہ اٹھنے بیٹھنے، امراء سے ملنے جلنے اور فوجون کے معائنہ کرنے وغیرہ کا لائحہ عمل لکھتا

[1] مرآۃ الخیال ص ۲۶۳

رہتا تھا، اس میں خاص اوقات میں کلام پاک کی تلاوت اور عربی زبان کے مطالعہ کی بھی تاکید ہے، مگر سلطان محمد کو تعلیم سے زیادہ شکار سے دلچسپی تھی، اس لئے اورنگزیب کبیدہ خاطر ہو کر اس کو لکھتا ہے:-

"ما ازیں کہ ایشاں را پیش از وقت در خدمتِ خود بشکار بردہ ایم تاسف داریم، چہ آن بلند اقبال تا لذتِ شکار یافتہ اند، از اکتسابِ کمالات از خواندن و نوشتن و مانندِ آن دست باز داشتہ، چندان رغبتے باین امور ندارند ایشاں را چون خواہم گذاشت کہ بدیں شغل از کسب کمال باز مانند"

سلطان محمد کو اورنگزیب کی خاص ہدایت تھی، کہ وہ ترکی زبان سیکھ کر اس میں بول چال کی مہارت پیدا کرے، کیونکہ مغل فوج میں ترکی النسل سپاہی اور افسروں کی تعداد کافی ہوتی تھی، اس لئے ان سے براہِ راست تعلق رکھنے کے لئے ترکی زبان کا سیکھنا تیموری شاہزادوں کے لئے ضروری تھا، مگر سلطان محمد کو اس زبان سے رغبت نہ تھی، چنانچہ جب وہ شمالی ہند کی ایک مہم پر روانہ ہوا تو ترکی کے استاد کو ساتھ نہ لے گیا، اورنگزیب کو یہ ناگوار ہوا، اس نے غصہ کی حالت میں ایک خط لکھا، کہ استاد کو اپنے پاس بلا کر ترکی میں گفتگو کرنے کی مشق جاری رکھے، سلطان محمد نے اپنے استاد کی پیری اور ناتوانی کا عذر پیش کر کے اغماض کرنے کی کوشش کی مگر اورنگزیب نے قبول نہ کیا، اور دوبارہ ایک غضب آلود رقعہ لکھا،

"پیری و ناتوانی او عذر نمی شود، واگر باشد، عذر بے فراست، آن جوان بخت در حضر نیز او را معدوم انگاشتہ درین یکسال کہ او نوکر است و مبلغہا در وجہ مواجب از سرکار نامدار یافتہ اصلا التفاتے بخواندن ترکی نداشتند وجہ بجہت عالی از تعین معلمان کسب کمالات ایشان است؟ الا این ہمہ ممنونیتِ آن مردم چرا بایستے کشید؟ ہرگاہ آن والا گہر قدر این

عواطف ندانستہ و فرصت را مغتنم نداشتہ در تحصیل امورے کہ سبب آراستگی و کمال نفس انسانیت و ابناے سلاطین را پیرایہ خوشتر از ان نیست رغبت نہ نمایند، ما را چہ زیان؟ الحال کہ بہ ہوش آمدہ اند و نیک را از بدی شناسند، در آنچہ بہبود ایشاں باشد خود کوتاہی نخواہند نمود۔"

اورنگزیب سلطان محمد کو فارسی تحریر و تقریر کی مہارت اور پاکیزگی کی بھی برابر ہدایت کرتا رہتا تھا، اور اس لئے خاص خاص کتابوں خصوصاً اکبرنامہ کے مطالعہ کی تاکید کرتا تھا ایک رقعہ میں ہے،

"اگر در نوشتن احتیاط نرود و عبارت مطابق آداب و قاعدہ نباشد جاے انفعالی است در اوقات فرصت بمطالعۂ کتب نیز عی الخصوص اکبرنامہ پرداختہ از مشق انشا غافل نہ گردند، و ہمگی جہد مصروف آن سازند کہ تقریر و تحریر پاکیزہ و پسندیدہ شود و تا معانی الفاظ و ربط مناسب آن بوا نمی خاطر نشان نہ گردد، در گفتن و نوشتن بکار نبرند و ہر چہ بگویند و بنویسند باید کہ فہمیدہ و سنجیدہ باشد۔"

چنانچہ سلطان محمد نے اکبرنامہ کا مطالعہ شروع کیا، اور جب اورنگزیب کو خط لکھا تو اکبرنامہ کے مصنف کی تقلید میں بسم اللہ کے بجاے "اللہ اکبر" اور جل جلالہ" تحریر کیا، اورنگزیب کو یہ ناگوار ہوا تو اس نے تنبیہ کی،

"مقصود از خواندن اکبرنامہ شیخ ابوالفضل تتبع عبارت آن کتاب است نہ اتباع مذہب مصنف کہ از وے بدعت اسلوب مسنون را تغیر دادہ ....."

سلطان محمد نے اکبرنامہ کی تقلید میں اپنے عریضہ کو "نشان والا" اور مہر کو "مہر خاص" لکھا تھا، اورنگزیب نے اس پر بھی نمایش کی، کہ یہ الفاظ شاہی رقعہ اور مہر کے لئے خاص ہو چکے ہیں

ایک بار سلطان محمد نے اورنگزیب کو لاپروائی مین خراب کاغذ پر بُرے مسطرین رقعہ لکھدیا اورنگزیب نے اوس کو ڈانٹ کر لکھا،

"ہرچہ بنویسند دست نگاہ داشتہ بر کاغذے لائق می نوشتہ باشند بے پروائی حُسن خط را برہم نزنند"[۵۱]

مگر افسوس ہو کہ اورنگزیب کی یہ ساری تربیت رائگان گئی، اور سلطان محمد عنفوانِ شباب ہی مین دنیا سے چل بسا۔

اکبر و کام بخش شاہزادہ اکبر ملکۂ دلرس بانو کے بطن سے تھا، ۱۶۸۰ء مین راجپوتون کے خلاف جنگ مین مشغول تھا کہ ان کے ورغلانے پر باپ سے منحرف ہو کر باغی ہو گیا، اور جب اسکی بغاوت ناکام رہی تو وہ ہندوستان سے بھاگ کر ایران چلا گیا، اور وہان ۴۸ سنہ جلوس عالمگیری مین فوت ہوا، عالمگیر اس کی دو باتون کا مداح تھا، ایک یہ کہ اوس نے نماز باجماعت کبھی قضا نہین کی، دوسرے مذہب کا اتنا دلدادہ تھا کہ مذہبی جوش مین مخالفینِ ملت سے کبھی خوفزدہ نہین ہوا[۵۲]

کام بخش اودے پوری کے بطن سے تھا، عالمگیر کے ۲۰ ویں سالِ جلوس مین حفظِ کلام اللہ کی سعادت حاصل کی، عالمگیر نے اس خوشی مین اسکو خلعت و اسپ با ساز طلا، و سرپیچ مرصع و مالائے مروارید و سپر با گل مرصع و ترکش با کمان عطا کئے[۵۳]، مآثر عالمگیری کے مصنف کا بیان ہے کہ تحصیلِ علوم مین اپنے تمام بھائیون پر سبقت لے گیا تھا، اوس کو ترکی زبان مین خاص مہارت حاصل تھی، اور مختلف اقسام کے خطوط کی کتابت مین استاذ زمانہ تھا[۵۴]

---

[۵۱] رقعاتِ عالمگیر ص ۸، ۲۷ [۵۲] مآثر عالمگیری دار الترجمہ عثمانیہ ص ۳۹۳ [۵۳] ایضاً ص ۱۰۸، [۵۴] ایضاً ص ۳۹۴،

اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت کی تاریخ جنگ و جدل اور انتشار و اختلال کی ایک داستان ہے، مورخین ان خون آشام واقعات کو قلمبند کرنے مین ایسے محو ہو گئے ہین کہ ان کی ساری توجہ بادشاہ وقت اور امرا کی سیاست اور ریشہ دوانیون مین الجھ کر رہ گئی ہے اسلئے ان شاہزادون کے علمی حالات پر تاریکی کے پردے پڑ گئے ہین، حالانکہ اورنگزیب کے پوتے شہزادہ عظیم الشان کے بارے مین عام طور سے مشہور ہے، کہ جب اوس نے اشوک کے دارالسلطنت پاٹلی پتر اور شہر پٹنہ کو عظیم آباد کے نام سے مستقر حکومت بنایا، تو اس عہد مین عظیم آباد شاہجہان آباد ہی کی طرح سیاسی اور علمی حیثیت سے نمایان ہو گیا تھا، مگر اس زمانہ کی علمی مجلسون کے غلغلے مستند متداول تاریخون مین بلند نہین ہوئے، اس لئے شہزادہ عظیم الشان کے علمی کارنامون پر اعتبار و وثوق کے ساتھ روشنی نہین ڈالی جا سکتی،

آخری شاہان تیموریہ سے اکبری جاہ و جلال، شاہجہانی سطوت و شہامت اور عالمگیری تدبر و ہوشمندی رخصت ہو چکی تھی، اسی کے ساتھ وہ اپنی زبان بھی کھو بیٹھے تھے، محمد شاہ کے زمانہ سے دربار مین عام چہچہا اردو زبان ہی کا رہنے لگا، اور زمانہ کے عام مذاق کے مطابق دربار کے شہزادے اسی زبان مین غزل گوئی کی مشق کرنے لگے، غزل گو شہزادون کی تعداد بہت ہے، لیکن ہم مثال کے طور پر صرف دو چار ایسے شہزادون کا ذکر کرنا چاہتے ہین، جن کی سخنگوئی اور علم نوازی کا حال بعض مستند تذکرہ نویسون نے بھی لکھا ہے، لیکن ان شہزادون کے علمی ذوق پر روشنی ڈالنے سے پہلے ایک ایسے باکمال شہزادہ کا ذکر ضروری ہے، جو اگرچہ تخت و تاج کے وارثون مین تو نہ تھا، لیکن علمی حیثیت سے تیموری خاندان کا نہایت ممتاز شہزادہ تھا،

میرزا علی بخت بہادر محمد ظہیر الدین اظفری گورگانی

یہ مرزا علی بخت بہادر محمد ظہیر الدین اظفری گورگانی ہے، یہ شاہ عالم بادشاہ کا ہم جد اور اورنگزیب عالمگیر کی پوتی نواب عفت آراء

بیگم کا زمانہ تھا ۱۱۷۲ھ مین قلعہ معلی دہلی مین پیدا ہوا، اور وہین تعلیم و تربیت پائی، یہ وہ زمانہ تھا جب مغلیہ سلطنت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا، بادشاہ وقت اور شہزادے محض ایک بیغیر اسلامی حکومت کے وظیفہ خوار اور نظر بند تھے، اظفری بھی قلعہ معلی دہلی مین ایک قیدی کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہا تھا، مگر کچھ عرصہ کے بعد خفیہ طور سے وہاں سے فرار ہو گیا، اور جے پور، جودھپور وغیرہ ہوتے ہوئے لکھنو پہنچا، نواب آصف الدولہ نے اسکی بڑی پذیرائی کی، اظفری لکھنؤ مین سات سال تک رہا، وہان سے مدراس پہونچا، اور یہین ۱۲۳۴ھ مین سپرد خاک ہوا،

اظفری کو عربی فارسی اردو اور ترکی چاروں زبانون مین مہارت تھی، آخر عمر مین مدراس پہنچکر انگریزی بھی سیکھ لی تھی، مختلف علوم و فنون مثلاً طب، رمل، عروض، قافیہ اور خصوصاً فن شاعری مین دسترس رکھتا تھا، فارسی اردو اور ترکی مین صاحب دیوان بھی تھا، مگر افسوس ہے، کہ اس کا فارسی اور ترکی دیوان مفقود ہے، اس کا اردو دیوان مدراس یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہوا ہے، یہ سطور لکھتے وقت اسکی ایک تالیف "واقعات اظفری" پیش نظر ہے، جس کا اردو ترجمہ مدراس یونیورسٹی نے شائع کیا ہے، اس کتاب مین اظفری نے اپنے سفر کے علاوہ قلعہ معلی کے بہت سے حالات لکھے ہین، اس لئے یہ کتاب تاریخی اور جغرافی حیثیت سے بھی اہم ہے، اس مین شاہ عالم کے زمانہ کے بہت سے ایسے حالات درج ہین، جو عام سیاسی تاریخون مین نہین ملتے، نظر بند شہزادون کے عادات و اطوار، رسم و رواج، جادو منتر اور عملیات کے متعلق بھی بہت سے معلومات ہین، پھر قلعہ سے فرار ہونے کے بعد اظفری نے جن جن مقامات کی سیر کی وہاں کی عجیب چیزون، رسم و رواج اور معتقدات کا بھی ذکر کیا ہے، آخر مین اپنی مختلف تالیفات کا ذکر ان الفاظ مین کیا ہے:-

"اپنے قیام لکھنو کے زمانہ مین مین نے کامل ایک سال کے اندر ایک ترکی چغتائی

لغت کی کتاب تالیف کی جس میں قدیم مؤلفین کے طرز کے خلاف تفصیل کے ساتھ بہت آسان طریقے پر نئے نئے فوائد لکھے ہیں،

ایک مہینہ میں نسخہ "محبوب القلوب" کا مقفی نثر میں فارسی زبان میں ترجمہ اور کچھ اس پر اضافہ کیا ہے، اصل کتاب میر نظام الدین علی شیر متخلص بہ نوائی کی تصنیف اور ترکی زبان میں ہے،

ایک ہفتہ میں "نصاب ترکی" صنعت مقلوبات میں مرتب کی، جس میں دو سو بیس شعر ہیں"

تین روز میں امیر خسرو کی "خالق باری" کے جواب میں اسی وزن پر ایک مختصر رسالہ ترکی اور ہندی زبان میں مرتب کیا، اس میں ساڑھے چھ سو شعر ہیں، اور اس کا نام میں نے "تنکری تاری" رکھا ہے،

حکیم حسین رضا خان کی استدعا پر جو ہماری سرکار کے ملازم ہیں، چند ہفتوں کے اندر بقراط کے "رسالہ قبریہ" کا فارسی میں ترجمہ کیا، پھر اُسے نظم کا لباس پہنایا، یہ رسالہ عربی زبان میں مریضوں کی ردی علامتوں کے بیان میں ہے،

اس کے بعد "نسخہ سانحات" کی تالیف میں مشغول ہوا جس میں میری اکثر نصیحتیں اور تنبیہیں مذکور ہیں، اب تک اس میں ایک سو نو سانحے درج ہو چکے ہیں،

جس وقت میں عظیم آباد پہونچا تو رائے ٹیکا رام کی خواہش پر سات دن کے اندر ایک اور کتاب "نصاب ترکی چغتائی" تصنیف کی، جس میں چار سو بادن اشعار ہیں، رائے ٹیکا رام ہمارا موروثی خانہ زاد ہماری سرکار کا بخشی..... ہے،

جب میں مقصود آباد میں وارد ہوا تو..... مرزا جان تپش کی خواہش پر اپنے واقعات کی تالیف شروع کی (واقعات اظفری مراد ہے)

مرزا جہاندار شاہ شاہ عالم ثانی کے جن لڑکوں نے باپ سے شعر و شاعری کا ذوق ورثہ مین پایا، ان کے نام حسب ذیل ہین:

مرزا جہاندار شاہ، مرزا احسن بخت، مرزا سلیمان شکوہ، مرزا فرخندہ بخت جہان شاہ،

شاہ عالم نے مرزا جہاندار شاہ کو ولی عہد بنایا تھا، مگر اوس نے عالم شباب مین سفر آخرت کیا، واقعات اظفری، طبقات الشعرا، مجموعہ نغز، تذکرہ ہندی اور گلزار ابراہیم، گلشن بے خار مین اس شاہزادہ کا ذکر شاعرون کی فہرست مین اچھے الفاظ مین کیا گیا ہے، واقعات اظفری کے مصنف کا بیان ہے، کہ یہ شاہزادہ جہاندار شاہ بہت بذلہ سنج، ظریف اور شوخ طبع تھا، اوس کے اردو اشعار مین بڑی شوخی ہوتی تھی، موسیقی سے بھی ذوق رکھتا تھا، فارسی اور اردو دونون زبانون مین جہاندار تخلص کرتا تھا،

طبقات الشعرا مؤلفہ قدرت اللہ شوق سنبھلی مین ہے:-

"جوانی بود مجمع قابلیت و اہلیت ..... جدت ذہن و جودت طبع و فہم رسا و فکر بجا داشت و اشعار فارسی و ہندی ہر دو را موزون می ساخت"

قدرت اللہ قاسم نے اسکو شیرین گفتار لکھا ہے، گلزار ابراہیم کے مصنف نے اس کے جود و سخا کے بیان مین بڑی تر زبانی دکھائی ہے، یہ شاہزادہ ۱۱۹۰ھ مین دہلی سے لکھنؤ آیا، اور یہان آکر اوس نے جو علمی بزم سجائی اس کا حال گلزار ابراہیم مین اس طرح ہے،

"اس شاہزادہ عالی تبار کی طبیعت شعر کی طرف اس قدر آئی تھی کہ ہفتے میں دو تین بنا مشاعرے کی اپنے دولت خانہ مین ٹھہرائی تھی، شعرائے باوقار کو اپنے چوب دار بھیج کر مشاعرے کے دن بلواتے، اور ہر ایک شخص سے نہایت الطاف اور عنایت کے ساتھ گرم جوشی فرماتے، چنانچہ راقم حقیر کو جب یاد فرمایا، تو اس سمجھدان نے یہ

عذر کہ بھیجوایا کہ کمترین نے مشاعرے کا جانا مدت سے موقوف کیا ہے، ازبس کہ ان صحبتون مین مناظرہ ہی کو یاران عالی حوصلہ نے رواج دیا ہے، اگر ارشاد ہو تو سوائے مشاعرے کے ایک دن بندگی مین حاضر ہون، اور اس تخم ناکاشتنی بے مغز کو موافق ارشاد کے زمین عرض مین بو دون، پذیرا نہ ہوا، اور پھر چو بدار آیا، اور یہ ارشاد فرمایا کہ تیرا حاضر ہونا مشاعرے مین نہایت ضرور ہے، مناظرہ کا مطلق ہمارے یہان نہیں دستور ہے غرض لیماسے نواب آصف الدولہ مرحوم کے حاضر ہوا، اور شرف سعادت ملازمت کا حاصل کیا، مکرر غزلین اس دن ازراہ تفضلات کے پڑھوائین، اور ہر شعر پر کیا کہون کہ کیا کیا عنایتین فرمائین، پھر اپنی طبع زاد سے بہت کچھ ارشاد فرمایا، اور سامعین کو مورد عنایت و امداد فرمایا۔"[1]

اس شہزادہ کا انتقال ۱۲۰۱ھ مین بمقام بنارس ہوا، مختلف تذکرون مین اسکے اشعار منقول ہین، نمونہ کے طور پر ہم یہان اسکے کچھ اشعار درج کرتے ہین،

واقعات اظفری :-

تری جب سے الفت کے پالے پڑے — ہمین اپنے جینے کے لالے پڑے،
پھرے ڈھونڈتے پا برہنہ تجھے، — یہان تک کہ پاؤن مین چھالے پڑے،

فارسی کلام :-

فتاد مشکل دیگر ز عشق جان مرا — کہ کس نمی شنود شرح داستان مرا
فزود وہ ایم غرورت ز عرض مبتانی — باین گناہ برآرد کسے زبان مرا

---

[1] گلزار ابراہیم، انجمن ترقی اردو صفحہ ۹ گلشن بے خار مین اس شہزادہ کے متعلق یہ الفاظ ہین :
"بفہم و فراست و عقل و کیاست ممتاز اقران و امثال خود بودہ"

دلم زسینہ برآرید و پیش او ببرید — زنام مابرسانید این بیان مرا

طبقات الشعراء :-

زلفِ آویختہ جو یہ رُخ پہ صنم رکھتے ہین — روز اور شب کو باہم رکھتے ہین

میرا دل فگار بھی کچھ گل سے کم نہین — منظور ہو جو گوشہ دستار کے لئے

جز جیب آستین نہین مونس جہان مین کوئی — دیکھا تو اپنے دیدۂ خونبار کے لئے

اس زلف عقدہ گیر کا بیکار ای صنم — بس تھے جہان کے سبحہ زنار کے لئے

گلزار ابراہیم :-

نہ پوچھو دہر مین کیا کر چلے ہم — اسی ہی آرزو مین مر چلے ہم

رہے اک شب جو اس ماتم کدے مین — بسان شمع رو رو کر چلے ہم

تذکرۂ ہندی :-

کونسی بات تری ہم سہ اٹھائی نہ گئی — پر جفا جو یہ تری نت کی لڑائی نہ گئی

قصد ہر چند کیا سیکھنے کا بلبل نے — وضع نالہ کی مری اس سہ اڑائی نہ گئی

بیمار عشق اب تک جانبر بھی کوئی ہوا ہی — تو اے طبیب ناحق میری دوا کرے ہی

پچتائیگا تو اک دن سنتا ہی ای جہاندار — دیتا تو ہی دل اس کو لیکن بُرا کرے ہی

کون میکش ای جہاندار آج گذرا باغ مین — ہاتھ مین ہر شاخ گل کی مے کا پیالہ دیکھنا

مرزا احسن بخت | قدرت اللہ شوق سنبھلی نے اپنے تذکرہ طبقات الشعرا مین شہزادہ کا ذکر ان الفاظ مین کیا ہے:

"ازدادہ قابلیت ذاتی برائے تفنن طبع گاہے متوجہ فن شعری شود و بعد سال دماہے غزل فارسی و ہندی ہم می رساند این چند ابیات آن احسن بخت کہ بزبانی بعضے متقدمان

ومنصبداران او بسمع رسیدہ بتحریر می آید، اگرچہ نوشتن است فاما ذہن صائب وفکر مناسب دارد"

اس کے بعض اشعار یہ ہیں :-

فرقت میں اوسکی یارب کھنچیں ہم آہ کب تک آنکھیں تو تھک گئی ہیں دیکھیں گے راہ کب تک

یاد ہے گلعذار کی صورت گل ہے نظروں میں خار کی صورت

کیا قیامت ہے اس کی نوکِ مژہ خنجر آبدار کی صورت

مرزا سلیمان شکوہ | مغلوں کے آخر زمانہ میں مرزا سلیمان شکوہ کا نام علمی حیثیت سے بہت نمایاں ہے اس شہزادہ کے متعلق قدرت اللہ شوق کا بیان ہے:

"مخزن قابلیت وعلم ومعدن انسانیت وحلم ..... از بسکہ جودت طبع ودقت ذہن بسیار دارد، ازراہ قابلیت ذاتی گاہے متوجہ فن شعر می شود وغزل فارسی وہندی بہم می رساند واکثر در خدمت او مشاعرہ شعرا می شود"۔

گلشن بے خار میں ہے :-

"مرزا سلیمان شکوہ ..... مدتے جلوہ فرمائے لکھنؤ بودہ، اکثر شعرائے آنجا از خوان نعمتش بہرہ ور وکامیاب بودند، چند سال است کہ دہلی وارد شدہ بود، الحال تربیت شعرائے مستقر الخلافۃ اکبرآباد است" (ص ۱۴۶، مطبع دہلی اردو اخبار پریس)

سلیمان شکوہ نے دہلی چھوڑنے کے بعد لکھنؤ میں جو علمی مجلس آراستہ کی تھی، آزاد نے اوسکی تصویر اس طرح دکھائی ہے:

"مرزا سلیمان شکوہ شاہ عالم کے بیٹے تھے ..... شاعر بھی تھے، چنانچہ عام اہل دہلی کے علاوہ شعراء کا مجمع دونوں وقت ان کے ہاں رہتا تھا، سودا، میر ضاحک، میر سوز،

وغیرہ کا ورق زمانہ الٹ چکا تھا، مصحفی، جرأت، مرزا قتیل وغیرہ شاعرون اور شعرفہمون کے جلسے رہتے تھے، جو محفل ایسے گلشن فصاحت کے گلدستون سے سجائی جائے وہان کی رنگینیان کیا کچھ ہون گی جی چاہتا تھا کہ ان کی باتون سے گلزار کھلا دون، مگر اکثر پھول ایسے فحش کانٹون مین الجھے ہوئے ہین، کہ کاغذ کے پرزے ہوتے جاتے ہین، اس لئے صفحہ پر پھیلاتے ہوئے ڈر لگتا ہے، پہلے مرزا سلیمان شکوہ مصحفی سے اصلاح لیا کرتے تھے، جب سید انشاء پہونچے، تو مصحفی کا مصحف طاق پر رکھا گیا، بزرگون سے سنا اور طرز کلام سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاہزادہ موصوف کے سر دیوان کی غزل اور اکثر غزلین بھی سید ممدوح کی اصلاح کی ہوئی یا کہی ہوئی ہین"

فحش کانٹون سے مراد شاید سلیمان شکوہ کے دربار کے اہل علم اور شعراء کے حسد اور رشک و رقابت ہو، مولوی عبدالحق صاحب انجمن ترقی اردو) تذکرۂ ہندی مؤلفہ غلام ہمدانی مصحفی کے مقدمہ مین رقمطراز ہین :-

"دلی کے شاہزادے، شاہ عالم کے بیٹے مرزا سلیمان شکوہ اس زمانہ مین لکھنؤ مین تھے، صاحب عالم نے لکھنؤ کی سرزمین پر چھوٹی سی دلی بسا رکھی تھی، اور سارا ٹھاٹ وہی قائم کر رکھا تھا، دلی سے جو جاتا پہلے اُن کی سرکار مین اپنا ٹھکانا ڈھونڈتا، شعر وسخن سے ذوق رکھتے تھے، اور شعراء اور اہل کمال کے قدردان تھے، انشاء، جرأت، سوز، مصحفی، وغیرہ انہی کے دربار مین ملازم تھے، یا انعام واکرام سے سرفراز ہوتے تھے، بارہ سو سات آٹھ ہجری مین مصحفی بھی میر انشاء اللہ کی وساطت سے اس دربار مین داخل ہوئے، ہمارے دربارون مین حسد ورشک، رقابت ونمازی اور سازو باز کی گرم بازاری ہمیشہ رہی ہے، ..... انشاء، جرأت اور مصحفی خواجہ تاش

اور ہم پیشہ تھے، اوّل اوّل شاعرانہ چشمک رہی بعد میں بڑھتے بڑھتے نوبت جنگ جدل اور نخش اور پچکڑ تک پہنچ گئی،..... غرض ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، جس کے مزے صاحب عالم..... بھی لینے لگے، اور شہر والوں کو ایک دل لگی ہاتھ آگئی، نتیجہ یہ ہوا کہ انشا اپنی طرّاری، تیزی اور رسوخ سے بازی لے گئے، اور مصحفی کو خفت نصیب ہوئی، صاحب عالم کی نظرین اُن کی طرف سے پھر گئین"

طبقات الشعرا مین مرزا سلیمان کے اشعار کے جو نمونے ہین ان مین سے بعض یہ ہین،

کس سے سلیمان پوچھے اس کے مکان کا پتا — واقفِ حال کب کوئی اُسکو ہی بود و باش سے

دورِ اشک سو کیونکر ہو اپنی چشم تر خالی — جو دریا جوش سو بہتا ہی سو ہوتا ہی کم خالی

بھرا تا ہی دل جب دیکھتے ہین شکل سائل کی — نہیں ہوتا ہے ظرفِ ہمتِ اہلِ کرم خالی

تاجِ شہی کا وارث تو کیون نہو سلیمان — تیمور کا تو پوتا عباس کا نواسا

گلشن بے خزان مین ہے :-

جاذبۂ تیری دیوانے کا اس توقیر سے اُٹھا — کہ شورِ نالہ ہر ایک خانۂ زنجیر سے اٹھا

گالیان سیکڑون ہر بات مین اب دینے لگے — دیکھو جھڑتے ہین کیا مونہہ سے تمہارے پھول

مرزا فرخندہ بخت جہان شاہ | یہ بھی شاہ عالم کا لڑکا تھا، شاعری مین قمر تخلص رکھتا تھا، قدرت اللہ شوق سنبھلی کا بیان ہے :

"جوانے بود وجیہ مجمع قابلیت و نیز عالی حوصلہ و خوش سلیقہ قدردان انسان کامل بسیار قابل و خوش تلاش و خوش فکر بودہ، فاما اجلش مہلت ندادہ"

واقعاتِ اظفری مین ہے :-

"ہر علم و فن خاصکر خوشنویسی اور آداب و تمکنت میں سارے تیموری خاندان مین

منتخب تھے، آہ کہ بیس سال کی عمر میں بعارضہ سرسام دنیا سے چل بسے" (ص ۱۹۲)

اس کے بعض اشعار یہ ہین :-

نمودار آفتاب عشق کا جلوہ اگر پیدا — تو کب ہوتا شب تاریک سے نور نظر پیدا

جلامت استخوان میری تجھے اے عشق کہتا ہون — ہوا ہی اس بیابان میں بیچ دل سا شیر نر پیدا

تمرا اس بت نے جب سے صندلی پوتا کی پہنی ہے — ہوا ہے ایک عالم کو تب ہی سے دردسر پیدا

کوئی پتے پر نہ آیا مجرمون کے غیر صبر — مفت میزان ستم مین ہم گئے قاتل کو تل

اے قمر دلگیر مت ہو کھول دینگے آن مین — حضرت مشکل کشا عقدہ تری مشکل کے کل

بہادر شاہ ظفر کے زمانہ مین قلعہ معلی شعر و شاعری کا ایک گہوارہ تھا، جیسا کہ "آخری شاہان تیموریہ کے علمی ذوق" کے سلسلہ میں بیان کیا جا چکا ہے، قلعہ معلی کے شہزادون مین شاید ہی کوئی ایسا شہزادہ ہوگا، جس کو شعر و شاعری سے لگاؤ نہ رہا ہو، اور وہ مشاعرون مین حصہ نہ لیتا رہا ہو، لیکن اس کی تفصیلات طویل بھی ہین، اور اردو کی بعض مطبوعہ کتابون مین ان کے جستہ جستہ حالات ملتے ہین، اس لئے ہم ان کو قلم انداز کرتے ہین،

تصحیح گذشتہ مہینہ کے معارف مین داراشکوہ کے علمی ذوق کے مضمون مین دو مقام پر تسامح ہو گیا ہے، سفینۃ الاولیاء کے ذکر مین یہ سطر "حتی کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنی کتاب اخبار الاخیار مین اس کا حوالہ جا بجا دیا ہے" سہواً ضبط تحریر مین آگئی ہے ناظرین براہ کرم اس کو قلمزد کر دین، دانش کی جو غزل نقل کی گئی ہے، اس کا پہلا مصرع اس طرح ہونا چاہئے،

موسمے آن شد کہ ابر ترچمن پرور شود

تاریخ ملک ارسلان غزنوی

از

جناب غلام مصطفٰے خان صاحب ایم اے علیگ اسسٹنٹ لکچرر کنگ ایڈورڈ کالج امراوتی (برار)

(۲)

پہلی جنگ سنجر دراصل اس زمانہ میں (یعنی ۱۱۱۸ء/۵۱۲ھ) اپنے بھائی سلطان محمد سلجوقی (م ۱۱۱۸ء/۵۱۱ھ) کا نائب تھا، لیکن پھر بھی ذمہ داری اپنے سر لیتے ہوئے اوس نے ارسلان کے پاس خطوط بھیجے کہ بہرام شاہ کے ساتھ مصالحت کر لی جائے، اور بھائیوں کے باہمی جھگڑوں کو ختم کر دیا جائے، لیکن ارسلان نے ایک نہ سُنی[۱]، اس کے علاوہ ارسلان نے اپنی والدہ کے ساتھ بہت سختی کا برتاؤ کیا تھا[۲]، اس لئے سنجر خود بہرام شاہ کو لیکر حملہ آور ہوا،

ملک ارسلان نے جب سنجر کی روانگی کی خبر سُنی تو بہت گھبرایا، اور ایک ایلچی سلطان

---

[۱] تاریخ بدایونی جلد اول صفحہ ۳۹ طبع کلکتہ منتخب التواریخ (از محمد یوسف بن رحمت اللہ) ورق الف ۳۱۶ بانکی پور [۲] طبقاتِ ناصری کے انگریزی ترجمہ ص ۵ کے حاشیہ پر راورٹی نے لکھا ہے کہ ملک ارسلان نے اپنی ماں سے کہا تھا کہ وہ اپنے رقص سے محظوظ کرے، لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی، کیونکہ کیسا ہی ناخلف بھی ہو، وہ اپنی حقیقی والدہ سے کم از کم اس زمانہ میں رقص کیلئے حکم نہیں دے سکتا تھا لیکن چونکہ ہر بات ممکن ہے، اور فرشتہ وغیرہ نے لکھا ہے کہ ارسلان کے زمانہ میں عتاب الٰہی ہوا اور آسمان سے آگ برسی اسلئے گمان کیا جاسکتا ہے کہ شاید رقص کا واقعہ بھی صحیح ہو،

محمد سلجوقی کے پاس اس سفارش کی غرض سے بھیجا کہ سنجر کو روک دیا جائے، سلطان محمد حالانکہ سنجر کا حقیقی بڑا بھائی تھا لیکن سنجر کے استقلال ہمت سے مرعوب تھا، اس لئے اُس نے صرف اتنا کیا کہ سنجر کے پاس سفارش ضرور بھیجی لیکن ساتھ ہی ایلچی سے یہ کہہ دیا کہ اگر سنجر روانگی کے لئے بالکل آمادہ ہو تو ہرگز میری سفارش اس تک نہ پہنچانا، ایلچی نے سنجر کی آمادگی دیکھ کر خاموشی اختیار کی[۵۱]

سنجر تیس ہزار سپاہیوں کی فوج لیکر روانہ ہوا، اور مقام بُست پر حاکم سیستان یعنی تاج الدین اور اوس کے بھائی فخر الدین کی بھی معیت حاصل ہوئی، ادھر ملک ارسلان نے بھی تیاری کی، اور تیس ہزار سوار لاتعداد پیادے اور ایک سو ساٹھ ہاتھی جمع کر لیے[۵۲]، ان ہاتھیوں کے متعلق مسعود سعد سلمان نے بھی اشارہ کیا ہے :-

(۱) مُلکِ ملک ارسلان + ساکن روض ایخان (۲) جمع شد از ہر سوے + دولیت کوہ و روان
(۳) جملہ بر آن ہر کیے + یک از دہاے دمان (۴) بر سر ہر پیل مست + نشستہ یک پیلبان[۵۳]

لیکن اس تیاری کے باوجود سنجر کی دھاک اس کے دل میں ایسی بیٹھی ہوئی تھی، کہ ایک مرتبہ پھر اوس نے سنجر کو "اپنانے" کی کوشش کی اور اپنی والدہ "مہد عراق" کو دو لاکھ دینار اور بیشمار تحائف کے ساتھ بُست کے مقام پر سنجر کے پاس بھیجا، لیکن چونکہ ملک ارسلان نے اپنے بھائیوں کو قید یا قتل کر دیا تھا، اور خود اپنی ماں کے ساتھ بُرا برتاؤ کیا تھا، اس لئے اوس نے سنجر کو غزنین کی طرف روکنے کے بجائے اور زیادہ آمادہ کیا، اس لئے خراسان اور سیستان کی فوجیں آگے

---

[۵۱] منتخب التواریخ (از محمد یوسف) ورق ۳۱۶ الف فرشتہ ص ۴۹۰ حبیب السیر ص ۳۳ وغیرہ میں یہ تفصیل ہے [۵۲] ابن اثیر (جلد دہم ص ۱۷۵) سے معلوم ہوتا ہے، کہ ارسلان نے ایک لاکھ دینار سنجر کے پاس بھیجے تھے، اور ارسلان کی فوج میں ایک سو بیس ہاتھی تھے اور ہر ہاتھی پر چار سوار تھے
[۵۳] دیوان مسعود سعد سلمان ص ۴۶۵، ۴۶۶،

بڑھیں اور غزنین سے ایک فرسخ پر ایک مقام پر ملک ارسلان کی فوجون سے مقابلہ ہوا[1] تاج الدین ابوالفضل نے بڑی بہادری دکھائی، اور بہت سے ہاتھیون کو مار ڈالا، اور پکڑ لیا، پھر تو ارسلان کی فوجون کے پاؤن اکھڑ گئے، اور وہ بھاگ نکلین،

تاج الدین ابوالفضل کے درباری شاعر خواجہ صاعد مستوفی نے اس واقعہ کو نظم کیا ہے، جسکے بعض اشعار یہ ہین :-

گفتی از صف کشیدہ پیل و کروہ — کوہ صحرا شدہ ست و صحرا کوہ
سر خرطوم ہر یک از مستی — گہ بلندی گرفت و گہ پستی
تا بر آویخت سر ز آب نہنگ — کرد اندر ہوا بصد آہنگ
رفت بر اوج ماہ زہرہ ہمی — بانگ نائے شنیدہ مژہ ہمی
ملک نیمروز نصر خلف — شدہ پیادہ، در آمد اندر صف
پیش صف باز رفت نیزہ بدست — راہ پیلان نبوک نیزہ ببست
دشنہ در کف چو شیر در غرید — شکم پیل مست را بدرید
شد سراسیمہ پیل و گشت ستوہ — اندر آمد ز پائے ہمچو کوہ
لشکر سیستان دلیر شدند — ہر یکے ہمچو نرہ شیر شدند

---

[1] اس لڑائی کی تاریخ ابن اثیر (جلد دہم ص۱۸۵) ابوالفداء (جلد دوم ص۲۳۹) اور ابن خلدون (اردو جلد چہاردہم ص۱۳۲) وغیرہ نے ۵۰۸ھ/۱۱۱۴-۱۵ء بتائی ہے، لیکن یہ تاریخ یقیناً غلط ہے، کیونکہ اس سال مسعود سوم کا انتقال ہوا، اس کے بعد ایک سال شیرزاد حاکم رہا، پھر ارسلان نے قبضہ جمایا، اور جیسا کہ آداب الحرب مین ہی، بہرام شاہ ایک مدت تک اس کے بعد سجز کے دربار مین رہا اسلئے روضۃ الصفا (جلد چہارم ص۷۴) کی تاریخ ۵۱۰ھ/۱۱۱۶ء صحیح ہے مزید یہ کہ ہم عصر شاعر مسعود سعد سلمان نے خود ارسلان کی تخت نشینی ۵۰۹ھ/۱۱۱۶ء مین بتائی ہے

زور بازوے خویش بنمودند | نیزۂ و تیغ کار فرمودند
ملکِ نیمروز کرد آن روز | کارزارے کہ گشت ازان پیروز
خاکِ میدان ز خون گلستان کرد | وز دلیری و پُردلی آن کرد
کہ نکرده ست رستم دستان | وز ہمہ عمرِ خویش صد یک آن
آن یل گرز گیر خصم شکن | آن نریمان نہاد در رستم تن
بخت و اقبال یار او گشته | جنگ و پیکار کار او گشته
شده میدانِ رزم گشنِ او | نه کشد کوه تابِ جوشنِ او[1]

عبدالواسع جبلی (م ۵۵۵ھ) نے اس ممدوح کی مدح میں کئی قصیدے لکھے ہیں، ایک طویل قصیدہ ۵۲ شعروں کا ہے، جو اسی واقعے کے متعلق ہے، مذکورۂ بالا اشعار کی طرح چونکہ یہ بھی کمیاب ہیں، اسلئے کچھ انتخاب ہدیۂ ناظرین ہے:-

چہ جرم است این برآورده سر از دریاے موج افگن | بکوه اندر دمان آتش بہ بحر اندر کشان دامن
مصاف افروز عالم سوز شاه نیمروز آن کس | کہ در ملک است کافی کفت و وافی عہد و صافی ظن
ملک بوالفضل نصر ابن خلف فرزانۂ تاج الدین | کہ بر باید همی تاج از سرِ شیران شیراوژن
بدان گہ کز سجستان شد سوے غزنیں یکے لشکر | همہ با دولتِ خسرو همہ با صولتِ بہمن
ملک تائید دیو آہن، فلک تاثیر، کوه آلت | نہنگ آسیب، شیر آفت، ملک آشوب، پیل افگن
دیرانے کہ از گردون بنوکِ نیزه سیاره | ربودندے چو گنجشکان بمنقار از زمین ارزن
مخالف جنگ را آمد بردن با لشکرے دیگر | چو شیران عرین پُردل چو دیوان لعین پُرفن
در آورده بہ بیش صف چو ن گردون گردنده پیلانے | کہ گردون شان بوقتِ کین نیارد گشت پیرامن

---

[1] تاریخ ابوالخیر خانی ورق ۱۳۶، الف، بانکی پور،

چو کوہ زفت شخص انگر، چو غول دشت حیلہ گر — چو باد تیز دریا بر، چو سیل تند ہامون کن
چو ضرغام دژم جوشان چو عفریت حرون کوشان — چو تماسح دمان ہایل چو ثعبان سیہ رین
سپاہے از نژاد دیو و تو در جنگ شان رستم — گرو ہے بر نہاد خوک و تو در جوشان ببیژن
قضا در تیغ سیابی نشاندہ ریزۂ مرجان — اجل بر درع زنگاری فشاندہ خردۂ ریون
چنان رفت از کمان تو سوے دشمن ہی نادک — کہ گاہ رجم سیارہ زگردون سوے اہرمین
چو شد رای ہمایونت قرین رایت اعلیٰ، — شد آثار اجل ظاہر شد اسباب ظفر مبین
نہ گشت از فرق تو خستہ ازین خونخوار گان یک کس — نہ گشت از زخم تو رستہ ازین بیچارگان یک تن
درین رفعت پدید آمد کہ نادر داد از بنی آدم — چو اہل سیستان ہرگز بمردی ایزد و داد الملک
خداوندا اگر ہستم بشخص از خدمت غایب — زجور عالم جانی، ز دور گنبد توسن
مرا جز راست پیوستہ ثنائے تو بہر موضع — مرا ورد است ہموارہ دعائے تو بہر مسکن[۵۱]

بہر حال اگر تاج الدین نے اتنی بہادری دکھائی تو یہ کیا کم ہے، کہ ارسلان نے بھی سنجر تاج الدین اور موخر الذکر کے بھائی فخر الدین جیسے مشہور بہادروں کا مقابلہ کیا،[۵۲]
ملک ارسلان آخر کار ہندوستان کی طرف بھاگ آیا، اور اپنے وائسرائے محمد بن ابو علیم

---

۵۱ مونس الاحرار ص ۴۰، ۴۳؛ حبیب گنج،
جلی کا مکمل دیوان بھی حبیب گنج مین موجود ہے، اس کا انتخاب جامع مسجد بمبئی کے کتب خانے میں ہو، اور حمیدیہ لائبریری بھوپال کے مجموعۂ کلام متقدمین مین بھی چھوٹا سا انتخاب ہے،

۵۲ محمد ابن ابو علیم کے متعلق ابھی تک وضاحت نہین ہوئی، ایرانی ادیب رشید یاسمی نے مقدمۂ دیوان سعد سلمان اور اسی دیوان کے صفحہ ۵۱ پر لکھا ہے، کہ اس کے خاندان کا پہلا شخص جس کا پتہ ملتا ہے نجم الدین تھا، جو سلطان ابراہیم کے عہد مین جاجرم سے آیا، اور وہ ابو علیم کا بیٹا تھا، لیکن ابو الفرج رونی

سے فوج جمع کرائی، اُدھر سلطان سنجر وغیرہ کا میابی کے ساتھ ۲۰ شوال ۵۱۰ھ مطابق یک شنبہ ۲۵ فروری ۱۱۱۷ء کو غزنین مین داخل ہوئے، اور چالیس روز تک یعنی جمعہ یکم ذی الحجہ ۵۱۰ھ (۶ - اپریل ۱۱۱۷ء) تک وہان قیام کیا، اور حکم دیدیا، کہ شہر اور اہل شہر کو ہرگز کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائے، اس دوران مین سنجر نے جشن نوروز بھی ۲۱ مارچ (چہار شنبہ - ۱۵ ذی القعدہ) کو منایا ہوگا، پھر سنجر نے بہرام شاہ کو افغانستان کا حاکم مقرر کیا، اس شرط پر کہ مؤخر الذکر ایک ہزار دینار

(بقیہ حاشیہ ص ۴۵۴) (م ۴۹۰ھ / ۱۰۹۷ء) کے یہ اشعار پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ "ابو حلیم" در اصل کنیت تھی، باپ کا نام نہ تھا :-

بجنگ شیر عرب نجم دین و صدر جہان — چو شاخ معجزہ ہم اژدہا و ہم خشب است
موافق آمد بارائے طبع کنیت او — کہ حلم او گہ قدرت قوی تر از غضب است

(دیوان ابو الفرج ص ۲۷-۲۸)

اے تیغ تو کشیدہ تر از تیغ آفتاب — اے نجم دین و داز تو بکفر اندر اضطراب
پیش درنگ حلم تو عاجز بود درنگ — گاہ شتاب جود تو داد بود شتاب

(دیوان ابو الفرج ص ۲۰-۲۱)

اسکی مدح میں ابو الفرج رونی کے اور قصائد بھی ہین، مثلاً صفحات ۴۹-۵۱، ۹۹-۱۰۱ وغیرہ پر، جن سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہ ہندوستان مین سپہ سالار رہا، اس کے بعد اس کا لڑکا زریر (محمد) اسی عہدے پر فائز ہوا :-

ز کسب جاہ پدر شاد باد و برخوردار — زریر نجم سپہ پرورے سپہ سالار
ہنوز رایت منصور او بظاہر سند — رسید ہیبت شمشیر او بدریا بار
نظام دولت محمودیان ملک مسعود — کہ اختیار خدایست و افتخار تبار
کراست از ہمہ شاہان خسروان جہان — چنین سپہبد رزم آزما و نیزہ گزار

(دیوان ابو الفرج ص ۴۷-۴۸)

ابو حلیم نجم الدین کا یہی لڑکا محمد سپہ سالار ہند مقرر ہوا، اور صرف یہی وہ شخص ہندوستان مین

روزانہ ادا کرے[۵۱]، یہی مقصد کے لئے ایک "عامل" بھی مقرر کیا گیا، کہ وہ یہ خراج وصول کرتا رہے،

ابن اثیر (جلد دہم ص۱۶۵) اور حدیقۃ الصفا، (ورق ب نمبر ۲۲۹ بانکی پور) سے معلوم ہوتا ہے کہ سنجر کو جو دولت غزنین میں ہاتھ آئی، اُس میں بیش بہا چیزوں کے علاوہ پانچ تاج بھی ملے جن میں ہر ایک کی قیمت ایک ہزار دینار سے زائد تھی، سترہ تخت سونے چاندی کے ملے، اور تیرہ سو دیگر شاہانہ اسباب حاصل ہوا، ابن خلدون (جلد چہارم ص۱۳۲) سے معلوم ہوتا ہے، کہ اسی دولت کی ہوس کی وجہ سے سنجر کے وزیر ابو جعفر محمد بن فخر الملک بن نظام الملک کو قتل کیا گیا تھا،

بہرام شاہ کی اس تخت نشینی کے وقت سید حسن غزنوی (م ۵۵۵ھ/۱۱۶۰ء) نے ایک قصیدہ لکھا جس کا مطلع یہ ہے :-

منادی بر آمد ز ہفت آسمان — کہ بہرام شاہ است شاہ جہان[۵۲]

(بقیہ حاشیہ ص ۴۵۵) سپہ سالار مقرر ہوئے تھے، محمد کے والد کے متعلق اسی لئے بہرام شاہ نے یہاں ہندوستان میں اس سے کہا تھا، "باز گرد و خود را بدنام مکن کہ پدرت این دولت را از خدمت ہائے پسندیدہ و دار و فراخور آن خدمت ہا تربیتہا یافتہ است، از روان او شرم می دارم ....." (آداب الحرب ص۴۶) اس کے اور رشتہ داروں کے متعلق مسعود سعد سلمان کے دیوان (صفحات ۲۳۲، ۳۰۰ وغیرہ) میں بیان ہے، آداب الحرب ص ۵۰ پر ایک نوٹ پرنسپل محمد شفیع نے بھی لکھا ہے، [۵۱] محمد عوفی (تاریخ الیٹ جلد دوم ص۱۹۹) نے چہار شنبہ ۱۴ شوال ۵۱۱ھ تاریخ بتائی ہے، جو یقیناً غلط ہے، کیونکہ ۱۴ شوال کو اس سال جمعہ تھا چہار شنبہ نہ تھا، مزید بحث آگے آئیگی، میں نے روضۃ الصفا (جلد چہارم ص۹۷) کی تاریخ اصح سمجھی ہے۔ [۵۱] راحت الصدور ص ۱۶۸ [۵۲] میں اس شاعر پر کام کر رہا ہوں، اس کے کلام کے میرے پاس ۸ نسخے ہیں، لیکن ایسا کوئی قصیدہ نہیں ہے، جس کا وہ مطلع ہو، تاریخوں نے مثلاً فرشتہ، طبقات ناصری وغیرہ نے اس کا ذکر کیا ہے، اور ٹی نے ص۱۱۰ کے حاشیہ پر بہرام شاہ کے سکہ کا ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ یہی شعر اس پر کندہ تھا، اگر یہ واقعہ ہے، تو گویا اس شاعر کو بہت بڑی شہرت حاصل تھی،

پھر سنجر واپس خراسان چلا گیا، اور بہرام شاہ کو غزنین مین چھوڑ گیا،

دوسری جنگ | جب سنجر کی روانگی کی خبر ملک ارسلان نے سُنی تو وہ ہندوستانی فوج کیساتھ غزنین کی طرف بڑھا، بہرام شاہ مین مقابلہ کی طاقت نہ تھی، اس لئے وہ غزنین سے بھاگ کر قلعۂ بامیان (غزنین کے شمال و مغرب) مین چھپ گیا، یہ زمانہ یقیناً ۵۱۱ھ کا ہوگا، کیونکہ ہم دیکھ چکے ہین، کہ ۵۱۰ھ کے ذی الحجہ (اپریل) تک تو سنجر غزنین ہی مین تھا، اور ملک ارسلان کا یہ حملہ اوس کے بعد ہوا،

بہرام شاہ نے پھر سنجر سے مدد کی درخواست کی، سنجر نے بلخ سے ایک فوج بھیجی[۵۱]، ملک ارسلان اب ہندی فوج کو لیکر کیا مقابلہ کرسکتا، اس لئے پھر منہ کی کھائی اور بھاگا، سنجر کی فوج نے اسکا پیچھا کیا، اور شکران[۵۲] کی پہاڑیون کے پاس اُسے پکڑ لیا، اور بہرام شاہ کے حوالہ کردیا،

ملک ارسلان کی اس دوسری جنگ کے متعلق ہم کچھ مفید باتین مسعود سعد سلمان کے ان چند اشعار سے حاصل کرسکتے ہین:

اے بُت لبت علیست کہ انرا خمار نیست	وے مہ رخت گلیست کہ رستہ ز خار نیست
سرو و چنار باران در ہر چمن ولیک	با حسن و زیب قدِ تو سرو و چنار نیست
اے قندھار گشتہ ز تو جایگاہ تو	واللہ کہ بہتر از تو در قندھار نیست
سلطان ہین دولتِ بہرام شاہ کوست	شاہے کہ در زمانہ ز شاہان نشانش یار نیست
دل در شکار شیر مبند از برائے آنک	یک شیر نر زبیم تو در مرغزار نیست
گر گہ گہے بچوگان بازی روا بود	گر چہ ز برف روئے زمین آشکار نیست

---

۵۱ محمد عوفی (تاریخ الیٹ۔ جلد دوم صفحہ ۱۹۹) نے لکھا ہے، کہ بہرام شاہ بھی بلخ کر بھاگ گیا تھا،

۵۲ ایضاً

اے پیشوائے وقبلۂ خود امیدوار باش — کز عمر خویش دشمنت امیدوار نیست
پیرار و پار بندہ ز جان نا امید بود — وامسال حال بندہ چو پیرار و پار نیست[1]

ان اشعار سے یہ چند باتیں حاصل ہوتی ہیں :

(۱) آخری شعر میں "پیرار و پار" سے ضرور ملک ارسلان کے عہد کے متعلق اشارہ کیا گیا ہے، کیونکہ وہ بہرام شاہ کا دشمن تھا، اور بہرام شاہ کی مدح میں اس عہد کی بُرائی کرنا ایک قصیدہ گو کے لئے ضروری تھا، چونکہ ارسلان ۵۰۹ھ/۱۱۱۶ء میں تخت نشین ہوا تھا، اس لئے "پیرار" سے مراد ۵۰۹ھ/۱۱۱۶ء ہے، "پار" ۵۱۰ھ/۱۱۱۶-۱۷ء ہوا تو یقیناً "امسال" ۵۱۱ھ/۱۱۱۷-۱۸ء ہے، اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ یہ قصیدہ ملک ارسلان کی دوسری شکست کے بعد لکھا گیا، جب کہ وہ نا امید ہو چکا تھا، اسی کی طرف شعر نمبر ۲ میں بھی اشارہ ہے؛

(۲) لفظ ارسلان کے معنی "ترکی" میں شیر کے ہیں، اسلئے پانچویں شعر میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، حضرت سنائی (م ۵۴۵ھ/۱۱۵۰ء) نے بھی اسی "شیر" کے متعلق ذیل کے ساتویں شعر میں اشارہ کیا ہے اور اس کے قتل کا ذکر بھی چوتھے شعر میں کیا ہے :

ہر کہ حبت اندرین ولایت صدر — از سر جہل بود نز سر قدر
بود باغی ز بغی فسق و فساد — چون بقایائے قوم ہود و عاد
شہ ز بس خون کہ ریخت از شش سون — گوئی یاقوت شد زمین از خون
کرد خصم بے آب را در خواب — سرش از تن جدا چو کوزۂ آب
ہمہ جُہال دہر دانند این — جملۂ غافلان شنا سند این
کہ نزید برائے ملک خطاب — خرس بر تخت و خوک در محراب
اندران جنگ دشمن دشمانش — صورت شیر بود و شادروانش

---

[1] دیوان مسعود سعد سلمان ص ۴۹ ،

تشنہ ماندہ زبان دشمن او جانِ او خشم کردہ باتن او
پیش بہرام شاہ بن مسعود ظفر و فتح در رکوع و سجود[1]

(۳) مسعود سعد سلمان کے مذکورۂ بالا چھٹے شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ (ملک ارسلان کی دوسری شکست کے بعد موسم سرما میں لکھا گیا یعنی یہ دوسری شکست ضرور ۵۱۱ھ کے موسم سرما (یعنی ۲۱ دسمبر ۱۱۱۷ء - ۲۰ مارچ ۱۱۱۸ء) کے پہلے ہو چکی تھی لیکن تیسری شعر میں قندھار محض استعاۃً معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس شہر کی خوبصورتی اور اس "تبکدۂ خوبان" کے متعلق اسی دیوان کے صفحات ۲۰۹-۲۳۸ اور ۴۹۵ پر بھی استعارے پائے جاتے ہیں،

ملک ارسلان کی وفات | سنجر کی فوج نے جب ارسلان کو بہرام شاہ کے حوالہ کر دیا، تو اس نے کچھ عرصہ تک تو ضرور قید میں رکھا لیکن پھر ۵۱۲ھ میں رہا کر دیا، ارسلان نے اپنی اس آزادی کو غنیمت سمجھ کر پھر ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کی جس پر بہرام شاہ نے اُسے جمادی الآخر ۵۱۲ھ (مطابق ستمبر ۱۱۱۸ء) میں قتل کر دیا، اور وہ غزنین میں اپنے والد مسعود سوم کی قبر کے پاس دفن کر دیا[2]، افسوس کہ غزنین میں ان قبروں میں سے اب کسی کا پتہ نہیں ملتا، نظامی عروضی تو پہلے ہی کہہ چکے تھے:

بسا کاخ کہ محمود شش بنا کرد کہ از رفعت ہمی با مہ مرا کرد
نہ بینی زان ہمہ یک خشت برپائے مدیح عنصری ماندہ است برجائے

---

[1] حدیقہ سنائی، طبع لکھنؤ ص ۶۶۳-۶۶۶ [2] اس تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، ابن اثیر (جلد دہم ص ۱۵) ابو الفدا (جلد دوم ص ۲۳۵) وغیرہ، اور جی نے اپنے ترجمہ کے ص ۹۰ کے حاشیہ نمبر ۵ پر ارسلان کی بدنیتی کے متعلق لکھا ہے، اور اسی صفحہ کے حاشیہ نمبر ۶ پر یہ لکھا ہے کہ ارسلان نے شاہ آباد میں شوال ۵۱۱ھ میں انتقال کیا، (یعنی قتل نہیں ہوا) ارسلان کے تاج، چتر اور علم وغیرہ کے متعلق (انشاء اللہ تاریخ بہرام شاہ کے سلسلہ میں ذکر آئے گا جس میں غزنوی بادشاہوں کی ان چیزوں کے متعلق مفصل بحث ہوگی،

تلخیص و تبصرہ

خانانِ قرم (کرمیہ)

۸۲۲ھ/۱۴۱۹ء سے ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۵ء تک

(بسلسلہ گذشتہ)

(ج) توقا تیمور کا سلسلہ، توقا تیمور کے حصہ مین بلغاریہ عظمی کے قبائل آئے تھے، بعد کو قرم اور کفہ کے قبائل بھی محکوم ہوگئے، توقا تیمور کی اولاد سے کبھی کبھی سیراوڑہ کے خان بھی ہوئے، آخر کار توقا تیمور کی اولاد سے قازان قاسموف اور قرم کے خانان بھی ہوئے[1]، توقا تیمور جوجی خان کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا، توقا تیمور کے محکوم وہ قبیلے تھے، جن کا تعلق سیراوردہ کے دست چپ والے بازو سے تھا، لیکن توقا تیمور کے ڈیرے خیمے دریاے اتیل (وولگا) کے بالائی مرکز گاہ سے ملحق علاقون مین لگائے جاتے تھے، ان علاقون مین بلغاریہ عظمی کا بڑا حصہ آجاتا تھا، اس شاخ کے ابتدائی مقامات جہان وہ اپنے ڈیرے ڈالتے تھے، نہیں معلوم، باتو خان کی اولاد سے چوتھے خانِ سیراوردہ منگو تیمور نے توقا تیمور کے بیٹے یورنگ تیمور کو جزیرہ نماے قرم اور کفہ دے دیئے تھے، غرض اس طرح یورنگ تیمور کا خاندان باتو کی خانیت کے شمال اور جنوب مین آباد ہوگیا، چنانچہ جب باتو خان کے خاندان مین تخت سیراوڑا کے لئے نزاع اٹھی تو توقا تیمور کے گھرانے والے بھی اس مین مداخلت کرنے لگے، ہم دیکھ چکے ہین، کہ سیراوردہ کی خانیت مین جب حریف خاتون کا عمل دخل ہوا ہے، تو توقا تیمور کی اولاد سے تین شخص

[1] دیکھو ہوورتھ کی تاریخ منغول صفحات ۱۵۸-۲۱۶-۲۹۴، ۳۶۳، ۶۲۶، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵،

(یعنی کلدی بیگ مؤیدِ شیخ ارجی) سیراورداکے خان ہوئے، لیکن توقاتیمور کی شاخ کو شہرت اس وقت ہوئی جب کہ امیر تیمور گورگان کے حملہ کے بعد سیراوردا کی خانیت معرضِ زوال میں آئی، توقاتیمور کی اولاد میں ایک شخص الغ محمد جس نے اوراق کے بعد خانیتِ بزدگ یعنی سیراوردا پر قبضہ کر لیا تھا، اوس نے ۱۴۳۸ء میں اپنے پرانے مقبوضہ ملک یعنی بلغاریہ عظمیٰ کی طرف مراجعت کی، اور یہاں اوس نے اپنے بزرگون کی خانیت کو خانیتِ قازان کے نام سے زندہ کیا، خانیت قازان کو جنوب مین خانیتِ سیراوردا سے خوف نہ تھا، اب خانیت قازان سلطنتِ روس کی آنکھون میں خار بن کر کھٹکنے لگی بہرکیف جب خان قازان محمد امین کا انتقال ۱۵۱۹ء مین ہو گیا، تو بانی سلطنتِ قازان کا اقبال بھی رخصت ہوا، اب قرم قاسیموف، استراخان، وردیگر مغل ریاستہائے اسلامی سے لوگ بلائے جاکر قازان مین خان مقرر کئے جانے لگے، یہ واقعہ ۱۵۵۲ء مین پیش آیا، جب الغ محمد کو اسکے بیٹے محمود ک نے قتل کر دیا، تو اوس کے باقی بیٹے بھاگ کر روس چلے گئے، اور کچھ دنون روسی فوج مین خدمت کرتے رہے، انہین سے ایک کو جس کا نام قاسم تھا، روسیون نے علاقہ گوروڈیز مین ایک شہر جو دریاے اوگہ پر واقع تھا، مع اوس کے علاقے کے تفویض کیا، گوروڈیز کا علاقہ صوبہ ریازان مین تھا، اس قاسم نے جو شہزادہ سے تفویض ہوا تھا، اس کا نام اپنے نام پر قاسیموف رکھا، اور سال کے خانان خانانِ قاسیموف کے نام سے مشہور ہوے، روسیون نے قاسم کو جو یہ شہر دیا تھا، تو اس سے ان کی نیت یہ تھی، کہ قازان کی خانیت مین انہین بڑا اقتدار حاصل تھا، اگر کوئی خرخشہ اٹھے تو خان قاسیموف کی معرفت اپنا کوئی مطلب نکالین چنانچہ جب الغ محمد کی اولاد باقی نہ رہی، تو اسی قاسم کی اولاد سے دو خان قازان مین ہوئے، خانیت قاسیموف آزاد مطلق نہ تھی، چنانچہ ۱۶۷۸ء مین وہ روسی سلطنت مین شامل کر لی گئی،

توقاتیمور سے جو تین خانیتین قائم ہوئین، (یعنی خانیت قاسیموف، خانیتِ قازان اور خانیتِ قرم) ان سب مین قرم کی خانیت کو سب سے زیادہ اقتدار حاصل ہوا، الغ محمد کا ایک بھائی تاش تیمور تھا ایک زمانہ مین یہ توقامیش کے سپہ سالارون مین تھا، اور یہی شخص بانی ہوا خانانِ قرم کے تقدم و صاحبِ حکومت

خاندان کا، اور اس کا فرزند حاجی گیرائی قرم کا پہلا خان بالعموم تسلیم کیا گیا ہے، دولِ یورپ کے مشرقی سوال میں خانیتِ قرم ایک زبردست مسئلہ رہا ہے، اوسے ٹرکی کا ایک دور کا قلعہ اور روسیون کا طرفدار سمجھ کر ٹرکی اور روس دونون نے اسی ایک اہم چیز سمجھا، آخر کار ان تکلیف دہ ہمسایون کے متعلق روس اور ٹرکی مین باہم سمجھوتا ہوگیا، اور ۱۷۸۳ء کے عہدنامہ کے بموجب قرم کی خانیت کا چراغ گل کر دیا گیا، ان ہی زبردست خانون مین ایک خان جس کا نام سلطان قرم گیرائی تھا، اپنا ملک چھوڑ کر اسکاٹ لینڈ کے شہر ایڈن برگ میں آباد ہوگیا، اور ایک اسکاٹش لیڈی سے اوس نے اپنی شادی کر لی،

خانانِ قرم کے ناموں کی فہرست اور ان کی حکومت کے زمانے یہ ہین، حاجی گیرائی (۸۲۳ھ/۱۴۲۰ء) نور دولت (۸۶۱ھ/۱۴۶۶ء) سنگلی گیرائی (۸۷۱ھ/۱۴۶۹ء) نور دولت (بار دیگر ۸۷۸ھ/۱۴۷۴ء) جانی بیگ گیرائی اول (۸۸۳ھ/۱۴۷۷ء) سنگلی گیرائی (بار دیگر ۸۸۳ھ/۱۴۷۸ء) محمد گیرائی اول (۹۲۱ھ/۱۵۱۵ء) غازی گیرائی اول (۹۲۹ھ/۱۵۲۳ء) سعادت گیرائی اول (۹۲۹ھ/۱۵۲۳ء) اسلام گیرائی اول (۹۳۸ھ/۱۵۳۲ء) صاحب گیرائی اول (۹۳۸ھ/۱۵۳۲ء) دولت گیرائی اول (۹۵۸ھ/۱۵۵۱ء) محمد گیرائی ثانی (۹۸۵ھ/۱۵۷۷ء) اسلام گیرائی ثانی (۹۹۲ھ/۱۵۸۴ء) غازی گیرائی ثانی (۹۹۶ھ/۱۵۸۸ء) فتح گیرائی (بار دیگر ۱۰۰۲ھ/۱۵۹۴ء) سلامت گیرائی (۱۰۱۶ھ/۱۶۰۸ء) جانی بیگ گیرائی ثانی (۱۰۱۹ھ/۱۶۱۰ء) محمد گیرائی ثالث (۱۰۳۱ھ/۱۶۲۲ء) جانی بیگ ثانی (بار دیگر خان ہوتا ہے) (۱۰۳۶ھ/۱۶۳۲ء) عنایت گیرائی (۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ء) بہادر گیرائی (۱۰۴۸ھ/۱۶۴۲ء) محمد گیرائی رابع (۱۰۵۲ھ/۱۶۴۴ء) اسلام گیرائی ثالث (۱۰۵۴ھ/۱۶۴۶ء) محمد رابع (بار دیگر ۱۰۶۴ھ/۱۶۵۴ء) عادل گیرائی (۱۰۷۵ھ/۱۶۶۵ء) سلیم گیرائی اول (۱۰۸۱ھ/۱۶۷۰ء) مراد گیرائی (۱۰۸۸ھ/۱۶۷۷ء) حاجی گیرائی ثانی (۱۰۹۴ھ/۱۶۸۳ء) سلیم گیرائی اول (بار دیگر) (۱۰۹۵ھ/۱۶۸۴ء) سعادت گیرائی ثانی (۱۱۰۲ھ/۱۶۹۱ء) صفا گیرائی (۱۱۰۲ھ/۱۶۹۱ء) سلیم اول (پھر خان ہوتا ہے) (۱۱۰۳ھ/۱۶۹۲ء) دولت گیرائی ثانی (۱۱۰۹ھ/۱۶۹۷ء) سلیم اول (تیسری بار خان ہوتا ہے) (۱۱۱۴ھ/۱۷۰۳ء) غازی گیرائی ثالث (۱۱۱۷ھ/۱۷۰۵ء) کپلان گیرائی اول (۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء) دولت گیرائی (بار دیگر) (۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء) کپلان (بار دیگر) (۱۱۲۵ھ/۱۷۱۳ء) قراد دولت گیرائی (۱۱۲۶ھ/۱۷۱۵ء) سعادت گیرائی ثالث (۱۱۲۷ھ/۱۷۱۵ء)

منگلی گیرائی ثانی (۱۱۳۶ھ/۱۷۲۴ء) کلپان اول (تیسری مرتبہ خان ہوتا ہے) (۱۱۴۲ھ/۱۷۳۰ء) فتح گیرائی ثانی (۱۱۴۹ھ/۱۷۳۶ء) منگلی ثانی (بار دیگر) (۱۱۵۰ھ/۱۷۳۷ء) سلامت گیرائی ثانی (۱۱۵۳ھ/۱۷۴۰ء) سلیم گیرائی ثانی (۱۱۵۶ھ/۱۷۴۳ء) ارسلان گیرائی (۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) حاکم گیرائی (۱۱۶۸ھ/۱۷۵۵ء) قرم گیرائی (۱۱۷۱ھ/۱۷۵۸ء) سلیم گیرائی ثالث (۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) ارسلان گیرائی (بار ثانی) (۱۱۷۸ھ/۱۷۶۴ء) مقصود گیرائی (۱۱۸۱ھ/۱۷۶۷ء) قرم گیرائی (بار دیگر) (۱۱۸۴ھ/۱۷۷۰ء) دولت گیرائی (بار دیگر) (۱۱۸۲ھ/۱۷۶۸ء) کلپان گیرائی ثانی (۱۱۸۴ھ/۱۷۷۱ء) سلیم ثالث (بار دیگر) (۱۱۸۴ھ/۱۷۷۱ء) مقصود گیرائی ثانی (بار دیگر) (۱۱۸۵ھ/۱۷۷۲ء) صاحب گیرائی ثانی (بار دیگر) (۱۱۸۵ھ/۱۷۷۵ء) دولت گیرائی ثالث (بار دیگر) (۱۱۸۹ھ/۱۷۷۵ء) شاہین گیرائی (۱۱۹۱ھ/۱۷۷۷ء)

اس کے بعد قرم روس کو تفویض کر دیا گیا،

(د) شیبان کا سلسلہ، شیبان کے محکوم قبائل وہ تھے، جو دریاے یایق (یورال) اور دریاے چو کی درمیانی زمینوں مین خانہ بدوش رہتے تھے، شیبان کی اولاد مین سے کبھی کبھی سیراور داکے خان بھی ہوئے تھے، اوران مین سے زاران یا خانانِ تیومن بھی ہوئے، (۱۴۲۶ء-۱۷۵۹ء) ان ہی سے خانانِ بخارا (۱۵۰۰ء-۱۷۶۸ء) اور خانان خیوہ (۱۵۱۵ء-۱۸۷۴ء تک) ہوئے،

جب باتو پسر جوجی نے ملک ہنگاریہ (ہنگری) پر فوجکشی کی، تو اس کا بھائی شیبان ساتھ تھا، شیبان نے ایسے ایسے بہادری کے کام کئے، کہ باتو نے خوش ہوکر اوسے ہنگری کا بادشاہ بنا دیا، اوراس کے ساتھ چند قبائل بھی اوسے عنایت کئے، جو اورداکی خانیت کے شمال مین خانہ بدوش رہتے تھے، شیبان کا دستور یہ تھا، کہ موسم گرما مین وہ اپنے ڈیرے بورال کے پہاڑی سلسلے سے دریاے یایک اور دریاے ارغیز تک کی زمینون مین نصب کرتا تھا، اور موسم سرما مین ان زمینون پر اپنے خیمے لگاتا تھا، جو دریاے سیحون (سیر دریا) دریاے چو اور دریاے ساری سو سے سیراب ہوتی تھین، (یہ کل دریا ایشیا کے نقشے مین ملتے ہین، کوئی صاحب اگر ان زمینون کی وسعت کا اندازہ کرنا چاہین، تو

وہ نتیجے ہے کر سکتے ہیں) شیبان سے چھٹی پشت میں منگو تیمور خان ہوا، یہ ہمعصر تھا سیراورد کے خان ازبک کے اور اسی ازبک خان کے نام کی رعایت سے شیبان کے محکوم قبائل بھی اپنے کو ازبک کہنے لگے، اور اُس وقت سے آجتک یہ ایک مشہور نام چلا آتا ہے، جب باتو کی اولاد سیراورد میں خان بنائے جانے کو نہ رہی، تو شیبان کی اولاد سے کئی خان سیراورد میں ہوئے اور حریف خاندانوں کے دوسرے طبقہ میں بھی تو قامیش کے زوال کے بعد خاندانِ شیبان کی نشانی غالباً درویش خان اور سید احمد میں نظر آتی ہے،

شیبان کا اصل سلسلہ اپنے ابتدائی خیمہ گاہوں میں زاران تیومن کے نام سے حکومت کرتا رہا، اور وسیع ملک سائبریا کے بڑے حصہ پر ان ہی زارانِ تیومن کا حکم چلتا تھا، زارانِ تیومن ۱۶۵۹ء تک صاحبِ حکومت رہے، پھر قیلماق کے قبیلوں نے ان کے ملک پر قبضہ کر لیا، مگر اس قبضہ سے کچھ پہلے انکی حکومت میں ضعف آچکا تھا،

مگر زارانِ تیومن سے کہیں بڑھکر ان شاخوں کو اقتدار حاصل تھا، جن کی اصل پولاد پسر منگو تیمور سے تھی، جو ایک وقت میں سیراورد کا خان تھا، پولاد خان کے دو بیٹے یعنی ابراہیم اور عرب شاہ تھے، اس میں سے ایک خانانِ بخارا، اور دوسرا خانانِ خیوہ یا خوارزم کا مورثِ اعلیٰ تھا،

خانیت بخارا کا بانی فی الواقع محمد شیبان ہوا، جو پوتا تھا ابوالخیر خان کا، اور ابوالخیر خان خود پوتا تھا ابراہیم خان کا، خانیت بخارا کی ابتدا ۱۵۰۰ء میں ہوئی، اور اب تک یعنی ۱۸۹۴ء تک چلی جاتی ہے، گو ۱۸۶۸ء میں جنرل کوفمان نے اوسے روسی سلطنت کا ماتحت بنا دیا تھا،

عرب شاہ جو خانیت خیوہ (یا خوارزم) کا بانی ہوا، گو وہ سیراورد کا خان نہیں ہوا تھا، مگر توقامیش کے حملہ سے پہلے اوس نے قپچاق میں اپنا سکہ مضروب کیا تھا، اور اس سے ساتویں پشت میں ابرس خان نے زبردستی ماوراء النہر پر اپنا قبضہ کر لیا، اور اس کے قرب وجوار کے ملکوں پر تصرف

کیا، یہ واقعہ شیبان خان کے مرنے کے بعد پیش آیا، یہ زمانہ غالباً ۱۵۱۵ء تھا، اس کی اولاد اب تک خانان خیوہ کہلاتی ہے، مگر ۱۸۷۴ء سے وہ سلطنت روس کے تابع ہوگئے ہین، امیر گورگان کی سلطنت کے ویرانے پر جو خانیتین قائم ہوئین ان کا ذکر بعد کو آئے گا،

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ جوجی خان کا ایک فرزند تیول بھی تھا، یہ تیول قبائل نیچ نیک کا جو جنوبی روس مین دریاے بگ کے علاقوں میں ڈیرے ڈالتے تھے، سردار تھا، (دریاے بگ روس کے علاقہ یوکرین کا ایک دریا ہے) اور قبائل نیچ نیک مین سے ایک شخص دادا تھا توغائی کا، توغائی خانیت سیرا اور داکے معاملات مین بہت دخل دیتے تھے، لیکن بعد کو نیچ نیک قرقا خان سے لڑ پڑے، اور نتیجہ یہ ہوا، کہ نیچ نیک ملک بدر کر دیئے گئے، ان کے ساتھ وہ قبیلے بھی تھے، جنھون نے دریاے وولگا (اتیل) کے پار اپنا نام توغائی رکھ لیا تھا، اور دریاے یایق (یورال) اور دریاے سیبہ کی درمیانی زمینون مین اپنی بستیان بسالی تھیں، ان قبیلون کی تاریخ بہت جستہ جستہ ملتی ہے، ان کی حالت اکثر خانہ بدوشانہ اور صحراگردی کی تھی،

یوگوسلاویہ کے مسلمان

یوگوسلادیہ مین مسلمانون کی آبادی پندرہ لاکھ سے بھی زیادہ ہے، وہ زیادہ تر بوسینیا ہرزگوینا کے علاقون اور سربیا کے حصون مین آباد ہین، یہ سب سلاوی نسل سے ہین جنھون نے اسلام قبول کرلیا ہے، ان زندہ اور ترقی یافتہ مسلمانون کے حالات بہت کم پردۂ عام پر آتے ہین، موجودہ جنگ مین بھی ان کے کارنامے بہت نمایان ہین،

اکثر لوگون کو حیرت ہوتی ہے کہ مسلمان یورپ کے قلب مین کیسے جڑ پکڑ گئے، یون تو اسکی تاریخ ترک سلاطین کی فتوحات یورپ سے ہوتی ہے، جب ۱۳۸۹ء مین انھون نے سربیا کے

شاہزادہ کوسو (Kossovo) کو شکست دی تھی، لیکن اس سے بہت پہلے جنوبی سربیا میں ترکی اور دوسرے مسلمان آباد ہو چکے تھے، جب ترکون نے اس ملک کو فتح کیا، تو یہان بہت سی اصلاحیں جاری کین، اور یہان کے مسلمانون کو اہم عہدون پر مقرر کیا، اور البانیا سے بہت سے مسلمانون کو لاکر سربیا کے علاقہ مین پولیس کی خدمت پر مامور کیا، اور خاص مراعات عطا کین، اس طرح آہستہ آہستہ سربی اسلام کا کلمہ پڑھنے لگے، اور جنوبی سربیا کا علاقہ مسلمان ہو گیا،

بوسنیا کی کہانی اس سے مختلف ہے، قرونِ وسطیٰ میں مشرقی کلیسا، اور مغربی کیتھولک طاقتون کے درمیان سخت اختلاف تھا، اور یہ دونون بوسنیا پر اپنا اپنا اثر ڈال رہے تھے، لیکن ان لوگون نے (Bogomiles) کے عقیدہ کو مان لیا، اس پر عیسائی کلیسا نے ان پر بے دینی کا فتویٰ صادر کر دیا، اور مذہبی جنگون کا سلسلہ شروع ہو گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بوسنیا کے زمیندار بہت آسانی سے اسلام کے حلقہ مین آگئے، کیونکہ ان کے اور مسلمانون کے عقائد بہت کچھ ملتے جلتے تھے، وہ مسلمان تو ہو گئے لیکن انھون نے قومیت نہین بدلی، اور اپنی زبان، روایات، شاعری، موسیقی اور اپنے فنون لطیفہ ہر چیز کو محفوظ رکھا،

ترکون نے بوسنیا پر چار صدی سے زیادہ حکومت کی، لیکن یہان کے مسلمانون کی آزادی مین کوئی فرق نہین آیا ایک زمانہ تک سلطان کے نمایندون کے اختیارات بہت محدود تھے، وہ شہر سراجووہ (Serajevo) مین صرف ایک مرتبہ داخل ہو سکتے تھے، اور چوبیس گھنٹون سے زیادہ قیام نہین کر سکتے تھے اور بوسنیا سلطنت عثمانیہ کا ایک آزاد صوبہ بن گیا تھا، سلاطینِ ترک کے بعض نامور سپاہی اور مدبرین یہین کے باشندے تھے،

اہل بوسنیا حد سے زیادہ حریت پسند واقع ہوئے ہین، اس کا ثبوت ۱۸۳۱ء کے اس واقعہ سے ملتا ہے، کہ جب سلطان محمود نے بوسنیا مین ایک نیا نظام قائم کرنے، اور ملک اور فوج

کو از سر نو ترتیب دینے کا ارادہ کیا تو بوسنیا کے مسلمانوں نے اس کو گوارا نہ کیا، اور اپنی آزادی برقرار رکھی، بوسنیا کے سپاہی ایسے جوان مرد اور بہادر تھے، کہ سلطنت عثمانیہ نے ہمیشہ ان پر ناز کیا، جب ڈانا پر چڑھائی کر رہے تھے، تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چند منٹوں میں اس شہر کی قسمت کا فیصلہ کر دیں گے، یہی وہ یورپی مسلمان ہیں، جنھوں نے ترکوں کے ساتھ نصف یورپ تک ہلالی جھنڈا پہنچا دیا، میدان جنگ میں وہ غیر معمولی جوہر دکھلائے کہ یورپ کے جنگ جو سپاہیوں میں کوئی بھی ان کا مقابلہ نہ کر سکا،

سراجو (Serajevo) بوسنیا کا نہایت ہی خوبصورت شہر ہے، ۱۹۱۲ء میں ساری دنیا کی نگاہیں اس پر پڑ رہی تھیں، یہ اسلامی بوسنیا کا دارالسلطنت ہونے کے ساتھ ڈیڑھ لاکھ سلاوی مسلمانوں کی تمدنی زندگی کا مرکز بھی ہے، اس لئے یہ شہر انھیں بہت عزیز ہے، اور یورپ کے قلب میں مشرق کا نمونہ ہے، دریائے ملجا کا کے دونوں جانب سبزہ وادیاں ہیں ان ہی سبزہ وادیوں کے آغوش میں یہ شہر آباد ہے، اس کے مشرقی بازار، اس کی پتلی پتلی گلیاں، اس کے سیکڑوں چمکیلے مینارے، دریا کے کناروں پر اس کے خوبصورت باغات ایسی دلکش تصویریں ہیں، جو ذہن و دماغ سے مٹ نہیں سکتیں،

لیکن اتنے ترقی یافتہ ہونے کے باوجود وہ اسلام پر سختی سے قائم ہیں، ان کی عورتیں اب بھی چہرے پر نقاب اور سر پر ایک قسم کی اوڑھنی ڈالتی ہیں، ان کا لباس سر سے پیر تک پورے جسم کو چھپائے رہتا ہے، مرد یا ترکی ٹوپی پہنتے یا سرخ پگڑی باندھتے ہیں، چھوٹی بچیاں ڈھیلا ڈھالا پائجامہ پہنتی ہیں، وہ چھوٹے چھوٹے مکانات میں رہتے ہیں، جن کا بالائی حصہ مینار دن کی طرح ہوتا ہے، اور کھڑکیوں کے دروازے لکڑی کے ہوتے ہیں، کہ باہر سے بے پردگی نہ ہو،

سراجو کے بازار میں سڑک کے کنارے زین ساز، خراد ساز، بڑھئی موچی اور بساطی اپنی

دکانیں پھیلائے بیٹھے رہتے ہیں، اکثر برقعہ پوش عورتیں بھی برتن بیچتی ہیں، ان دوکانوں میں قسم قسم کی چیزیں بکتی ہیں، قدیم اسلامی طرز کی پیتل کی صراحیاں اور مٹھائیاں پھلوں کے مربے، رنگین کشیدہ کاری کے نمونے، بھیڑ کا بھنا ہوا گوشت، یہ چیزیں بڑی مقدار میں بکتی ہیں،

قہوہ خانوں میں ایک ہجوم ہوتا ہے، جہاں لوگ لذیذ ترکی قہوہ پی پی کر تازہ خبروں پر رائے زنی کرتے، اور سگریٹ پیتے ہیں، جاجے (مخصوص اسلامی طرز کا ایک شہر) کی ترکی سراؤں میں امیر و غریب سب ہی قسم کے لوگ آتے اور کھاتے پیتے ہیں، یہاں کے مرد چمکیلے لباس پسند کرتے ہیں، اور عورتیں بلوزیں چاندی کے سکے ٹانکتی ہیں لیکن یہاں کے بازار سراجو کے مقابلہ میں گندے ہیں، یہاں پیاز، نمسالون، پنیر اور کاجک کی عجیب قسم کی ملی جلی بو سارے بازار میں پھیلی رہتی ہے، یہ چیزیں بوسینا کے پہاڑی علاقوں سے لائی جاتی ہیں،

یہاں کی ایک اور خاص اور نمایاں چیز یہ ہے، کہ ہر ترکی قہوہ خانے کے پاس ایک مغنی ہاتھ میں بربط لئے اپنے آباؤ اجداد کے کارنامون، ہیروں کی کہانیوں اور بیگ اور پاشاؤں کی بہادری کی داستانوں کے راگ الاپا کرتا ہے، جس کو لوگ بہت توجہ اور شوق سے سنتے ہیں، اور ان کے جوش کے ساتھ مغنی کا نغمہ تیز ہوتا اور انھیں شاندار ماضی کی یاد دلاتا ہے،

بوسینا میں مسلمان، عیسائی، یہودی، روی، یونانی کیتھولک ہمیشہ متحد ہو کر رہے، لیکن سب نے اپنی انفرادی خصوصیات کو محفوظ رکھا، یوں تو یوگوسلاوی قوم کی فلاح اور ترقی میں سب کا ہاتھ ہے لیکن اس کی تعمیر و تشکیل میں بوسینا کے مسلمانوں کا خاص حصہ ہے، بوسینا نے موجودہ دور کے بہترین مصنفین پیدا کئے، صفوت بیگ بسا جگ، حمزہ ہومو، احمد مراد بیگووک وغیرہ سارے ملک میں مشہور ہیں، ان کی اکثر تصانیف یورپ اور ایشیا کی متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں، نقاشوں اور سنگ تراشوں کی بھی کمی نہیں ہے، مجاوزک کی مصوری کی ساری دنیا میں

دھوم ہے، اور فنونِ لطیفہ کے دلدادہ اس کی غیر معمولی جدت طرازی اور کمالِ فن پر رشید ہین، یہان کے ڈاکٹرون، ہئیت دانون، قانون دانون، مورخون، فلسفیون پروفیسرون اور ججون کی شہرت بھی کچھ کم نہین ہے، اس ترقی مین عورتین بھی مردون سے پیچھے نہیں ہین، اور اپنی ترقی یافتہ ترکی بہنون کی طرح وہ بھی حکومت کے ہر شعبہ مین نظر آتی ہین خصوصاً معلّم کی حیثیت سے تو سارے ملک میں پھیلی ہوئی ہین،

اسلام حکومت کا تسلیم شدہ مذہب ہے، یوگوسلاوی حکومت اسلامی انجمنون کی مدد کے لئے کافی رقمین منظور کرتی تھی، یوگوسلاوی مسلمانون کے واحد مذہبی رہنما اور سردار اور شیخ الاسلام فیم ایندی فیا ہین، ان کی اب بھی بہت اہم حیثیت ہے، وہ کابینہ کے وزیر بھی تھے، انکا قیام بلغراد میں رہتا تھا، یہین سے وہ اپنے وسیع شعبہ کی دیکھ بھال کرتے تھے، جس کے ذریعہ وہان کے مسلمانون کی اسلامی روایات محفوظ ہین،

گجرت ان کی سب سے بڑی اور طاقتور انجمن ہے، ان کی ذہنی زندگی گجرت کی ترقی کے ساتھ وابستہ ہے، ۱۹۱۳ء مین جب یہ انجمن قائم ہوئی تو کسی کو یہ گمان بھی نہ تھا، کہ وہ اتنی مفید اور بلند خدمتین انجام دے سکیگی، اس انجمن کے چھبیس ہزار ممبر ہین، اس کی غرض یتیمون کی پرورش اور تعلیم و تربیت، غریب طالب علمون کو وظائف دینا ہے، ہونہار طالب علمون کو بلغراد، قاہرہ، الجیریا، بلکہ آکسفورڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیون تک بھیجتی ہے، انجمن کی طرف سے دستکاری کے مدرسے قائم ہین، جہان لڑکیون کو کاتنے، قالین بننے اور زردوزی کے کام کی تعلیم دی جاتی ہے، یوگوسلاویہ کے مسلمانون نے مختلف شعبون مین جو ترقی کی ہے، وہ زیادہ تر گجرت کی مرہون منت ہے،

بوزنیا، ہرزگوینا اور شمالی سربیا کے مسلمانون نے اب تک اپنے آبائی پیشہ اور تجارت کو

نہین چھوڑا ہے، دیہاتون کے کسان کھیتون میں بڑی محنت سے کام کرتے اور اپنے زراعتی کامون میں لگے رہتے ہین، اور شہرون مین تجارت اور دوسرے دھندون مین معروف رہتے ہین، لکڑی تانبے، جواہرات، زردوزی اور قالین کے کامون مین زیادہ ماہر اور ممتاز ہین، سراجوہن مشہور پروفیسر آرنلڈ کا قائم کیا ہوا ایک مدرسہ بھی ہے، حکومت کی جانب سے بھی ایک قالین بافی کا کارخانہ ہے، غرض یوگوسلاویہ کے مسلمانون کی حالت ہر اعتبار سے بہت اطمینان بخش ہے،

ا-ع.

سائنس

(انجمن ترقی اردو (ہند) کا ماہانہ رسالہ)

جون ۱۹۴۱ء کے چند مضامین

۱- ایک اور ایک سو زائد انجن کے ہوائی جہاز (۲) بجلی اور گرج پر ابن سینا کے خیالات (۳) حشرات کی تباہ کاریان اور فائدے (۴) تاریخ زمین کے ماخذون پر ایک نظر (۵) مچھلی کا تیل (۶) ہماری غذاؤن کے ماخذ (۷) آیوڈین،

جولائی ۱۹۴۱ء کے چند مضامین

(۱) کاغذ سازی (۲) بچہ پر موروثی اثرات (۳) اصول تعلیل اور جدید طبیعیات، (۴) ہوائی حملہ اور زہریلی گیسین

یہ رسالہ ملکی زبان مین سائنس کا واحد رسالہ ہے، جس مین مختلف مضامین کے علاوہ ہر قسم کے دلچسپ معلومات، سائنس سے متعلق سوال و جواب سائنس و صنعت سے متعلق تازہ ترین خبریں اور نئی کتابون پر تبصرے شائع ہوتے ہین، رسالہ میں متعدد بلاک بھی شائع ہوتے ہین، امید ہے کہ علم کے شائقین اور اردو زبان کے بہی خواہ سرپرستی فرمائین گے، اشتہارات کے نرخ طلب کئے جا سکتے ہین،

چندہ سالانہ:- پانچ روپیہ سکہ انگریزی، نمونہ کا پرچہ آٹھ آنہ

المشتہر:- معتمد مجلس ادارت رسالہ سائنس جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن،

اخبار علمیہ

انگریزی رسالون کے بعض اہم مضامین

سالِ رواں مین اسلامی علوم وفنون، اور اسلامی ممالک پر دنیا کے مختلف حصّون کے انگریزی رسالون مین جو اہم مقالات شائع ہوئے ہین، ان مین بعض یہ ہین،

"جرنل آف دی امریکن اورینٹل سوسائٹی" بالٹی مور (مارچ ۱۹۴۱ء) مین ایک جرمن اہلِ قلم کا مضمون "دسویں صدی عیسوی مین عربی زبان کی علمی تنقیدات" کے عنوان سے شائع ہوا ہے، اس مین مقالہ نگار نے یہ دکھایا ہے، کہ اس صدی مین شعراء کی زبان اور قرآن مجید کی معجزبیانی نے اربابِ علم وادب کو شعروشاعری کا لسانی تجزیہ کرنے کی طرف متوجہ کیا، اس تجزیہ سے شاعری مین جمالیاتی عناصر کو نمایان کرنے پر زیادہ زور دینے کی کوشش کی گئی، برلن کے ایک رسالہ Der Islam مین مولانا روم کے سوانح اور ان کے مریدون کے حالات پر ایک مقالہ چھپا ہے، "ایشیاٹک ریویو" لندن (اپریل ۱۹۴۱ء) مین ایک انگریز مقالہ نگار نے ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی کتاب "مستقبل الثقافۃ المصریۃ" پر ایک مستقل مضمون لکھکر یہ بتایا ہے، کہ جدید عربی لٹریچر مین یہ کتاب بہت ہی اہم ہے، "ایشیا" نیویارک (مارچ ۱۹۴۱ء) مین [illegible] مین ساتوین صدی عیسوی تک کے عربون کی حکومت کے آثار پر روشنی ڈالی گئی ہے، "جرنل آف دی رائل امریکن سوسائٹی" (اپریل ۱۹۴۱ء) مین ایک

مسلمان اہل قلم نے مصر کے شمال مشرقی حصون مین مختلف قومون کی آبادی سے جو فرقہ وارانہ عناصر پیدا ہو گئے ہین، ان پر ایک مبسوط مضمون لکھا ہے" ایشیاٹک ریویو" لندن (اپریل ۱۹۴۱ء) مین سردار اقبال علی شاہ نے اپنے ایک مقالہ مین یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے، کہ مشرق قریب کے مسلمانون کی ہمدردی انگریزون کے ساتھ ہے۔ موجودہ جنگ سے ان ممالک مین جو اقتصادی حالات پیدا ہو گئے ہین، ان پر بھی اس مضمون مین ایک تبصرہ ہے" نیشنل جیوگریفک میگزین" واشنگٹن کے ایک مضمون مین (مئی ۱۹۴۱ء) ایک امریکن مضمون نگار نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ٹم بکٹو کے فن موسیقی کے فروغ مین حبشیون کے ساتھ مسلمانون کا بھی حصہ رہا ہے، سوشیولوجیکل ریویو لندن (جنوری - اپریل ۱۹۴۰ء) مین مراکش کے گاؤن، قصبون اور قبیلون کے بازار پر ایک مقالہ شائع ہوا ہے، "اسلامک ریویو" وکنگ مین ایک مسلمان اہل قلم نے موجودہ زمانہ کے حالات و مصالح کی بنا پر تعدد ازدواج کو ایک ضروری مسئلہ قرار دیا ہے" ایشیاٹک ریویو" لندن (اپریل ۱۹۴۱ء) کے ایک مقالہ مین یہ ظاہر کیا گیا ہے، کہ موجودہ جنگ مین عرب قوم رفتہ رفتہ انگریزون کی طرف مائل ہو رہی ہے، جرمنی کے پروپیگنڈے اور چاپلوسی کے باوجود یہ قوم ہٹلر کی شہر آفاق کتاب Mein Kamp کے ان فقرون کو فراموش نہیں کر سکتی جن مین اس کو ایک "ادنیٰ درجہ کی قوم بتایا گیا ہے"، کن ٹیپریری ریویو" لندن کے ایک مضمون نگار نے بتایا ہے کہ مصر جنگ مین صرف اپنی مدافعت کے لئے شرکت کر سکتا ہے، اور اوس کے دوستانہ تعلقات سے انگریزون کو بڑی سہولتین بہم پہنچ رہی ہین" گریٹ برٹین اینڈ دی ایسٹ" (جنوری ۱۹۴۱ء) مین مشہور اہل قلم راشن بروک ولیمز نے مسلمانون پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے، کہ نازی حکومتون کا رویہ کلام پاک کے احکام کے سراسر خلاف ہے، اٹلانٹک منتھلی بوسٹن (اپریل ۱۹۴۱ء) کی ایک بحث مین یہ یقین دلایا گیا ہے، کہ ترکی عصمت انونو کی حیرت انگیز دانشمندی

اور ہوشمندی کے ذریعہ اپنی جنگی اور اقتصادی مشکلات پر قابو حاصل کرکے انگریزوں کے ساتھ ہو جائیگا،
"کن ٹمپریری ریویو" لندن (مئی ۱۹۴۱ء) مین عصمت انونو، رفیق سیدام، سراج اوغلو، اور سپہ سالار
چتھاق کی زندگی کے حالات اور کارنامے بھی شائع کئے گئے ہین،

ہندوستان کی بعض طبی تحقیقات

طبی مسائل کی تحقیقات کے لئے ۱۹۱۱ء مین ایک ادارہ انڈین ریسرچ فنڈ ایسوسی ایشن کے
نام سے قائم ہوا تھا، چنانچہ گذشتہ تیس سال مین اس ادارہ کی طرف سے غذا، ملیریا، ہیضہ، بلیگ
دق، جذام اور زچگی کے متعلق بہت سی نئی تحقیقات شائع ہو چکی ہین، جن سے یہ پتہ چلتا ہے، کہ روزمرہ
کی غذاؤن مین چاول کے ساتھ گیہون یا باجرہ کے آٹے کے استعمال سے غذا مقوی ہو جاتی ہے، دال
کی غذائیت میں دال سے بھی کافی قوت پہونچتی ہے، اس لئے ہندوستان کے زراعتی تحقیقات کرنے
سرکاری ادارے دال کی کاشت پر زیادہ زور دیرہے ہین، طبی نقطۂ نظر سے غذاؤن مین برگ پوش
(یا ورقی) ترکاریون کی اہمیت روز بروز زیادہ بڑھ رہی ہے، کیونکہ ان ترکاریون مین وٹامن اے
اور سی اور چونا زیادہ ہوتا ہے، جن سے ان مین بڑی قوت پہنچتی ہو، مچھلی کو بھی غذا کا ایک اہم جزو
قرار دیا گیا ہے، اور خیال کیا جاتا ہے، کہ اگر یورپ اور جاپان کی طرح ہندوستان مین بھی مچھلیون کی پرورش
کی طرف توجہ کیجائے، تو وہ ہندوستانی غذاؤن کیلئے بہت ہی مفید ثابت ہو سکتی ہین،

ہندوستان کے مختلف امراض مین ملیریا روز بروز زیادہ مہلک ہو رہا ہے، اس مرض سے ہندوستان
مین ہر سال دس لاکھ موتین ہوتی ہین، اور دس کروڑ سے زیادہ اشخاص اس مرض مین مبتلا ہوتے ہین،
اس کے انسداد کے لئے صوبہ متحدہ، مدراس اور اڑیسہ مین ادارے قائم کئے گئے ہین، ان اداروں کی
تحقیقات کے بعد مرض کی زیادتی اور ہلاکت خیزی مین کمی ہونے کی امید ہے، "ص ع"

ادبیات

کس لئے

از پروفیسر آل احمد صاحب سرور

(۱)

اے ہم نفس یہ گرمیِ گفتار کس لئے؟
یہ ولولہ، یہ شوق، یہ آزار کس لئے؟
خوابیدہ انجمن میں یہ تلوار کس لئے؟
بنجر زمین پہ ابرِ گہربار کس لئے؟

(۲)

مانا کہ دل میں سوزِ محبت بھی ہو تو کیا!
پہلو میں دردِ درد میں لذت بھی ہو تو کیا!
کچھ نشۂ بلندیِ فطرت بھی ہو تو کیا!
احساسِ فرض، پاسِ حمیت بھی ہے تو کیا!

(۳)

اس جنسِ بے بہا کا خریدار کون ہے؟
اس جامِ لالہ رنگ سے سرشار کون ہے؟
سرمایہ دارِ دولتِ بیدار کون ہے؟
اپنے ہی احتساب پہ تیار کون ہے؟

(۴)

یہ جلوۂ تبسمِ برق و شرر فضول!
یہ دعویِ طہارتِ قلب و نظر فضول!
رنگینیِ ترا دشِ خونِ جگر فضول!
کیفِ دعا فضول دعا میں اثر فضول!

(۵)

ذہنی مسرتیں بھی متاعِ جنوں بھی ہیچ!
پابندیِ نظام کا سارا فسوں بھی ہیچ
امید بھی فضول، امیدوں کا خوں بھی ہیچ
حسنِ عمل بھی ہیچ ہے جذبِ دروں بھی ہیچ

(۶)

شاعر کو چاہیئے رہو عشقِ بتان مین مست
مومن کو چاہیئے ہو خیالِ جنان مین مست
بلبل قفس مین مست ہو یا آشیان مین مست
قدغن ہو کوئی رہ نہ سکے گلستان مین مست

(۷)

اے ہم نفس یہ گرمیِ گفتار کس لیئے؟
یہ ولولہ، یہ شوق، یہ آزار کس لیئے؟
خوابیدہ انجمن مین یہ تلوار کس لیئے؟
بنجر زمین پہ ابرِ گہربار کس لیئے؟

دعوتِ نشاط

از جناب اصغر حسین خان نظیر لودھیانوی

آ کہ خلوت گہِ عالم کو درخشان کردین
ذرہ ذرہ کو چراغِ رہِ عرفان کردین
بحرِ خاموش کو آمادۂ طوفان کردین
منکرِ حشر کو بھی حشر بدامان کردین
ربط باہم سے نئے دور کا سامان کردین
مشکلین عشقِ سیہ بخت کی آسان کردین
موجِ انفاس سے گلشن کو معطر کرکے
باد کو عطر فشان پھول کو خندان کردین
آ پیئین بادۂ اخلاص لبِ جوئے روان
ختم افسانۂ خونریزیِ ہجران کردین
مئے گلرنگ سے لبریز کرین جامِ ایاغ
رات کے گوشۂ خلوت کو فروزان کردین
اک اشارہ سے کرین ساقیِ مطرب کا ظہور
چنگ کو نغمہ سرا، جام کو رقصان کردین
صحنِ گلزار مین جس حوض پہ بیٹھین مل کر
اپنی سایی سے اُسے چشمۂ حیوان کردین
ڈالین جس مور پہ الطاف و محبت کی نگاہ
دم زدن مین اُسی ہمدوشِ سلیمان کردین
اپنا آئینۂ دل اوس کے مقابل رکھکر
اپنے کردار پہ واعظ کو پشیمان کردین

جو نظر آئے پرستارِ صنم خانۂ نظیر
رنگِ توحید اوسے دے کے مسلمان کردین

مطبوعاتِ جدیدہ

اقسام القرآن از مولانا حمید الدین فراہی مرحوم مترجمہ مولانا امین احسن صاحب اصلاحی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۰۸ صفحے، کاغذ و کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۸ر، پتہ:- دائرۂ حمیدیہ سرائمیر اعظم گڈھ،

اللہ تعالیٰ نے کلام مجید میں جابجا جو قسمیں کھائی ہیں، ان کے متعلق ایک متشکک کے دل میں مختلف قسم کے شکوک اور اعتراضات پیدا ہو سکتے ہیں، مثلاً یہ کہ قسم کھانا فی نفسہٖ کوئی اچھی چیز نہیں، اور خدا کے مرتبہ سے تو بہت فروتر ہے، پھر اگر قسم کھائی بھی جائے، تو کسی بلند مرتبہ چیز کی، اور اللہ تعالیٰ نے بہت چھوٹی چھوٹی چیزوں مثلاً توحید، رسالت اور آخرت وغیرہ پر یقین دلانے کے لئے قسم کھائی ہے، تو ان پر محض قسم سے کسی منکر کے دل میں یقین نہیں پیدا ہو سکتا، مولانا مرحوم نے اس کتاب میں انہی شکوک کے جوابات دیئے ہیں، پہلے امام رازی اور ابن قیم کے جوابات نقل کر کے ان کی کمزوری دکھائی ہے، پھر اس بارہ میں اپنی تحقیق بیان کی ہے، ان کے نزدیک کلام مجید کی قسمیں درحقیقت دلیلیں ہیں، چنانچہ مختلف قوموں کی تاریخ، قسم کی غرض و غایت اس کے طریقوں اسکی مختلف قسموں اور کلام مجید اور کلام عرب کی روشنی میں دکھایا ہے، کہ ہر موقع پر قسم کا ظاہری طریقہ متعارف معنوں میں قسم نہیں ہوتا، بلکہ اس سے مقصود استدلال ہوتا ہے، اور کلام پاک کی تمام قسمیں اسی قبیل کی ہیں اسلئے وہ خدا کے رتبہ سے فروتر ہیں، اور اس کے لئے مقسم بہ کی تعظیم و تقدیس ضروری ہے، پھر عام مفسرین پر اس پہلو کے مخفی رہنے کے

اسباب ظاہر کئے ہین، اور دلائل کو قسم کے لباس مین پیش کرنے کی بلاغتین مستحسن اور غیر مستحسن قسمون اور موقع کے لحاظ سے قسم کے مستحسن اور غیر مستحسن الفاظ کا فرق دکھایا ہے، اس ضمن مین اور بہت سے مفید معلومات اور ذوقی نکتے بھی آگئے ہین، مصنف مرحوم کی مخصوص قرآنی تحقیقات کی طرح یہ تحقیق بھی دلنشین اور عقلی و نقلی دلائل سے مدلل ہے، جن لوگون کو کلام پاک کے مطالعہ کا ذوق ہو، یہ کتاب ان کے پڑھنے کے لائق ہے،

ایمان مولانا سید سلیمان ندوی، تقطیع چھوٹی ضخامت ۳۲ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مرقوم نہین، پتہ:- جناب محمد اللہ صاحب انصاری معتمد نشر و اشاعت انجمن تاریخ و تمدن مسلم یونیورسٹی علی گڈھ،

مولانا سید سلیمان ندوی نے انجمن تاریخ و تمدن مسلم یونیورسٹی کے جلسہ ستمبر ۱۹۳۸ء مین یہ تقریر فرمائی تھی، اس میں قومون اور ملتون کے عروج و زوال اور ان کی موت و حیات کے فلسفہ کی روشنی مین ایمان اور اسلامی عقائد پر روشنی ڈالی گئی ہے، کہ کسی قوم کی تعمیر اور اس کی بقا کے لئے اس کے تمام افراد مین ایک مشترکہ عقیدہ، ایک متحدہ نصب العین اور چند اصولِ حیات پر اعتقاد جازم اور اسکے حصول و بقا کے لئے پوری تنظیم و وحدت کے ساتھ علی جدوجہد بمنزلہ اساس کے ہے، بغیر اس کے نہ کوئی قوم زندہ رہ سکتی ہے، اور نہ آگے بڑھ سکتی ہے، اور بغیر مشترک نصب العین کے عمل ناممکن اور بے نتیجہ ہے، اس اصولی بحث کے بعد تاریخ کی روشنی مین عالمگیر انسانی وحدت اور اسکی فلاح کے بارہ مین نسل، قومیت اور اقتصادی عقیدون کی ناکامی اور اس کے اسباب کو دکھا کر اس کے مقابلہ مین اسلامی عقائد کی برتری اسکی عالمگیری اور اس کے اجزاء کی حکمتون اور مصلحتون کو ظاہر کیا ہے، اور اس کے متعلق جو شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہین انھین دفع دخل مقدر کے طور پر دور کیا ہے، یہ تقریر برسون کے تجربہ اور فکر و تدبر کا نتیجہ ہے، اور عوام سوزیادہ ہمارے پریشان فکر حواص

کے پڑھنے کے لائق ہے،

تمدنِ اسلام از مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۳ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت معلوم نہین، یہ کتاب بھی سابق پتہ سے ملیگی،

یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، اس مین مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے اپنے مخصوص موثر تبلیغی انداز مین ایک مسلمان کی پوری زندگی کے مراسم اور تقریبات کے متعلق اسلامی تعلیمات اور انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بارے مین اسلامی قوانین کی سادگی اور پاکیزگی اور اس کے فوائد مصالح اور برکتون اور اس کے مقابلہ میں دوسرے مذاہب کے پیرووں کی زندگی کے مفاسد اور انسانی فلاح مین موجودہ تمدن کی ناکامیون اور اسکی اصلاح کے لئے اسلامی قوانین کی تقلید پر اضطرار کو دکھایا ہے، یہ تقریر نہ صرف مسلمانون بلکہ دوسری قومون کے لئے بھی سبق آموز ہے، اور اس لائق ہے کہ مسلمان اسے اپنی زندگی کا دستور العمل بنائین،

یارانِ میکدہ از جناب عبدالشکور صاحب بی اے علیگ تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۵۱ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت معلوم نہین، پتہ:-

مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی،

انسان کی مختلف قسمون اور ان کی خصوصیات کا نفسیاتی مطالعہ بڑی دلچسپ چیز ہے، اس کتاب میں مزاحیہ رنگ مین ایک درجن مختلف خصوصیات کے انسانون کے کردار دن کا جن مین مرد بھی ہین اور عورتین بھی، خاکہ پیش کیا گیا ہے، ہر کردار کی جزئیات کی مصوری سے مصنف کی قوتِ مشاہدہ کا پتہ چلتا ہے، کتاب بہت دلچسپ ہے، انسانون کی قسمین اتنی گوناگون ہین، کہ ان سب کا احاطہ مشکل ہے، تاہم اس کتاب مین بہت سے دلچسپ نمونے آگئے ہین،

تذکرۂ شمیم، از جناب سعید رضوی بی اے تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۲۸ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت معلوم نہیں، پتہ:- مصنف صحبتیا باغ لکھنؤ سے ملیگی،

جناب مؤلف نے اس کتاب میں اپنی منہ بولی بہن انوار فاطمہ شمیم مرحومہ پروفیسر کراسته ویٹ گرلس کالج الہ آباد کے حالات لکھے ہیں، ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ ایک مسلمان خاتون اعلیٰ تعلیم کے باوجود کس طرح اپنی نسوانی خصوصیات کو قائم رکھتے ہوئے اپنے تمام دینی و دنیوی حقوق و فرائض ادا کر سکتی ہے، مرحومہ کی ذات علمی قابلیت، دینداری، سیرت و اخلاق کے لحاظ سے مسلمان عورتوں کے لئے قابلِ تقلید نمونہ تھی اصلاحِ حالات آج کل کی تعلیم یافتہ عورتوں کے پڑھنے کے لائق ہیں، جناب مؤلف کو مرحومہ سے دلی تعلق تھا جس کا اثر پوری کتاب میں نمایاں ہے، انداز بیان موثر اور دلنشین ہے،

ملیریا مؤلفہ جناب ڈاکٹر محمد عبدالحئی صاحب بی اے، ایل ایل بی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۹۲ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مرقوم نہیں، پتہ:- ڈاکٹر محمد عبدالحئی ہومیوپیتھ جونپور،

ملیریا ہندوستان کا سب سے زیادہ موذی مرض ہے، اس سے لاکھوں جانیں سالانہ ضائع ہوتی ہیں، جناب محمد عبدالحئی صاحب نے جو ایک تجربہ کار ہومیوپیتھ ہیں، اس کتاب میں اس مہلک مرض کی تمام قسموں، اس کی علامتوں، طریقۂ علاج اور دواؤں وغیرہ کے متعلق بہت مفصل اور مفید معلومات جمع کر دیئے ہیں، آخر میں میٹیریا میڈیکا کی وہ دوائیں جو اس مرض میں زیادہ مفید ثابت ہوئی ہیں، ایک مکمل اور جامع ریپٹری بھی دیدی ہے، کتاب کی فنی خوبی کا صحیح اندازہ تو اس فن کے واقف کار ہی کر سکتے ہیں، لیکن بظاہر کتاب بہت جامع اور مفید معلوم ہوتی ہے،

خزینۂ رباعیات از جناب شفق عمادپوری تقطیع جیبی ضخامت ۴۴۵ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت:- پتہ:- شمسی پریس بکڈپو گھسیارٹولہ گیا،

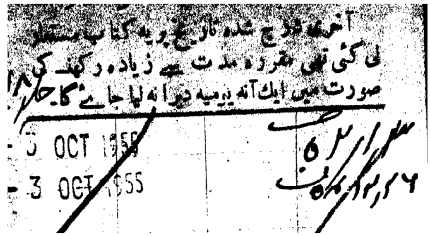
جناب شفق عمادپوری کی شہرت تعارف سے مستغنی ہے، خزینہ رباعیات ان کی رباعیون کا مجموعہ ہی، اس مین، توحید، تحمید، نعت منقبت، فلسفۂ الٰہیات، اخلاق وتصوف، دل، دنیا، ہستی، جوانی، پیری، فنا وبقا، جاڑا گرمی، برسات، روزے، عید، عشرہ محرم، قومی تخیل خیام، ساقی، حسن وعشق، مکالمے، ضرب الامثال، مذاق، نصائح، اور آپ بیتی کے متعلق چار سو رباعیان ہین، جناب شفق کی قادرالکلامی مسلم ہے، یہ تمام رباعیان اس کا نمونہ ہین،

ایضاحِ سخن، مؤلفہ جناب مولوی تمنا عمادی پھلواروی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۳۹ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت معمولی، قیمت عہ علاوہ محصول ڈاک پتہ:-

مسلم ایسوسی ایشن پھلواروی ضلع پٹنہ،

اصلاحِ سخن جناب احمد علی صاحب شوق سندیلوی کی مشہور کتاب ہے، اس مین ان کی سولہ غزلون پر ہندوستان کے اکثر ممتاز اساتذہ کی اصلاحین ہین، مولوی تمنا صاحب نے ان تمام اصلاحون پر نقد وتبصرہ کرنے کا ارادہ کیا تھا، لیکن ایک ہی غزل کی نوبت آئی تھی، کہ یہ کام رُک گیا، عام استفادہ کی غرض سے اسی کو انھون نے شائع کر دیا ہی، جناب مؤلف ایک مشہور اور صاحبِ نظر استاد ہین، اس لئے انکا یہ تبصرہ بھی ناقدانہ اور مستبصرانہ ہے، اور اس مین شعروشاعری کے متعلق بہت سے ادبی نکتے معلوم ہوتے ہین، لیکن جس طرح ان اصلاحون پر نقد کی گنجایش تھی، اسی طرح اس نقد پر کہین کہین گفتگو کی گنجایش نکل سکتی ہے، لیکن ادبی حیثیت سے اسکی اہمیت وافادیت مسلم ہی اور نوشق شعراء اور اردو زبان وادب کے طلبہ کی ادبی بصیرت کیلئے اس کا مطالعہ بہت مفید ہے،

"م"



آخری درج شدہ تاریخ پر یہ کتاب مستعار
لی گئی تھی مقررہ مدت سے زیادہ رکھنے کی
صورت میں ایک آنہ یومیہ دیرانہ لیا جائے گا۔
3 OCT 1955
3 OCT 1955